# کائنات کے اَن کُھلے راز

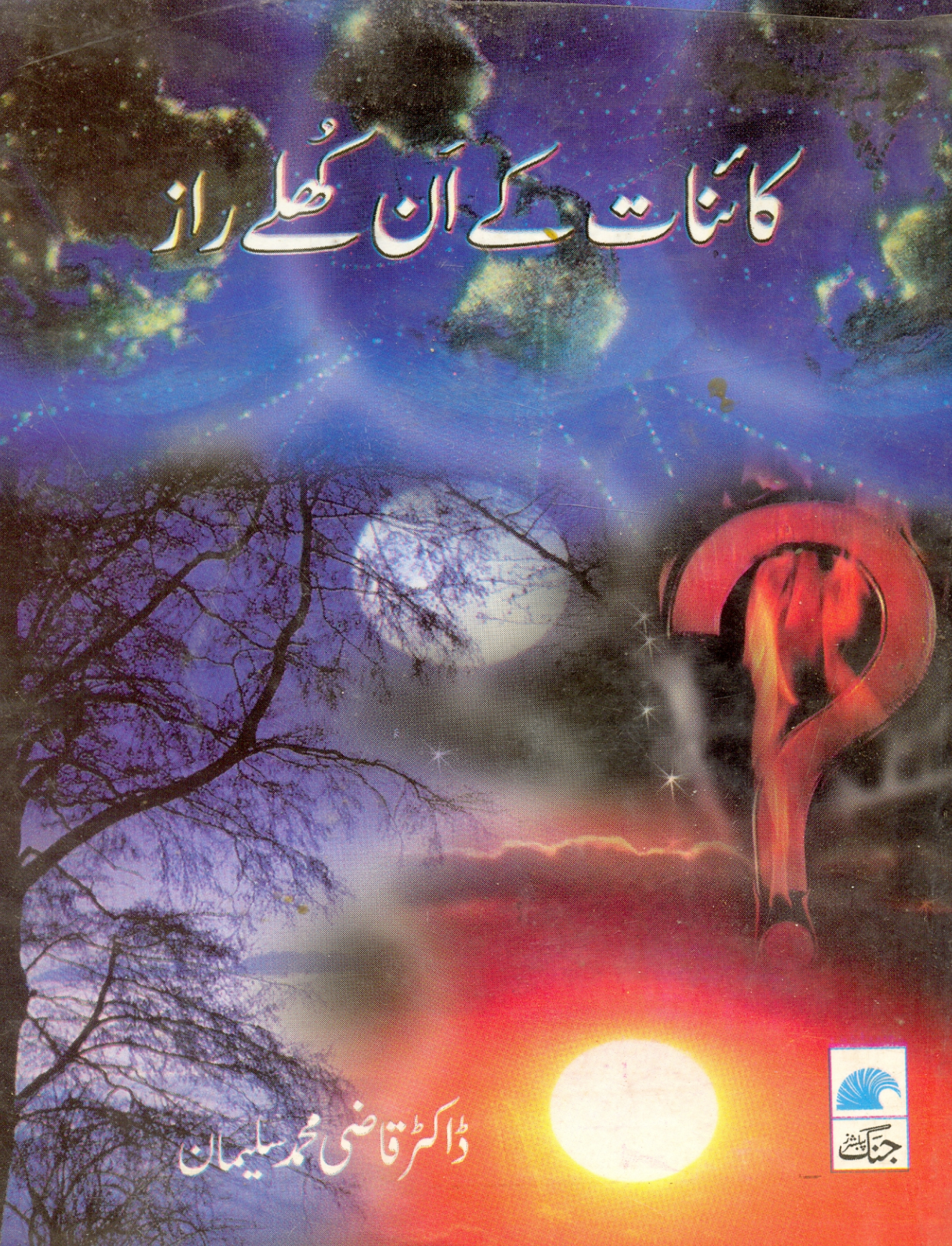

ڈاکٹر قاضی محمد سلیمان

جنگ پبلشرز

# کائنات کے ان کھلے راز

دیو مالا، مذہب، تصوف، سائنس، ادب، تاریخ، تہذیب،
آثار قدمیہ، السنہ، انسانیات، نفسیات، جرم و سزا،
جغرافیہ، ارضیات، حیاتیات، کیمیا، فلکیات، کونیات،
طبیعیات، فلسفہ، منطق، علوم مخفی اور دیگر علوم و فنون کے
وہ ان کھلے راز جن پر عالم انسانیت انگشت بدنداں ہے

# کائنات کے ان کھلے راز

محمد سلیمان قاضی

جنگ پبلشرز

13۔ سر آغا خاں روڈ لاہور فون: 6307804, 6367480-83

Fax = (042) 6309761-2, 6362316, 6361026 http:// www. Jang-group.com

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات

ناشر : میر شکیل الرحمٰن

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت : اپریل 2000ء
قیمت : 250روپے
زیر اہتمام وادارت : مظفر محمد علی
ٹائٹل ڈیزائن : انیس یعقوب
پرنٹرز : جنگ پبلشرز پریس
: جنگ انٹرپرائزز لمیٹڈ کی ذیلی ادارہ
: 13سر آغا خان روڈ لاہور

# انتساب

اپنے مخلص ترین دوست
فضل الرحمٰن قاضی کے نام
——— جو میرے والد بھی ہیں

# فہرست


باب اول : خدا، مذہب اور متعلقات ۱۵
خدا ۱۷
مذہب ۲۱
مذہب اور پیشنگوئی ۲۵
تصوف ۲۷
شیطان مت ۲۸
معجزے ۳۱
کرامتیں ۳۶
طوفان نوحؑ ۴۰
کشتی نوحؑ ۴۱
تورات کا نادر نسخہ ۴۲
یسوع مسیح کا کفن ۴۴
انجیل برنباس ۴۷
تقدیر ۴۸
آئندہ آنے والے ۵۱
حیات بعد از موت ۶۰
آواگون/تناسخ ۶۱
حوالہ جات ۶۳

باب دوم : اسرار تہذیب ۶۵
گمنام تہذیبیں بے نام شہر ۶۷
پراسرار تہذیبیں گم شدہ تاریخ ۶۹
انسان کی قدامت، تہذیب کی ابتداء ۷۴
تحریر کی ابتداء پراسرار تحریریں ۷۶
پراسرار تعمیرات ۸۰
خطوں کی دریافت ۸۹
پراسرار نقشے ۹۳
عالمی تہذیب کا نظریہ قدیم تہذیبوں کے مابین روابط ۹۶
نئی اور پرانی دنیا کے لسانی روابط ۹۸
گمشدہ دانش ناپید علوم ۱۰۰
قدیم فلکیات ۱۰۶
حوالہ جات ۱۰۷

باب سوم : اسرار فطرت ۱۰۹
کائنات کا آغاز ۱۱۱
معمہ وقت ۱۱۳
زندگی کا آغاز ۱۱۴
خلائی مخلوق کی تلاش ۱۱۶
ڈائنو سور زکیوں ختم ہو گئے ۱۱۹
زندہ رکاز اور زندہ مدفون مخلوق ۱۲۱
ہالہ نور ۱۲۳
روشن اور آتشیں گولے ۱۲۴
کیا فلکی اجسام انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ۱۲۷
دسواں سیارہ ۱۲۹

موت زندگی کا منطقی انجام ۱۳۰
قیامت کائنات کا انجام کیا ہو گا ۱۳۱
حوالہ جات ۱۳۲

باب چہارم : اسرار آدم ۱۳۳
انسان کی پیدائش ۱۳۵
مماثل جڑواں بچے ۱۳۶
نابغہ بچے ۱۳۹
روح ۱۴۳
ذہانت ۱۴۵
ذہن انسان ۱۴۶
انسانی ذہن کس طرح کام کرتا ہے ۱۴۷
یادداشت ۱۴۸
معمہ شناخت ۱۴۹
دماغ جنہوں نے طبی ماہرین کو ہلا دیا ۱۵۲
سائی کومیٹری ۱۵۳
ذہنی تصویر کشی ۱۵۵
تیسری آنکھ (بن آنکھوں کی بصارت) ۱۵۶
تنویم ۱۵۷
آتش قدمی آگ سے کھیلنے والے ۱۶۰
پراسرار آتش زدگی یہ انسان کیوں جل گئے ۱۶۲
غیر حنوط شدہ محفوظ لاشیں ۱۶۴
زمانے میں سفر ۱۶۶
انتقال روح ۱۶۸
طائر روح کی پرواز ۱۶۹
روحوں سے رابطہ ۱۷۱
روحوں کا رابطہ ۷۴
حوالہ جات ۷۷

باب پنجم : پراسرار مخلوق ۱۷۹
جنات ۱۸۱
بھوت ۱۸۳
بدارواح/ارواح خبیثہ ۱۸۷
آدم نما انسانوں کے پراسرار بھائی بند ۱۸۹
بگ فٹ ۱۹۳
برفانی انسان ۱۹۶
زندہ ڈائنو سار اور غیر شناختہ حیوانات ۱۹۸
کراکن ۲۰۲
نیسی - لاخ نیس کا عفریت ۲۰۳
جھیلوں کی بلائیں ۲۰۷
حوالہ جات ۲۱۱

باب ششم : جنگیں- جرائم- حوادث اور ایجادات ۲۱۳
نپولین کا انجام ۲۱۵
ہٹلر کی زندگی کے پراسرار گوشے ۲۱۶
ٹائی ٹینک کی تباہی ۲۱۸
لوسی تینیا کی غرقابی ۲۲۰
ہنڈن برگ کی بربادی ۲۲۲
پرل ہاربر پر جاپانی حملہ ۲۲۳
جم جونز اور ہزار انسانوں کا قتل ۲۲۵
ساڑھے اٹھارہ منٹ کا وقفہ ۲۲۷

وائرلیس کا موجد کون۔ مارکونی یا سٹیبل فیلڈ ۲۲۸
پانی کا ایندھن۔ جعلسازی یا حقیقت ۲۲۹
نکولا ٹیسلا ۔ ایک عظیم اور پراسرار موجد ۲۳۱
بارش برسانے والے ۲۳۲
افق کے پار دیکھنے کا علم
حوالہ جات ۲۳۵

باب ہفتم : نامعلوم انجام اور پراسرار گمشدگیاں ۲۳۷
گمشدہ سرزمین ۲۳۹
بنو اسرائیل کے گمشدہ قبائل ۲۴۵
پریسٹر جان کی گمشدہ سلطنت ۲۵۰
جنرل بخت خان روہیلہ ۲۵۲
بے چاری ایمیلیا ۲۵۳
ہٹلر اور دوسرے نازیوں کا انجام ۲۵۵
جزیرے کی آنکھ مچولی۔ گمشدہ جزیرہ ۲۵۷
برمودا مثلث ۲۵۸
گمشدہ خزانے ۲۶۰
ایلڈوراڈو کا خزانہ ۲۶۰
پیرو کا خزانہ ۲۶۲
جزیرہ اوک کا خزانہ ۲۶۲
برے فوگل کی گمشدہ کان ۲۶۳
ولندیزی شخص کی گمشدہ کان ۲۶۴
ایڈم کی سونے کی کان ۲۶۶
حوالہ جات ۲۶۶

باب ہشتم : پراسرار علوم ۲۶۷
علم نجوم ۲۶۹
علم کیمیا/کیمیا گری ۲۷۲
علم باطن/علم تصوف/علم لدنی ۲۷۶
علم ارواح۔ روحیت ۔ حاضرات ارواح ۲۷۸
حوالہ جات ۲۸۱

هر کس نه شناسندهٔ راز است و گرنه
انها همه راز است که معلوم عوام است

# پیش لفظ

یہ کتاب الاسرار ہے!

یہ ان حقائق پر طائرانہ نظر ڈالتی ہے جنہوں نے مسلمہ علوم کے ماہرین کو چیلنج دے رکھا ہے۔ یہ ناقابل یقین واقعات، خوارق عادت مظاہر اور مافوق الفطرت حقائق کی کہانی ہے۔ یہ وہ ان کھلے راز ہیں جو انسانوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہیں انہیں دھمکاتے ہیں، خوفزدہ کرتے ہیں، بے یقینی سے دوچار کرتے ہیں اور رہ رہ کر اپنا پیچھا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

ایک ان کھلا راز انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ اس پہلے تاثر کے بعد انسان اس راز کا چیلنج قبول کر لیتا ہے جو وہ بزبان حال دے رہا ہوتا ہے کہ میں ایک معمہ ہوں، ایک گتھی ہوں اسے سلجھا سکتے ہو تو سلجھاؤ میں ایک پہیلی ہوں، بجھارت ہوں، تم اپنی سوجھ بوجھ سے اسے بوجھنے کی کوشش کرو۔

ان اسرار کا پیچھا کیوں کیا جائے؟ ان گتھیوں کو سلجھانے کا کیا فائدہ؟

در حقیقت حصول علم کی اساس تسکین استعجاب Satisfaction of Curosity میں ہے۔ یہ انسان کا ذوق تجسس ہی ہے جو اسے مجبور کرتا ہے کہ اسے ان ان کھلے رازوں کی کنہ و حقیقت کا علم حاصل ہو جائے۔ چنانچہ تاریخ انسانی کی ایک تشریح ان معنوں میں بھی کی جا سکتی ہے یہ اسرار کو حل کرتے چلے جانے کی مسلسل کاوشوں کی داستان ہے۔

نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے ان اسرار کے مختلف درجے ہیں۔ بعض کا تعلق ہماری بقاء سے بھی ہے۔ کائنات کی زیادہ سے زیادہ کھوج اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ علم۔ بنی نوع انسان کے مستقبل کا دارومدار اسی بات پر ہے۔ اسرار سے واقفیت آگے بڑھنے پر اکساتی ہے۔ کسی ممکنہ اور قابل قبول حل کی تلاش میں نئے نظریات، نئی دریافتیں اور ایجادات منظر عام پر آتی ہیں۔ پرانے تصورات تبدیل ہو جاتے ہیں اور تہذیب ایک قدم اور آگے بڑھ جاتی ہے۔

غالباً انسان جلد باز واقع ہوا ہے کسی مسئلے کے متعلق جو حل اسے سوجھتا ہے اسے فوری طور پر حرف آخر قرار دے دیتا ہے مگر فکر و تدبر اور ٹھنڈے ذہن سے سوچنے پر اسے بعض جہتیں ہنوز سوالیہ نشان بن کر سر اٹھائے نظر آتی ہیں۔ ذہن کی حدود کی وسعتوں سے انکار نہیں لیکن حقائق اور امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے رویئے پر نظر ثانی کرنے سے احتراز بھی کوئی حوصلہ افزاء امر نہیں۔ ان اسرار کو توہم پرستی یا کج بحثی خیال کرنا اسی رویئے کی دلیل ہے۔ سائنسی طرز فکر جلد بازی سے روکتا ہے۔ چنانچہ ان اسرار کے مطالعہ کے بعد فرانسیسی سائنس داں مارسلین برتھی لوٹ کے قول میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ اس نے ۱۸۸۷ء میں سائنسی ترقی کی رفتار دیکھتے ہوئے کہا تھا

"From now on there is no mystery about the Universe"

اس کے اس غیر حقیقت پسندانہ بیان کی نسبت ہائزن برگ کے اصول غیر یقینی کی روشنی میں برطانوی ماہر حیاتیات جے بی ایس ہالڈین کا یہ مقولہ کتنا قرین

حقیقت معلوم ہوتا ہے کہ

"The Universe is not only stranger than we imagine, it is stranger than we can imagine"

لیکن ان اسرار کے بیان سے یہ مطلب ہر گز نہ لیا جائے کہ یہ عقل و شعور کی تذلیل و تحقیر کے نقطۂ نظر سے لکھے گئے ہیں۔ مصنف نہ تو خرد دشمنی کا علمبردار ہے اور نہ ہی عقل کے جامد پن اور یکطرفہ سوچ کو قابل ستائش سمجھتا ہے۔ یہاں صرف معلومہ حقائق کو بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے اور اپنی رائے دینے سے حتی الامکان اجتناب کیا گیا ہے۔ نشر و اشاعت کے ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں ان پر مختلف مکاتب فکر کے زعماء کی آراء اور تشریحات اور توجیہات نمایاں ہیں۔ گویا منقولاتی شہادتوں کو تجرباتی استدلال سے پرکھنے کی دعوت دی گئی ہے۔

شائد پراسراریت سے دلچسپی انسان کے خمیر میں ہے۔ بیشتر انسانوں کی تحیر پسندی ہی ہے کہ سس پنس کا عنصر ڈرامے یا کہانی کا جزو لازم بن چکا ہے۔ چنانچہ جس طرح ایک طربیہ تحریر کا منتہا طبیعت کا شگفتہ پن اور المیہ کا افسردگی اور خوفناک تحریر کا مطالعہ ڈر کا احساس پیدا کرتا ہے ویسے ہی ان اسرار میں سے ہر ایک کے مطالعہ کے بعد تشنگی کا ایک احساس پیدا ہوتا ہے اور یہی احساس تشنگی اسرار کے بیان کی جان ہے۔

محمد سلیمان قاضی

(۱۵ - ۱۲) ۵/۱/۲ گوردت سنگھ روڈ، کوئٹہ

باب اول

# خدا، مذہب، فلسفہ

# اور

# متعلقات

# خدا..... ہستیٔ برتر کا تصوّر

اگر خدا موجود نہ ہوتا تو اسے ایجاد کرنا ضروری تھا۔ (وولٹائر)

قدیم ترین ادوار سے انسانی تہذیبوں میں کسی ایک یا بہت سی ماورا ہستیوں کا تصور تواتر سے چلا آتا ہے۔ اس ذات کو بہت سے ناموں سے پکارا گیا۔ بہت سے متنوع کام، خواص اور طاقتیں اس سے منسوب ہوئیں۔ اسے حقیقتِ اُولیٰ اور علّت اُولیٰ کہا گیا۔ محبت، قوت، علم اور تخلیق کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔ یہ لفظ خدا "خود آSELF EXISTANT" سے مشتق ہے جو اس ہستی برتر سے منسوب، ایک خوبی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

گو دنیا کے تمام قدیم و جدید مذاہب میں عبادات کی جزئیات میں فرق ہے لیکن ایک نکتہ ایسا ہے جس پر سب کا اتفاق ہے اور وہ کسی ہستی برتر کی "خالق" کی حیثیت ہے۔

لاادری AGNOSTICS وہ ہیں جو کائنات کی ابتدا اور خدا کے بارے میں کوئی رائے دینے سے معذور ہوتے ہیں، لیکن صرف مادی مظاہر کے بارے میں یقینی ہوتے ہیں۔ دہریئے ATHIEST خدا کے ہونے سے ہی انکاری ہوتے ہیں، جبکہ الوہیت کا اقرار کرنے والے مُوحّد، خدا پرست THEIST ہمہ از اُوست کا اعتقاد رکھنے والے، وجود انسانی کو وجود خداوندی کا مرہون منت خیال کرتے ہیں اور خدا کو تمام سچائیوں کا عمیق اور اعلیٰ راز داں سمجھتے ہیں۔

الٰہ پرست DEISTS وہ ہیں جو فطرت کی بنیاد پر خالق کائنات کی ہستی کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن اس سے دعا مانگنے کو بے مصرف سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں خدا کاروبار کائنات میں حصہ نہیں لے رہا۔

خدا کے بارے میں عمومی تصور ہر عہد میں مختلف رہا ہے بلکہ ایک ہی عہد میں اس تصور میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر بڑا تنوع نظر آتا ہے۔

درحقیقت جب بھی کوئی خدا کے بارے میں بات کرتا ہے تو یہ بات خدا کے بارے میں انسانی تصور کی بات ہوتی ہے۔ یوں ہر فرد کا خدا کے بارے میں الگ اور انفرادی تصور ہوتا ہے جو زندگی کے مختلف ادوار میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فرد اپنی طبیعت کے مطابق اس تصور کو اپنے ذہن میں ڈھالتا رہتا ہے۔

اجتماعی سطح پر آئیں تو یہاں بھی احساس ہوتا ہے کہ معاشرہ جس ماحول سے گزر رہا ہوگا اجتماعی طور پر ویسا ہی خدا کا تصور نظر آئے گا۔ ایک قوم جب مفتوح اور مغضوب ہو تو اس وقت اس کا تصور خدا کے بارے میں اور ہوتا ہے اور فاتح اور خوشحال ہونے کی صورت میں وہ اور تصور رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر کسی قوم کے تمدن کا جائزہ کسی خاص دور میں لینا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس مخصوص دور میں اس قوم کی خدا کے بارے میں کیا رائے تھی۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ گزرے ہوئے ادوار میں آنے والا دور گزشتہ دور سے مادی اعتبار سے آگے ہوتا ہے لہٰذا اسی نسبت سے خدا

کے تصور میں وقت کے ساتھ ساتھ ارتقاء ہوا۔ دہریوں کے مطابق ایک وقت تھا جب وحشی انسان ہر ضرر رساں یا فائدہ مند چیز میں کسی معبود کو پا لیتا تھا چنانچہ سانپ اور آگ کی پرستش اور مادر گیتی سے عقیدت اسی کے مظاہر ہیں۔ پھر مشاہدے اور تجربے نے یہ سمجھایا کہ یہ چیزیں تو انسانی دسترس میں ہیں تو وقت کے ساتھ ساتھ گویا خوب تر کی تلاش جاری رہی۔ یوں تصور خدا (نعوذ باللہ) ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتا پھرا۔ درختوں اور پہاڑوں میں وہاں سے دریاؤں میں سمندروں اور جب انسانوں نے سمندروں کا سینہ بھی چیر دیا تو گویا تصور خدا نے بھاگ کر آسمان میں پناہ لی۔

تصور خدا کی حکمرانی دنیا پر دو طرح سے رہی ہے پہلے تصور میں تو خدا کا کوئی شریک نہیں وہ واحد ہے کائنات کے تمام چھوٹے بڑے معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں اسے عقیدہ توحید (MONOTHEISM) کہتے ہیں۔ فرعون اخناتون نے عقیدہ توحید کی جانب لوگوں کو راغب کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے اس نے سورج کو خدائے واحد کا درجہ دیا۔

دوسرا تصور اپنے اندر ایک تکوینی نظام سموئے ہوئے ہے۔ اس نظام میں ہر مظہر کا اپنا خدا یا دیوتا ہوتا ہے جو اپنے دائرہ کار میں کامل اختیار رکھتا ہے۔ چنانچہ قدیم یونان میں آسمان کا دیوتا زیوس، قانون کا دیوتا اپولن اور جنگ کا دیوتا ایریز مانا جاتا تھا۔ اسے کثرت پرستی (POLYTHEISM) کہتے ہیں۔ مذاہب عالم کے محققین کی دو آراء ہیں ایک مکتب فکر کے مطابق انسان کثرت پرستی سے توحید پرستی کی طرف راغب ہوا جبکہ دوسرے گروہ کا اصرار ہے کہ پہلے پہلے انساں موحد تھا رفتہ رفتہ وہ کثرت پرستی اور شرک کی جانب آیا۔

انسان کا تصور اسے خدا کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سمجھاتا کبھی انسان خدا کو اپنی شکل میں ڈھال لیتا اور کہتا آدمی 5 فٹ ہوتا ہے اور دیوتا ہزاروں گز لمبے تڑنگے۔ آدمی ایک گلاس پانی پیتا ہے تو دیوتا سمندر انڈیل لیتے ہیں۔ یہ دیوتا بنیادی انسانی کمزوریوں اور جذبات سے بھی پاک نہیں ہوتے۔ دیویوں کا پیچھا کرنے سے باز نہیں آتے۔ بے وقوف بھی بن جاتے ہیں اور انہیں نیند بھی آتی ہے پھر ہر ایک کی طبیعت میں فرق ہے کوئی غصہ میں ہمہ وقت پھنکارتا رہتا ہے اور ناراض ہونے پر آدمیوں کے گروہ کے گروہ سموچا نگل لیتا ہے۔ وحشیانہ قربانیاں لے کر راضی ہوتا ہے اور کوئی بے انتہا رحم دل ہے، ایسے ہی ہر ایک اپنے اپنے کام سے مخصوص ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن پھر انسان کے ذہن میں تصور پیدا ہوا کہ اس قسم کے بچگانہ تصورات دیوتاؤں کے شایان شان نہیں، لہٰذا اب دیوتا کھانے پینے اور سونے کے حاجت مند نہیں رہے۔ یوں خدا کے بارے میں رفتہ رفتہ ایسا تصور پیدا ہونے لگا جو اسے مافوق الفطرت، خامیوں سے پاک ہر شے پر قادر اور بے نیاز ظاہر کرتا ہے۔ توحید کے تصور کے متعلق ماہرین مذہب تصور خدا کی بنیادی طور پر دو اقسام بیان کرتے ہیں۔ جو زمانہ قدیم سے رائج ہیں۔ پہلا ماورائی دوسرا سریانی①

ماورائی تصور خدا سامی نسل کی اقوام اور ان کے مذاہب کے حوالے سے مشہور ہے۔ اس تصور کے مطابق خدا کائنات اور مادے سے بالا ایک ایسی شخصیت ہے جو عدم سے مادے کو وجود میں لانے پر قادر ہے اور اپنی مرضی کا مالک ہے مخلوق خالق کی ذات تک پہنچنے سے قاصر ہے جسے وحدت الشہود کہتے ہیں۔

سریانی تصور خدا کو سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ سریان کیا ہے۔ سریان ایک چیز کے دوسری چیز میں نفوذ کر جانے کو کہتے ہیں۔ گویا سریانی تصور خدا دعویٰ کرتا ہے کہ خدا مادے میں نفوذ کئے ہوئے ہے۔ اس تصور کے مطابق خدا اور مادہ دونوں قدیم ہیں اور مخلوق ترقی کر کے جزو خدا بن سکتی ہے۔ یعنی عشرت قطرہ یہی ہے کہ وہ دریا میں فنا ہو جائے اسے وحدت الوجود (PANTHISM) کہا جاتا ہے۔ یہ تصور آریائی اقوام کی پہچان ہے۔

ماورائی اور سریانی تصورات پر مزید بات مذہب اور تصوف کے عنوانات کے تحت ہوگی۔ یہاں ہم خدا کے ادراک سے متعلق گفتگو کریں گے کہ انسان نے خدا کی جستجو کس انداز میں کی ہے۔ گو فارسی مقولہ ہے کہ "بے علم نتواں خدا را شناخت" لیکن اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ میں اس صدی میں خصوصاً اور گزشتہ صدیوں میں عموماً ایسے افراد کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے خدا کے کسی بھی شکل میں وجود سے صاف انکار کیا۔ قطع نظر اس بات کے کہ ایسا کن حالات کے تحت ہوا ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے خدا کو عقلی بنیادوں پر جاننے کی کوشش کی اور بڑی علمی بحثیں بھی کیں۔

ماضی میں اس کی شکل بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰؑ سے اصرار کرنا ہے کہ وہ خداوند سے کہیں کہ وہ انہیں اپنا آپ دکھائے۔ نسبتاً قریب کے دور میں اس دہریئے کا حوالہ ملتا ہے جس نے ایک مسلم فقیہہ سے دریافت کیا تھا کہ خدا کہاں ہے تو مسلم فقیہہ نے جواب میں اسے پتھر کھینچ مارا تھا اور جواباً سوال داغ دیا تھا کہ بتاؤ درد کہاں ہے اور وہ سائل اپنا سامنہ لے کر رہ گیا تھا۔

محققین دو گروہوں میں تقسیم ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو مذہب سے قلبی تعلق کی بنا پر خدا کے وجود پر ثبوت فراہم کرنے کی نیت سے مصروف کار

ہے جبکہ دوسرا گروہ اس بات کو ذہن میں رکھ کر کام کر رہا ہے کہ کسی طرح کائنات کی تشریح اس انداز سے کی جائے کہ جس کے سبب ''خدا کی ضرورت'' نہ رہے اور کوئی بھی ایسا کام نہ رہے جس کے بارے میں اہل مذہب کہہ سکیں کہ یہ خدا کر رہا ہے۔

جولین ہکسلے (RELIGION WITHOUT REVOLUTION) میں کہتا ہے ''نیوٹن نے دکھایا ہے کہ خدا نہیں ہے جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریئے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں۔ باسیور نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے''۔

خدا پر یقین رکھنے والے حضرات کو بخوبی علم ہو چکا ہے کہ انسان اب محض تک بندیوں سے نہیں بہلے گا۔ اوپر مسلم فقیہہ کی مثال ہی لے لیجئے کیا یہ بات موجودہ دور کے انسان کے لئے قابل قبول ہو گی؟ یقیناً نہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ''درد'' دکھانا اب ممکن ہو چکا ہے۔ برقناطیسی فیلڈ میں مخصوص کیمروں کے ذریعے اگر ہم جسم کے درد محسوس کرنے والے حصے کی تصویر کھینچیں تو جسم کا وہ مخصوص حصہ باقی حصوں کی نسبت مختلف رنگ کے نتائج دے کر واضح کر دے گا کہ ہم نے درد دیکھ لیا۔ اب خدا دکھایا جائے۔ لیکن ٹھہریئے پہلے ایک بات سن لیجئے درد کیا ہے؟ ایک احساس، خدا کو بھی محسوس کرنے والے محسوس کرتے ہیں۔ یعنی خدا بھی ایک احساس ہے۔ بقول شاعر ؎

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

درد کا احساس کیونکر پیدا ہوا؟ اس وقت جب مادہ (پتھر) مادے (گوشت) سے ٹکرایا۔ یعنی مادے کے تصادم کے نتیجے میں احساس پیدا ہوا۔ یہ طے شدہ ہے کہ مادہ پہلے پیدا ہوا اور بعد میں اس میں حس پیدا ہوئی۔ پھر پڑھیئے ''مادے کے تصادم کے نتیجے میں احساس پیدا ہوا'' کیا کہہ دیں کہ مادہ پہلے پیدا ہوا پھر کہیں شعور پیدا ہوا اور پھر آخر میں اس شعور نے خدا کو پیدا کیا؟

اہل مذہب کہتے ہیں کہ باقی ٹھیک لیکن آخر میں یوں کہئے کہ شعور نے خدا کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس خدا کا ادراک کیا (لیکن پھر وہی کہ یہ ادراک تو مادے کے تصادم کے نتیجے میں پیدا ہوا) اہل مذہب اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شعور اعلیٰ نے مادے کو پیدا کیا اور پھر مادے میں انسانی و حیوانی سطح کا شعور پیدا ہوا۔

دوسری طرف دہریئے بھی تک بندی سے اجتناب نہیں کرتے، مثلاً ماضی میں ایک سوال بڑا مشہور ہوا کہ ''کیا خدا ایک ایسی چٹان تخلیق کر سکتا ہے جسے وہ نہ اٹھا سکے'' یوں خدا کے ہر چیز پر قادر ہونے پر زد پڑتی ہے۔ کیا خیال ہے؟

دراصل منطقی طور پر یہ سوال ہی غلط ہے۔ جب ہر شے پر خدا قادر ہے تو چٹان نہ اٹھا سکنا چہ معنی دارد؟ اس کی مزید تشریح ایک مصنف نے یوں کی کہ جب ہم کہتے ہیں کہ کوئی قوت ایسی ہے جسے بے اثر کر دینے والا کوئی بھاری بھرکم جسم نہیں ہے تو ہم کسی ایسے جسم کا تصور نہیں کر سکتے جسے یہ قوت اٹھا دینے پر قادر نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر ہم کہتے ہیں کہ کوئی جسم اس قدر وزنی ہے کہ بڑی سے بڑی قوت بھی اسے ہلانے پر قادر نہیں ہے تو پھر کوئی بھی ایسی طاقت خارج از بحث ہے جو اس جسم کو حرکت دے سکتی ہو۔ خدا کے وجود سے انکار کرنے والے ایک زمانے تک صاف صاف لفظوں میں کسی خالق کے وجود سے انکار کرتے رہے ہیں لیکن تخلیق کائنات کے پیچیدہ ترین مسائل کو وہ حل نہیں کر پا رہے۔ پھر اس تمام ہل چل پیدائش ارتقاء اور موت کے سلسلہ کا مقصد ان کی سمجھ سے بالا ہے۔ مارکس جو جدلیاتی نظریہ پیش کرتا ہے کہ نظام میں سے نظام کے مخالف ایک نظام پیدا ہوتا ہے جو پہلے کو ختم کر دیا کرتا ہے پھر نئے نظام کی غلطیوں کے نتیجے میں اس نظام کے مخالف ایک تیسرا نظام جنم لیتا ہے جو دوسرے نظام کو ختم کر دیتا ہے یوں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے لیکن اسی جدلیاتی کیفیت کا مطمح نظر کیا ہے؟ کہ اس کا مقصد ''روح مطلق'' تک پہنچنا ہے۔ یہ روح مطلق کیا ہے؟ خالق کائنات؟۔

الحاد کے سلسلے میں سب سے بدنام سوویت یونین میں ایک رخ پر تحقیق جاری رہی وہاں اس پر بحث و مباحثے بھی ہوتے رہے ہیں۔ اصحاب اعتقاد اور ملاحدہ کے مناظر فلم شو کی صورت میں پیش ہوتے تھے۔ مزید پیش رفت تعلیمی اداروں کے سلسلے میں ہوئی۔ سوویت اخبار قزل ازبکستان کی 16 اپریل 1963ء کی اشاعت میں درج تھا کہ ملک میں چودہ یونیورسٹیاں اور چھ الحاد گھر کام کر رہے ہیں۔ 1959ء پہلی مرتبہ اشک آباد میں یونیورسٹی

آف ایتھی ازم (جامہ الحاد) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ لیکن یہاں کی تحقیق اور الحاد کے پروپیگنڈے سے پیشتر حکومت نے گزشتہ دہائیوں میں مذہب کو سختی سے کچلنے اور خدا کے تصور کو ذہنوں سے نکال باہر کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ نوجوانوں میں خصوصاً یہ نظریات سرایت کر گئے۔ مقامی طور پر اس کی مثال روسی خلاباز عزمان ٹیٹنوف کا وہ بیان تھا جس کا تذکرہ ویسٹرن میل کارڈف کی یکم فروری 1964ء کی اشاعت میں کیا گیا۔ اس نے کہا کہ "اجرام کائنات کے مطالعہ اور کائنات کے اندر گہرائیوں تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد زمین یا آسمان پر خدا کے لئے کوئی جگہ نظر نہیں آتی"[2] یورپ میں ایسے اشتہارات عام تھے جن میں مزدور کو دکھایا جاتا کہ وہ خدا کو ٹھوکریں مار کر آسمان سے نکال رہا ہے۔ ادھر خدا دشمنی کا نظارہ عراق میں اس وقت نظر آیا جب کارکنان بعث پارٹی نے سر بازار خدا کا مصنوعی جنازہ نکالا۔

1960ء کی دہائی میں مسیحی علماء نے رائے دی کہ "خدا مر چکا ہے" ان کا کہنا تھا کہ خدا کا "باپ" ہونے کا روایتی عیسائی تصور اور مافوق الفطرت قوتوں کی مالک ہستی کا نظریہ جدید دنیا کے سائنسی تصورات سے میل نہیں کھاتا (GOD DICTIONARY OF IDEAS) انگلستان کی کلیساء کے رکن اور شاریات کے ماہر ڈاکٹر ڈیوڈ پیرٹ نے "مسیحیت اور مذاہب عالم۔ 1985ء میں" میں لکھا ہے "کہ بیسویں صدی میں سب سے بڑا ذہنی انقلاب یہ آیا ہے کہ لوگ ان عقیدوں سے بیزار ہو گئے جو انہوں نے بزرگوں سے ورثے میں پائے تھے۔ اندازہ ہے 1900ء میں منکرین مذہب کی تعداد انسانی آبادی میں دو فیصد سے زیادہ نہیں تھی لیکن اب عالمی مردم شماری میں ان کی تعداد 20.8 فیصد ہے"۔

لیکن ابھی تک اہل سائنس دو گروہوں میں منقسم ہیں ہر ایک اپنی دانست میں ایسے ثبوت فراہم کرتا ہے جو خدا کے وجود پر بحث کی ایک نئی راہ کھول دے۔

بقول شخصے خدا کے موجود ہونے کے جتنے ثبوت ہیں تقریباً اتنے ہی اس کے عدم وجود پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی بیشتر مسائل پر تحقیق کے نتیجے میں تان ہمیشہ مادے پر آکر ٹوٹتی ہے کہ اس کی تخلیق کیونکر ہوئی۔

زندگی کا آغاز بھی ایسے ہی معموں میں سے ایک ہے۔ معمہ حیات ایسا ہی پراسرار ہے کہ خدا کو نہ ماننے والوں کا یہ بیان کہ عناصر میں ترتیب محض اتفاقاً پیدا ہو گئی ہے غیر موثر ہے اور پرنسٹن یونیورسٹی کے حیاتیات کے استاد پروفیسر نکلسن کا مقولہ درست کہ عناصر کے اجماع سے زندگی کا اتفاق پیدا ہو جانا اتنا ہی امکان رکھتا ہے جتنا کہ ایک چھاپہ خانے میں یک لخت دھماکہ ہو جانے سے ایک ڈکشنری مرتب اور طبع ہو کر نکل آنے کا امکان ہے۔

آیئے ایک اور انداز میں بات کریں۔ دراصل انسان اپنے سے باہر کسی مجرد یا ایبسٹرکٹ چیز کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ آپ نے دیکھا کہ ہم خدا کے بارے میں محض تخیل کی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہیں یوں خدا کے بارے میں جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ دراصل ہمارے ذہن کا تراشیدہ تصور خدا ہوتا ہے۔ ہم خدا کی ذات کے بارے میں جو سوچتے ہیں اس کی بنیاد مادے سے متعلق ہمارا ذخیرہ علم ہے جس کے بہت سے اجزاء تاحال تشنہ ہیں۔ ہمارے پاس حصول علم کا ذریعہ حواس خمسہ ہیں اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ حواس ہمیں دھوکہ دے جاتے ہیں۔ عام مادی مثالیں دیکھ لیجئے سراب کو ہماری آنکھیں پانی کی موجودگی قرار دیتی ہیں۔ لکڑی کا ایک ٹکڑا زبان کے مختلف گوشوں میں مختلف ذائقے ظاہر کرتا ہے۔ اگرچہ درجہ حرارت ایک ہی ہوتا ہے لیکن لوہے کی چیز کا درجہ حرارت لکڑی کی چیزوں سے مختلف محسوس ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے حواس کمزور ہیں اور ان کی اطلاعات ہمیشہ درست نہیں ہوتیں پھر آج کے انسان کو یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ مادے سے متعلق اس کا علم بھی اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔ اس ناقص علم کو ٹیڑھے میٹر راڈ سے تشبیہہ دے لیتے ہیں کہ اس سے پیمائش ہی غلط ہو گی تو اس میں میٹر راڈ کی غلطی ہو گی۔ ویسے ہی ہمارا نامکمل اور ناقص علم اگر خدا کو ڈھونڈھنے میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں، کہ خدا موجود ہی نہیں یہ بڑی حماقت ہو گی کہ اگر چیز کا علم ہی نہیں تو ہم اس کی موجودگی کا انکار کریں۔

علم اور معلومات میں ستم کا اقرار خرد دشمنی نہیں ہے۔ سائنسی طرز فکر کی رو سے بھی ہر چیز میں امکان اور گنجائش بہر حال موجود ہو سکتے ہیں۔ یوں حتمی طور پر بات کہنے سے پہلے بڑا غور و خوض اور باریکی سے تجربات اور مشاہدات کرنے پڑتے ہیں تب بھی امکان ہوتا ہے، کل کلاں متعلقہ فیلڈ میں مزید واقفیت پرانے نظریات کو توڑ پھوڑ دے۔ تازہ مثالیں لیں "بقائے مادہ" کو قانون کا درجہ دے دیا گیا تھا اور سائنس کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ سائنس میں کسی

بات کو قانون کہہ دینا مذاق نہیں، اس کے پیچھے مشاہدہ، تجربہ اور استنتاج کے کٹھن مراحل ہوتے ہیں لیکن آج ہم جانتے ہیں کہ آئن سٹائین کے نظریات نے بقائے مادہ کے قانون میں ترمیم کر دی۔ برٹرینڈرسل نے اپنے فلسفے کا آغاز اس سوال سے کیا تھا کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا علم ہے جو اس قدر یقینی ہو کہ کوئی معقول شخص اس پر شک نہ کر سکے۔ ۳۶ برس بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ "تمام انسانی علم غیر یقینی ناقص اور جزوی ہے"۔ یقیناً ممتاز ماہر طبیعات لارڈ کلیون نے یہ بات کچھ سوچ کر ہی کہی تھی کہ "آپ جتنا غور و فکر سے کام لیں گے اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کو ماننے پر مجبور کرے گی"۔ بلاشبہ نظام ہائے کائنات میں انتہائی توازن، ربط اور پیچیدگی ہر ذی شعور کو کسی برتر اور ذہین تر خالق کے اقرار پر مجبور کر دیتی ہے اور فی الواقعی اگر کوئی اس بات پر اڑتا ہے کہ اس کی عقل کسی خالق کے تصور کو ماننے سے انکاری ہے تو اسے اپنے تصورات پر نظر ثانی کی ضرورت ہوگی۔ آپ اگلے مضامین دیکھئے یہ کائنات کیسے کیسے اسرار سے بھری پڑی ہے۔ خود انسان ایک بہت بڑا راز ہے اسے اپنے دماغ کے بارے میں سطحی قسم کی معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ ہمارے شعور اور ذہنی استعداد میں اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے کہ ہم تخیل مادے اور توانائی سے ماورا ایک ہستی کا ادراک مادی بنیادوں پر کر سکیں ایک ننھے بچے کو آپ اضافیت کے پیچیدہ مسائل سمجھا دیں گے؟ کیا آپ اسے فلسفہ کے اسرار و رموز سے آگاہ کر پائیں گے؟ یقیناً نہیں کیوں؟؟؟ اس لئے کہ اس کی ذہنی سطح اتنی نہیں کہ آپ اسے یہ چیزیں سمجھا سکیں۔ اس کے لئے جمع، تفریق، ضرب، تقسیم اور جذر ہی کم عجیب چیز نہیں ہوگی ہم بھی اس بچے کے مانند ہیں آپ آگے دیکھیں گے کہ کتنے ہی اسرار ہیں جن کے آگے فلسفہ، منطق ریاضی اور سائنس انگشت بدنداں کھڑے ہیں۔ ہم ازلی مادی مسائل کو حل کر نہیں سکتے اور کم ذہنی شعور کے ساتھ چلے ہیں خدا کے وجود یا عدم وجود پر بحث کرنے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ دو پیدائشی اندھے اس پر بحث کریں کہ لال رنگ کیسا ہوتا ہے؟

# مذہب

"دنیا کی سب مسلم اور مروج اشیاء میں سب سے بڑا راز مذہب ہے۔ یہ پوجنا کیا ہے؟ یہ جھکنا کیوں ہے؟ یہ رسمی عقائد اور شرعی مراسم، یہ برہمن کے قشقے اور بت پرست کی مورتیاں، مسلم کی قربانیاں اور ہندو کے چڑھاوے کیوں ہیں؟ گبر کی شعلہ نوازی کیوں ہے؟ عیسائی کا ابن خدا کیا ہے؟ تسبیحوں کے ہار، حج کے مناسک، جاترے، نماز، تپسیا، پن دان، خیرات، صدقات، نذر نیاز، لمبی داڑھیاں، متشرع چہرے، تعویذ، اصطباغ، ہون، اشنان وغیرہ وغیرہ سب مذہبی مراسم مشق و رواج کے وہ اسرار جاریہ ہیں جن کی لم تک پہنچنا عوام کے نزدیک کچھ ضروری نہیں۔ بااین ہمہ ہر شخص ان کو نہایت عقیدت اور التزام سے کرتا ہے ان کے جھوٹ یا سچ، روا یا ناروا ہونے کے متعلق ایک حرف زبان پر نہیں لاتا۔ جاہل اور عالم کم فہم اور عاقل سب اس مشق نامعلوم میں حصہ لے رہے ہیں اور ان کو حسب توفیق نباہتے رہنا زندگی کا منتہائے اہم سمجھتے ہیں"۔ (تذکرہ از عنایت اللہ خان مشرقی)

یہ سب کیا ہے؟ دنیا کے گوشے گوشے سے انسانی تہذیب کا سراغ جہاں سے بھی ملا وہاں مذہب اور مذہب سے متعلق امور کا وجود کیوں ہے؟ عالم انسانی کے عہد شعور سے یہ عجیب لفظ کیوں چپکا ہوا ہے؟ پلوٹارک بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کسی انسان نے کوئی ایسی بستی نہیں دیکھی جس میں مذہب نہ ہو۔ مذہب، مذہب، مذہب آخر یہ کیا چیز ہے؟

مذہب کیا ہے؟ یہ آج تک متعین نہیں ہو سکا، فلاسفہ کی کوئی بھی تعریف ایسی نہیں جو مذہب کو بیان کرنے میں مجموعی تاثر پیش کرنے کی اہل کہلا سکے۔ ان تعریفات میں بے پناہ الجھاؤ اور تضاد ہے جن کی بنا پر مذہب ایک پہیلی یا معمہ بن جاتا ہے جبھی تو پس کال نے کہا تھا کہ مذہب کا بنیادی عنصر ہے ہی یہی کہ وہ سمجھ میں نہ آسکے اور غیر واضح ہو۔ تاہم مذہب کے بارے میں بعض امور عام ملتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ مذہب عقیدے اور عمل کا مجموعہ ہوتا ہے جو نمبر ایک ایمان و یقین، نمبر دو کلٹ (Cult) نمبر تین گروہیت اور نمبر چار کسی ضابطہ پر مشتمل ہوتا ہے[3] ان میں کلٹ وہ عنصر ہے جو پرستش کے جملہ طریقوں رسوم و رواج، مذہبی گیتوں اور مذہبی نوعیت کے اجتماعات کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ امور مذاہب عالم میں اس قدر مختلف النوع صورتوں میں پائے جاتے ہیں کہ جن کا جائزہ آدمی کو پریشان کر کے رکھ دیتا ہے۔ مذاہب عالم میں لے دے کر تان اسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور موجود ہے۔ کیا یہی حقیقت کبریٰ ہے؟ اگر ایسا ہی

ہے تو اس تصور میں بعد المشرقین تضادات کا وجود کیا معنی رکھتا ہے۔ مذہب کی طرح خدا کے بارے میں بھی شخصی طور پر ہر شخص انفرادی اور جداگانہ تصور کا حامل ہے تو پھر آخر مذہب کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حتمی جواب ہم نہیں دے سکتے، بظاہر ان سب سوالوں کا جواب ذہن میں موجود ہو سکتا ہے تاہم جتنا سوچیں اور گہرائی میں جائیں اتنی پیچیدگی بڑھتی چلی جائے گی اور ہم نہیں کہہ سکیں گے کہ خالق کائنات کا منشا کیا ہے اور اس سب کاروبار سے وہ آخر چاہتا کیا ہے؟

"خدا" کے عنوان کے تحت ہم دیکھ آئے ہیں اس تصور پر کیا کچھ نہیں بیتی۔ ایک مرتبہ یہ طے پا گیا کہ یہ سب نظام کائنات اپنے آپ جاری و ساری نہیں ہے بلکہ اس کی تخلیق کے پیچھے بھی کوئی ہستی کارفرما ہے تو اب یہ سوال سامنے آئے گا کہ اس پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اہمیت ہے؟؟ اس کی عبادت کیوں کی جائے؟؟؟ کیا اس نے تمام نظام کائنات محض اس لئے پیدا کیا کہ اسے ہماری عبادت کی حاجت ہے اور پھر یہ کہ اس کی عبادت کس طور سے کی جائے اور اس کی خوشی اور رضا کیوں حاصل کی جائے۔

مذہب کو تسلیم کرنے والوں نے عبادت کے نت نئے رنگ ڈھنگ ظاہر کئے۔ اول یہ رویہ رہا کہ مذہب محض چند مخصوص حرکات اور پوجا پاٹ تک محدود تھا لیکن رفتہ رفتہ "شریعت" تک آ پہنچنے پر مذہب نے اپنا دائرہ وسیع تر کرنا شروع کر دیا۔ یہ سیاست میں داخل ہوا اور پھر دین کی اہمیت یہ ٹھہری کہ مذہب اور سیاست کے ساتھ ساتھ زندگی کا کوئی شعبہ دین کی گرفت سے باہر نہیں رہا۔ بلکہ فرد کا سانس لینا بھی خدا کے مشن (نہ معلوم) کی تکمیل کا ایک جزو قرار پایا۔ یوں وہ مرحلہ سامنے آیا کہ ایک نظام حیات سے دوسرے نظاموں کے بھیانک تصادم وقوع پذیر ہوئے اور تاریخ انسانی میں کشت و خون کے شرمناک واقعات مذاہب کے نتیجے میں ہی سامنے آئے۔

اہل مذہب کا بیان ہے کہ پرستش انسان کے خمیر میں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی ہستی کے آگے سر تسلیم ختم کر دے۔ اس بات کے ڈانڈے روایتی یوم الست سے ملائے جاتے ہیں۔ جب مٹی کے پتلے کو بنانے سے بھی پہلے معبود نے ارواح سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی ربوبیت کا اقرار کریں یہی وہ وقت تھا جب انسان کے خمیر میں جبین نیاز جھکانے کی داغ بیل پڑی۔ یہی سبب اس بات کا بیان کیا جاتا ہے کہ دنیا کی تقریباً تمام اقوام میں پرستش کسی نہ کسی طور موجود رہی، قطع نظر اس سے کہ وہ مظاہر پرستی ہو یا آفتاب پرستی، کواکب پرستی ہو یا صنم پرستی، ہر ایک کے پیچھے وعدہ شب الست کارفرما ہے جو لاشعور میں بیٹھا، انسان کو ہستیٔ برتر و اعلیٰ کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتا ہے۔ بقول ساقی فاروقی

میرے اجداد کے پرانے خدا
دل سمجھتا ہے تو نہیں ہے کہیں
اور اگر ہے تو واہمے کی طرح
ایک بے نام و بے حقیقت شے
تو نہیں ہے میری بلا سے نہ ہو
اک اطاعت مگر خمیر میں ہے
سو چکاتا ہوں قرض ناخن کا

لیکن لامذہب اور دہریے اس سے قطعاً منکر ہیں اور جواباً تاریخ سے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مثلاً دنیا کی قدیم ترین ملنے والی تحریروں میں سے ایک سمیری تحریر ہے جس میں اور تو تمام اشیاء کے متعلق الفاظ مل جاتے ہیں (جو اس وقت پائی جاتی تھیں) تاہم ایک تو ذاتی ملکیت اور دوسرے کسی معبود کے لئے کوئی لفظ ان کی تحریر میں دکھائی نہیں دیتا۔ گویا وہاں معبود کا تصور ہی نہ تھا اور یہ تصور ان چیزوں نے پیدا کیا جنہیں اس وقت پراسرار سمجھا جاتا تھا اور جن کی توجیح مشکل ہوتی۔ ایسے پراسرار مظاہر کو فوق الطبع قوتوں کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔ یہیں سے مذہب کی داغ بیل پڑی کہ یہ فوق الطبع قوتیں انسان کی تقدیر، بھاگ یا قسمت پر متصرف ہوتی ہیں اور ان قوتوں کو خوش کر کے انسان خوش نصیب بن سکتا ہے۔

علی عباس جلال پوری کائنات اور انسان میں رقم طراز ہیں "مذہب کی تشکیل میں دو عوامل کارفرما رہے ہیں۔ معاشی اور نفسیاتی۔ بھوک کے خوف اور تشویش کے باعث قدیم انسان کو بے بسی کا تلخ احساس تھا جس کے تدارک کے لئے اس نے تخیل آرائی سے کام لیا اور مافوق الطبع عناصر کا سہارا لیا۔ مافوق الطبع کا

سہارا وہی شخص لیتا ہے جو موت سے ڈرتا ہو یا غریب اور مفلس ہو۔ مذہب کی مقبولیت کا راز اسی بات میں ہے کہ وہ موت کے بعد زندگی کی بشارت دیتا ہے"۔

"خدا" کے عنوان کے تحت ہم روس میں الحاد کی باقاعدہ تعلیم دینے والے اداروں کا تذکرہ کر آئے ہیں۔ ان اداروں سے تعلیم پانے والے نوجوان جن کی تربیت اس نہج پر ہوتی ہے کہ بچپن سے ان کے ذہنوں سے مافوق الفطرت ہستی کا تصور پیدا ہی نہیں ہونے دیا جاتا۔ جب فارغ التحصیل ہوتے ہیں تو ان کے ذہن میں خدا کا کیا تصور ہوتا ہے؟ اسے ہم دور جدید کے کسی بھی ایسے اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے موازنہ کر کے محسوس کر سکتے ہیں۔ جس کے نزدیک بھوت پریاں محض تخیلاتی مخلوقات ہیں۔ ویسے ہی دہریہ نوجوان محسوس کرتے ہیں کہ خدا کا تصور تو بے شعور انسان کے ذہن کا تراشیدہ ہے حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یوں دہریے ایک دلیل دیتے ہیں کہ پرستش کی "عادت" انسان کے خمیر میں نہیں ہے بلکہ ماحول کی پیداوار ہے۔ پس خدا پر ایمان سے انسان کا طرز عمل غیر حقیقی اور جھوٹا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوویت لوگ خدا کی طاقت میں نہیں بلکہ اپنے کارناموں میں یقین رکھتے اور عبادت کو ضیاع وقت گردانتے تھے۔

اہل مذہب کا تصور خدا شخصی ہے یعنی خدا باقی کائنات سے الگ ایک شخصیت ہے جس کی آنکھیں بھی موجود ہیں کان، ناک اور دیگر اعضا بھی۔ اس نے کائنات کو عدم سے تخلیق کیا اور ایک روز کائنات کا انجام بھی ہو گا۔ خدا روح کا خالق ہے جسم مٹ جائے گا روح باقی رہے گی۔ خدا قادر مطلق ہے اور اس نے صرف انسانوں کو فاعل و مختار بنایا اور اسی رعایت سے انسان اپنے کرتوت کی بنا پر جزا و سزا کا مستحق ہے جس کے لئے خدا نے جنت دوزخ بنا رکھے ہیں۔ اس لئے انسان کا ہر قول و فعل ایسا ہو جو اسے جہنم یا جنت سے قریب لائے۔ راہ حق کی طرف راہنمائی کے لئے خدا الہام یا وحی کو ذریعہ بناتا ہے۔

یہ تصور خدا اور مقصد حیات مذہب سے مخصوص ہے اور اس تصور کو خدا کا شخصی یا ماورائی تصور کہتے ہیں۔ چونکہ سامی مذاہب اسی تصور کے علمبردار ہیں لہٰذا یہ سامی تصور خدا بھی کہلاتا ہے۔ (یہ تصور کہ خدا غیر شخصی ہے اور انسان کا مقصد حیات فنا فی اللہ ہونا ہے مذہب سے جدا تصور ہے اور تصوف سے مخصوص ہے)

غالباً اہل بابل معلومہ تاریخ میں اولین لوگ تھے جنہوں نے ایک خدا کا تصور دیا۔ وہ بعل دیوتا کے پجاری تھے۔ مصر میں فرعون اخناتون نے حکماً کثرت پرستی بند کر دی تھی اور صرف خدائے واحد آتن (سورج) کی پرستش لازم ٹھہرائی۔ یہود نے ایک شخصی خدا "یہوا" کا تصور دیا جو عیسائیت میں پولسی تعلیمات کے نتیجے میں توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کے گنجلک مسئلہ کا شکار ہوا مگر مسلمانوں میں غیر صوفیوں کے ہاں خدا پھر ایک شخصیت کی صورت میں رونما ہوا جو عقل و خرد سے ماورا ہے کیونکہ اس کی مثل کوئی شے نہیں (القران) تاہم خدا کے اس شخصی تصور میں خدا کی شکل و صورت کے بارے میں رویہ یہی ہے کہ وہ انسان سے ملتا جلتا ہو گا۔ بائبل کا بیان ہے خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اس جملہ نے خدا کی شکل و صورت سے متعلق قیاسات کی راہ ہموار کی اور تشبیہات کا سلسلہ چل نکلا یہاں تک کہ "خدا نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا اور انسان نے بدلے میں خدا کو اپنی صورت پر بنالیا" (والٹیئر) مذہب کی ابتداء کیونکر ہوئی اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔ بعض اسے روح مت کی ارتقائی شکل خیال کرتے ہیں۔ بعض اسے مرے ہوئے آباء کی پرستش کی ترقی یافتہ شکل سمجھتے ہیں اور کچھ نے ستارہ پرستی کو مذہب کا ماخذ قرار دیا ہے۔ الغرض مذہب کی ابتداء بھی مذہب کی طرح ایک معمہ ہے۔

مذہب اور سائنس میں کیا تعلق ہے؟ مذہبی عقائد میں لچک نہیں ہوتی ان پر نظر ثانی منع ہے جبکہ سائنس تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر نظریات پیش کرتی ہے جن پر ہر قسم کی تنقید اور رائے کا بلا روک ٹوک اظہار ہی اسے قابل قبول قرار دیتا ہے۔ مذہبی عقائد زبردستی کا عنصر لئے ہوئے ہیں کیونکہ یہ ایسے اصول موضوعات ہیں جن کو بہرحال تسلیم کرنا پڑتا ہے چاہے حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہ ہو۔ مذہب اور سائنس کے مابین معرکے کی ایک بڑی اچھی مثال گلیلیو کا مقدمہ ہے۔ اہل مذہب اسے اپنے مشاہدات اور تجربات سے انکار کرنے پر مجبور کرتے رہے۔

لیکن اہل مذہب کی یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں مغرب میں عقل و خرد کا انقلاب برپا ہوا تو مذہب کے ٹھیکیداروں نے بھی چال تبدیل کر لی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ نئے نئے سائنسی انکشافات کے آگے ان کی فرسودہ روایات دم نہیں مار سکیں گی۔ لہٰذا ہونا یہ چاہئے کہ مذہبی عقائد کی تشریح سائنسی بنیادوں پر کی جائے تاکہ متبعین بھی اطمینان سے سانس لیں اور اہل خرد کو بھی خاموش کرایا جا سکے۔ لیکن اسی نئی روش نے تاویلات کا جن بوتل سے آزاد کر دیا۔ اب دنیا کا ہر مذہب اسی بات کی گھات میں لگا رہتا ہے کہ جونہی کوئی سائنسی انکشاف ہو تو اسی وقت مقدس کلام سے کوئی آیت چھانٹ کر نکالی جائے اس کا مفہوم توڑ موڑ کر ایسا پیش کیا جائے کہ گویا صدیوں پہلے بانیان مذہب اس حقیقت سے واقفیت حاصل کر چکے تھے جس کی بابت سائنس کو اب آ کر معلوم ہوا ہے۔ "سائنس ہزار

مشکلوں سے پہاڑی کی چوٹی پر پہنچی تو مذہب وہاں بہت پہلے سے براجمان تھا۔ " اسی پس منظر میں کہا گیا۔

لیکن صحیح لطف اس وقت آتا ہے جب متعلقہ مفروضہ غلط ثابت ہو جائے۔ ایسے میں سائنس کو اسے رد کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی جبکہ تاویل کرنے والے عجیب مخمصے میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ آئے روز اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جس سے مذاہب مسلسل روبہ زوال ہیں کیونکہ اہل خرد کے نزدیک سائنس کی مثال ایسے نوجوان کی سی ہے جو کم جانتا اور پوچھتا زیادہ ہو جبکہ خرد دشمن یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذہب قادر مطلق کے حوالے سے جملہ علوم کا حامل ہے اور عقیدت مند ہی ان سے فیضیاب ہو سکتے ہیں۔

مذہب اور سائنس کو انسانی ذہن کے حوالے سے دو مختلف بنیادوں پر بیان کیا جاتا ہے۔ علی عباس جلال پوری انسان اور کائنات میں کہتے ہیں "تحلیل نفسی کی رو سے نفس انسانی کے دو پہلو ہیں

۱۔ حظ فکری Pleasure Thinking

۲۔ حقیقت فکری Reality Thinking

مذہب اور تصوف حظ فکری کی پیداوار ہیں جبکہ سائنس حقیقت فکری کی دست پروردہ ہے۔ حقیقت پسند آدمی خواب و خیال کی دنیا کی بجائے حقائق کی دنیا میں گزر بسر کرتا ہے اور اپنی زندگی میں حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے خواہ وہ کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں۔ اس کے برعکس جو شخص ان کا سامنا نہیں کر سکتا، وہ حقائق سے فرار کر کے تخیلات سے رجوع لاتا ہے اور تخیل میں ہی اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کا مداوا تلاش کر لیتا ہے۔ مذہب بھی اسی اجتماعی تخیل آرائی کا کرشمہ ہے۔ بنی نوع انسان نے اپنے ابتدائی دور میں بچوں کی طرح نامساعد قدرتی ماحول سے گریز کر کے تخیل آرائی کے دامن میں پناہ لی تھی اور پرکھوں کی روحوں اور دیوتاؤں کا سہارا تلاش کیا تھا"۔

ڈاکٹر ڈیوڈ فارسمتھ کہتا ہے "مذہب انسان کو سہارا دیتا ہے لیکن یہ سہارا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک بچہ تلاش کرتا ہے۔ بالغ آدمی کسی کا سہارا لے گا تو یہ اس کی ذہنی ناپختگی اور طفلانہ پن کا ثبوت ہو گا انسان کے لئے خدا کی ذات کا سہارا لینے کی بجائے خود اپنی ذات کا سہارا لینا ضروری ہے"۔

ان امور سے ہمیں یہ تاثر ملتا ہے کہ اہل خرد مذہب کو ذلیل توہم پرستی پر محمول کرتے ہیں۔ پس ایسی افیون سے چھٹکارا پانا ہی بہتر ہو گا جو انسانی فکر و عمل اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جائے۔ لیکن ایسے میں ہمیں ایک جانب سے پھر ایک تضاد کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب بعض اہل دانش مذہب اور سائنس کو لازم و ملزوم گردانتے ہیں۔ آئن سٹائن کہتا ہے "سائنس مذہب کے بغیر لنگڑی ہے اور مذہب سائنس کے بغیر اندھا"۔ اوس پنسکی یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں۔ چلئے ایک بار مان لیا کہ سائنس اور مذہب کے درمیان کوئی پراسرار رشتہ موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب کیوں لیا جائے کہ مذہب کو اپنے حواس پر سوار کر لیا جائے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسانیت کو مذہب کی احتیاج ہے؟ یا یہ محض انسان کو تباہی سے دوچار کرتا رہا ہے؟

مذاہب عالم شروع سے خرد دشمنی کا درس دیتے چلے آئے ہیں۔ ایک لمحہ توقف کر کے ہم یہ دیکھ لیتے ہیں کہ عقل محض کو راہبر بنا کر مذہب سے قطع تعلق کر کے انسان نے اپنے مسائل کے لئے کیا حل تجویز کئے۔ تاریخ عالم سے ثبوت ملتا ہے کہ فکر انسانی زندگی کے بیشتر اہم شعبوں میں اب تک ٹامک ٹوئیاں مار رہی ہے۔ "انسان ہر جگہ فکر اور بے یقینی کے عالم میں پھر رہا ہے۔ اس کا مطمع نظر اسے ہمیشہ دھوکہ دیتا ہے۔ قدیمی اقدار اور عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں۔ انسان نے جو کچھ صدیوں میں حاصل کیا وہ سب ختم ہو رہا ہے انسان نے اپنے طبعی ماحول پر اچھا خاصا قابو پالیا ہے لیکن اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا نہیں سیکھا"۔ (پروفیسر بینڈ)

انسان نے طبعی ماحول پر خرد اور سائنس کو بروئے کار لا کر قابو پایا مگر یہ خرد اور سائنس جذباتی ماحول پر قابو کیوں نہیں پاتے۔ سائنس نے انسان کو طبعی زندگی میں آرام و آسائش ضرور عطا کیے ہیں مگر داخلی اضطراب کا کوئی حل نہیں دیا۔ اس لئے کہ اس اضطراب کا حل اقدار کی پیروی میں ہے۔ "سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہے وہ یہ نہیں بتا سکتی کیا ہونا چاہئے۔ پس اقدار کی قیمت کا تعین کرنا سائنس کے بس میں نہیں"۔ (آئن سٹائن) سائنس کے لئے اصل ضرورت عقل کی ہے لیکن عقل جذبات کی لونڈی ہے جو انسان کو تسکین کے حصول کے لئے اندھا دھند طریقے پر حصول لذت کے مواقع فراہم کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ یوں خرد پرست کے ہاں اقدار، نصب العین اور خیر و شر کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ صرف ذرائع اور اسباب پر نظر رکھتا ہے۔ انسانیت کی بقا کے لئے

ضروری ہے کہ وہ مذہب کا دامن تھام لے کیونکہ مذہب ہی مستقل اقدار فراہم کرنے کا دعوے دار ہے۔ مذہب کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا مطلب عقائد کی پختگی ہے لیکن عقیدہ تو عقیدہ ہے جو توہم پرستی کی ایک شکل اور انفرادی نوعیت کی چیز ہے۔ اب پھر مسئلہ سامنے آ گیا کہ عقائد میں بے پناہ اختلافات ہیں۔ بالفرض کسی ایک عقیدے کا جبراً نفاذ عمل میں لایا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ پروفیسر کوہن نے کہا تھا "اب صرف اتنا پوچھنا باقی رہ گیا ہے کہ عقل کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد ہے جس پر ہم قانون حکومت کی دوبارہ تشکیل کر سکیں؟ اگر دنیا میں کوئی عالمگیر مذہب ہوتا تو اس کے آسمانی قوانین پر جدید نظام حکومت کی بنیاد رکھی جا سکتی تھی لیکن ایسی دنیا میں جہاں مختلف مذاہب موجود ہوں یہ کوشش کرنا کہ اس میں سے کسی ایک ضابطے کے مطابق قانون فطرت قائم کر دیا جائے تو نہ صرف یہ کہ نظری طور پر اس کا جواز مشکل ہو گا بلکہ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم پھر سے لڑائیوں کے دور کو بلالیں"④

مسئلہ یہ ہوا کہ عقائد اور مذاہب میں ان اختلافات کو کیسے دور کیا جائے؟ اس کے بغیر ایک عالمگیر مذہب کا شوشہ بے معنی ہو گا۔ جذباتیت سے ہٹ کر یہ سوچنا چاہئے کہ ہر فرد کو اپنا عقیدہ کس قدر پیارا ہے وہ کیونکر اسے دوسرے عقیدے پر قربان کرنے کو تیار ہو گا۔ ہم یہ معلوم نہیں کر سکے کہ وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر مذاہب کے کھرے و کھوٹے پن کی پہچان ممکن ہے جو بھی پیمانہ اس سلسلے میں قائم کیا جاتا رہا وہ کسی ایک ہی مذہب سے مخصوص نہیں رہتا اور جلد ہی دوسرے مذاہب اس معیار پر پورے اترنے لگ جاتے ہیں۔

خرد دشمن اس مرحلے پر مذہب کے ماورائے عقل عنصر کو بنیاد بنا کر اپنے عقیدے کی حقانیت کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان ماورائے عقل یا خوارق عادات مظاہر میں سے بعض ایک تو محض توہمات یا خرد دشمنوں کی ہاتھ کی صفائی چالاکی اور دھوکہ بازی کا نتیجہ ثابت ہوئے ہیں اور بعض فی الحقیقت خرد پرستوں کے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ لاینحل ماورائے سائنس مظاہر بھی کسی ایک مسلک سے مخصوص نہیں۔ آئندہ صفحات اسی حقیقت کے شاہد ہیں۔

# مذہب اور پیش گوئی

دنیا بھر کے مذاہب اپنی حقانیت کے دعوے کے سلسلے میں اپنے زعماء سے معجزے، کرامتیں اور دیگر مافوق الفطرت واقعات منسوب کرتے چلے آئے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا مقصد عوام الناس میں خرد دشمنی اور خدا پر اندھا اعتقاد پیدا کرنا ہوتا ہے کیونکہ علیٰ وجہ البصیرت کسی کو دل و جان سے قائل کرنا نسبتاً دشوار کام ہے جبکہ معجزہ عمومی طور پر ذہنوں کو مرعوب کرنے میں کامیاب خیال کیا جاتا ہے۔

معجزے کے متعلق عام آراء میں یا تو اس سے انکار کر دیا جاتا ہے یا اس پر اندھا دھند اعتماد کیا جاتا ہے اور یا پھر اس کی توجیہہ کی کوشش کی جاتی ہے لیکن معجزے کے علاوہ ایک اور چیز جو لوگوں کو مرعوب کرتی ہے اور توجیہہ کی گرفت میں نہیں آتی پیش گوئی ہے یعنی بانیان مذاہب کا مستقبل کی باتیں پہلے سے بتا دینا اور اقرار کرنا کہ یہ سب کچھ خدا کا عطا کردہ علم ہے مذاہب کی تاریخ میں پیش گوئی کا عنصر بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ نبی یا Prophet کا لفظ ہی Prophecy سے بنا ہے کہ نبی وہ شخص ہوتا ہے جو آئندہ کے بارے میں بتائے۔ اس تعریف کی بنیاد پر فرانس میں ناسٹراڈیمس نامی شخص جو کہ پیش بین تھا کے مرنے کے سو برس بعد کچھ لوگوں نے اس کی عظیم پیش گوئیوں کی بنا پر اسے نبی کا مرتبہ دے کر ایک مذہب تشکیل دے ڈالا۔

قبل از مسیح تاریخ میں مذہبی بنیادوں پر پیش گوئی کے اعتبار سے سب سے زیادہ شہرت ڈلفی کو نصیب ہوئی جو وسطی یونان میں کوہ پرناسس کی ڈھلوانوں پر واقع کہانت گاہ تھی جسے ۱۵۰۰ ق م کے لگ بھگ کریٹ کے مذہبی رہنماؤں نے مادر ارضی کی یاد میں تعمیر کیا تھا مگر ۱۰۰۰ ق م میں اہل یونان اس پر قابض ہو گئے اور اسے دیوتا اپالو کے نام سے معنون کیا جس کے بارے میں روایات مشہور تھیں کہ ایک مادہ اژدر پائی تھن ڈلفی کے زیر زمین غاروں میں اپالو سے لڑ کر ہلاک ہو گئی۔ اس کی لاش گل کر سڑنے لگی اور اس سے خاص بو کے بھبھکے اٹھنے لگے۔ ایک چرواہا اتفاقاً یہ بو سونگھ کر دیوانہ ہوا اور لگا پیش گوئی کرنے جو بعد ازاں پوری بھی ہو گئیں سب سمجھ گئے کہ اس کے پیچھے پائی تھن کی سڑاند کارفرما ہے۔ اکثر لوگ وہاں آنے جانے لگے کہ بو سونگھ کر پیش گوئیاں کر سکیں مگر جب کچھ لوگ اس

گڑھے میں بیہوش ہو کر گرنے سے ہلاک ہوئے جو گیس کا منبع تھا تو یہ سلسلہ رک گیا اور اب مقامی لوگ ایک عورت کو چن کر لے جاتے جو بدبو دار گیس کو سونگھ کر ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتی اور پیش گوئیاں کرتی، اس عورت کو پائی تھن کی گیس سونگھنے کی رعایت سے پائی تھیا کہا جاتا جو ڈلفی مندر کی سب سے بڑی راہبہ تصور ہوتی۔ شروع میں پائی تھیا کے لئے یہ شرائط ہوتیں کہ وہ نوجوان حسین کنواری کسی اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی ہو مگر بعدازاں ایک پائی تھیا جو گیس سونگھ سونگھ کر اکتا گئی تھی ایک نوجوان کے ساتھ فرار ہو گئی تو ڈلفی کا مندر بدنام ہو گیا۔ چنانچہ پائی تھیا کے چناؤ کا طریقہ بدل گیا کہ وہ ۵۰ برس سے زیادہ عمر کی بدشکل بڑھیا ہو۔

پائی تھیا مہینے میں ایک بار لارل کی پتیوں کا تاج اور بیش قیمت لباس زیب تن کر کے مندر کی ایک چٹان پر جا بیٹھتی۔ جہاں اسے لارل کی نشہ آور پتیاں چبانے کو دی جاتیں اور پروہت بخورات جلا دیتے اب وہ مندر کے فرش پر واقع دراڑ پر بٹھا دی جاتی اور دراڑ سے نکلتے ہوئے ابخرات سونگھ کر پیش گوئی شروع کر دیتی۔ طریقہ کار کچھ یوں ہوتا کہ ایک پروہت اس کی خدمت میں سائل کی خواہش بیان کرتا اور وہ تنویمی حالت میں اعضا کو اکڑا کر جھٹکے کھانے لگتی خیال کیا جاتا کہ دیوتا اپالو اس وقت پائی تھیا سے مخاطب ہے۔ تب اس کے منہ سے جھاگ بہنا بند ہو جاتا اور وہ دھیمے الفاظ میں کچھ کہتی جو پروہت لکھ لیتا اور سائل کے حوالے کر دیتا یہ الفاظ عموماً مبہم اور ذو معنی ہوتے تاہم اکثر پیش گوئیاں درست ثابت ہوتیں۔ بڑے بڑے بادشاہ مندر سے رجوع کرتے رہے اور نہایت قیمتی سازو سامان اور جواہر نذر کرتے رہے، جس کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ شہرہ آفاق فاتح سکندر اعظم نے بھی جنگ سے پہلے مندر میں پائی تھیا سے رجوع کیا تھا اور فتح کی نوید پائی تھی۔ مگر بعض اوقات پیش گوئی کچھ اور ہی تماشا دکھا دیتی مثال کے طور پر ۵۰۰ ق م میں لیڈیا کے شہنشاہ کروسس نے ڈلفی سے سوال کیا کہ آیا وہ سلطنت فارس پر حملہ کر دے جواب ملا اگر بادشاہ حملہ کریگا تو ایک عظیم سلطنت کو تباہ کر کے رکھ دے گا اور ایسا ہی ہوا یعنی اہل فارس نے بادشاہ کروسس کو ایسی بری شکست دی کہ وہ خود بھی گرفتار ہوا اور لیڈیا کی اپنی ہی عظیم سلطنت کو تباہ کرنے کا ذمہ دار بھی ٹھہرا۔ وہ اپنی فتح کی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔⑤

یوں پیش گوئی کا غلط سمجھنا خطرناک ثابت ہوتا ہے (پیش گوئی کے تباہ کن اثرات کا اندازہ آئندہ آنے والے مصلحین اور نجات دہندوں کے مطالعہ سے بھی ہو گا۔)

دوسری طرف غلط پیش گوئی کے نتائج بھی کم خطرناک نہیں ہو سکتے۔ زار روس کے عہد میں کارگوپول کے علاقے میں دو سو سال سے ایک خفیہ مذہب پھل پھول رہا تھا جس کے ماننے والے اپنے آپ کو سرخ موت کے بہن بھائی کہتے تھے۔ ان کے ہاں اصول تھا کہ جب کوئی شخص ۱۲ نئے افراد کو اپنے مذہب میں شامل کر لے گا بہشت اس کے لئے لازمی ہو جائے گی اور اس وقت اگر وہ شخص چاہے تو خود کشی کر کے جنت کے مزے لوٹنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ سرخ موت کے بہن بھائیوں کو اس پیش گوئی پر بھی یقین تھا کہ ۱۳ر نومبر ۱۹۰۰ء کو دنیا کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (کیلنڈر کی تبدیلی سے پہلے یہ یکم نومبر کی تاریخ بنتی تھی) اس مذہب کے ۸۶۲ پیرو کاروں نے ارادہ کیا کہ قیامت آنے سے پہلے ہی خود کشی کر کے معبود کو خوش کر دینا چاہئے۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں بند ہو گئے اور خود کشی کے انتظامات کرنے لگے۔ ۴۰۰ میل دور سینٹ پیٹرز برگ میں جب یہ خبر پہنچی تو فوراً سرکاری دستے روانہ کیے گئے۔ جب یہ لوگ کارگوپول پہنچے تو ۱۰۰ سے زائد افراد اپنے گھروں کو نذر آتش کر کے خود سوزی کر چکے تھے مگر باقی پیرو کار بچا لئے گئے جب مقررہ تاریخ گزر گئی اور کچھ بھی نہ ہوا تو یہ مذہب بھی ٹوٹ گیا۔

معجزوں میں پیش گوئی اس اعتبار سے زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ اہل مذہب کے نزدیک خدا کے ابدی اور کامل علم کی پہچان ہے۔ جبکہ دیگر معجزات خدائی طاقت کا مظاہرہ ہوتے ہیں اور گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ عموماً معجزوں کے گواہ کم ہوتے چلے جاتے ہیں اور شہادتیں کمزور پڑتی چلی جاتی ہیں۔

پیش گوئی کا عنصر آدمی کے لئے بہت اہم ہے انتہائی نامساعد حالات میں اگر کوئی مضبوط انداز میں مستقبل کو خوش آئند قرار دے تو یہ ڈھارس کا ذریعہ بنتا ہے۔ سامی مذاہب کی تاریخ میں ان مذاہب کے بڑے بڑے علمبردار اور انبیاء کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی یہ لوگ حالات کی گردش کا شکار ہو کر مایوس ہونے لگتے تو انہیں خدا کا سہارا ہی کافی ہوتا جو انہیں یقین دلاتا کہ وہ صاف بچ نکلیں گے۔ صرف اسلامی تاریخ میں ہی ایسے بہت سے واقعات مل جاتے ہیں غار ثور کے منہ تک آپہنچنے والے دشمنوں کی آہٹ دل دہلائے دے رہی تھی مگر حضرت محمدؐ مطمئن رہے۔ سراقہ جو کفار مکہ کے انعام کے لالچ میں آپؐ کا پیچھا کر رہا تھا آپؐ سے کسریٰ کے دربار کے کنگنوں کی نوید سن کر گیا۔ بدر کی جنگ میں ۳۱۳ اور ہزاروں کا بےجوڑ مقابلہ ہوا۔ ان سب واقعات میں خدا کی طرف سے یقین دہانی پیش گوئی کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔

متعلقہ موضوعات ''آئندہ آنے والے''

# تصوّف

تصوّف مذہب سے علیحدہ ایک نظریہ ہے۔ اہل مذہب تو کائنات کو حادث اور خدا کو قدیم قرار دیتے ہیں جبکہ اہل تصوف کے نزدیک خدا اور کائنات دونوں قدیم ہیں یعنی یہ لامحدود ہیں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے اور ان میں جسم و جان کا سا تعلق ہے۔ کائنات کے جسم میں روح "خدا" جاری و ساری ہے۔

تصوف کا آغاز کیوں اور کہاں ہوا اس کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اتنا اندازہ ہے کہ تصوف سے پہلے روح کا عقیدہ ضرور موجود تھا۔ خواب میں آدمی اپنے آپ کو ادھر ادھر چلتا پھرتا دیکھتا ہو گا اور بیدار ہونے پر پہلے مقام پر ہی موجود پاتا ہو گا تو اسے خیال آیا ہو گا کہ اس کے بدن سے نکل کر کوئی چیز گھوم پھر کر واپس آ جاتی ہے روح جو اگر بدن میں واپس نہ آئے تو اس کیفیت کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن پودوں کے مرجھا کر مرنے اور بیجوں کو پھر اگتا دیکھنے کے مشاہدے نے اس عقیدے کو جنم دیا ہو گا کہ اصل روح کو بقا حاصل ہے۔ (دیکھئے "روح")

روح کے اس تصور کے بعد سے مذہب اور تصوف نے جنم لیا۔ صوفیوں کے نزدیک روح مادی آلائشوں میں گرفتار ہے اور اس کی معراج یہی ہے کہ وہ روح کائنات (خدا) سے وصال کرے۔ یہ روح کائنات تمام کائنات میں سریان یا نفوذ کیے ہوتے ہیں اور مذہبی خدا کے برعکس موجب بالذات ہے۔ خدا کا یہ غیر شخصی تصور وحدت الوجودی نظریئے کی جان ہے۔

روح کو انسان کا باطن کہنے والوں کے نزدیک اہمیت باطن کی ہی تھی۔ قدیم مصر اور یونان میں ایسے لوگ بھی تھے جو اس باطن پر تحقیق کو مطمح زندگی قرار دیتے تھے۔ یہ اہل باطن کہلاتے جو اپنی پراسرار خفیہ رسوم کی وجہ سے سریت پسند مشہور تھے۔

یہ لوگ عام مذہبی طریقے پر کی جانے والی ظاہری عبادات کی اہمیت سے منکر تھے اور روح کو مادی جسم کی قید سے آزاد کرانے کے لئے ریاضت، چلہ کشی، حبس دم اور مراقبہ وغیرہ کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اس دور سے دو نظریات ایک دوسرے کی مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نظریہ مادیت کا ہے جو مادہ کی حقیقت کا قائل اور روح کا منکر ہے۔ دوسری جانب یہ عقیدہ ہے کہ عالم مادی کی کچھ حقیقت بھی نہیں اور یہ تو صرف اور صرف نظر کا فریب ہے اصل حقیقت روح ہے جو مادے کے قفس میں قید ہے۔ قدیم یونان میں فیثا غورث نے اپنے شاگردوں کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک کو مادیت کی تعلیم دی جاتی اور وہ اہل ظاہر کہلاتے جبکہ دوسرے گروہ کو روح کے اسرار و رموز سمجھائے جاتے۔ یہ لوگ اہل باطن کے نام سے مشہور ہوئے۔

صوفی ازم شروع سے عقل کو محض ناقص قرار دے کر خرد دشمنی کا مظاہرہ کرتا چلا آ رہا ہے اور یہ مسلک اس معاملے میں انتہا پسندانہ عقائد کا حامل ہے۔ چنانچہ قدیم یونان میں عارفیوں سکندریہ میں نو اشراقیوں، ایران میں صوفیوں اور ہندوستان میں ویدانتیوں کے ماورائے عقل کشف اور اشراق کا استعمال ذات مطلق میں واصل ہونے کے لئے لازمی تصور کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل جب اہل باطن نے یہ کہا کہ عالم مادی مایا اور بے حقیقت ہے تو حواس بھی اس زد میں آ گئے کیونکہ حسیات کی مدد ہی سے تو اس فریب نگاہ کا ادراک کیا جاتا تھا اس کے برخلاف حقیقی عالم کوئی اور ہی ہے جو عقل سے ماوراء ہے، اس لئے ظاہری حواس کے ذریعے اس ماورائی عالم کو سمجھنا ممکن نہیں بلکہ ظاہری حواس بند کر کے باطنی قوت بیدار کر کے اس عالم کا ادراک ممکن ہے جہاں تک مادے کی حقیقت کا سوال ہے تو اہل تصوف میں سے بیشتر نے یہ بھی کہا کہ مادہ قدیم ہے اور اس مادی کائنات کی ابتدا ہے اور نہ ہی انتہا۔ روح اصل اور مادے میں فرق کرنا ممکن نہیں یہ دونوں ایک دوسرے کے پرتو ہیں۔

تصوف کے منفی اثرات بے پناہ رہے ہیں یہاں عمل مفقود ہوتا ہے۔ کسی موہوم سی توانائی کے سراغ اور اپنی ذات کے ادراک کے تصور نے معاشرے کے ایک حصہ کو بیکار کر کے رکھ دیا ہے۔ فضول قسم کے مباحث کے علاوہ لمبے لمبے چلوں اور معاشرے سے کٹ کر جنگلوں میں رہنے والے رہبانیت پسندوں کی نشہ بازی اور ہلڑ بازی کو تصوف کا تحفہ سمجھنا چاہئے۔ یہ حرکتیں معاشرے کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ اسلامی تاریخ میں اس سے متعلق ایک واقعہ خاصا اہم ہے کہ ادھر تو ہرقل بادشاہ یرموک میں مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے لشکر جرار ترتیب دے رہا تھا اور ادھر مسجد نبوی میں ایک شخص مراقبے میں مصروف تھا جسے خلیفہ اسلام عمرؓ نے لاٹھی رسید کر کے استغراق سے ہٹایا اور کہا کہ وہ بدبخت نفس کے لئے مراقبے میں ڈوبا پڑا ہے اور ادھر مسلمانوں کی تباہی کے سامان کیے جا رہے

ہیں۔ اس بے عملی سے بچانے کی خاطر اتاترک نے ترکی میں خانقاہوں کو بند کرا دیا کہ وہ نوجوانوں کو چانڈو بازی کا درس دے کر تباہ کر رہی تھیں۔

لیکن دوسری جانب یہ امر بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ قدیم و جدید مشرق و مغرب کے اصحاب فکر و دانش میں کئی نمایاں اور معتبر شخصیات نے اس پر بحث کی اور اس کا مسلک اختیار کیا۔ درحقیقت طبیعیات کے علم کی ترقی کے ساتھ مادے کے وجود اس کی پیدائش اور حقیقت پر بہت تحقیق ہوئی۔ اور اس دوران یہ امر واضح ہوا کہ انسانی حواس اسے دھوکہ دیتے ہیں۔ رہ گئی عقل تو یہ ماورائے مادیت کو سمجھ نہیں سکتی۔ شین نے کہا تھا "فزکس کی جدید تحقیقات کے مطابق نہ تو مادہ ازل سے ہے اور نہ ہی توانائی۔ جب یہ دونوں آخر کار معدوم ہو جاتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی مادہ اور توانائی سے متعلق وہ امور بھی ختم ہو جاتے ہیں جنہیں قوانین فطرت کہا جاتا ہے۔"

اہل تصوف کے ہاں خوارق عادات باطنیت کے اظہار کی ایک معمولی دلیل ہوتے ہیں۔ یہ امور عموماً ماورائے عقل مظاہر ہوا کرتے ہیں چونکہ عقل مادی مظاہر سے بحث کرتی ہے، لہٰذا وہ ان مظاہر کی شرح کرنے سے قاصر ہوتی ہے اور ان مظاہر کو اسرار کی فہرست میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

ایسے میں خرد دشمنی کے جذبے کو تحریک ہوتی ہے اور باطنی قوت کا تصور زور پکڑتا ہے، لیکن کیا یہ باطنی قوت واقعی عقل پر فوقیت رکھتی ہے؟ کیا اس وجدانی علم کے امور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں؟ علم باطن کے موضوع کے تحت اسی بات کا جائزہ لیا جائے گا۔

(دیکھئے "علم باطن")

# شیطان مت

مذاہب عالم اور اصنامیات خیر و شر کے مسئلے کی تشریح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے نظام کائنات میں دو قوتیں برسرپیکار رہی ہیں ایک قوت خیر اور دوسری شر کی طاقت۔ وقتاً فوقتاً دونوں ایک دوسرے پر غالب آتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ بالآخر خیر کی فتح اور شر کی ہمیشہ ہمیشہ کی مغلوبیت کی صورت میں انجام پذیر ہو گا۔

All is well that ends well. کے حوالے سے جملہ مذاہب (ماسوائے شیطان مت) کا رجحان نیک اور خوشگوار انجام پانے والی خیر کی قوت کی طرف ہے جس کا نمائندہ یزداں یا خدا ہے جب کہ شر کی قوت چونکہ اس قوت خیر کی دشمن ہے لہٰذا اہل مذہب بھی قوت شر کے مخالف ہیں جسے وہ شیطان، ابلیس، اہرمن اور لوسیفر وغیرہ کے ناموں سے پکارتے ہیں۔

شیطان مت سے تعلق رکھنے والے اس کے برعکس تخریب کی منفی قوت پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں اور خیر کی طاقت سے متنفر ہیں۔ گو بنیادی طور پر یہ سب شیطان کو پوجتے ہیں۔ لیکن جزئیات کے اعتبار سے ان میں بھی بڑا تنوع نظر آتا ہے اور دنیا کے مختلف علاقوں میں یہ لوگ عقائد میں اختلاف کے ساتھ نظر آتے ہیں شیطان کے بارے میں ان کی تشریحات میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بعض ان میں کافی موثر بھی ہیں اور یورپ اور امریکہ میں جدید دور میں ایک نئے جوش اور ولولے سے اٹھے ہیں۔

شام میں اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا فرقہ یزیدیہ شیطان کو ملک الطاؤس کہتا ہے اور جو شیطان کو برا کہے، یہ لوگ اسے قتل کر دیتے ہیں۔ ایران کے کسی علاقے میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اگرچہ اپنے آپ کو صحیح مسلمان قرار دیتے ہیں تاہم ان کے اور عام مسلمان کے عقائد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ لوگ شیطان کو خدا تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ بارگاہ خداوندی میں غلطی کر بیٹھنے پر شیطان کو بڑا افسوس ہوا۔ وہ خدا کا بہت مقرب تھا اور خدا کے بعد اسی کا درجہ آتا تھا کیونکہ اس نے عرش کے چپے چپے پر جبین نیاز جھکائی تھی۔ وہ علم و فضل میں کل مخلوقات سے آگے تھا۔ حسن و جمال میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اسے حکمت کی وجہ سے فرشتوں کے استاد کا درجہ دیا گیا تھا۔ آدم کے آگے سر نہ جھکانے کی غلطی کرنے پر جب اسے راندہ درگاہ قرار دیا گیا تو اس دانا کو احساس ہوا کہ غلطی کے ارتکاب کے کیسے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں پس وہ خوب گڑگڑایا اور اتنا رویا کہ اس کے انفعال

کے قطروں سے جہنم کے ساتوں درجے بجھ گئے اور وہ خدا کو اس رعایت سے اتنا ہی پیارا ہو گیا اور ادھر جہنم کے خطرے کو انسان کے لئے ختم کر دینے کی وجہ سے انسانیت کا محسن بھی ٹھہرا پس وہ انسانوں کی جانب سے سجدہ شکر کا حقدار ہے۔

لیکن اوپر بیان کردہ عقائد میں ہمیں اس بات کی جھلک ملتی ہے کہ خدا کا رتبہ پھر بھی بلند تصور ہوتا ہے اس کے برعکس مغرب میں ابلیس کے پجاری خدا سے سخت عداوت رکھتے ہیں اور عبادت کے لائق صرف شیطان کو قرار دیتے ہیں اور مشکلات کے حل کے لئے شیطان سے رجوع کرتے ہیں دور حاضر کے شیطان پرستوں کے عقائد ازمنہ وسطی کے مغربی شیطان پرستوں کے عقائد سے مماثل ہیں یہ مذہب عیسائیت کے خلاف شروع ہوا تھا، ان دونوں کے عقائد کا مشترکہ جائزہ آگے لیا گیا ہے۔

اہل تصوف کے رنگا رنگ عقائد میں شیطان کے بارے میں دو متضاد رویئے ملتے ہیں ایک جانب اس سے سخت عداوت کا اظہار کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اسے مرشد تک کا رتبہ دیا جاتا ہے۔ قصہ آدم وابلیس کی تشریح دوسرا گروہ ایک اور انداز سے کرتا ہے اور ابلیس کے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کو حق عبودیت ادا کرنا بتاتا ہے۔ عبدالکریم الجیلی نے کہا کہ جب ابلیس کو حکم ہوا کہ فرشتوں کے ہمراہ آدم کے آگے سجدہ ریز ہو تو ابلیس پر یہ امر مشتبہ ہو گیا کہ کہیں ایسا کرنے سے غیراللہ کو سجدہ کرنے کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ انہی جیلی صاحب نے ابلیس کو مظہر خداوندی بھی قرار دیا اور کہا کہ نوری فرشتے خدا کے جمالی پہلو کے مظہر ہیں اور شیطان جلالی کا.. اسلامی تصوف کے ایک اہم ستون منصور حلاج، جیلی سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کتاب الطواسین میں رقم طراز ہیں۔

"میرے استاد اور دوست ابلیس اور فرعون ہیں ابلیس کو جہنم واصل کرنے کی دھمکی دی گئی لیکن اس نے توبہ نہ کی۔ فرعون غرقاب ہوا لیکن اس نے توبہ نہیں کی کیونکہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان کسی وجود کا قائل نہ تھا۔" (6)

صوفی ازم سے متاثر اقبال بھی ابلیس کے بارے میں جداگانہ رویہ رکھتے تھے ان کے نزدیک ابلیس ایک ہیرو سے کم نہیں کیونکہ وہ اسے قوت فکر وعمل اور حرکت کا پیکر تصور کرتے تھے۔ ایک خط میں کہتے ہیں "ذہنی طور پر ایک ابدی اور قادر مطلق شیطان پر ایمان لانا زیادہ آسان ہے۔ بہ نسبت ایک خدا پر ایمان لانے کے جو خیر محض کا مبداء ہو۔" (7)

انیسویں صدی میں مغرب میں رومانیت کی تحریک چلی۔ اس سے متاثر ہونے والوں نے بھی شیطان کی بہت توصیف کی۔ اہل مذہب جسے ابلیس کی سرکشی قرار دیتے ہیں۔ رومانیوں کے نزدیک وہ ابلیس کی خودداری تھی۔ ایک رومانوی سموئیل ٹیلر نے قصہ آدم وابلیس کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے کہا تھا "ہم نے مقدمہ کے ایک ہی رخ کا مطالعہ کیا ہے کیونکہ ساری کتب خدا کی تحریر کردہ ہیں۔"

گویا شیطان کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا اور یہی کام رومانوی کر رہے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ شیطان کو الہامی کتب کا ذریعہ حاصل نہیں رہا جب کہ خدا نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

سحر پرست اقوام میں شیطان کی پرستش کا سراغ قدیم زمانے سے ملتا ہے۔ یورپ میں سحر کے تاریک دور میں شیطان پرستی جادو کا لازمی جزو قرار پایا۔ اب ساحرین شیطان کو خالق کائنات اور خدا کو اس کا دشمن گردانتے ہیں جس نے ناجائز طور پر ابلیس کی مملکت پر قبضہ جما رکھا ہے اور آخر کار یہ بادشاہت حقیقی وارث شیطان کے ہاتھ میں ہو گی۔

عیسائیت کے ظہور کے بعد سحر اور شیطان مت میں یہی فرق رہا کہ ساحر Sorcerer وہ شخص مانا گیا جو سحر کا استعمال محض کسی دنیاوی مقصد کے لئے کرے جبکہ شیطان پرست Witch انہیں کہا گیا جو شیطان کو اپنا دنیا و آخرت کا رکھوالا جانتے اور مانتے تھے کہ آخر کار خدا شیطان اور اس کے مددگاروں کے آگے شکست کھا جائے گا۔ عیسائی دیومالائی کرداروں کو شیطان کے چیلے خیال کرتے جو دوسروں کے نزدیک دیوی اور دیوتا ہونے کی وجہ سے واجب الاحترام اور لائق عبادت تھے رومی سلطنت میں ان دیوی دیوتاؤں کی پوجا اور قربانیاں عیسائی حکام نے بند کر دی تھیں بعدازاں سحر پر بھی یہ کہہ کر پابندی عائد کر دی گئی کہ ساحر شیطان کے ہاتھ اپنی روح فروخت کر دیتا ہے اور بدلے میں پراسرار طاقتیں حاصل کرتا ہے جب کہ شیطان پرست بلا کسی ستائش شیطان کو آقا مانتے ہوئے پوجتے ہیں۔

عیسائیت نے تیرھویں صدی عیسوی میں انکوئیزیشن نامی ادارے قائم کئے جن کا مقصد پوچھ گچھ کی آڑ میں دولت مند گھرانوں پر سحر کاری کا الزم لگا کر انہیں تشدد سے تسلیم کرانا تھا کہ وہ شیطان کے پجاری ہیں اور پھر ان کی دولت بحق مسیحیت ضبط کرا لینا تھا۔ انکوئیزیشن کے دہشت ناک

مظالم شیطان مت کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام رہے بلکہ شیطان کے پیروکاروں نے اور مضبوطی سے اپنے عقیدے کو پکڑنا شروع کر دیا کوئی نیا شخص جب اس مذہب کو قبول کرتا تو سب سے پہلے عیسائیت سے تائب ہوتا۔ شیطان کے نام پر بپتسمہ حاصل کرتا اور عیسائی نام ترک کر دیتا۔ وہ ایک دائرے میں کھڑا ہو کر عہد کرتا کہ ابلیس کا وفادار رہے گا اور اس کے نام پر بچوں کی قربانی دے گا۔ خدا بیٹے اور روح القدس سے متعلق مقدسات کی بے حرمتی کرے گا اور شیطانی افعال، سیاہ رسوم اور سبت کی بابت کسی سے کچھ نہ کہے گا۔

اس عہد کے بعد وہ ان شیطانی افعال میں مصروف ہو جاتا جن پر آج تک شکوک کے پردے پڑے ہوئے ہیں اتنا اندازہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا عیسائیت کی مروجہ رسوم کے بالکل برعکس تھا۔ تحفظ عصمت ایک بڑا جرم سمجھا جاتا اور حرام کاری کو شیطان سے وفاداری کی علامت خیال کیا جاتا۔ یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ مرد شیطان پرست ابلیس کے فرستادے سکوبی اور عورتیں انکوبی سے تمتع کے ذریعے مدارج طے کرتے ہیں یہ خیال بھی عام تھا کہ شیطان ضرورت کے مطابق انکوبی یا سکوبی بن جانے کی اہلیت رکھتا ہے اور خدا پرستوں کو گناہ میں ملوث کر کے شیطان کے پجاریوں میں شامل کرانے کی کوشش کرتا ہے۔

شیطان کی پرستش کے حوالے سے مردوں سے زیادہ عورتیں قصوروار ٹھہرائی گئیں کیونکہ اس دور میں مشہور تھا کہ مرد سے کم تر یہ مخلوق گناہ کی جڑ ہے، کج رو ہے اور شیطان سے جنسی مواصلت کی خاطر اپنی روح بیچ ڈالتی ہے یہ اور بات ہے کہ اس عمل سے پھر کبھی لطف حاصل کرنا ممکن نہ رہتا اور یہ ایک شدید تکلیف دہ عمل ٹھہرتا۔ تاہم جادوگرنی اس سے زبردست قوت ضرور حاصل کرتی جس کے بل پر وہ لوگوں کو ہر قسم کا جانی و مالی نقصان دینے پر قادر ہو جاتی شیطان کے نسطو نگڑے انکوبی اور سکوبی ہر سال مقررہ اوقات پر شیطان کے بندوں سے رابطہ قائم کرتے اور خلوت میں بے راہ روی کے مظاہرے کرتے۔ مخصوص دنوں میں شیطان پرست چودھویں کی رات کو اجتماع میں شریک ہوتے اور وہاں شیطان کے قائم مقام بھیس بدلے ہوئے اشخاص کا ایک دائرے میں طواف کرتے اور اس کے سرین چومتے جاتے اور مرغ کی بانگ کے وقت ساری رات سے جاری فسق و فجور کا سلسلہ رک جاتا۔

سولھویں صدی عیسوی میں ان شیطان پرستوں کی پکڑ دھکڑ اور زندہ جلا دینے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا اور بے پناہ تشدد سے ان رسوم کی بابت معلومات حاصل کی گئیں جو خفیہ طور پر سرانجام دی جاتی تھیں معلوم ہوا کہ جادوگرنیاں خاص جڑی بوٹیوں نومولود انسانی بچوں کے خون اور چمگادڑوں، مینڈوں اور چھپکلیوں کو کوٹ کر ایسا مرہم تیار کرتی ہیں جسے بدن پر مل کر ان میں اڑنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اس بارے میں مختلف جادوگرنیوں نے تشدد کے بعد ان جڑی بوٹیوں کی شناخت کرا دی پتہ چلا کہ درحقیقت اس ملغوبے میں نشہ آور اجزاء موجود ہوتے ہیں جن کے کھانے یا مالش کرنے سے آدمی کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اڑ رہا ہے۔

برطانیہ میں ان لوگوں کو پھانسی دینے کا رواج تھا مگر کلیسا کبھی انہیں جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہ رہا برطانیہ میں سترھویں صدی عیسوی میں عیاشیوں کو مذہب کا لبادہ اوڑھا کر "ہیل فائر" کلب تشکیل دیئے گئے جہاں سوائے خدا کے تمام دیوی دیوتا پوجے گئے۔ شیطانی عبادت گاہوں میں سفلے جذبات کو ابھارنے کی خاطر ہر قسم کا سامان فراہم کیا جاتا۔ نوجوان نسل نے اس مسلک کو دل سے قبول کیا ان کے نزدیک یہ سب کچھ فرحت انگیز تھا۔ کلیساء کے کئی محترم افراد کے اعزاء اقرباء بھی خفیہ طور پر اس مذہب سے منسلک رہے مسیح سے عداوت کا مظاہرہ عشائے ربانی کی روٹی کو غلاظت سے آلودہ کرنے اور ٹکڑے کر دینے سے کرتے۔ الٹی صلیب پر کنواری کو برہنہ لٹا کر اس پر شراب چھڑکتے اور بائیں پیر سے فرش پر صلیب بنا کر دعاؤں کو الٹ پڑھتے۔ کنواری کو مادر ارضی تصور کرتے۔[8]

دور حاضر میں شیطان مت کے احیاء کی کوشش ۱۹۲۱ء میں شائع ہونے والی کتاب "مغربی یورپ کا سحری مذہب" سے شروع ہوئی اسی کتاب کے ایک شارح جیرال گارڈنر نے اعلان کیا کہ اسے انگلینڈ میں قدیم شیطان پرستوں کا ایسا گروہ ملا ہے جو کسی نہ کسی طرح جادوگروں کے قتل عام سے بچتا چلا آ رہا تھا اور انہوں نے اسے اپنی تقاریب میں شریک بھی کیا تھا۔ بعدازاں امریکہ کی سب سے زیادہ مشہور جادوگرنی سائبل لیک اور ایک برطانوی محقق ولسن نے بھی تصدیق کر دی کہ نیو فارسٹ (برطانیہ) میں شیطان پرست ۱۹۳۰ء اور ۱۹۵۰ء کے عشروں تک موجود رہے ہیں اور اب بھی موجود ہوں گے۔

نسبتاً قریب کے ادوار میں شیطان مت کی ایک نئی صورت سحر ابیض یا سفید جادو ہے اس مذہب کے متبعین عیسائیت، کے مخالف ایسے شیطان پرست ہیں جو قدیم شیطان پرستوں کے برعکس انسانیت کی خدمت میں عظمت خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک گناہ کا مفہوم الگ ہے تاہم جنسی بے راہ راوی یہاں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ لوگ دیومالائی کرداروں کو پوجتے ہیں ان کے ہاں مادر ارضی جو زرخیزی کی دیوی ہے سب سے زیادہ قابل احترام ہے جس کی پوجا تقریباً تمام قدیم ادوار کی اقوام نے زراعت کے دور میں کی۔ اس کے علاوہ دیگر رومی مصری اور یونانی اصنامیاتی کردار بھی پوجے جارہے ہیں۔ ۱۸۸۰ء میں امریکہ کے ایک شخص چارلس لی لینڈ کی ملاقات فلورنس میں ایک اطالوی جادوگرنی مدالینا سے ہوئی جس نے بتایا کہ ان جادوگرنیوں کا عقیدہ ہے کہ چاند دیوی ڈیانا نے اپنے بھائی لوسی فر کے تعلق سے ایک لڑکی ارادیا کو جنم دیا۔ اب ارادیا جادوگری سکھاتی ہے اور شیطان کے پجاریوں کی مددگار ہے تاکہ انہیں خدا بیٹا اور روح القدس کے "شر" سے محفوظ رکھ سکے۔ لی لینڈ نے ۱۸۹۹ء میں جادوگروں کی انجیل، اردایا شائع کر دی خیال ہے کہ اس انجیل کو نیوفارسٹ میں بڑا تقدس حاصل ہوا۔ اور یہی مقام سحر ابیض کی جنم بھومی قرار دیا جاتا ہے۔ (9)

یورپی شیطان پرستوں کے بارے میں عام رویہ یہ ہے کہ اس مذہب نے محض عیسائیت کے مروجہ عقائد کے خلاف جنم لیا۔ شیطانی بائبل کی یہ آیات اس کی دلیل ہیں۔ "شیطان صرف ان سے مہربانی کا روادار ہے جو اس کے حقدار ہوں نہ کہ (مروجہ عیسائیت کی طرح) کمینوں سے" "شیطان بدلے پر یقین رکھتا ہے نہ کہ دوسرا گال بھی مارنے والے کے آگے کرنے پر" "شیطانیت انسان کی طبعی اور ذہنی و جذباتی تسکین کی علامت ہے جو گناہ کے ذریعے ممکن ہے" "شیطانیت فکر و عمل اور جہد مسلسل کی دعوت دیتی ہے اور خالی خولی کے سراب سے بچاتی ہے"۔ (10)

# معجزے

ایک ننھا طالب علم ایک روز اپنی ماں سے کہنے لگا "امی آج ہمارے استاد صاحب نے ایک بڑا زبردست قصہ سنایا" ماں نے اشتیاق سے پوچھا "اچھا! مجھے بھی سناؤ" بچے نے کہا "اللہ کے ایک بڑے پیغمبر موسیٰؑ کی جنگ فرعون بادشاہ سے ہوئی۔ فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کا پیچھا کرنے لگا لیکن موسیٰؑ کے راستے میں ایک دریا آگیا۔ تب موسیٰؑ کی آرمی کے انجینئر نے فوراً ایک بڑا پل بنایا اور موسیٰؑ اپنی آرمی کے ساتھ اس پر گزر کر دریا کے پار اتر گئے۔ اتنے میں فرعون کی فوجیں بھی آگئیں اور پل پر سے گزرنے لگیں تاکہ موسیٰؑ کو دریا پار اتر کر پکڑ لیں مگر موسیٰؑ کی ائیر فورس کے جنگی جہازوں نے پل کو بمباری کر کے فوراً تباہ کر دیا اور فرعون اور اس کی ساری آرمی دریا میں ڈوب گئی"۔

کیا؟ ماں نے دانتوں میں انگلی داب کر کہا "تمہارے استاد نے ایسا قصہ سنایا تھا؟" "نہیں امی جس طرح انہوں نے بتایا اس کا تو آپ کبھی یقین بھی نہیں کریں گی۔"

درحقیقت معجزہ ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جو ایسے شخص سے سرزد ہو جو خدا کا نبی یا رسول ہونے کا دعوے دار ہو اور یہ واقعہ انسانی عقل کی گرفت میں نہ آ سکے کہ ایسا کیونکر ہوا۔ اہل ایمان کے بقول اس واقعے میں خدا کا ہاتھ ہوتا ہے تاکہ لوگ اس کے نبی یا رسول کی حقانیت کے قائل ہو جائیں اسے معجزہ اس لئے کہتے ہیں کہ دوسرا ہر آدمی اس جیسا کام کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔

مذہبی تاریخی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں دعویٰ پیغمبری کرنے والے افراد سے ان کے متبعین کوئی نہ کوئی معجزہ منسوب کرتے آئے ہیں جو عموماً حالات کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ ان معجزوں میں غیب دانی، پیش بینی اور دیگر ماورائے عقل و فطرت مظاہر کا ظہور شامل ہے۔ (پیش بینی سے متعلق اس باب کا مضمون "مذہب اور پیش گوئی" دیکھئے۔ یہاں صرف ماورائے عقل مظاہر کا ذکر کیا جارہا ہے۔)

بائبل میں قدیم ترین معجزہ بوڑھی اور بانجھ عورتوں کو حمل ٹھہرنا ہے۔ اس کے بعد موسیٰؑ کے معجزوں کا تذکرہ ہے۔ انہیں وحی اسی طرح ملی کہ ایک جھاڑی میں آگ لگی نظر آئی مگر جھاڑی جلنے سے محفوظ تھی پھر سب سے زیادہ قابل ذکر معرکہ فرعون و کلیم میں لاٹھی کا معجزہ ہے جس کے ذریعے نیل کے دریا

میں راستہ بنایا اور ختم کیا گیا جس سے فرعون مع اپنے لشکر کے غرقاب ہو گیا اسی قسم کے معجزے یوشع نبی سے منسوب ہیں جنہوں نے آفتاب اور ماہتاب حکماً روک دیئے تھے۔ دیگر نبیوں سے منسوب کارناموں میں ان کا مردوں کو زندہ کرنا معمولی مقدار خوراک سے بڑے مجمعوں کو شکم سیر کرنا اور بیماریوں کے روحانی علاج شامل ہیں عہد نامہ جدید میں عیسیٰؑ کی پیدائش بن باپ کے ہونا ایک معجزہ ہے۔ آپ کے دیگر معجزوں میں اندھوں، بہروں، گونگوں، جذامیوں، پاگلوں کو شفا بخشنا، مُردوں کو حیاتِ نو دینا، بانجھ درختوں سے پھل پیدا کرنا، ارواح خبیثہ کو رفع کرنا، طوفانوں کو تھما دینا، پانی پر چلنا، پانی کا شراب بنا دینا اور پانچ ہزار افراد کو نہایت قلیل خوراک بانٹ کر پیٹ بھر دینا شامل ہیں[11]

آنحضورؐ سے منسوب معجزات کی فہرست بھی خاصی طویل ہے جن میں سے مشہور ترین چاند کو دو ٹکڑے کرنے، انگلیوں سے پانی جاری فرمانے، معمولی کھانے میں دعا اور برکت کے ذریعے فراوانی، بیماروں کو شفا عطا کرنے اور معراج کے معجزے سرفہرست ہیں جن کی شہادتیں مضبوط ہیں۔ بعض ایسے معجزات بھی منسوب ہیں جن کی تاریخی اہمیت نہیں ہے اور یہ محض عقیدت مندوں کے غلو کے سبب مشہور ہوئے۔ جیسے آپؐ کا سورج کو لوٹا دینے کا واقعہ دراصل خوش عقیدگی کا نتیجہ ہے۔ اس طرح بائبل کا یہ قول کہ مسیح کے تمام کارنامے لکھنا امکان سے باہر ہے۔ غلو کا عنصر لئے ہوئے ہے۔

آنحضورؐ سے منسوب بعض معجزے تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں ایسے معجزات کا شمار لازم ہے جو آپؐ کی وفات کے بعد بھی جاری و ساری ہیں۔ اس کی سب سے اہم مثال قرآن مجید کا وجود ایک زندہ معجزے کی صورت میں ہے۔ اس کے بعد باری آتی ہے مذہبی بشارتوں کی اور ان خوابوں کی کہ جن میں نبیؐ بنفس نفیس لوگوں کے خواب میں ظاہر ہوئے اور انہیں کوئی حکم فرمایا۔ تاریخ اسلامی میں غالباً اس نوعیت کا اہم ترین واقعہ شہنشاہ نورالدین زنگیؒ کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ یہودیوں کے دو جاسوس مدینۃ النبی بھیجے گئے جن کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ زیر زمین سرنگ کھود کر نبیؐ کے جسد پاک کو روضہ مبارک سے چرا کر لے آئیں تاکہ بعد ازاں مسلمانوں پر اعتقادی اعتبار سے دباؤ ڈالا جا سکے۔ یہ دونوں بزرگ صورت افراد اس کام میں جُت گئے۔ ادھر بادشاہ زنگی نے خواب میں نبیؐ کی زیارت کی۔ جنہوں نے حکم فرمایا کہ ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے۔ بادشاہ خواب سے بیدار ہوا تو اس کے بدن کا رواں رواں پسینے میں تربتر تھا۔ اس نے مدینۃ النبی کے تمام افراد کو دعوت کے بہانے شناخت کے لئے بلا بھیجا اور ان دو افراد کی صورتیں پہچان کر انہیں گرفتار کر لیا۔ زیر زمین سرنگ بھی تلاش کر لی گئی جس کی مٹی یہ خبیث لوگ نظر بچا کر پھینک دیتے تھے۔ بادشاہ نے انہیں قتل کرا دیا۔ اور روضہ نبوی کے ارد گرد سیسہ پگھلا کر اس کی ایک بہت موٹی اور گہری حفاظتی دیوار بنا دی۔

آنحضورؐ سے منسوب ایک اور بہت بڑا معجزہ شق القمر ہے۔ مسلمانوں کی صحیح احادیث میں اس واقعہ کا تذکرہ کچھ اس طرح ملتا ہے کہ ہجرت سے پہلے حج کی رات مکہ کے کافر ایک جگہ جمع تھے۔ انہوں نے محمدؐ سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو چاند کو دو ٹکڑے کر دو۔ تب محمدؐ نے انگلی سے اشارہ فرمایا تو چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک ٹکڑا ابو قبیس پہاڑ کی طرف اور دوسرا قبقعان پہاڑ کی طرف جاتا صاف دکھائی دیا پھر انہیں ملتا دیکھ کر مشرکوں نے کہا محمدؐ تم بڑے جادوگر ہو گئے ہو۔

آپؐ نے فرمایا "کیا میں نے کبھی جھوٹ بولا یا جادو سیکھا ہے؟" کفار نے کہا نہیں۔ آنحضرت نے فرمایا "تم کیوں ہلاکت کی طرف جا رہے ہو۔ خدا سے ڈرو اور میرے ساتھ ہو جاؤ"۔

مفسرین قرآن کا کہنا ہے کہ سورۃ قمر کی پہلی آیت "قیامت نزدیک آ پہنچی اور چاند شق ہو گیا" میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

علامہ قاضی محمد سلیمان سلمان "سفرنامہ حجاز" میں رقم طراز ہیں۔ "یہ معجزہ ہمارے سید و مولا محمد مصطفیٰؐ کے بزرگ ترین معجزات میں سے ہے۔ مضبوط سے مضبوط صحت کے ساتھ روایت کیا گیا ہے اور صحابہؓ کی بڑی تعداد نے اس کی روایت کی ہے۔ اور اس کا درجہ تواتر معنوی تک پہنچ گیا ہے اور جملہ روایات بلا کسی انقطاع یا وقف یا ارسال کے مسند و صحیح و مرفوع ہیں۔ آج ایسے معجزے پر سب سے زیادہ اعتراض کرنے والے پادری صاحبان ہیں۔ جن کا اعتراض ہے کہ اگر چاند پھٹ گیا ہوتا تو اس واقعہ عظیم کی شہادت ہر ایک ملک کی تاریخ سے ملنی چاہئے تھی"۔ "واضح ہو کہ اگر انشقاق القمر کا وقت نو بجے شب (یعنی بعد از نہار) مکہ معظمہ میں فرض کر لیا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں مندرجہ ذیل وقت ہو گا۔ ان اوقات پر ذرا غور کی نگاہ ڈالو تاکہ اس اعتراض کا ضعف معلوم ہو جائے کہ شق القمر کُل دنیا کو کیوں نظر نہیں آیا۔"

نیوزی لینڈ ۶ بجے صبح، جنوبی آسٹریلیا ۵۰: ۴ صبح، مغربی آسٹریلیا شمالی بورینو فلپائن، ہانگ کانگ، چین ۲۰: ۳ دوپہر، تسمانیہ، وکٹوریہ، نیو ساؤتھ ویلز

۵:۲۲، جاپان، کوریا ۲۰: ۴ بعد دوپہر، نیوگنی ۲۰:۲ (دوپہر) برما ۵۰:۱ رات ہندوستان ۵۰:۱۲ شب، مڈغاسکر ۲۰:۱۰ رات رومانیہ، بلغاریہ، ترکی، یونان ۲۰:۸ جرمنی، ڈنمارک، سویڈن ۲۰:۸ دن سپین، برطانیہ، فرانس بلجیئم ۳۰:۶ آئس لینڈ میڈریا ۲۰:۵ دن مشرقی برازیل ۲۰: ۳ بعد نیم شب متوسط برازیل چلی ۲۰:۲ بعد نیم شب پیرو، پناما، بہامہ ۲۰:۱ شب برٹش کولمبیا ۲۰:۱۰ صبح، سموآ ۵۰:۶ صبح[12]

بعض ہندی روایات کے مطابق ریاست مالابار (ہندوستان) کا راجہ زمورن نامی تھا جو اپنی بیٹیوں کی شادی کے سلسلے میں بڑا پریشان رہتا تھا۔ نجومیوں نے اس سے کہا کہ پورے چاند کی تاریخ کو دیوتاؤں کا کہا پورا ہو گا اور وہ اسی روز علم نجوم کے ذریعے درست فیصلہ کر سکیں گے۔ مقررہ رات زمورن پریشانی کے عالم میں محل کی چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے بچیوں کی شادی کی شبھ گھڑی کا پتہ لگانے کی فکر کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا محل کے ایک جانب اور دوسرا ٹکڑا دوسری جانب دکھائی دے رہا تھا۔ راجہ آنکھیں مل مل کر یہ دیکھنے لگا۔ اسے اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔ مگر پھر اس نے صاف طور پر چاند کے دونوں ٹکڑے آپس میں ملتے دیکھے۔ اگلے روز وہ نجومیوں کو اس واقعہ کی تفصیل بتا کر اور انہیں اس کے اسباب تلاش کرنے کا حکم دے کر قنوج چلا گیا اور ریاست کا کاروبار جنگ دیو کے سپرد کر دیا۔

نجومیوں نے اس سلسلے میں سومنات کے مندر جانے کا فیصلہ کیا تاکہ مہاپجاری سے اس کی بابت کچھ دریافت کریں۔ اس نے سونے کا ایک تھال قبول کر کے نجومیوں کو صرف اتنا کہا "شامل دیپ" یہ لفظ اس دور میں ملک عرب کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ چنانچہ جب زمورن قنوج سے واپس لوٹا تو نجومیوں نے اسے بتایا کہ مہاراج فارس کے درباری حکیم جاماسپ نے تحریر کیا ہے کہ چاند دو ٹکڑے کرنے کا معجزہ عرب میں پیدا ہونے والا پیغمبر دکھائے گا اور جو اس پیغمبر کو سچا جانے گا اسے نہ اس دنیا میں کوئی رنج پہنچے گا نہ دوسری دنیا میں" کہا جاتا ہے کہ زمورن اس نبی سے ملنے یا اس کی تعلیمات معلوم کرنے کی حسرت لئے ہی دنیا سے چلا گیا۔

ایک اور روایت کہتی ہے کہ چین میں ایک ایسا پتھر دریافت کیا گیا جس پر اہم واقعات درج تھے۔ اس پتھر پر چاند شق ہونے کا واقعہ درج ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی گھڑا ہوا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ قاضی سلیمان منصور پوری کے مندرجہ نقشہ کے تحت ہندوستان میں رات ۵۰:۱۲ کا وقت دکھایا گیا ہے جب کہ چین میں ۲۰: ۳ دوپہر درج ہے۔

ایک روایت "الانسان العربیہ" میں درج ہے کہ مصنف نے چین میں ایسی عمارت دیکھی جس پر درج تھا کہ یہ چاند ٹوٹنے کے زمانے میں بنی تھی۔

روشن خیال اور ترقی پسند اس معجزہ شق القمر سے یہ کہہ کر انکار کرتے ہیں کہ اس صورت میں زمین پر زبردست تغیر رونما ہونا چاہئے تھا۔ لیکن بعض جگہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ چاند پر اترنے والے خلابازوں نے بتایا کہ انہوں نے چاند کی سطح پر تاحد نگاہ ایک دراڑ کا مشاہدہ کیا جسے بعد ازاں فلکیات دانوں نے عربی شگاف یا Arabic Crack کا نام دیا۔ مسلمانوں کا کہنا ہے کہ یہ عربیک کریک شق القمر کے معجزہ محمدیؐ کی دلیل اور یادگار ہے اور اسی واقعے سے معنون ہے۔

عیسائی دنیا میں ایک بہت بڑا معجزہ لزبن (پرتگال) کے شمال مشرقی علاقے (فاتما) میں پیش آیا۔ ۱۳ر مئی ۱۹۱۷ء کو دوپہر کے وقت تین بچے بھیڑیں چرا رہے تھے۔ جس وقت دن ڈھلنے لگا تو وہ کھیل کود میں مصروف تھے، اچانک دس سالہ لوسیا نے دیکھا کہ جیسے فضا میں بجلی سی چمکی ہے۔ ننھی بچی نے سوچا شاید طوفان آ رہا ہے اور اسے اپنے کزنوں جاکنٹا مارٹو (عمر سات برس) اور فرانسسکو مارٹو (عمر آٹھ برس) کو کسی محفوظ مقام پر لے جانا چاہئے۔ مگر وہ حیران تھی کہ وہاں بادل تو تھے ہی نہیں پھر چمک کیسی شاید نظر کا دھوکا ہو۔ مگر نہیں اگلے ہی لمحے ایک اور تیز چمک نے اس کا شک رفع کر دیا۔ بچوں نے اوپر دیکھا تو انہیں ایک درخت کی شاخوں پر عجیب منظر دکھائی دیا۔ وہ شاید سولہ برس کی ایک ایسی لڑکی تھی جس نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور ان میں مالا نظر آ رہی تھی۔ "ہم نے آج تک اس سے زیادہ حسین صورت نہیں دیکھی۔" اس نے ہم سے دو درخواستیں کیں۔ اول یہ کہ مسلسل چھ ماہ تک ہر مہینے کی تیرہ تاریخ کو اس وقت اس سے یہاں ملاقات کریں اور دوم یہ کہ روزانہ عبادت گزاروں سے کہیں کہ وہ جنگ (عظیم اول) بند کرائیں۔ اور قیام امن کی کوششیں کریں۔ ہیولے نے یہ کہا اور مشرق میں غائب ہو گیا۔

اگلے ماہ جون کی تیرہ تاریخ کو بچوں نے پھر اس پراسرار لڑکی سے ملاقات کی۔ ننھی لوسیا نے اس سے کہا کہ ہم بچوں کو بہشت میں لے جایئے۔ لڑکی کے

ہیولے نے جواب دیا کہ وہ صرف اس کے دو کزنز کو اپنے ہمراہ جلد لے جائے گی مگر لوسیا کو کچھ عرصہ زمین پر ہی قیام کرنا ہو گا۔ پھر ۱۳ر جولائی کا دن طلوع ہوا۔ بہت سے لوگ ہاتھوں میں مالائیں پھیرتے ہوئے فاتما میں آن جمع ہوئے۔ اگرچہ بچوں نے اس پراسرار لڑکی کی آمد کی اطلاع دوسروں سے مخفی رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر جاکنٹا کے پیٹ میں بات نہ رہ سکی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اسے بچوں کی شرارت اور جھوٹ پر محمول کیا تھا۔ مگر شائقین کی خاطر اس ہیولے نے بچوں سے وعدہ کیا کہ اکتوبر میں وہ ایک معجزہ پیش کرے گی تاکہ لوگوں کو اس کا یقین ہو جائے اور پتہ لگ جائے کہ وہ کون ہے۔ اگست کا مہینہ بچوں پر بڑا بھاری گزرا مقامی لوگوں نے پوچھ پوچھ کر ان کے ناک میں دم کر دیا تیرہ تاریخ کو انہیں محبوس کیا گیا۔ چنانچہ ملاقات نہ ہو سکی مگر ۱۹ر اگست کو بچوں نے دوبارہ مشاہدہ کیا تو اس خاتون نے کہا کہ توبہ اور عبادت بہت ضروری ہیں اور جس معجزے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ بھی نسبتاً کم اہمیت کا حامل ہو گا کیونکہ مقررہ تاریخ کو ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ستمبر کی ۱۳ر تاریخ کو اندازاً تیس ہزار افراد فاتما میں جمع ہو گئے اور انہیں معلوم ہوا کہ یہ ہیولہ مقدس ماں مریم کا ہے جنہوں نے اس وقت لوگوں سے کہا کہ وہ سب حمد و ثنا اور دعاؤں کے ذریعے جنگ بندی کی کوشش کریں۔ اب صرف آخری ملاقات رہ گئی تھی۔ جب معجزے کا وعدہ پورا ہونا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ آ گیا دور دور سے لوگوں نے آنا شروع کر دیا تاکہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ سکیں۔ ۱۳ تاریخ کو بوندا باندی ہو رہی تھی لیکن کم و بیش ۸۰ ہزار افراد کا ایک عظیم اجتماع منتظر تھا کہ دیکھیں غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔ سہ پہر کے وقت دفعتاً چمک پیدا ہوئی جسے تقریباً سب نے دیکھا اور اکثریت نے جان لیا کہ مقدس خاتون تشریف لے آئی ہیں کیونکہ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا رہا تھا (سوائے بچوں کے کسی نے بھی خاتون کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ نہیں کیا صرف لوسیا ہیولے کے ساتھ چل پھر کر گفتگو کرنے اور دیکھنے کی خوبی رکھتی تھی۔ باقی جاکنٹا کھڑا ہو کر ہیولے کو دیکھنے اور سننے پر اور فرانسسکو محض دیکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔)

اس روز مقدسہ نے انہیں بتایا کہ اس کی خواہش ہے کہ وہاں لوگ اس کی یاد میں ایک عبادت گاہ تعمیر کریں۔ اس نے کہا "میں دعا گو لوگوں کی خاتون مقدس ہوں" اور پھر وہ معجزہ واضح ہوا جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔ بقول لوسیا "خاتون نے ہاتھ کھولے اور ان کا رخ سورج کی جانب کر دیا اور ان کا اپنا عکس سورج پر پڑنے لگا" "سورج کو دیکھا" بارش تھم گئی اور سورج نکل آیا۔[13] سارے مجمع کے بارش سے بھیگے کپڑے خود بخود فوراً خشک ہو گئے۔ اچانک یوں معلوم ہوا کہ گویا سورج دیوانہ ہو گیا ہے۔ وہ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ جیسے لٹو، دفعتاً اس کی تیز گردش تھم گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر گھومنے لگا۔ پھر رکا اور پھر گھومنے لگا اور پھر ساکن ہو گیا۔ مجمع اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اب ایک نیا تماشہ شروع ہوا۔ لگتا تھا سورج ان لوگوں پر آن گرے گا۔ وہ تیزی سے دائیں بائیں ہوتا ان کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ نزدیک اور نزدیک لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بعض دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

ایک شخص فادر پیریرا جو اس وقت ۹ سال کا تھا کا بیان ہے "ہم سکول میں پڑھ رہے تھے۔ اچانک باہر شور و غل سنائی دیا۔ استانی اور بچے باہر کو دوڑے۔ بہت سے لوگ چیخ رہے تھے۔ اور شدت سے رو رہے تھے۔ کسی نے ہماری استانی کے سوالات کا جواب نہیں دیا۔ بس وہ سورج کی طرف اشارہ کئے جاتے تھے" "میں نے سورج کی طرف دیکھا وہ برف کا گولہ معلوم ہوتا تھا پھر اچانک یہ آسمان سے جدا ہو کر دائیں بائیں لڑھکتا ہوا آگے بڑھنے لگا کہ گویا زمین پر آن گرے گا۔ سخت دہشت پھیل گئی میں دوڑتا ہوا مجمعے کی طرف گیا۔ سب رو رہے تھے کہ کسی بھی لمحے دنیا کا خاتمہ ہوا چاہتا ہے۔ اس دوران ہر طرف قوس قزح کے سارے رنگ پھیل گئے۔ ہمیں کوئی نیلا شخص نظر آتا تھا کہیں پیلا اور کہیں سرخ۔ اس کیفیت نے خوف کی شدت میں اور اضافہ کر دیا۔ ۱۰ منٹ بعد سورج اپنی جگہ کی طرف لوٹ گیا مگر ابھی تک زردی مائل تھا جب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے تو ہر طرف مسرت پھیل گئی۔[14]"

اس مظاہرے کو بھانت بھانت کے ۸۰ ہزار افراد نے دیکھا۔ نصف کے قریب افراد نے کوئی خاص بات محسوس ہی نہیں کی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے سارے کیمرہ مینوں کے حواس رخصت تھے کہ کسی نے "سورج کے رقص" کی تصویر نہیں اتاری۔

مقدسہ نے دو بچوں کو جلد ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ صرف دو برس بعد ۱۹۱۹ء میں فرانسسکو راہی عدم ہوا اور اگلے برس جاکنٹا انفلوئنزا کا شکار ہو گئی اور وعدہ پورا ہو گیا۔ ادھر لوسیا نے طویل عمر پائی اور ۱۹۴۲ء میں اپنی یادداشتیں شائع کیں اور کئی ماورائے فطرت مظاہر دیکھنے کا اقرار کیا۔

دنیائے عیسائیت میں حضرت عیسیٰؑ کے معتقدین کی تاریخ میں متعدد جگہ اس امر کے مشاہدے کا تذکرہ ملتا ہے کہ بعض خواتین اور حضرات مسیحؑ کے عشق میں وارفتگی کی اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے بدن پر مخصوص زخم پراسرار طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ یہ زخم عموماً ان مقامات پر ظاہر ہوتے ہیں جو بائبل کے بقول عیسیٰؑ کے بدن پر صلیب کے وقت رومیوں نے لگائے تھے۔ کیتھولک عقائد انہیں مافوق الفطرت تحائف قرار دیتے ہیں اور اسٹگ مینا کا نام

دیتے ہیں۔

"سٹگ میٹا" قسم کے زخم لینے والے شخص کا صاحب ایمان اور متقی ہونا ضروری ہے یہ زخمی طبی نقطہ نگاہ سے عام زخموں کی نسبت چند مختلف خواص کے حامل ہوتے ہیں۔ ان زخموں سے رسنے والا خون صاف شفاف اور شریانوں سے نکلتا ہے جس میں کسی بھی بیماری کے آثار نہیں ہوتے۔ زخم لینے والوں کا بیان ہے کہ اس عالم میں پہلے پہل کوئی ہیولہ سا آکر متعلقہ شخص کو بتاتا ہے کہ اس کے بدن میں کیا ہو رہا ہے یہ ہیولہ کبھی کبھار عیسیٰؑ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد پیشانی، پسلیوں، ہتھیلیوں یا پیروں پر شعاعیں مرکوز ہو جاتی ہے اور زخم پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس دوران شدید تکلیف کا احساس ہوتا ہے(15)

بعض اوقات ہر جمعہ کو زخموں سے خون رسنے لگتا ہے اور کبھی کبھی صرف ایسٹر کے موقع پر جمعہ کو زخم بنے تو اتوار کی شب خود بخود مندمل ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ زخم اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ ایسے افراد مروجہ عیسائی عقائد کے مطابق عیسیٰؑ کی حالت صلیب میں اٹھائے جانے والے زخموں کے احساس میں برابر کے شریک ہیں اور ان زخموں کی کسک انہیں روح کی گہرائیوں میں محسوس ہوتی ہے۔

زخم لینے والوں میں جنس اور عمر کی تخصیص نہیں نفسیات دان ایک عرصہ تک یہ کہتے رہے کہ یہ سب اختناق الرحم کے مرض کے شعبدے ہیں یا پھر ہپناٹزم کی ترغیبات ہیں لیکن مشاہدات اور تجربات نے اس نظریئے کی تردید کر دی۔

ٹریسا ماسکو نامی ایک خاتون ۱۹۷۶ء میں ۳۳ برس کی عمر میں وفات پا گئی تھی اس نے موت سے پہلے اس امر کا ادراک کر لیا تھا کہ وہ عیسیٰؑ کی عمر پا کر مر جائے گی۔ ۱۹۶۹ء میں اسے سٹگ میٹا عطا ہوا۔ وہ ان پڑھ تھی مگر اس عالم میں بائبل کے ابواب زبانی لکھنے لگ گئی۔ اس کے دونوں ہاتھ چھدے ہوئے تھے۔

فاتما (پرتگال) میں معجزے کے شاہدین

بیت اللحم کی ایک نن سسٹر میری نے ایک مرتبہ عجیب کیفیت طاری ہونے پر پکار کر کہا تھا "یسوع مسیح نے میرا دل چھید ڈالا ہے"۔ ۱۱ برس بعد ۳۳ برس کی عمر میں وہ وفات پا گئی۔ ماہر سرجن ڈاکٹر کرپانی نے اس کا پوسٹ مارٹم کیا تو یہ دیکھ کر سخت حیران ہوا کہ میری کے دل میں ایک تکون شگاف ہے۔ جس کی ظاہری حالت بتا رہی ہے کہ وہ بہت پرانا ہے۔ اسی طرح لیونارڈو ڈالیٹر کے مشاہدات تھے۔ جس وقت اس کا سینہ کھولا گیا تو طبیب بڑے حیران ہوئے کہ وہ اپنے حقیقی طور پر زخموں سے چھدے دل کے ساتھ کس طرح زندہ رہا تھا۔

ٹریسا نامی راہبہ کہا کرتی تھی کہ میں نے حالت کشف میں ایک فرشتے کو دیکھا جس کے ہاتھ میں سونے کا بنا ہوا نیزہ تھا جس کی فولادی انی پر ایک شعلہ سا بھڑک رہا تھا۔ یہ نیزہ فرشتے نے میرے سینے میں جھونک دیا جو میری آنتوں میں جا کر پیوست ہو گیا۔ جب اس آتشیں فرشتے نے اس نیزے کو باہر کھینچ نکالا تو مجھے یوں لگا کہ گویا خدا کا عشق مجھ میں سرایت کر چکا ہے۔ ٹریسا کے اس بیان کو نفسیات دانوں نے جنسی طور پر شدید تشنگی کے احساس کی صورت میں پیش کیا مگر وہ اس

بات کا جواب نہ دے سکے کہ ٹریسا کے قلب پر وہ گہرا افقی شگاف سینے کے اندر کیونکر نمودار ہو گیا تھا۔ جو آج بھی ایلیاڈی ٹارمز، سپین میں اس کی آخری آرام گاہ میں محفوظ اس کے دل پر نقش دیکھا جا سکتا ہے۔

عیسائی تعلیمات کے مطابق عیسیٰؑ زندگی کی روٹی ہیں۔ مسیح کے گوشت اور خون کی جزو غذا سمجھنے کا نظریہ کتنا ہی عجیب اور طبع پر گراں گزرے لیکن سچے عیسائی سے اس عقیدے پر کاربند رہنے کی توقع کی جاتی ہے۔ عشائے ربانی کے مقدس موقع پر روٹی اور شراب مسیح کے گوشت اور لہو کے قائم مقام متصور ہوتے ہیں۔ بہت سی روایات بتاتی ہیں کہ اس موقع پر جب بھی کسی بد عقیدہ نے اس امر میں شبہ کیا تو عشائے ربانی فی الحقیقت گوشت اور خون میں تبدیل ہو گئے اس قسم کے واقعات کا سب سے بڑا ریکارڈ ۵۹۵ء سے ۱۷۳۰ء کے دوران ملتا ہے۔ اطالیہ میں لانسیانو کے پادری کو عشائے ربانی کی تقریب میں مسیح کی موجودگی کے عقیدے پر شک تھا۔ اچانک اس کی نظروں کے سامنے اور لوگوں نے بھی دیکھا کہ روٹی کا بہت سا حصہ گوشت میں تبدیل ہو گیا اور شراب لہو میں تبدیل ہو گئی۔ یہ لہو خشک ہو گیا تو پانچ مختلف جسامت کے ٹھوس ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ چیزیں سان فرانسسکو میں تبرک کے طور پر رکھ دی گئیں۔ بارہ سو سال بعد ۱۹۷۰ء میں ایزورو کے ایک ڈاکٹر نے جسے خوردبین انسانی عضلات اور پٹھوں کی ساخت پر مکمل عبور حاصل تھا۔ اس گوشت اور خون کا خوردبینی تجزیہ کیا۔ اس ڈاکٹر اوڈو ارڈو نے بیان کیا "گوشت واقعی گوشت ہے اور خون بھی حقیقی خون ہے۔ گوشت کے بارے میں مجھے یقین ہے کہ یہ انسانی دل کے عضلات "مائیو کارڈیم" سے بنا ہوا ہے۔ دل کا گوشت اور خون دونوں انسانی ہیں اور خون کے گروپ AB سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ آخر بارہ سو سال تک خون اور گوشت محفوظ کیونکر رہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ فی الحقیقت خون شراب سے اور گوشت روٹی سے بن گیا تھا۔ لیکن گوشت اور خون فطری طور پر کس طرح محفوظ رہے یہ ایک معمہ ہے"(16)

# کرامتیں

بنیادی طور پر کرامت بھی معجزے کی ایک صورت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کرامت کسی ایسے شخص سے سرزد ہوتی ہے جو کسی نئے مذہب کا بانی نہ ہو بلکہ کسی اور کے نظریئے کی ترویج و اشاعت کی خاطر عوام الناس کو متاثر کرنے کے لئے کوئی خلاف عقل یا مافوق الفطرت کام کر دکھائے۔

کرامت کی یہ تعریف اہل مذہب کے نزدیک درست ہے۔ ادھر اہل تصوف کے ہاں معنوی اعتبار سے معجزے اور کرامت کے مابین تفریق مشکل ہے کیونکہ خوارق عادت واقعہ کسی ایسی شخصیت سے بھی منسوب ہو سکتا ہے جو کسی نئے مسلک اور مذہب کی بنیاد ڈالے۔

ویدانتیوں کے ہاں وجدان کی قوت میں اضافے کے لئے حبس دم یا پرانا یام کا ایک طریقہ استعمال ہوتا ہے۔ اس طریقہ کار کی مشقیں کرنے والے سانس کو روکنے میں زبردست مہارت کر لیتے ہیں۔ ۱۸۳۷ء میں لاہور پر رنجیت سنگھ مہاراج کی حکمرانی تھی یہاں ایک یوگی ہری داس کا ناک منہ اور آنکھیں موم سے بند کر کے اسے کپڑے میں لپیٹ کر زندہ زمین میں گاڑ دیا گیا۔ اس کی قبر پر مہاراج کے حکم سے ہر وقت ایک سپاہی کا پہرا لگا رہتا۔ ۴۰ روز گزرنے کے بعد یوگی کی خواہش کے مطابق قبر کھودی گئی اور اسے باہر نکال کر کپڑا ہٹا کر موم صاف کیا گیا تو وہ دوبارہ سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔

بعض اوقات صاحب کرامت کی مرگ کے بعد بھی اس سے متعلق کرامت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال امروہہ (بھارت) میں شاہ ولایت کا مرقد ہے۔ اس بزرگ کی قبر پر ہمہ وقت زہریلے بچھوؤں کی ایک بڑی تعداد دیکھنے میں آتی ہے۔ لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ کوئی بھی بچھو کسی بھی زائر کو کچھ نہیں کہتا خواہ اسے ہاتھ میں اٹھا لیا جائے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ باہر سے کوئی اور بچھو لا کر مزار میں چھوڑ دیں تو وہ بچھو بھی ڈنک نہیں مارتا۔

گجرات کے قریب ایک قصبے جلال پور جٹاں میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ قصبہ میں ایک بزرگ قاضی عبدالحکیمؒ کا دربار تھا جن کے ارادتمند دور دور پھیلے ہوئے تھے۔ ایک سال برسات کا موسم شروع ہوا تو علاقے کے لوگوں کو خشک سالی کی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمان ایسے موقع پر نماز استسقاء ادا کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر نماز کے کچھ ہی دیر بعد بارش شروع ہو جاتی ہے۔ مگر اس علاقے میں اس نماز کے بار بار قیام کے باوجود نتیجہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔

مذکورہ بزرگ ایک روز دربار سجائے بیٹھے تھے کہ سات افراد کمرے میں سلام کرتے ہوئے داخل ہو گئے۔ ان افراد کے مکتب فکر میں پیر و مرشد کی مروجہ

شکل کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا عام معتقدین سے ہٹ کر ان کا رویہ غیر برخوردارانہ تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ قاضی صاحب بمعہ مریدین کے ٹھنڈے کمرے کی آسائش ترک کر کے ذرہ باہر آنے کی تکلیف کریں۔ دیکھیں کہ گرمی کی شدت کیا تماشا کر رہی ہے اور بارش کے لئے نماز استسقاء قائم کریں۔ قاضی عبدالحکیمؒ نے کہا کہ ان لوگوں کو چاہئے کہ وہ کتوں سے دعا کی درخواست کریں۔ وہ سات افراد یہ سن کر بڑے برافروختہ ہوئے اور اٹھ کر باہر نکل گئے مگر فوراً ایک واپس اندر آیا اور قاضی صاحب پر چوٹ کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ہمیں تو کتوں کی بولی آتی ہی نہیں ہاں جناب ہی کتوں کی زبان سمجھتے ہوں گے لہٰذا آپ ہی کتوں سے دعا کی درخواست ان کی بولی میں کر دیجئے گا۔ قاضی صاحب نے جواباً کہا کہ اگر سات حضرات کتوں کو دعا مانگتے سننا چاہیں تو اگلے روز صبح آ کر دیکھ لیں۔ وہ سات افراد اسے مجذوب کی بڑ قرار دیتے ہوئے ٹھٹا کرتے چلے گئے۔

اب قاضی صاحب نے خانقاہ کے ناظم کو حکم دیا کہ راتوں رات بہت سا حلوہ تیار کر لیا جائے اور ڈھاک کے پتوں کے دو تین سو پیالے سے بھی منگائے جائیں کیونکہ اگلے روز صبح کتوں نے آنا ہے۔ خانقاہ کے سب لوگ ساری رات حیرت اور پریشانی کے عالم میں حلوہ پکاتے رہے۔ صبح ہوئی تو یہ قصہ پورے قصبے میں مشہور ہو چکا تھا اور لوگ دور دور سے آ رہے تھے۔ ہر طرف ایک عجیب سا سکوت تھا۔ دیکھیں کیا ظہور میں آتا ہے۔ خدمت گار گلی کی صفائی سے فارغ ہو چکے تھے اور اب حلوہ ڈھاک کے پیالوں میں ڈال کر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھتے جا رہے تھے۔

اس کام سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہجوم میں سراسیمگی پھیل گئی کوئی انہونی بات ہو رہی تھی۔ لوگ استعجاب کے عالم میں ایک جانب دیکھنے لگے۔ خانقاہ کے آس پاس پھرنے اور بچا کھچا کھانا کھانے والا سیاہ کتا "کالو" سامنے سے چلا آ رہا تھا اس کے پیچھے کتوں کی ایک طویل قطار تھی ان سب کے سر جھکے ہوئے تھے اور یہ بالکل چپ تھے۔ بزرگ نے ہجوم کی جانب سے کسی بھگدڑ کے پیش نظر پہلے ہی ہاتھ اٹھا کر پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ کالو سیدھا قاضی صاحب کے پیروں میں آ کھڑا ہوا جیسے حکم کا غلام ہو۔ بزرگ نے بلند آواز سے کہا کہ کتے حلوہ کھالیں اور پھر خدا سے التجا کریں کہ وہ مخلوق پر رحم فرماتے ہوئے بارش برسائے۔ یہ کہہ کر بزرگ تو پیچھے ہٹ گئے لیکن لوگوں نے ایک عجیب منظر دیکھا سارے کتے چپ چاپ تین تین کے گروپوں میں تقسیم ہو گئے اور بغیر کسی "کتاپن" کے مظاہرے کے خاموشی سے حلوہ کھانے لگے۔ گزشتہ روز آنے والے سات افراد بھی ایک جانب کھڑے تھے اور ان کے حواس رخصت تھے۔

کتے حلوہ کھا چکے تو بزرگ نے پھر کہا کہ اب کتے خدا سے ابر رحمت کی التجا کریں۔ سب کتوں نے منہ اوپر آسمان کی طرف کر کے بھیانک آواز ہو ہو کر رونا شروع کر دیا۔ اس آواز بلند اجتماعی غراہٹ سے لوگوں کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ پھر وہ پہلے کی طرح کالو کی نگرانی میں قطار بنا کر ایک جانب چلے گئے۔ ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اب بزرگ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو سارے مجمع کے ہاتھ بھی بلند ہو گئے اور ہر کوئی صدق دل سے بارش کی دعا کرنے لگا چند لمحے ہی گزرے ہوں گے کہ ایک جانب سے سیاہ گھٹائیں تیزی سے علاقے پر چھا گئیں اور تیز بارش شروع ہو گئی۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ راسخ العقیدہ نیک لوگوں کی لاشیں زمین کے اثرات سے محفوظ رہتی ہیں ان کا جسم گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے اور زمانے کی گردش بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ سائنسی بنیادوں پر یہ عقیدہ خواہ کتنا ہی بودا کیوں نہ ہو تاہم اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ تاریخی طور پر اس بات کا ریکارڈ موجود ہے کہ پرانے وقتوں سے دبی ہوئی بعض لاشیں بعض اوقات دانستہ یا نادانستہ طور پر کھدائی کے دوران اس حالت میں پائی گئیں کہ گویا ابھی ابھی دفن کی گئی ہیں۔ ان لاشوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ حیران کن بات یہی ہوتی ہے کہ انہیں کسی قسم کا مسالہ نہیں لگایا گیا ہوتا لیکن پھر بھی جسم محفوظ ہوتا ہے۔ یہودیوں کو اس بات کا علم تھا چنانچہ ایک سازش کے تحت انہوں نے نبی اکرمؐ کا جسد مبارک چرانے کی سازش کی تھی۔

ایک واقعہ شیخ صدوق کا ہے جو ۳۸۱ھ میں دفن ہوا۔ ۹ سو برس بعد اس کی خستہ قبر کی تجدید کے لئے کام شروع ہوا تو یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ اس کا بدن بالکل درست حالت میں تھا۔ یہ ۱۲۸۱ھ کا واقعہ ہے۔

اس سلسلے میں غالباً سب سے مشہور واقعہ بیسویں صدی میں پیش آیا ہے۔ یہ دو اصحاب رسولؐ کے جسد مبارک ظاہر ہونے کا واقعہ ہے۔ ایک تھے حذیفہ بن الیمانؓ جنہوں نے احد میں عورتوں کی حفاظت کے فرائض سنبھالے تھے۔ دوسرے جابر بن عبداللہؓ جو بیعت رضوان اور حجۃ الوداع میں موجود تھے۔ تاریخ میں ان دونوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بغداد سے تقریباً ۴۱ میل دور مشہور دریا دجلہ کے بائیں جانب سلمان پارک میں ان دو اصحاب کے مزارات تھے کچھ پرے حضرت سلمان فارسیؓ مشہور صحابی کا روضہ بھی ہے۔ یہ علاقہ مدائن کے نام سے مشہور رہا ہے۔

چودھویں صدی ہجری میں عراق کے شاہ فیصل اول نے ایک رات خواب میں حذیفہؓ کو دیکھا جنہوں نے کہا کہ ان کی قبر نمی سے خراب ہو رہی ہے لہٰذا

انہیں دجلہ کے پانی سے اور زیادہ فاصلے پر دفن کیا جائے۔ شاہ صبح خواب بھول گیا۔ اگلی رات پھر یہی خواب دہرایا گیا۔ لیکن شاہ مصروفیت کی بناء پر یاد نہ رکھ سکا۔ چنانچہ تیسری رات مفتی اعظم عراق کو خواب آیا اور بتایا گیا کہ بادشاہ کو دو مرتبہ کہا گیا ہے مگر وہ بھول جاتا ہے۔ مفتی اعظم نے فوری طور پر وزیر اعظم نوری السعید پاشا سے رابطہ قائم کیا اور وہ دونوں بادشاہ کے پاس چلے آئے اور اس نے خواب کی تصدیق کی لیکن شک کو مزید رفع کرنے کے لئے محکمہ تعمیرات کو حکم دیا کہ مزاروں کے قریب سے زمین کھود کر نمی کی صورت حال کا اندازہ لگایا جائے۔ چنانچہ مزارات اور دریا کے درمیان مزاروں سے ۲۰ فٹ دوری پر بورنگ کی جانے لگی لیکن رپورٹ یہی ملی کہ اندر مٹی خشک ہے۔ اسی رات صحابیؓ پھر شاہ کے خواب میں آئے اور ارشاد دہرایا۔ لیکن بادشاہ نے بورنگ کی رپورٹ دیکھ کر اسے وہم سمجھا۔ اب حذیفہ صحابیؓ دوبارہ مفتی اعظم کے خواب میں آئے اور اسے سختی سے کہا کہ ان کے مزاروں پر پانی داخل ہو رہا ہے۔ مفتی صبح بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور خواب کی بابت بتایا۔ آخر کار شاہ بورنگ کی رپورٹ نظر انداز کرنے پر مجبور ہو گیا اور مفتی سے قبر کھولنے کا فتویٰ لے کر فرمان جاری کر دیا کہ عیدالاضحیٰ کی دوپہر نماز کے بعد مزارات کھول دیئے جائیں لیکن جیسے ہی یہ خبر اخبارات اور دیگر ذرائع کے ذریعے مشہور ہوئی، دنیا بھر سے خطوط اور تار کا تانتا بندھ گیا کہ اس میں ذرا تاخیر کی جائے تاکہ خواہش مند لوگ دور دراز سے آکر اس اہم موقع پر موجود ہوں اور جنازوں میں شریک ہو سکیں۔ اس بھرپور اصرار پر شاہ نے مقررہ تاریخ سے ۱۰ روز بعد مزار کھولنے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی دریا اور مزاروں کے درمیان ایک لمبی اور گہری خندق کھدوا کر اس میں سیمنٹ اور بجری بھروا دی تاکہ اگر پانی واقعی رس رہا ہے تو اس طریقے سے کچھ دیر کے لئے رک جائے۔

سلمان پارک میں مقررہ روز دنیا بھر سے ۵ لاکھ افراد آن کر جمع ہو گئے۔ سرکاری پیمانے پر غیر ممالک سے علما اور دیگر وفود بھی آئے ہوئے تھے۔ عراق کی انتظامیہ کے اہم ترین افراد کی موجودگی میں مزارات کھول دیئے گئے۔

توقع کے عین مطابق حضرت حذیفہؓ کے روضہ میں پانی آچکا تھا اور حضرت جابرؓ کے مزار میں نمی کے اثرات ہویدا تھے۔ ایک کرین کے ذریعے جسد مبارک نکال لئے گئے اور انہیں سٹریچر کے ذریعے اسلامی ممالک کے بڑے نمائندوں نے مل کر شیشے کے بکسوں میں رکھ دیا پھر چہروں سے کفن ہٹا دیا گیا۔ پانچ لاکھ نفوس جرمن فلم ساز کمپنی کی نصب کردہ پانچ بڑی سکرینوں پر یہ کاروائی دم سادھے دیکھتے رہے۔ حیران کن بات یہ تھی کہ جسد مبارک کے کفن تک صحیح سلامت تھے۔ دونوں صحابیوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان کی چمک اس قدر تھی کہ کوئی دیکھ نہ پاتا تھا۔ یہ پراسرار چمک دیکھ کر خبروں کے مطابق ایک جرمن ماہر چشم اس لمحے مفتی اعظم کے ہاتھ ایمان لے آیا۔ ایک جلوس کی صورت میں یہ مبارک جسد لے جاکر نئے مزاروں میں منتقل کر دیئے اور اس واقعے کی فلمیں بنالی گئیں۔ بے اندازہ لوگوں نے اسلام قبول کیا یہ حیرت ناک معمہ اپنی جگہ سائنس کے لئے چیلنج بنا ہوا ہے اور بلاشبہ بیسویں صدی کے حیرت انگیز واقعہ میں سے ایک ہے۔ یاد رہے صحابی حذیفہؓ نے ۳۸ھ میں وفات پائی تھی اور جابرؓ کا انتقال ۷۴ھ کے قریب ہوا اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری میں ان کا دوبارہ دیدار تیرہ سو برس بعد ہوا۔[17]

کیا اس واقعے کے پیچھے یہ حقیقت کارفرما ہے کہ محض صحیح العقیدہ اور نیک کار ہونے کی بناء پر یہ جسد خراب ہونے سے بچ گئے؟

مدینہ اور مکہ کے قبرستانوں میں لحد کے تیاری کے دوران کئی مرتبہ اصحاب نبویؐ اور دیگر تابعین کے جسد محفوظ حالت میں ملے ہیں لیکن اس سے محض یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ صالح فطرت، نیکوکار اور مخلص العمل ہونے کا نتیجہ لاش کی حفاظت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ یہ امر صرف مسلم حضرات سے مخصوص نہیں، ابراہام لنکن، نپولین بوناپارٹ اور بدنام زمانہ شاعر لارڈ بائرن کی لاشیں اسی حقیقت کا ثبوت ہیں۔ جنہیں دفن کرنے کے بعد ایک طویل عرصہ گزرنے پر جب دوبارہ کھولا گیا تو وہ حیران کن حد تک محفوظ تھیں۔ (دیکھئے "غیر حنوط شدہ محفوظ لاشیں")

عیسائی دنیا میں بھی محفوظ لاشوں کی دریافت غیر معمولی طور پر ہوتی آرہی ہے۔ فرانس میں ۱۸۷۶ء میں ایک راہبہ کیتھرین کی لاش کو تین تہوں والے کفن میں لپیٹ کر ایک عبادت گاہ کے قریب دفنایا گیا۔ ۵۶ سال بعد ۲۱ر مارچ ۱۹۳۳ء کو جب لاش نکالی گئی تو خاتون کا جسم صحیح سالم تھا اور اس کی تازگی برقرار تھی۔ کارڈینل سنسٹر اطالوی آمر مسولینی کا دوست تھا اور ۱۹۵۴ء میں مرا تھا اس کی لاش بھی کافی عرصہ پہلے عمدہ حالت میں دستیاب ہوئی تھی۔ تبت سے تعلق رکھنے والے بدھ مذہبی راہنما تسانگ خاپا کا انتقال ۱۴۱۹ء میں ہوا تھا اس کی لاش کا معائنہ چینی کمیونسٹوں نے کیا تو بیان کیا کہ اس کی بدن میں اب بھی حرارت کا احساس ہوتا ہے۔[18]

جنوبی ہندوستان میں ایک تہوار منایا جاتا ہے جسے تھائی پوسام کہتے ہیں۔ مقررہ روز خاص ذات کے ہندو بہت بڑی تعداد میں سورج ڈوبنے کے بعد ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اب یہ لوگ ایک دوسرے کی زبانوں، گالوں اور بدن کے دیگر حصوں میں فولادی سلائیاں گوشت کے آر پار کر دیتے ہیں۔ لیکن خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہتا۔ اس حالت میں ۱۶، ۱۶ دن تک اچھلتے کودتے اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ آخری روز تہوار کے خاتمے کے موقعہ جونہی کسی فرد کے بدن سے ساری سلائیاں نکالی جاتی ہیں وہ یکدم نڈھال ہو جاتا ہے اور سولہ روز کی تھکاوٹ اس پر غالب آجاتی ہے۔ غیر مقامی لوگ مقامی لوگوں کے بدنوں میں چبھے ہوئے سوئے اور چھدی ہوئیں زبانیں دیکھ کر سخت متحیر ہوتے ہیں کہ انہیں تکلیف کا ذرہ بھر احساس نہیں۔

استنبول (ترکی) میں مسلم درویش بعض تقاریب کے دوران بڑا خطرناک کام کرتے ہیں۔ ایک روسی صوفی بے نیٹ نے اس کا آنکھوں دیکھا حال یوں بیان کیا ہے کہ درویش اللہ اللہ پکار کر تیزی سے جھومنے لگے یہ لوگ گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے۔ پھر وہ لمحہ آیا کہ خود رفتگی عروج پر پہنچ گئی تب انہوں نے اپنے گالوں اور بازوؤں میں سوئیاں اور پتلی سلاخیں پرو دیں۔ ایک بوڑھا زمین پر لیٹ گیا اور اس نے ایک تیز تلوار اپنے پیٹ پر اس طرح رکھی کہ اس کی دھار کا رخ اس کے بدن کی طرف تھا۔ پھر ایک نوجوان اس تلوار پر کھڑا ہو گیا اور دو آدمیوں نے نوجوان کو کھڑا رہنے میں سہارا دیا۔ نوجوان تلوار سے اترا تو بوڑھے نے اٹھ کر اپنا پیٹ دکھایا۔ وہاں خراش تک نہیں آئی تھی۔ بے نیٹ نے تلوار دیکھی وہ بڑی تیز تھی اور اس پر خون کا ایک قطرہ نہ تھا۔

مسلمانوں کا ایک فرقہ ایک خاص تقریب میں جو ۹ یا ۱۰ محرم کو منائی جاتی ہے دہکتے انگاروں پر کھڑا ہو کر سینہ کوبی کرتا ہے مگر کے پیروں اور تلوؤں میں کوئی

آبلہ نہیں پڑتا۔ اسی طرح ہانگ کانگ کے بعض مذہبی تہواروں میں لوگ کڑکتے ہوئے تیل کو چہرے، پشت اور سینے پر انڈیل لیتے ہیں مگر اف نہیں کرتے۔

ہندوؤں کے ہاں گنگا ایک مقدس دریا ہے۔ جس کا پانی پوتر (پاک) مانا جاتا ہے۔ ہندو اپنے مردوں کا کریا کرم کر کے لاش کی راکھ اسی دریا میں بہاتے ہیں۔ بسا اوقات ادھ جلی لاشیں پھینک دی جاتی ہیں جنہیں گدھ نوچتے پھرتے ہیں۔ اس عمل سے اس دریا کا پانی بیشتر مقامات پر سخت گدلا ہو چکا ہے اور طبی اعتبار سے اس کا پینا زہر کے مترادف ہے۔ خاص مواقع پر ہندوستان بھر سے لوگ گنگا اشنان کرنے کے لئے آتے ہیں اور اس "پوتر" پانی کے غرارے کرنے کے ساتھ ساتھ کئی گھونٹ چڑھا جاتے ہیں لیکن بیمار نہیں ہوتے۔ ادھر سر رچرڈ برٹن کو اس بات پر حیرت تھی کہ آب زم زم جیسا معدنی پانی پی کر مسلمان بیمار کیوں نہیں ہوتے۔

بیسویں صدی کا سب سے زیادہ مشہور صاحب کرامت "پٹاپرتی" کا سائیں بابا ہے۔ یہ شخص عام یوگیوں سے مختلف وجوہات کی بناء پر زیادہ شہرت رکھتا ہے۔ اول یہ کہ اگر فرمائش کی جائے تو بھی کرامت دکھانے سے انکار نہیں کرتا۔ دوسرے یہ کہ اس قدر بااخلاق اور بذلہ سنج ہے کہ جو لوگ اس کی کرامتوں کو ڈھونگ اور ہاتھ کی صفائی خیال کرتے ہیں ان کی فرمائش پر بھی کرامتیں دکھانے سے اعراض نہیں کرتا۔ پھر اس کی کرامتوں کے ہزاروں افراد گواہ ہیں جن میں ایسے معتبر اور محترم لوگ بھی شامل ہیں جو توہم پرست نہیں ہیں اور سائنسی، منطقی مزاج رکھنے کے باوجود بابا کی کرامتوں کی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں۔ حالانکہ وہ ایسی معائنہ ٹیموں کی شکل میں بابا کے مظاہرے دیکھ چکے ہیں جو خصوصی طور پر "پٹاپرتی" بھیجی گئیں۔ بابا کے کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن اس کا سب سے بڑا ریکارڈ ایک نوجوان کے لاشے کو زندہ کر دکھانا ہے اور یہ واقعہ سائنس دانوں کی بھرپور توجہ کے دوران پیش آیا۔ بابا کے آشرم سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کہنا ہے کہ بابا نے کئی مرتبہ مردوں کو زندہ کیا ہے اور اس بنیاد پر وہ اوتار ہونے کا مدعی ہے۔ کیونکہ عام چھوٹے موٹے کارنامے جن پر دوسرے یوگی بہت اکڑتے ہیں بابا کے نزدیک بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔

تسمانیہ کے ایک صحافی ہارولڈ مرفٹ نے کتاب "سائیں بابا صاحب کرامت ہستی" میں بابا کے کارنامے بیان کرتے ہوئے اسے ایک زبردست روحانی معالج قرار دیا ہے۔ جس نے اس کی نظروں کے سامنے ایک مریض کے کینسر کا تدارک کر دکھایا۔ لیکن یہ بابا کے عام معمولات میں شامل ہے۔

بابا اپنے ملاقاتیوں پر روحانیت کا رعب نہیں جھاڑتا اور نہ ہی عام صوفیوں کی طرح سنجیدہ اور ماتھے پر شکنیں چڑھائے بیٹھا رہتا ہے۔ بلکہ ہلکا پھلکا مذاق کرتا رہتا ہے اور ملنے والوں کو نامعلوم طریقے سے مٹھی بھر مقدس راکھ بھی دیتا رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو اپنی ایسی تصویریں بھی دیتا ہے جو ہر سال پراسرار طریقے پر مقدس راکھ چھڑکاتی ہیں۔

متعلقہ موضوعات

آتش قدمی

# طوفان نوحؑ

مذہبی صحیفوں اور مقدس تحریروں میں ایسے حالات کا پتہ چلتا ہے کہ جب کسی معبود نے ناراض ہو کر انسانوں کو گناہوں کی سزا دینے کے لئے پانی کا عظیم ریلا بھیجا۔ اہل کتاب کی روایات کے مطابق نوحؑ نامی پیغمبر کے عہد میں ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا تھا قرآن مجید میں اعراف، ہود، مومنون، شعراء، قمر اور نوح نامی سورتوں میں اس واقعے کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ ادھر پیدائش ۶: ۵۔۲۲، ۷: ۱۔۲۴، اور ۸: ۱۔۲۲ میں بھی اس کی تفاصیل رقم ہیں۔ واقعہ یہ بیان ہوا کہ نوحؑ پیغمبر کے آنے پر دنیا میں گناہ بہت پھیل چکے تھے۔ اور باوجود سخت تبلیغ کے لوگ اپنی بے راہروی سے باز نہ آئے تو خدا نے پیغمبر کی دعا قبول کرتے ہوئے سرکشوں کو پانی کے ذریعے تباہ کرنے کی سزا کا اعلان کر دیا۔ پیغمبر ان کے ساتھی اور حیوانات کے جوڑے ایک کشتی میں سوار ہوئے اور پھر خدا کے حکم سے چشمے ابل پڑے اور آسمان سے بارش برسنے لگی۔ ۴۰ دن ۴۰ رات مسلسل۔ سب کچھ غرق ہو گیا سوائے کشتی نوحؑ اور اس کے سواروں کے۔ بائبل کے مطابق ۱۵۰ دن تک زمین زیر آب رہی اور ۷ ماہ بعد کشتی ارارات پر جا ٹھہری اور پھر کافی عرصہ بعد پرندہ اڑا کر خشکی کی تلاش کی گئی اور آخر کار سب کشتی سے باہر آ گئے۔

اس طوفان کے بارے میں دو متضاد آراء ملتی ہیں۔ پہلی یہ کہ یہ طوفان پورے کرہ ارض پر محیط نہ تھا بلکہ اندازاً ایک لاکھ چالیس ہزار مربع کلو میٹر تک کے علاقے تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسا کہ بعض علمائے مذاہب اور فلکیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ ایسے طوفان کے آثار دور کے علاقوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ مزید یہ کہ اس دور کی قلیل انسانی آبادی زیادہ بکھری ہوئی نہ ہو گی۔

دوسری رائے رکھنے والے ماہرین علوم ارضی اور مذاہب اس خیال کے حامل ہیں کہ طوفان نوحؑ کرہ ارض پر محیط تھا اور کل جانداروں کی تباہی کا سبب بنا تھا ایک اور رائے ہے کہ ایسے متعدد طوفان آئے ہیں کیونکہ بعض بلند پہاڑوں پر آبی حیوانات کے ناقابل تردید آثار نظر آئے ہیں اور سوال سامنے آتا ہے کہ صرف پانی میں زندہ رہ سکنے والی مخلوق اتنے بلند پہاڑوں پر کیونکہ پہنچی اس کے علاوہ بعض جگہوں سے ملنے والے ایسے پتھر جن کے ہم جنس آس پاس نظر نہیں آتے کسی سیلاب کے ساتھ بہہ کر آنے کی گواہی دیتے ہیں۔

تباہ کن سیلاب کی دیگر روایات حیرت انگیز طور پر بیشتر مذاہب میں ملتی ہیں۔ جیسے ہندو مذہب کی قدیم کتب میں اس کا تذکرہ طوفان منو کے حوالے سے ملتا ہے۔ چینی روایات میں ہے کہ یاہو نامی قبل از تاریخ کے ایک شہنشاہ کے عہد میں اتنا بڑا طوفان آیا تھا کہ پہاڑ اور صحرا زیر آب آ گئے اور یاہو کے بیٹے نے اپنے باپ کی نو برس لاحاصل کوششوں کے بعد ملک سے پانی نکالنے کا کام مکمل کیا[19]

اوکلاہاما کے ریڈ انڈین بتاتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمین پر سخت تاریکی چھا گئی کیونکہ سمندر کی اونچی اونچی موجوں نے روشنی کو روک دیا تھا۔ پانی کی ایسی ہی اونچی دیواروں کا تذکرہ ہدرش (عہد نامہ قدیم کی عبرانی تفسیر) میں درج ہے کہ بحیرۂ قلزم کا پانی بنی اسرائیل کی راہ گزر کے دونوں جانب سولہ سو میل اونچی دیوار بنا کر کھڑا ہو گیا تھا۔

پیرو کی روایات میں بھی ایک واقعہ کا ذکر ہے جب سمندری لہریں خشکی پر چڑھ دوڑی تھیں اور تباہی مچا دی تھی۔ یونانی تاریخ میں بھی دو عظیم سیلابوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں سے ایک ساری دنیا پر اور دوسرا ایک ہی مقام تک محدود تھا۔ ایک سیلاب کو گیگس کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے کو ڈیکالین کا لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ بڑا طوفان گیگس تھا یا ڈیکالین۔ البتہ ڈیکالین کے بارے میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہی نام ایک یونانی دیوتا کا بھی تھا۔ دیومالا میں اس کا قصہ نوحؑ کے قصے سے مشابہ ہے کیونکہ ڈیکالین نے بھی سیلاب عظیم آنے پر ایک کشتی بنائی تھی اور اس میں بیوی کے ہمراہ سوار ہو کر بچ نکلا تھا۔

۱۸۴۱ء میں نینوا کی کھدائی کے دوران آسٹن لیئرڈ نامی شخص کو مٹی کی تختیاں ملیں۔ جنہیں بہت عرصہ بعد عکادی زبان سمجھنے والے ایک انگریز جارج اسمتھ نے پڑھا۔ ایک دن اس نے ایک ٹوٹی ہوئی تختی کے تیسرے کالم میں پڑھا کہ وہاں کسی جہاز کے کوہ نذیر پر رکنے اور فاختہ اڑانے کا قصہ درج ہے۔ اسمتھ کے مطابق "مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے حضرت نوحؑ کے سیلاب کے کلدانی تذکرے کا کم از کم ایک ٹکڑا پا لیا ہے۔"

بعد ازاں ۱۸۷۲ء میں اسمتھ نے نینوا جا کر تختی کے باقی اجزاء حاصل کیے۔ معلوم ہوا ہے کہ عراق کے قدیم مورخوں نے ملک کی تاریخ کے دو ادوار مقرر کیے ہیں ایک سیلاب عظیم سے پہلے اور دوسرا اس کے بعد کا دور۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہی سیلاب عظیم ہے جس کا تذکرہ سامی مذاہب میں منتقل ہو کر

طوفان نوحؑ بن گیا۔ کیونکہ اسمتھ کی بارہ لوحوں میں درج شدہ دیومالائی قصے کے ہیرو اور نوحؑ میں کافی باتیں مشترک ہیں دونوں قصوں میں دنیا کی غرقابی معبودوں کی برہمی کا نتیجہ ہے۔ دونوں کے مرکزی کردار طوفان کے بارے میں پہلے سے خبردار ہوتے ہیں کیونکہ دونوں کو معبود پہلے سے بتا دیتے ہیں اور یہ دونوں کشتی بنانے کا حکم پاتے اور کشتی بناتے ہیں دیومالائی قصے کا ہیرو تمام جانداروں کے تخم کشتی میں رکھ لیتا ہے اور نوحؑ کو جانداروں کے جوڑے رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ طوفان تھمنے پر دیومالائی ہیرو کی کشتی کوہ نصیر (عراق کی شمالی سرحد) پر ٹھہرتی ہے۔ اور نوحؑ کی کشتی بھی ایک پہاڑ جودی (عراق کی شمالی سرحد) پر جا ٹھہرتی ہے۔ دونوں افراد خشکی کا پتہ لگانے کے لئے پرندے بھیجتے ہیں۔

سبط حسن لکھتے ہیں "مگر سوال یہ ہے کہ گل گامش (دیومالائی کردار) کی داستان میں جس سیلاب کا ذکر کیا گیا ہے اس کی کوئی تاریخی حیثیت بھی ہے یا وہ فقط ایک فرضی قصہ تھا۔"

تحقیق اور تلاش کا کام جاری رہا۔ چنانچہ سرلیونارڈ وولی نے "ار" کے شاہی مقبروں کی کھدائی سے فارغ ہو کر ۱۹۲۹ء میں سیلاب نوحؑ کی تہہ تک پہنچنے کا بیڑا اٹھایا "قبرستان کے ساتھ ۷۵ فٹ لمبا ۶۰ فٹ چوڑا اور ۶۵ فٹ گہرا گڑھا کھودا گیا۔ ۲۰ فٹ کی گہرائی تک پرانے گھروں کی آٹھ تہیں ملیں ۱۸ فٹ تک مٹی کے ٹوٹے برتنوں کا ڈھیر ملا گویا وہاں کبھی کمہاروں کی بھٹی تھی۔ مزید گہرائی میں جا کر یہ برتنوں کا سلسلہ ختم ہوا اور پھر سیلاب کی لائی ہوئی گاد کی ۱۱ فٹ موٹی تہہ ملی جس کے نیچے انسانی آبادی کے آثار نظر آئے سرلیونارڈ کا خیال تھا کہ ۱۱ فٹ موٹی تہہ کا مطلب یہ ہوا کہ پانی کم از کم ۲۵ فٹ اونچا ضرور ہو گا جس سے عراق کے نشیب میں تین سو میل لمبا، ایک سو میل چوڑا علاقہ غرقاب ہو گیا ہو گا۔ لہٰذا کتاب پیدائش کا یہ دعویٰ کہ سیلاب کا پانی ۹۶ فٹ بلند تھا غالباً درست ہے مگر یہ کوئی عالمگیر سیلاب نہ تھا البتہ اتنا بڑا ضرور تھا جس نے دجلہ و فرات کی وادی غرقاب کر دی ہو۔ جو لوگ اس وادی میں بستے تھے ان کے لئے ساری دنیا تو یہی تھی۔" (ماضی کے مزار)۔

لیکن معترضین کا کہنا تھا کہ ۲۵ فٹ بلند سیلاب نے ار کے آس پاس کے علاقوں کو بھی غرق کر دینا تھا لیکن وہاں کی کھدائی سے اس کا ثبوت نہیں ملا پھر ار میں گاد کی تہہ کی دبازت مختلف مقامات پر مختلف ہے صرف قبرستان کی حد تک ۱۱ فٹ موٹی تہہ کے ملنے کو پورے علاقے پر چھا جانے والے ۲۵ فٹ بلند طوفان کی دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سبط حسن کہتے ہیں "عجیب بات ہے کہ ہندوستان میکسیکو اور دوسری پرانی تہذیبوں کی اساطیری داستانوں میں بھی سیلاب عظیم کی روایات ملتی ہیں قیاس کہتا ہے کہ ہو نہ ہو سیلاب کا یہ تصور برفانی دور میں پیدا ہوا۔ جب منطقہ حارہ میں برفانی چشمے کبھی آگے بڑھتے کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور موسلا دھار بارشیں ہوتی تھی اور دریا ابل کر سمندر بن جاتے تھے"۔

قدیم ہندوستان کی روایات مہابھارت میں ہے کہ رشی منو طوفان میں بچ نکلا تھا اسے برہما نے مچھلی کے روپ میں آ کر طوفان سے پہلے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسی طرح امریکہ کے انڈینیز میں بھی روایات ملتی ہیں۔ ناروے کے قریب لیپ لینڈ میں مشہور ہے کہ جبمل جو مالک کائنات ہے نے ایک مرتبہ لوگوں کے گناہوں سے تنگ آ کر کہا تھا کہ وہ پانی کی بلند دیوار خشکی پر پھینک مارے گا اور لوگوں کو برباد کر دے گا۔

عظیم سیلاب کیونکر آتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ چاند کی کشش (مدوجزر کے نتیجے میں) یا دمدار ستارے کی کشش سے پیدا ہو سکتے ہیں جیسے کہ تبت کی تاریخ میں ہے کہ ایک مرتبہ دمدار ستارے کے زمین کے قریب سے گزرنے کے سبب سمندر کی اتنی اونچی لہریں اٹھی تھیں کہ تبت کا پلیٹو ڈوب گیا تھا۔ لے لینڈ کے مطابق اگر کسی دمدار ستارے کا سرزمین کے سائز کا ہو اور وہ ۱۳۲۹۰ میل دوری سے گزرے تو سمندر سے تیرہ ہزار فٹ (چار کلو میٹر) لہریں اٹھیں ں۔ کیا طوفان نوح بھی کسی ایسے ہی ستارے کے سبب ظاہر ہوا؟

## کشتی نوحؑ

طوفان کے آنے سے قبل خدا نے نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا (سورۃ ہود ۳۷)۔ اس کشتی کو مسلمان کشتی نوحؑ اور عیسائی آرک کا نام دیتے ہیں

جب کہ مصریوں نے اسے محل کا نام دیا لیکن وہاں اس کی ساخت لکڑی کے ایک بڑے تیرتے ہوئے مکان کی سی تھی۔ ادھر ریڈ انڈین اسے صنوبر کا درخت قرار دیتے ہیں جسے "نتا" نے طوفان سے پہلے اپنے اور اپنی بیوی "نینا" کے لئے کھوکھلا کر لیا تھا۔

ایک روایت کہتی ہے کہ کشتی نوحؑ کی لمبائی ۴۵۰ فٹ، چوڑائی ۷۵ فٹ اور بلندی ۴۵ فٹ تھی۔ جب کہ دوسری روایت کے مطابق اس تین منزلہ کشتی کی لمبائی ۵۴۷ فٹ، چوڑائی ۹۱ فٹ اور بلندی ۴۷ فٹ تھی۔ قرآن مجید کے مطابق نوحؑ کی عمر اس وقت ساڑھے نو سو برس تھی۔ بیضاوی کا کہنا ہے کہ کشتی کی تعمیر میں دو سال کی مدت صرف ہوئی جب کہ ڈاکٹر بلیکی کے مطابق پوری ایک صدی کا عرصہ لگا۔

کشتی کی تعمیر مکمل ہونے پر نوحؑ نے چند ایمانداروں کو ساتھ لیا اور تمام پاک و ناپاک جانوروں کے جوڑے رکھ لئے اور روایت کے مطابق نر و مادہ الگ الگ رکھا۔

کسوی روایات کے مطابق ہیبسدار کو ہیا دیوتا نے اناج، اسباب، باندیاں اور حیوانات جمع کرنے کا حکم دیا تھا جب کہ آریائی روایات کا دیو کلیان جب خاندان کے ہمراہ صندوق میں سوار ہوا تو کل حیوانات دوڑتے آئے اور اس میں سوار ہو گئے تھے۔ ادھر ریڈ انڈین روایات کے مطابق ٹسلا ن دیوتا نے نتا کو صرف ایک ہمنٹہ مکئی کا اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی۔ (بحوالہ اسلامی انسائیکلوپیڈیا)۔

طوفان ختم ہونے پر کشتی کہاں گئی؟ یونانی دیو مالا کے مطابق زیوس دیوتا کے کہنے پر ہرمس نے شاہ بلوط کا جو جہاز بنوایا تھا وہ پارناسس کی چوٹیوں پر طوفان کے بعد جا لگا تھا۔

مہابھارت کے مطابق رشی منو کی کشتی ہماوت کی چوٹی پر جا رکی تھی۔ جب کہ آریاؤں کے دیو کلیان کا صندوق پارناسس پہاڑ پر ٹھہرا تھا۔ سمیریوں کے "جلیج موس" کی کشتی (جس کی چھ منزلیں، سات درجے اور ہر منزل کے نو حصے تھے) کوہ نصر پر جا لگی تھی۔

نوحؑ کی کشتی بائبل، کے مطابق ارارط پہاڑ پر رکی تھی جب کہ قرآن نے سورۃ ہود میں اس پہاڑ کو جودی کا نام دیا ہے۔ بعض کے نزدیک جودی اور ارارط ایک ہی پہاڑ کے نام ہیں یہ پہاڑ ترکی، آرمی نیا اور ایران کی سرحدوں کے پاس واقع ہے جسے فارسی میں کوہ نوحؑ کہتے ہیں۔ آس پاس کے علاقے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کبھی زیر آب رہا ہے۔ پہلے اس پہاڑ کو اغری تاغ کہتے تھے۔ عبرانی میں اسے ارادہو یا اراتو کہتے تھے۔ جب کہ جبل قرداد اور جبل الحارث بھی اسی کے نام ہیں۔

گو "سینٹ جیکب" کے دیہاتیوں کا خیال ہے کہ اس پہاڑ پر چڑھنا نحوست کو دعوت دینا ہے تاہم اس بات پر بہت لوگ یقین رکھتے ہیں کہ اگر آج بھی ارارط کی جمی ہوئی برفانی چوٹی کو کھرچا جائے تو آرک کے اجزاء مل سکتے ہیں۔ کیونکہ سکندر اعظم کے عہد کے مورخ پروسس نے جودی پر کشتی کے آثار نظر آنے کے بارے میں لکھا ہے۔ ۱۸۲۹ء میں ستمبر کی ۲۷ تاریخ کو ایک جرمن پروفیسر پیرٹ نے چوٹی پر چڑھ کر دیکھا تو اسے قدیم منجمد برف کی گول چبوترے جیسی چوٹی نظر آئی۔ یہ پہلا آدمی تھا جو جودی پر چڑھا۔

۱۸۴۵ء میں جرمن پروفیسر ہرمن نے اسے سر کیا۔ ایک ہواباز نے کہا کہ اسے چوٹی میں سیاہ دھبہ دکھائی دیا ہے جو شاید کشتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں باقاعدہ ٹیم بنا کر یورپی لوگوں نے کشتی کی تلاش کا ارادہ کیا تاہم پاسپورٹ وغیرہ کی وجہ سے اجازت نہیں دی گئی۔

دوسری طرف بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اسرائیل کے شمال میں یا ترکی کے جنوبی علاقوں میں کہیں ایک منجمد جھیل ہے جس میں آدھی کشتی باہر اور آدھی اندر ہے اور جس سال برف کم پڑے تو دیکھی جا سکتی ہے اس کے لکڑی کے تختے ۱۰ انچ موٹے ہیں جب کہ بعض بعض جگہ موٹائی ڈیڑھ سے دو فٹ تک ہے اور کہیں کہیں سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ لیکن اس کی تصدیق نہیں ہو سکی۔

## تورات کا نادر نسخہ

گردش لیل و نہار کے نتیجے میں بعض اوقات نہایت نادر و نایاب اشیاء ہماری دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں جبکہ بعض اوقات زمانہ ایسے نوادرات انسانوں

کے سپرد کر دیتا ہے جو مختلف جہتوں سے بے انتہا اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں تورات کے ایک قدیم نسخے کا تذکرہ خاصا دلچسپ ہے۔

بحیرہ مردار کے مشرق میں پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جنہیں موآب کی پہاڑیاں کہا جاتا ہے اس علاقے سے انجیل اور تورات کے قدیم مخطوطے دستیاب ہوتے رہے ہیں۔ ۱۸۶۸ء میں یہاں سے دریافت ہونے والے مشہور پتھر "سنگ موآب" کی تحریر کی شہرت کے بعد سے یہ علاقہ خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا۔

یروشلم کا ایک شخص موسیٰ شاپیرا ایسے ہی نوادرات کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ بے چارا کاروبار کی نزاکت کا شکار ہو گیا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے جرمنی میں موآب کے علاقے کے قدیم برتن ایمانداری سے فروخت کیے تھے مگر ماہرین نے تجزیئے کے بعد انہیں جعلی قرار دے دیا اور یوں اس کی کاروباری ساکھ متاثر ہوئی اور اب وہ خاصا محتاط ہو گیا۔

۱۸۸۳ء میں وہ لندن کے ماہرین سے رائے لینے کے لئے ایک عجیب چیز لایا یہ بھیڑ کی کھال پر ایک قدیم تحریر تھی۔ شاپیرا کا بیان تھا اس نے یہ کھال ایک عرب سے حاصل کی تھی جس کا بیان تھا کہ اسے یہ موآب کی پہاڑیوں میں ایک غار سے دستیاب ہوئی تھی شاپیرا کا خیال تھا کہ یہ ۹۰۰ ق م دور کی تورات کا کوئی حصہ ہے اس دور میں تورات کا قدیم ترین معلومہ نسخہ بھی ۹۰۰ عیسوی سے تعلق رکھتا تھا۔ یوں بھیڑ کی یہ کھال ایک اہم نوادر کی حیثیت حاصل کر کے اچھی قیمت پا سکتی تھی۔

شاپیرا نے اسے برٹش میوزیم میں نمائش کے لئے رکھ دیا۔ جہاں ڈاکٹر کرسچن گنسز برگ اور کرنل کلاڈ کونڈر نامی ماہرین اس پر کام کرنے لگے لیکن شاپیرا کو ایک اور آفت کا علم ہی نہ ہو سکا۔

یہ کلرمنٹ کینو تھا وہ شخص جس نے سنگ موآب دریافت کیا، اسی شخص نے شاپیرا کے فروخت کردہ موآب کے برتنوں کو جعلی ثابت کیا تھی اور اب خفیہ طور پر کھال پر کام کر رہا تھا اس نے اس ٹکڑے کا کچھ دیر مشاہدہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ زیادہ سے زیادہ ۳۰۰ برس پرانا ہے۔ کرنل کونڈر نے کہا کہ یہ بعید از امکان ہے کہ اس نمدار غار میں کھال کا ٹکڑا تین ہزار سال سے پڑا ہوا ہو اور گل جانے سے محفوظ ہو۔ اس کے ساتھی گنسز برگ نے طرز تحریر پر گرفت کی۔ کھال پر ویسی ہی فونیشیاتی تحریر موجود تھی۔ جیسا کہ سنگ موآب پر دیکھی گئی تھی۔ ضرور کسی جعلساز نے سنگ موآب کی تحریر سے مدد لیتے ہوئے لکھا ہو گا۔

ادھر جب موسیٰ شاپیرا کو ان باتوں کا علم ہوا تو اس نے ہوٹل میں دلبرداشتہ ہو کر خودکشی کر لی اور اس کا قیمتی نادر کسی نوادرات کے شوقین کتب فروش نے محض ۱۰ پاؤنڈ میں لے لیا۔

۱۹۴۷ء میں فلسطین کا ایک گڈریا بحر مراد کے پاس بکریاں چرا رہا تھا۔ یہ موآب میں قمران کا علاقہ تھا اس کی ایک بکری کھو گئی اور وہ اسے تلاش کرتا ہوا ایک غار کے پاس جا پہنچا اس نے ایک پتھر اٹھایا اور وہ غار میں پھینک دیا کہ اگر بکری موجود ہو تو باہر نکل آئے۔ لیکن اندر سے برتن ٹوٹنے کی آواز آئی۔ وہ گھبرا کر گاؤں واپس بھاگ گیا اور کسی اور آدمی سے برتن ٹوٹنے کا قصہ بیان کیا۔ وہ اس گڈریئے کو لے کر غار تک آیا کہ شاید کوئی خزانہ مل جائے، مگر انہیں وہاں بڑے بڑے مرتبان نظر آتے ہیں جن میں کاغذوں کے طومار بھرے تھے وہ انہیں باہر نکال لائے اور ردی میں بیچ دیا[20]۔ ان طوماروں کو مختلف عجائب گھروں اور محققین نے خرید لیا اور یہ تمام عہد عتیق کے عبرانی نسخے ثابت ہوئے۔ یہ نسخے اندازاً دو ہزار برس سے ویسے ہی ماحول میں رکھتے تھے جیسے حالات میں شاہ پیرا کی قدیم کھال ملی تھی چونکہ یہ نسخے محفوظ رہے تھے لہٰذا شاپیرا کے نادر کا محفوظ رہ جانا شک سے بالا تھا کھال کے اس ٹکڑے کی تحریر ان نو دریافت شدہ طوماروں کی تحریروں سے مشابہ تھی۔

۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر جے ایل ٹیچر نے کہا کہ حقائق بتاتے ہیں کہ شاپیرا کا بیان درست تھا۔

۱۹۶۵ء میں مخطوطوں کے ایک محقق جان الیگرو نے اپنی تصنیف "شاپیرا افیئر" میں دوبارہ اس امر کی صداقت کا اظہار کیا۔ بے چارا موسیٰ شاپیرا بالکل درست کہتا تھا اس نے اپنی بے عزتی برداشت نہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو ختم کر ڈالا اور وہ مخطوطہ جس کی موجودہ قیمت (اگر دوبارہ مل جائے) ایک ملین پاؤنڈ ٹھہرتی ہے محض ۱۰ پاؤنڈ میں فروخت کر دیا گیا جو شاپیرا کی دانست میں تورات کا قدیم نسخہ تھا[21]

# یسوع مسیحؑ کا کفن

ایک ایسا تبرک جس نے ایک نئی سائنس کفنیات Sindonology کی بنیاد رکھی۔

مذہب عیسائیت پر بڑے عجیب و غریب ادوار گزرے ہیں جن کی وجہ سے اس کی تعلیمات میں بے پناہ تغیرات کے سبب ان گنت فرقے وجود میں آتے چلے گئے۔ ان اثر انداز ہونے والے عناصر میں سے ایک مقدس زیارتیں ہیں مقامات کی بھی اور اشیاء کی بھی۔

ایک زمانہ تک موخر الذکر تبرکات کی خرید و فروخت کا کاروبار بڑا منفعت بخش تھا۔ آپ ان چیزوں کے بارے میں پڑھ کر ہنس دیں گے۔ یہ تھیں کنواری مریم کا دودھ۔ نوح کی ڈاڑھی کا بال۔ جبرائیل کے پروں میں سے نکلے ہوئے اجزاء، کشتی نوح کے اجزاء اور من و سلویٰ کے یادگار حصے وغیرہ۔ اسی فہرست میں ایک نہایت اہم چیز مسیح کا کفن ہے۔

یوں تو تاریخی طور پر ایسے بہت سے کفنوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کے مالک دعویٰ کرتے تھے کہ یہ عیسیٰؑ کا ہے مگر سب سے زیادہ شہرت ٹیورن کے کفن کو حاصل ہے۔ یہ ایک سوا کہتر انچ لمبا پانی کے دھبوں کے نشانات لگا قدیم سوتی کپڑے کا ٹکڑا ہے۔ ساڑھے ترتالیس انچ اس کا عرض ہے۔ سب سے عجیب چیز سرخی مائل بھورے مٹے مٹے سے رنگوں میں ایک پراسرار انسانی خاکہ ہے جو اس کپڑے پر گویا چھپا ہوا ہے۔ یہ ایک داڑھی والے نیم برہنہ بوڑھے کی شبیہ ہے جس کے ہاتھوں نے کولہوں پر سے گزرتے ہوئے برہنگی کو چھپا رکھا ہے۔ کلائیوں اور پیروں پر سوراخ دار زخموں کے نشانات پتہ دے رہے ہیں کہ اس شخص کو صلیب دی گئی ہے۔ پورے کپڑے پر وہ جسموں کی شبیہ ہے ایک سامنے اور ایک پشت کی طرف سے گویا مصلوب پر کپڑا پیروں کی انگلیوں سے لے جا کر سر اور پشت پر سے گزار کر ایڑیوں تک لپیٹا گیا تھا۔ بہت سے عیسائیوں کے نزدیک یہ عیسیٰؑ کی شبیہ ہے اور یہ کپڑا ان پر صلیب دیئے جانے کے بعد لپیٹا گیا تھا۔

مروجہ عیسائی عقائد کے مطابق عیسیٰؑ کو جب صلیب دے دی گئی تو ارامتیہ کے شہر کا یوسف ان کا جسد لے گیا اور اسے چٹان کے گڑھے میں دفنا دیا، اگلے روز اسے اطلاع ملی کہ جسد مسیح قبر سے غائب ہے وہ دوستوں کے ساتھ اس طرف دوڑا اور قبر میں جھانکا اور (یوحنا ۲۰:۶) کے مطابق "شمعون بطرس اس کے پیچھے پیچھے پہنچا اور اس نے قبر کے اندر جا کر دیکھا کہ سوتی کپڑے پڑے ہیں"۔

عیسائی معتقدین میں یہ بات مشہور ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک یہ کفن یروشلم میں رکھا گیا پھر ۱۲۰۴ء میں اسے قسطنطنیہ لے جایا گیا جہاں صلیبی جنگوں کی تباہ کاریوں کے دوران یہ دیگر نادر تبرکات کے ہمراہ گم ہو گیا یہاں تک کی مبینہ روداد کی تصدیق نہیں ہو سکی تاہم اس کے بعد سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ مصدقہ ہے۔

مختلف کفنوں کے دعوے داروں میں سے سوائے کے نواب بھی تھے[22] جو بعد ازاں اٹلی کے بادشاہ ہوئے ان کی ملکیت میں وہی کفن تھا جس کی تفاصیل اوپر بیان ہوئی ہیں اور جو خاکے کی وجہ سے تمام مبینہ کفنوں میں ممتاز ہے۔ سوائے کے نوابوں کے ہاتھ یہ کفن کہاں سے لگا اس کا علم نہیں۔ ۱۳۵۳ء میں رابرٹ ڈی چرنے چیمبرے میں خصوصی طور پر ایک چرچ اس کفن کے رکھنے کے لئے تعمیر کیا۔ ۱۳۵۴ء میں جیوفرے اول نے ٹرائیز (فرانس) میں لائرے کی چرچ کو کفن پیش کر دیا (بعض تاریخ دانوں کے مطابق ۱۴۵۲ء میں سوائے اسے خرید کر چیمبرے (فرانس) لے گئے جہاں آگ سے اس کا کچھ حصہ جل گیا) پھر ۱۵۷۸ء میں اسے الپس پہاڑوں کے پار لے جایا گیا تاکہ میلان کا بوڑھا بشپ اس کا دیدار کر سکے۔ تب وہیں اسے ٹیورن کے کیتھڈرل میں رکھ دیا گیا اور ماسوائے جنگ عظیم دوم کے جب اسے حفاظت کے غرض سے کچھ عرصے کے لئے جنوبی اٹلی منتقل کر دیا گیا۔ یہ ٹیورن میں ہی رہا ہے جہاں اسے ایک قیمتی بکس میں رکھا گیا ہے اور شاذ و نادر ہی عوام الناس کو اس کی زیارت کا موقع ملتا ہے۔

کیا یہ واقعی مسیح کا کفن ہے؟ کیا وہ شبیہ حقیقتاً مسیح کی ہے؟ یہ تصویر کپڑے پر کیونکر ظاہر ہوئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ امور مذہبی دنیا میں زبردست ہلچل مچا سکتے ہیں۔

۱۸۹۸ء میں اٹلی کے بادشاہ ہمبرٹ اول کی اجازت سے سیکنڈو پایا نامی فوٹوگرافر نے کفن کی اولین تصاویر کھینچیں جب اس نے تصاویر کے نیگٹیو تیار کئے تو

چونک پڑا اسے لگا جیسے وہ کفن کا نیگیٹو نہیں دیکھ رہا بلکہ دھلی ہوئی تصویر دیکھ رہا ہے (نیگیٹو میں سیاہ حصے سفید اور سفید حصے سیاہ نظر آتے ہیں) یہ گویا نیگیٹو کا نیگیٹو تھا اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز بات عضلات کی وہ تفصیل تھی جو صرف کھینچی ہوئی تصویر کے نیگیٹو میں دکھائی دے سکتی تھی[23]

ایک عرصہ سے خبر گرم تھی کہ کفن پر خاکہ قرون وسطیٰ کے کسی مصور کی چابک دستی کا کرشمہ ہے لیکن ماہرین نے یہ بات غلط قرار دے دی۔ رنگ کرنے سے نہ صرف سوت کے ریشے باہم چپک جاتے ہیں بلکہ برش کے کناروں سے شیڈ بھی پڑتا ہے جو کہ یہاں مفقود ہے۔ خوردبینی مشاہدے، نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ کپڑے پر رنگ ہرگز نہیں کیا گیا بلکہ ہر ریشہ الگ الگ ہے۔

نومبر ۱۹۷۳ء میں جب پہلی بار کفن کی فلم اٹلی ٹیلیویژن پر پیش کی گئی تو سائنس دان حرکت میں آ گئے اور کفن پر تحقیق میں تیزی آ گئی کیونکہ ۱۹۳۳ء سے اسے عام دیدار کے لئے نہیں رکھا گیا تھا۔ اس امکان کو بالکل رد کر دیا گیا کہ یہ کسی آرٹسٹ کا کارنامہ ہے۔ کیونکہ یہ بات امکان سے باہر ہے کہ کیمرے کی ایجاد سے صدیوں پہلے کوئی مصور اناٹومی (مطالعہ عضلات) کا اس قدر ماہر ہو گا کہ تصویر کا نیگیٹو پینٹ کرنے کی " حماقت " اور اس میں انسانی عضلات کو مخفی رکھنی کی جرأت کرے جو صرف تصویر کھینچنے سے ظاہر ہوں۔

ہم اسے قرون وسطیٰ کے کسی آرٹسٹ کی کارستانی ایک اور وجہ سے قرار نہیں دے سکتے آپ اس دور کی کوئی بھی تصویر اٹھا کر دیکھئے۔ مسیحؑ کے ہاتھوں میں کیل ٹھونکے دکھائے گئے ہیں اور کلائیاں صاف ہیں جبکہ اس کپڑے پر ہاتھ صاف دکھائی دیتے ہیں اور کلائیوں میں کیلوں کے نشان واضح ہیں۔ اور اس بات کے ثبوت مل چکے ہیں کہ رومی درحقیقت کلائیوں میں ہی کیل ٹھونکا کرتے تھے نہ کہ ہتھیلیوں میں۔

ایک اور بات جو قرون وسطیٰ کے آرٹ سے انحراف ظاہر کرتی ہے شبیہ کا برہنہ ہونا ہے کیونکہ اس دور کی کسی تصویر میں مصلوب مسیح کو برہنہ نہیں دکھایا گیا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ اس دور میں انسانی نظام دوران خون کے بارے میں معلومات اس قدر نہیں تھیں جن کا اظہار شبیہ میں ہوتا ہے کیونکہ جن زخموں سے خون پھوٹتا دکھایا گیا ہے وہ ماہرین دوران خون کے مطابق بالکل درست مقامات ہیں جہاں سے خون کی نالیاں گزرتی ہیں۔

مصلوب کی پسلیوں کے نیچے پیٹ اندر کو دھنسا ہوا ہے جو یہ ثابت کرتا ہے کہ اس شخص کی موت اس حالت میں ہوئی کہ یہ بازوؤں سے لٹکا ہوا تھا۔

کفن کی شبیہ کے ہاتھوں میں ایک اور معمہ تھا اس میں صرف چار انگلیاں دکھائی دیتی ہیں انگوٹھا نظر نہیں آتا۔ فرانسیسی طبیب پائر بربط نے یہ معمہ بھی حل کر ہی لیا اس نے ایک بیمار آدمی کے ہاتھوں میں کیل ٹھونکنے کا بھیانک تجربہ کیا۔ اس نے حیرت انگیز بات نوٹ کی جونہی صلیب بلند کی گئی ہاتھوں نے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور ہاتھ کیلوں سے چر کر الگ ہو گئے۔ اب اس نے کلائیوں کو تختہ مشق بنایا تو نہ صرف یہ کہ کلائیوں نے پورے جسم کا بوجھ اٹھا لیا بلکہ دیکھا گیا کہ کلائیوں میں کیل ٹھونکنے سے انگوٹھا ہتھیلی کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہ گویا ایک اور ثبوت ہے کہ صلیب کا مروّجہ تصور غلط ہے۔ کیل کلائیوں میں ہی ٹھونکے جاتے تھے۔

مارچ ۱۹۷۷ء میں امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کے مبینہ کفن سے متعلق ایک کانفرنس میں کیلیفورنیا کے ایک سائنس دان نے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ اس دور میں مریخ کی تصاویر میں پہاڑوں اور وادیوں کے سراغ کے لئے خاص کمپیوٹر ٹیکنیک کا استعمال کیا گیا تھا۔ اس سائنس دان نے جب یہی طریقہ کفن پر آزمایا تو معلوم ہوا کہ یہ تصویر پینٹ نہیں کی گئی اور نہ ہی ہموار سطح پر رکھنے کے دوران وجود میں آئی ہے بلکہ نقوش اور نشانات واضح طور پر کہتے ہیں کہ شبیہ بنتے وقت کپڑے کے نیچے ایسے نشیب و فراز تھے جس سے تصویر کے بعض مقامات گہرے اور بعض ہلکے رنگوں میں ظاہر ہوئے یعنی کفن ضرور کسی انسانی جسم پر موجود تھا جب یہ خاکہ ظاہر ہوا۔

ادھر ماہرین ملبوسات نے عرصہ پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ جس قسم کا سوت اور بنائی کا جو طریقہ اس کفن میں استعمال ہوا ہے وہ پہلی سے تیسری صدی عیسوی کے دور کا ہے سوئٹزر لینڈ کے ایک سائنس دان میکس فرئی نے ایک اور بات کا مشاہدہ کیا۔ سوتی کپڑے کی بنائی اور کپڑے میں پودوں کے زردانے موجود تھے جب ان کا بغور جائزہ لیا گیا تو یہ عین دو ہزار سال پرانے ان زردانوں جیسے تھے جو گلیل کی جھیل سے دستیاب ہوئے تھے۔ بعدازاں کفن کی مٹی کے تجزیئے نے بھی ثابت کر دیا کہ ضرور بالضرور یہ کپڑا فلسطین میں رہا ہے۔

ایک اور بات جو عرصہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ شبیہ کی آنکھوں پر گول گول دو نشانات ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں لیولا یونیورسٹی شکاگو کے پروفیسر فلاس نے اعلان کیا کہ یہ معمہ حل ہو گیا ہے اس نے بتایا کہ یہ دراصل ۳۰ سے ۳۲ عیسوی کے ان سکوں کے نشان ہیں جو عیسیٰؑ کے ہم عصر فلسطینی گورنر پیلاطس یہودی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

چلئے مان لیا کہ یہ کفن عیسیٰؑ کے دور کا ہے اور فلسطین سے بھی تعلق رکھتا ہے لیکن کیا ثبوت ہے کہ اس پر موجود ۶ فٹ قد کا انسانی خاکہ عیسیٰؑ کا ہی ہے ان کے کسی ہم عصر مصلوب کا نہیں عیسائی ماہرین نے اس کے جواب میں بتایا ہے کہ گورومیوں کے صلیب دینے کے ان گنت طریقے رائج تھے تاہم بائبل کی بیان کردہ تفاصیل اس خاکے پر بالکل درست بیٹھتی ہیں اور عین یسوعؑ ناصری کے طریقے پر کسی بھی اور شخص کو صلیب دینے کے امکانات تقریباً صفر ہیں۔

بائبل کا بیان ہے کہ عیسیٰؑ کو کانٹوں کا تاج پہنا کر اس قدر زور سے دبایا گیا تھا کہ چہرے پر خون بہنے لگ گیا تھا کفن کی شبیہ کے سر پر سفید دھبے اس بات کی علامت ہیں بائبل کہتی ہے کہ پہلو میں ایک رومی نے برچھی ماری جس سے فوراً خون اور پانی بہہ نکلا۔ شبیہ کی پانچویں، چھٹی پسلی کے پاس بائیں پہلو میں خون کا نشان سفید رنگوں میں صاف ظاہر ہے۔ شبیہ کے پشت کے حصے پر کاندھوں کے قریب ایسے نشانات ہیں گویا لکڑی کی صلیب کے دباؤ سے نشان پڑ گئے ہیں مصلوب کے جسم پر تشدد کے اور نشانات بھی ہیں ملاحظہ ہو انجیل۔ (یوحنا ۱۹۔۱۔ ۴۲)

گھٹنوں پر گھسٹنے سے بننے والی خراشیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

اب معمہ کا سب سے عجیب مرحلہ سامنے آتا ہے یعنی شبیہ کفن پر کیونکر ظاہر ہوئی۔ انجیل کا بیان ہے کہ یسوع کا شاگرد یوسف صلیب کے بعد جسد مسیح ساتھ لے گیا پھر۔

"نیکودیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں کا دفن کرنے کا دستور ہے۔ (یوحنا ۱۹۔ ۳۹، ۴۰)

اس بنا پر پہلا نظریہ یہ پیش کیا گیا کہ تیل اور مصالحوں سے ملا ہوا آمیزہ جسے لاش پر ملا گیا تھا وہ کفن سے لگ گیا اور لاش کا بڑا سا دھبا بنا دیا۔ لیکن جب یہی تجربہ عملی طور پر کیا گیا تو نتائج اتنے حوصلہ افزاء نہیں نکلے کیونکہ اس طرح شکل کئی پھٹی بنتی ہے جبکہ اصل کفن میں تو بے حد تفصیل نظر آتی ہے۔

ایک نظریہ یہ کہتا ہے کہ جسم سے امونیا اور دوسری گیسوں کے بخارات نکلے اور انہوں نے کفن کے کپڑے سے مل کر شبیہ بنا دی۔ گو اس طریقے سے بھی شبیہ کے غیر واضح خطوط بنتے ہیں لیکن اصل کفن میں مسئلہ اسی تفصیل کا ہے جو پہلے نظریئے کو رد کرنے کا سبب بنی۔

انجیل کا بیان ہے کہ مسیح مرنے کے بعد اٹھ گئے تھے جو لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ دوبارہ جی اٹھنے کے وقت خاص قسم کی حرارت کا اخراج ہوا ہو گا جس نے یہ شبیہ بنا دی۔ اسی سے ملتا جلتا نظریہ نیم سائنسی قسم کا ہے جس کے مطابق مرتے وقت یسوع کے جذبات کی عجیب کیفیت تھی جس کے نتیجے میں مرنے کے بعد ان کے جسم سے حیاتیاتی شعاعوں کا اخراج ہوا جس نے یہ شکل بنا ڈالی۔ دوسرے لفظوں میں مرنے پر ان کے جسم کے ہالہ نے ساتھ چھوڑا تو کفن پر جسم کا نقش ثابت ہو گیا۔[24]

۱۳ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو آکسفورڈ، زیورچ اور ایریزونا کی تجربہ گاہوں میں کاربن ڈیٹنگ کے طریقہ کو کفن پر آزمایا گیا تو نتیجہ یہ نکلا کہ کفن جعلی ہے۔ آکسفورڈ ٹیم کے سربراہ پروفیسر ایڈورڈ ہال کا بیان ہے کہ اعداد و شمار سے ۹۵٪ درستی کے ساتھ معلوم ہوا ہے کہ یہ کپڑا ۱۲۶۰ سے ۱۳۹۰ عیسوی کے درمیانی عہد سے تعلق رکھتا ہے جو جعل سازی کے حوالے سے مشہور دور ہے۔ گو کیتھولک چرچ میں کفن کی اصلیت میں شبہ پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا تاہم بیشتر معتقدین سائنس دانوں کے نتائج پر یقین نہیں رکھتے۔[25]

# انجیل برنباس

برنباس یا برناباس عیسیٰؑ کا حواری تھا جس نے انجیل کا ایک نسخہ ترتیب دیا تھا جو انجیل برنباس کہلایا۔ انجیل برنباس دنیا کے دو بڑے مذاہب اسلام اور عیسائیت کے مابین باعث نزاع بنی ہوئی ہے مروجہ انجیل میں برناباس کا تذکرہ موجود ہے۔ لوقا میں ہے "اور یوسف نامی ایک لاوی تھا جس کا لقب رسولوں نے برنباس یعنی نصیحت والا بیٹا رکھا تھا اور جس کی پیدائش قبرس (قبرص) کی تھی۔ اس کا ایک کھیت تھا جسے اس نے بیچا اور قیمت لاکر رسولوں کے پاؤں پر رکھ دی"۔ (اعمال ۳۶:۳۷)

یوسف برنباس قبرص کا ایک یہودی تھا اس کا کہنا تھا کہ وہ عیسیٰؑ کے اولین بارہ حواریوں میں شامل تھا اور عیسیٰؑ سے قریب رہ کر ان کے غائب ہونے تک کے مراحل کے دوران پیش آنے والے واقعات کا چشم دید گواہ۔ ان واقعات اور عیسیٰؑ کی تعلیمات کو اس نے انجیل کی شکل دی لیکن اس کے بیان کردہ واقعات اور تعلیمات مروجہ اناجیل سے شدید طور پر متصادم ہیں۔ اس انجیل کا وجود قدیم عیسائی ادب میں مذکور ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں موحد ارانیئس نے پولس کے تثلیثی عقائد کے خلاف لکھتے ہوئے برنباس کی انجیل کا کئی جگہ حوالہ دیا۔

ہسپانیہ، شام اور مصر کے ابتدائی کلیساؤں میں یہ انجیل بڑے عرصے تک مروج رہی اسکندریہ کے کتب خانوں اور کلیساؤں میں ۳۲۵ء تک اسے کتاب مقدس کا ایک جزو سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسی سال نیقیہ کی کونسل کی مقرر کردہ متروکہ کتب کی فہرست کی زد میں یہ انجیل بھی آگئی اور حکم صادر ہوا کہ ان تمام کتب کو جلا دیا جائے۔

۳۸۲ء میں "مغربی کلیساؤں کے فرمان" میں دوبارہ اسے ممنوعہ کتب کی فہرست میں شمار کیا گیا۔ لیکن اگلے برس پوپ کو کہیں سے ایک نسخہ ملا جو اس نے اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ کر لیا ۴۶۵ء میں پوپ نے جو ایماندار کے نام سے مشہور تھا اسے رد کر دیا۔

۴۷۸ء میں شہنشاہ زینو کے زمانے میں انجیل برنباس کی کچھ باقیات دریافت کی گئیں جن کے بارے میں مشہور ہوا کہ یہ برنباس کی اپنی تحریر ہے (خیال ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے بائبل کے لاطینی نسخے ولگیٹ کی بنیاد برنباس کی یہی انجیل ہی تھی) ۴۹۶ء میں پوپ گلاسس اول نے گمراہ کن کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہوئے انجیل برنباس کو بھی اسی میں شامل کیا۔

مروجہ عیسائیت کے عقائد کی بنیادیں رومی دیومالا اور قدیم علمائے یونان کے افکار سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں۔ (اس کی عمدہ مثال عیسائیت کے عقیدہ مسیحؑ کے انجام اور ایک دیومالائی کردار کے انجام میں حیرت انگیز مشابہت ہے جس کی تفصیل عیسیٰؑ کا انجام کے تحت دی جائے گی۔) عیسائی متکلمین اس کی توجیہہ اس طرح کرتے ہیں کہ یہ سب ابلیس کی کارستانی ہے۔ جو ظہور عیسیٰؑ سے صدیوں پہلے دیومالائی روایات میں لوگوں کے ذہن میں ایسے واقعات بٹھاتا رہا۔ جو بعد میں حقیقتاً پیش آنے والے تھے تاکہ عیسائیوں کا ایمان متزلزل ہو جائے اور وہ عیسائیت میں شبہ کرنے لگ جائیں۔ لیکن تنقید کی ابتداء بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ ارانیس نامی توحید پرست مسیحی دوسری صدی عیسوی میں پولس کے افکار پر کڑی تنقید کرنے لگ گیا تھا اور برنباس کی انجیل سے حوالے دے کر پولس پر الزام لگاتا رہا کہ وہ عیسائیت کا حلیہ بگاڑ رہا ہے۔

سولہویں صدی عیسوی میں فرامرینو نامی شخص نے ارانیس کے افکار کا مطالعہ کیا تو اسے انجیل برنباس کے حوالے جابجا دکھائی دیئے۔ وہ اس کتاب کی جستجو میں تھا کہ ایک روز اسے اپنے دوست پوپ سکسٹس کی لائبریری میں اطالوی زبان کا ایک نسخہ مل گیا۔ یہی نسخہ کئی لوگوں کے پاس رہا۔ یہاں تک کہ ایمسٹرڈم کے کسی معزز شخص کے ہاتھ لگا جو اسے ایک بیش بہا قیمت دریافت قرار دیتا تھا۔ جب ۱۷۰۹ء میں وہ مراتوجے ای کرومر نامی شخص نے جو پروشیا کے بادشاہ کا مشیر تھا۔ انجیل برنباس کا اطالوی نسخہ اس کے کتب خانے سے حاصل کر لیا اور سوائے (اطالیہ) کے شہزادے یوجین کو تحفہ میں دے دیا جو کتابوں کا بڑا شوقین تھا۔ ۱۷۳۸ء میں انجیل برنباس ویانا (آسٹریا) کے شاہی کتب خانے میں یوجین کی باقی کتب کے ہمراہ منتقل کر دی گئی اور وہیں محفوظ ہے۔

انجیل برنباس کے دو اور نسخے بھی دریافت ہوئے۔ ایک یونانی زبان میں تھا جس کا کچھ حصہ جل چکا تھا۔ ریگ نامی شخص اور اس کی بیوی نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا اور ۱۹۰۷ء میں آکسفورڈ پریس سے شائع کرایا مگر اس ترجمے کے صرف دو نسخے محفوظ رہ سکے اور باقی نامعلوم طور پر مارکیٹ سے غائب کر

دیئے گئے۔ ایک نسخہ امریکہ میں لائبریری آف کانگریس واشنگٹن میں اور دوسرا برٹش میوزیم میں محفوظ کر دیا گیا۔

ایک اور پرانا نسخہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں ڈاکٹر ہل من نے ہڈلی کے مقام سے دریافت کیا جو ہسپانوی زبان میں تھا۔ جارج سیل نے اسی نسخے کے حوالے اپنے ترجمہ قرآن میں دیئے۔ پھر نامعلوم ذرائع سے یہ نسخے غالباً ڈاکٹر ہیوٹ کو ۱۷۸۴ء میں ملا کیونکہ وہ یہ کہتا تھا کہ ہسپانوی نسخے اور ویانا کے نسخے میں اسے کوئی خاص اختلاف دکھائی نہیں دیا۔

انجیل برنباس کہتی ہے کہ عیسیٰؑ ابن اللہ نہیں تھے اور نہ کبھی انہوں نے ایسا دعویٰ کیا وہ خدائے واحد کے ایک رسول تھے اور انسان تھے جو کنواری مریمؑ کے بطن سے ظاہر ہوئے جنہیں خدا کے فرشتے جبرائیلؑ نے مسیحؑ کی بشارت دی۔ مسیحؑ کی پیدائش کے وقت اسی فرشتے نے چرواہوں کو خدا کے نبیؑ کی پیدائش کی خبر دی۔ عیسیٰؑ کا آٹھویں روز ختنہ ہوا۔ پھر جبرائیل نے انہیں شام فرار ہونے کو کہا تاکہ ہیرود کے قتل عام سے بچ سکیں۔

۳۰ برس کی عمر میں پہاڑ پر انہیں معجزانہ طور پر انجیل عطا ہوئی ۴۰ دن رات کے روزے کے بعد یسوعؑ نے اپنے ۱۲ حواری چنے اور انہیں توحید کی تعلیم اور تورات اور اخلاقیات کے درس دیتے رہے اس دوران (مروجہ بائبل کے بیان کردہ) معجزات بھی دکھاتے رہے۔ پھر یہودا اسکریوطی نامی حواری نے بدمعاشی کی اور یسوعؑ کا پتہ رومیوں کو دے دیا مگر عین وقت پر معجزہ رونما ہوا اور یہودا کی شباہت تبدیل ہو گئی اور رومی اسے عیسیٰؑ سمجھ کر لے گئے اور صلیب پر چڑھا دیا۔ مگر برنباس حواری چند اور گنے چنے لوگوں کے ہمراہ حقیقی مسیحؑ کے ساتھ ساتھ رہا جس نے انہیں بتایا کہ وہ خدا کے پاس جا رہا ہے۔ ادھر شرارتی لوگوں نے مسیحؑ سے مشابہ یہودا کی لاش غائب کر کے خبر اڑا دی کہ مصلوب زندہ ہو گیا ہے۔ کئی ایک نے زخمی مسیحؑ سے ملنے کا دعویٰ کیا اور پھر مشہور کر دیا گیا کہ مسیحؑ آسمانوں کو بلند ہو گیا ہے۔ ادھر حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں کے سامنے فرشتوں کے ہمراہ آسمانوں پر زندہ اٹھا لئے گئے اور عوام کی اکثریت گمراہ ہو گئی۔

برنباس کے بیان کردہ واقعات اور افکار اسلامی تعلیمات سے بڑی حد تک مشابہ ہیں برنباس میں محمدؐ کے آنے کی پیش گوئی اسی نام محمدؐ رسول اللہ سے کی گئی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کے نزدیک یہ کتاب بہت اہمیت اختیار کر گئی لیکن عیسائی یہ کہتے ہیں کہ (۱) برنباس نے کوئی انجیل لکھی ہی نہیں۔ (۲) اگر لکھی بھی تھی تو معدوم ہو گئی۔ (۳) موجودہ انجیل برنباس درحقیقت کسی مسلمان کی تصنیف ہے جو برنباس سے منسوب کر دی گئی ہے۔ (۴) برنباس تھا ہی مرتد کیونکہ وہ پولس رسول سے بھی جھگڑا تھا اور علیحدہ ہو کر قبرص چلا گیا تھا اور وہیں وفات پائی[26]

مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ مروجہ اناجیل کے مصنفین میں سے کوئی بھی عیسیٰؑ کا حواری نہیں تھا انہوں نے صرف زبانی روایات درج کیں اور وہ بھی بغیر حوالہ جب کہ برنباس تو مسیحؑ کے قریب رہا اور ۱۲ حواریوں میں شامل تھا اور جو کچھ ہوا اس کے سامنے ہوا۔ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف نہیں ہو سکتی ایک تو اس کا انداز تحریر یہ ثابت کرتا ہے دوسرے کسی بھی بڑے مسلم مفکر اور تاریخ دان نے اس بات کا ماضی میں تذکرہ نہیں کیا۔ وگرنہ اگر ایسی کوئی سازش کی بھی گئی ہوتی تو مسلمان عیسائیوں کے خلاف اس وقت سے ہی اس کتاب کو استعمال کرتے جب کہ حقیقتاً ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

# تقدیر

کیا وہ ہستی برتر تخلیق کر چکنے کے بعد اس کائنات میں دلچسپی لے رہی ہے؟ کیا وہ انسانوں کے اعمال کو دیکھ رہی ہے؟ کیا انسان جو کچھ کر رہے ہیں اس میں اس ہستی کا اختیار اور ارادہ شامل ہے اور کیا یہ سب کچھ اس کے احاطہ علم میں پہلے سے ہے؟۔

تقدیر کا تصور نیا نہیں ہے اس کے ڈانڈے تاریخ انسانی کے قدیم ادوار میں ملتے ہیں۔ اشتراکیت کے علمبرداروں کا بیان ہے کہ تقدیر کا تصور شکاری انسانوں سے شروع ہوتا ہے جب قبیلے والے شکار مار کر لوٹتے تو کوئی سیانا یا بزرگ ہر ایک کو گوشت بانٹتا جو اس کی ضرورت کے مطابق ہوتا۔ یہ فرد لوگوں کی نظر میں "رزاق" ٹھہرتا۔ لیکن قبیلے کے بزرگ کا عہدہ زرعی عہد میں ختم ہو گیا۔ چنانچہ "رزاق" کی صفت دیوی دیوتاؤں کے لئے مخصوص ٹھہری۔

عقیدہ تقدیر کا سراغ قدیم بولیوں سے ملتا ہے۔ مثلاً پوکا گیروں کی قدیم بولی میں ایک لفظ ہے جس کا مطلب ہے "آدمی ہرن مار" بظاہر یہ

عجیب لفظ ہے جس کے مطلب مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن پوکا گیر اس لفظ کو اس وقت استعمال کرتے تھے جب انہیں کہنا ہوتا تھا کہ آدمی نے ہرن مارا۔ لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی اور ہے جس نے ان کے ذریعے ہرن کو مروایا۔(27)

ایک اور مثال چوک چیوں کی بولی میں ملتی ہے " آدمی کے ذریعے گوشت کتے کو دیتا ہے۔ " یعنی آدمی بذات خود گوشت کتے کو نہیں ڈالتا۔ بلکہ کوئی اور یہ کام آدمی کے ذریعے کرتا ہے۔ اسی طرح ڈکوتا انڈین جب کہنا چاہتے ہیں کہ میں بنتا ہوں تو کہتے ہیں " بنائی میری کی ہوئی " حتیٰ کہ اس قدیم تصور کا اظہار موجودہ یورپی زبانوں میں بھی نظر آتا ہے جب فرانسیسی زبان میں سردی ہے کے لئے لفظ استعمال ہوتا ہے " وہ سردی کرتا ہے!(28) "

بول چال سے بڑھ کر جب انسان تحریر تک آ پہنچا تو اس سلسلے میں مٹی کی الواح پر دعاؤں منتر اور حساب و کتاب کا اندراج ہوتا۔ یہیں سے تصور پیدا ہوا کہ قادر مطلق کے پاس بھی ایسی لوحیں ہیں جن پر سب کچھ پہلے سے رقم کر دیا گیا ہے اور ان کو مٹانا آدمی کے بس سے باہر ہے۔ انہیں لوح تقدیر کہا گیا۔ اس تصور نے محکوم طبقے کا بیڑہ غرق کر دیا کیونکہ وہ حاکم کے خلاف چوں چرا نہیں کر سکتے تھے کہ ایسا سب پہلے سے طے کیا گیا تھا کہ وہ بادشاہ اور پروہت کو خراج ادا کریں اور ان کا قہر سہتے رہیں۔ اس عقیدے کا سراغ قدیم مصری، اشوری اور سومیری تہذیبوں میں ملتا ہے۔

دیومالا سے آگے مذاہب کی ابتداء میں بھی اس عقیدے کا پتہ چلتا ہے۔ تقدیر کو یوں سمجھا جاتا ہے کہ جیسے کسی مکان کی تعمیر سے قبل اس کا نقشہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ اور بعد ازاں اس کے مطابق تعمیر کا سلسلہ شروع کیا جاتا ہے۔ ویسے ہی خالق کائنات نے تخلیق سے پہلے ہی سب کچھ طے کر رکھا ہے۔ جس کے مطابق یہ سارا نظام کائنات جاری و ساری ہے اور اس کی مرضی کے خلاف کچھ واقع نہیں ہوتا ہے لیکن یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہر چیز میں اس کی مرضی ہے تو پھر اس مجسم خیر کی شان کے خلاف ہے کہ شر کی قوت پیدا فرمائے اور پھر جب خدا کی مرضی ہے تو اس میں بندے کے گناہوں کا کیا قصور۔ وہ تو گویا کٹھ پتلی ہوا جو اپنے خالق کی مرضی کی تکمیل کرتی ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ سوچا گیا کہ انسان اپنے اعمال کے لئے خود مختار ہے۔ اس نظریئے کے حامی قدری کہلاتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسان کو مجبور محض قرار دینے والے جبری ہیں۔ بنیادی طور پر مذاہب کا رجحان جبر کی طرف ہے۔

یونانیوں میں اپی کیورس غالباً پہلا فلسفی تھا جس نے انسان کو اپنے افعال کا خود مختار ٹھہرایا۔ ارسطا طالیس کے بعد لائب نٹز اور پھر برگساں جیسے فلاسفہ نظریہ قدر کے سلسلے میں مشہور ہوئے۔ تاریخ اسلام میں معتزلہ نے اسی حوالے سے شہرت پائی۔ غالباً نازی جرمنوں کا بھی یہی خیال تھا کہ تخلیق کائنات کے بعد خالق ایک طرف چپکا بیٹھا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ انسان کو کرنا ہے۔

اہل قدر پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر انسان کو مطلق العنان تصور کیا جائے تو خدا کے ارادے اور حاکمیت میں کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے جیسا کہ مجوسیوں کے ہاں خدا کو فرشتوں تک کے افعال پر قابو نہ تھا۔ پھر معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا چاہتا ہے کہ نیکی کا بول بالا ہو لوگ اہل ایمان ہوں لیکن اہل قدر کے عقیدے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی ناکام ہے۔

چنانچہ اہل جبر نے کہا کہ انسان مجبور محض ہے۔ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں کیونکہ اگر ایسا کہیں تو پھر خدا کو خالق کل کہنا درست نہیں۔ جبر کا عقیدہ ہندو مت میں اوا گان کی شکل میں نظر آتا ہے۔ یہود کے ہاں صحیفہ ایوب میں اور نصاریٰ کے ہاں " خدا کی مرضی " کی صورت میں جبر کا تصور کارفرما نظر آتا ہے۔ مشہور جبریوں میں گوتم بدھ، شنکر اچاریہ، ابن عربی اور عمر خیام شامل ہیں۔

ادھر مادیت پسند بھی جبر کے قائل ہیں بلکہ جبر مطلق کے۔ لیکن ذرا دوسرے انداز سے۔ کیونکہ روح اور خدا کے منکر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہر شے اور عمل سبب اور سبب کے قانون کے تحت واقع ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان بھی اسی اصول کا بڑی سختی سے پابند ہے۔ اس لئے انسان مجبور محض ہے۔

اہل جبر پر جو اہم اعتراضات کیے گئے۔ ان میں اہل مذہب سے پوچھا گیا ہے کہ اگر یہ گناہ و ثواب اور دوزخ اور جنت کو مانتے ہیں تو پھر جبر خالص کا مطلب یہ ہوا کہ پیغمبروں کی بعثت بے مقصد تھی اور دنیاوی کاموں میں خدا کا بندوں کو امر و نہی کرنا بے معنی ہے۔

ان حالات میں ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا جس نے افراط و تفریط کے وسط میں ایک نئی راہ تلاش کی۔ یہ کچھ جبر اور کچھ قدر کے قائل لوگ بین بین کہلاتے ہیں۔ اسلام میں اس فکر کا بانی الاشعری تھا جس نے عقل کے بجائے الہام و انکشاف کو ذریعہ علم قرار دیا اور اس کے افکار آج تک موجود ہیں۔

ان کے ہاں تشریح تقدیر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ مشہور ہے کہ حضرت علیؑ نے سائل کو تقدیر سے متعلق سمجھاتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر کھڑا ہو جائے پھر کہا کہ اب دوسری ٹانگ بھی اٹھا لو لیکن یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ پہلی حالت کہ جب وہ شخص اپنی ٹانگ اٹھانے پر

قادر تھا۔ حالت قدر بتائی گئی لیکن چونکہ دونوں ٹانگیں بیک وقت اٹھالینا ممکن نہیں لہٰذا دوسری حالت کو جبر کہا گیا۔ گویا انسان کو کچھ اختیار دیا گیا ہے[29]

لیکن ہر شے میں خدا کا ارادہ کارفرما ہے۔ فرق یہ ہے کہ کہیں بالواسطہ طریقے پر خدا کی مرضی پوری ہوتی ہے۔ جیسے چاند، سورج کی روشنی لے کر کرہ ارض پر چمکتا ہے اور کبھی خدا کی مرضی بلاواسطہ پوری ہوتی ہے۔ مثلاً سورج کی شعاعوں کا زمین پر پڑنا۔

بین بین کے نزدیک پہلی حالت وہ ہے جس میں مشیت ایزدی بندے میں سے ہو کر پوری ہوتی ہے۔ اسے کسب کہتے ہیں جب کہ دوسری حالت جس میں بلاواسطہ ارادہ الٰہیہ پورا ہوتا ہے۔ اسے خلق کہتے ہیں اوپر کی مثال میں انسان کا ایک ٹانگ اٹھالینا بھی خدا کے حکم سے ہوا یعنی اس کی اجازت سے ہوا اور اس کی مرضی سے ہوا۔ یہ جبر نہیں تو کیا ہے؟ بین بین جو دلائل دیتے ہیں ان کا بودا پن ذرا سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے۔ درحقیقت مذاہب یا تو تقدیر کے موضوع پر بات ہی نہیں کرتے۔ ورنہ ان کا رجحان جبر کی طرف ہوتا ہے۔

لیکن عقیدہ جبر اس بات کی تشریح کرنے سے قاصر ہے کہ آخر گناہ گار کو کس بات کی سزا ملتی ہے کیونکہ گناہ سرزد ہونے میں اس کے اپنے ارادے کا کیا دخل۔ بلکہ اس کا ارادہ تک قادر مطلق کی مرضی کے تابع ہے۔

یوں یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ کائنات پر ایک مطلق آمریت چھائی ہوئی ہے جو اپنے مزاج پر اسے چلا رہی ہے۔ مخلوق مجبور محض ہے جو اس کے اشاروں پر تھرکتی پھرتی ہے اور اس کے ارادے اور مرضی کو مجال نہیں کہ چوں چرا کر سکے۔ حتیٰ کہ قرآن سے بھی اس کی مثال لی جاتی ہے۔ واقعہ آدم" میں خدا آدم کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے کہا ہے کہ انی جاعل فی الارض خلیفہ تو یہ گویا طے شدہ پروگرام ہے کہ آدم سے لغزش سرزد کروا کر اسے راندہ درگاہ کرنا ہے۔ تو پھر آدم کا اس میں کیا قصور؟

بعض کہتے ہیں کہ نہیں درحقیقت اس میں خدا کی مرضی نہیں بلکہ علم کا اظہار ہے۔ یوں سمجھیں کہ ریل گاڑی آپ کے شہر میں پانچ بجے دخل ہوا کرتی ہے۔ اور آج بھی صحیح وقت پر آمد متوقع ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ٹرین کو آپ نے مجبور کر رکھا ہے بلکہ آپ کو علم ہے کہ وہ پانچ بجے آئے گی ویسے ہی خدا کو علم تھا کہ آدم سے یہ جرم سرزد ہو گا۔ لیکن یہ دلیل بھی اتنی مضبوط نہیں کہ تقدیر کے معمے کی قابل اطمینان تشریح کر سکے۔

ہم نے پہلے دیکھا کہ مادیت پسند جبر مطلق کے قائل ہیں کیونکہ ان کے خیال میں انسان بھی Cause and Effect کے کائناتی قانون کا پابند ہے جیسا کہ نیچر کی ہر دوسری چیز اس اصول کی پابند ہے۔ لیکن کارل مارکس نے مادیت پسندوں کے اس جبر مطلق کے عقیدے کے خلاف لب کشائی کرتے ہوئے کہا کہ مادیت پسند غلطی کرتے ہیں جب وہ انسانی ذہن کی فعالیت کو نظرانداز کر دیتے ہیں چنانچہ مارکس نے جبر مطلق اور قدر مطلق کے مقابلے میں کہا کہ درحقیقت جبر اور قدر دونوں میں اتحاد ہے۔ بظاہر یہ بین بین کے قریب ہے۔

اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرت کے قوانین کے سامنے مجبور ہیں لیکن اپنے زور علم سے وہ قوانین فطرت کی تسخیر کر کے ان پر قدرت اور اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ "جبر کے شعور کا نام اختیار و ارادہ ہے[30]"

لیکن مارکسی نظریہ تقدیر اور مادئین کے جبر مطلق کے نظریئے پر بات، ہماری بحث سے خارج ہے۔ ہم تو اس تقدیر کی بات کرتے ہیں جس کا پتہ مذاہب میں ملتا ہے۔ کیا یہ تمام کاروبار کائنات خود بخود چل رہا ہے یا یہ ایک طے شدہ پروگرام ہے؟ تقدیر کیوں ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟

اگر یہ محض ایک مفروضہ ہے تو پھر نجوم۔ مستقبل بینی، علم الید، علم جفر، پیش گوئی اور حاضرات کے ناقابل تردید شواہد کیا ہیں جو وقوعہ سے پیشتر اس کی بابت بتاتے ہیں؟

کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ ہمارا مستقبل، ہماری منزل پہلے سے طے کر دی گئی ہے؟

# آئندہ آنے والے

## (مصلحین اور نجات دہندے)

دنیا کی مختلف تہذیبوں اور مذاہب میں ایک ایسی شخصیت کا تصور پایا جاتا ہے جو مستقبل میں اپنی قوم یا اپنے قبیلے کی مدد کو اس وقت ظاہر ہو گی جب وہ زوال کی انتہا چھو رہے ہوں۔ یہ روایات اس قدر عجیب و غریب پیرائے میں بیان کی جاتی ہیں کہ جن پر یقین کرنا مشکل ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ تہذیبوں نے ایک دوسرے سے تعلقات کی بنا پر یہ تصور اخذ کیا کیونکہ یہ تصور ایسے دور دراز مقامات پر بھی ملتا ہے جو باقی دنیا سے تمدنی اعتبار سے بالکل الگ رہے ہیں۔ ایشیاء یورپ اور افریقی اقوام میں اس عقیدے کا ملنا اقوام کے باہمی روابط کی کمزور بنیادوں پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امریکہ کے ریڈ انڈین قبائل تو باقی دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے رہے وہاں کسی شخص موعود کی روایات کی اساس کیا ہو سکتی ہے؟

قدیم ہسپانوی قزاق جب امریکہ آئے تو بعض جگہ انہیں بڑی شدت سے روکا گیا جبکہ بعض مقامات پر حیران کن طریقے سے ان کا استقبال کیا گیا اور بے پناہ مسرت اور شادمانی کا اظہار کیا گیا۔ درحقیقت ان ریڈ انڈین اقوام کی روایات بتاتی ہیں کہ مستقبل میں دیوتاؤں کے فرستادے سفید چمڑی والے ان کے لئے آسمانی تحائف لے کر آئیں گے اور ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ (ہسپانوی لٹیرے) وہی روایات کے مطابق ظاہر ہونے والی شخصیات ہیں۔

قدیم میکسیکو کے علاقہ میں ایک شخص قویزل کوتل Quietzelcoatl کا تذکرہ ملتا ہے روایات کے مطابق وہ طلوع آفتاب کی سرزمین سے میکسیکو آیا تھا۔ وہ سفید قبا میں ملبوس تھا اور ریڈ انڈینوں کے برعکس اس کی داڑھی بھی تھی اس نے لوگوں کو دانشمندانہ قوانین عطا کیے چیزیں بنانا سکھائیں اور ایک شاندار سلطنت قائم کی جہاں رنگین کپاس اگا کرتی تھی اور وہاں کے بھٹے انسانی قد جتنے لمبے ہوا کرتے تھے۔ پھر ایک روز اسے یہ سلطنت چھوڑنا پڑی۔ وہ کہ جو تہذیب سکھانے آیا تھا سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا کوئی گیت کوئی تحریر اور کوئی قانون نہ چھوڑا وہ سمندر کے ساحل پر آن بیٹھا اور رونے لگا پھر اس نے سب کو یقین دلایا کہ ایک روز وہ ضرور لوٹے گا تب اس کا جسم دھڑ دھڑ جلنے لگا اور صرف دل جلنے سے محفوظ رہا جو ستارہ صبح بن گیا ایک اور روایت کے مطابق وہ سارا سامان ساتھ لے کر وہیں چلا گیا جہاں سے آیا تھا لیکن اس نے ایک مرتبہ پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

جنوبی امریکہ کے علاقے یوکاٹان میں مایا قبائل کی بادشاہت تھی۔ مایا سلطنت کے شمالی علاقے میں ایک علاقہ چیچن انزا تھا جہاں ایک بڑے گہرے کنویں میں نوجوان لڑکیوں کو دلہن بنا کر پھینکا جاتا تھا تاکہ بارش کا دیوتا خوش ہو جائے ایک روز مایا قوم نے ایک داڑھی والے سفید فام شخص کو اپنے علاقے سے گرفتار کیا۔ یہ سفید چمڑی والا ان کے لئے عجیب مخلوق تھی اسے کنویں میں پھینکا گیا لیکن وہ بچ نکلا۔ مایا نے اسے زندہ دیوتا کا درجہ دیا اور وہ یوکاٹان کا سب سے زیادہ طاقتور سردار بن گیا اس کا نام Kukul Can کوکل کان تھا۔ یہ نیم دیوتا کوکل کان عین اپنے عروج کے دور میں واپس آنے کا وعدہ کر کے پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

قوئزل کوتل ازٹک قوم کا شخص موعود تھا اور کوکل کان مایا قوم کا۔ گوئٹے مالا کے کوچ مایا قبائل کی روایات کو کوماز کا تذکرہ کرتی ہیں جو ازٹک اور مایا کے شخص موعود کی سی خصوصیات رکھتا تھا کولمبیا کے علاقے میں چپ چاز اور بوچکاز قبائل بھی قوئزل کوتل جیسے شخص کی آمد کے منتظر تھے جو اونٹ نما حیوانوں پر سوار مشرق سے آیا تھا اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر گیا تھا۔ اہل برازیل کو دیوتا سیم Same کا انتظار تھا جو داڑھی والا تھا اور انہیں زراعت اور سحر کی تربیت دے گیا تھا۔ پیرو کے علاقے میں انکا قوم کا راج تھا وہ اپنے دیوتا "ویراکوچا" کی آمد کے منتظر تھے جو ایک دیو قامت سفید فام تھا اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے مالٹا کے مقام سے لہروں کے دوش پر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لیکن یہ انتظار یا خوش فہمی ان لوگوں کو بہت مہنگی پڑی۔ ہسپانوی لٹیرے ازٹک جیسی ہلاکو صفت قوم کی سلطنت کے ساحلی علاقوں پر وارد ہوئے تو ازٹک ان بیرونی حملہ آوروں کو قویزل کوتل کے فرستادے سمجھے اور ہسپانوی سالار کورٹیز کو فرزند آفتاب کا لقب دیا لیکن کورٹیز کی لوٹ مار نے انہیں برباد کر کے رکھ دیا تو وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ فرزند آفتاب سے لڑنا دیوتاؤں کو ناراض کرنے کے مترادف خیال کرتا دوسرا اس کی غارت گری روکنا ہی عافیت جانتا تھا۔ آخر کار یہ پھوٹ اس عظیم قوم کو لے ڈوبی۔

آئندہ آنے والی ایسی ہی پیش گوئیاں عظیم انکا سلطنت جو جنوبی امریکہ میں کولمبیا چلی اور بولیویا تک پھیلی ہوئی تھی، کی بربادی کا سبب بنیں۔ انکا بادشاہوں کے ہاں یہ روایت نسل در نسل چلی آرہی تھی کہ سفید فام دیوتا ویراکوچا ایک روز ضرور لوٹے گا۔ اس سلسلے کے بارہویں بادشاہ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تیرہویں انکا بادشاہ کے زمانے میں طلوع آفتاب کی جانب سے سفید چمڑی والے نمودار ہوں گے اور اہل پیرو پر غالب آجائیں گے انکا افواج تعداد اور جرأت کے اعتبار سے ہسپانوی مٹھی بھر لٹیروں کے لئے ناقابل تسخیر تھیں لیکن روایات اور پیش گوئیوں کو عین وقت پر پورا ہوتا دیکھ کر انکا حوصلہ ہار بیٹھے اور ان کے لاکھوں جری نفوس پزارو کے ہاتھوں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔

مایائی اثریات میں ایک صحیفے چیلم بالم میں ایک پروہت نے پیش گوئی کی تھی کہ تیرہویں دور کے خاتمے پر سفید آدمی ایک بار پھر یوکاتان آئیں گے۔ پیش گوئی پوری ہوئی لیکن مایا اپنی اقدار اور تہذیب سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

آئندہ آنے والی شخصیات کی ان پیش گوئیوں کی تعبیر کس قدر مختلف نکلی اس بات سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ امریکہ سے الگ تھلگ تہذیبوں قوموں اور مذاہب میں شخص موعود کی روایات کیسی کیسی صورتوں میں ملتی ہے۔ تاہم اس مضمون میں محض ان آئندہ آنے والوں کا تذکرہ شامل ہے جن کا ذکر ایک مصلح یا نجات دہندے کے طور پر آتا ہے۔ جو کسی ایک گروہ کو پستی سے نکال کر عظمت کی بلندیوں سے آشنا کرائے گا اور باقی تمام انسانی گروہوں پر فوقیت دلائے گا۔

سامی مذاہب کے محققین کا خیال ہے کہ آئندہ آنے والوں کی حکایت کا اولین سراغ زرتشتی عقائد سے ملتا ہے۔ جن کے مطابق تقدیر کی دیوی کے جڑواں بچے یزداں اور اہرمن تولد ہوئے مگر اہرمن جو شر نمائندہ تھا چالاکی سے ماں کی کھوکھ سے پہلے باہر آگیا اور یزداں (نمائندہ خیر) کی پیدائش بعد میں ہوئی اس لئے شر غالب آگیا۔ مگر قیامت کے قریب شاہ بہرام کا ظہور ہوگا جو شر کا قلع قمع کر کے یزداں کی حکمرانی قائم کروائے گا۔

خیال ہے کہ یہ مجوسی حکایت دیگر روایات کے ساتھ سامی مذاہب کا حصہ بن گئی اور ان کے پیروکار بھی کسی شخص کی موعود کا انتظار کرنے لگ گئے۔ لیکن اگر یہ عقیدہ مجوسی الاصل بھی ہے تو یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ دوسری الگ تھلگ تہذیبوں میں یہ تصور کیوں کر وارد ہوا۔

بیشتر مذاہب کے علم الکلام کے ماہر دنیا بھر کی روایتوں کے شخص موعود کو اپنے گروہ میں سے قرار دیتے رہے ہیں اس سلسلے میں مسلمان محققین اور علم الکلام کے ماہرین نے قدیم صحائف میں پائے جانے والے آئندہ پیغمبر کے متعلق شواہد کا اطلاق آنحضورؐ پر کیا بعض جگہ تو تاویل سے کام لیا گیا ہے لیکن اکثر مقامات پر جو اشارے ملتے ہیں انہیں نظرانداز کرنا ممکن نہیں قطع نظر متن کی صحت سے آئیے آنے والے "نبی" کے ظہور سے متعلق قدیم مذہبی صحائف کی بشارتوں کا جائزہ لیتے ہیں جن کے بارے میں مسلم متکلمین کا خیال ہے کہ یہ حضرت محمدؐ کی بعثت مبارکہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

دنیا کا قدیم ترین مذہب غالباً پارسیت ہے اس اعتبار سے اس کی مذہبی کتاب دنیا کی قدیم ترین مذہبی کتاب ہوئی۔ پارسیت یا مجوسیت کی جائے پیدائش قدیم فارس کی سرزمین تھی۔ بانی مذہب کو ہم جناب زرتشت کہتے ہیں جن سے پہلوی اور ژندی زبانوں کی متبرک تحریروں کے دو نسخے "دساتر" اور "ژنداوستا" منسوب ہیں۔ امتداد زمانہ سے ان صحائف کا بیشتر حصہ ضائع ہو گیا اور اب پاژند کی صورت میں ژنداوستا کی وہ تلخیص باقی ہے جو بہت پہلے ژندی کے متروک ہونے پر چند علماء نے کی تھی۔

دساتر جسے پارسیوں کا پرانا عہدنامہ بھی کہتے ہیں کا بیان ہے جب اہل فارس بداخلاقی اور بدکرداری کی انتہائی سطح پر جا پہنچیں گے تب ملک عرب میں ایک شخص پیدا ہوگا جس کے پیروکار ان کے تخت و تاج مذہب اور ہر چیز کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ فارس کے طاقتور سرکش شکست کھائیں گے۔ عبادت کدے کو بتوں سے پاک صاف کر دیا جائے گا اور لوگ اس کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھیں گے وہ مدائن اور اس کے اردگرد کے آتش کدوں پر قابض ہو جائیں گے اور طوس، بلخ اور دیگر اہم مقامات کو فتح کر لیں گے۔ عوام الناس میں بے چینی پیدا ہو جائے گی۔ ایران کے علماء فضلاء اور دوسرے لوگ اس کے پیروکاروں کے ساتھ مل جائیں گے۔ (ساسانل دساتر کا چودھواں حصہ)[31]

دوسری کتاب اوستا میں جناب زرتشت کا قول ملتا ہے میں نے دین مکمل نہیں کیا میرے بعد ایک نبی اور آئے گا جو اس کی تکمیل کرے گا اور اس کا نام رحمتہ اللعالمین ہوگا۔

اس کتاب میں ایک اور جگہ رقم ہے "اس کا نام فاتح مہربان اور اسی کا نام اس وقت اریتا" ہوگا۔ وہ رحمت کا مجسمہ ہوگا۔ کیونکہ وہ تمام جہان کے لئے

رحمت ہو گا۔ وہ حاشر ہو گا اس لئے کامل انسان اور روحانی انسان ہونے کی وجہ سے وہ تمام لوگوں کی ہلاکت کے خلاف مبعوث ہو گا وہ مشرک لوگوں اور ایمانداروں کی اصلاح کرے گا۔ (فرور دین یشت۔ ژنداوستا۔ باب ۲۸ آیت ۱۲۹) ۲ ؎ (32)

وہ کون ہے جو آئے گا؟ دوسری پیش گوئی کے لفظ اس وقت ارینا کا ترجمہ ہے تعریف کیا گیا۔ لفظ محمد کا عربی مفہوم بھی "تعریف کیا گیا" ہے اور حاشر اور رحمتہ اللعالمین بھی آپ ؐ کے القابات ہیں۔

اہل ہند پراسرار علوم کے حوالے سے بہت ممتاز ہیں ان کی مستقبل بینی اور علم نجوم تو مشہور ہیں ہی ان کی مبینہ آسمانی کتب بھی اپنے پراسرار بیانات میں پیچھے نہیں، ان کتب (وید، اپنشد، پران وغیرہ) کی قدامت مسلم ہے لیکن صحت مشکوک

پران تعداد میں ۱۰ بتائے جاتے ہیں اور ان کی اٹھارہ جلدیں رشی مہر دیاس سے منسوب ہیں ان میں بھویش یا بھوشیہ پران میں ایک جگہ لکھا ہے کہ راجہ بھوج نے اپنے خواب میں دیکھا "ایک ملیچھ (اجنبی) ملک اور زبان کا ناخواندہ شخص جس کا لقب سکھانے والا اور نام محمدؐ تھا اپنے ساتھیوں (صحابہ) کے ہمراہ آیا۔ راجہ نے اس مہادیو (عظیم دیوتا) باشندہ عرب کو آب رود گنگا (گنگا کے پاک پانی) اور پنج گویہ (گائے کی پانچ چیزوں) کے ساتھ غسل کرایا اور صندل کی لکڑی تعظیم سے پیش کی اور اس کے حضور جھک کر مخاطب ہوا اے عرب کی قابل فخر ہستی میری پرستش تیرے لئے ہے اے وہ کہ جسے شیطان کو مارنے کی قوت اور اختیار ہے وہ کہ جو ان بڑھوں میں سب سے باعصمت ہے معصوم ہے اے کہ تو سچائی کی روح اور سرور کامل ہے میری اطاعت تیرے لئے ہے مجھے اپنے قدموں پر قبول فرما (پرتی سرگ۔ کھنڈ ۳۔ ادھیا ۳۔ شلوک ۵ تا ۸)

بھویش پران میں ایک جگہ اس اجنبی زبان اور انجانے ملک کے باسی کو "ماروتھل سنان" کہا گیا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں باشندہ صحرا۔ یہ لقب ریگستان عرب سے نمودار ہونے والے محمدؐ پر صادق آتا ہے۔ رہی سہی کسر لفظ محمدؐ نے پوری کر دی جو کتاب کے شروع میں مذکورہ ہے۔ ہندو فرقہ آریہ سماج بھویش کی صحت میں شک کرتا ہے۔ ؎ (33)

ویدوں میں اتھروید کی پیش گوئی زیادہ مشہور ہے بیسویں باب کنتپ سوکت کے ایک سو ستائیسویں منتر میں خطاب ہے "لوگو غور سے سنو تعریف کے قابل انسان لوگوں میں پیدا کیا جائے گا ہمیں چاہئے کہ ہجرت کرنے والوں کو چھ ہزار (یا ساٹھ ہزار) نوے دشمنوں سے بچانے کے لئے جن کی سواری میں ۲۰ اونٹ اور سانڈنیاں ہوں گی، جن کی شان آسمان کو سرنگوں کرتی ہو گی۔ اپنی پناہ میں لیں۔

اس نے مہارشی کو سینکڑوں اشرفیاں، دس حلقے، تین سو عربی گھوڑے اور دس ہزار گائیں دیں" (اتھروید، کند ۲۰، شکنتلا ۱۲۷، منتیر ۳۔ ۱)

ہندوؤں کی ایک اور مقدس کتاب کلنکی کا کہنا ہے۔

"جگت گرو وشنو بھگت اور سومتی سے پیدا ہو گا۔ اس کی پیدائش ۱۲ بساکھ، پیر کے دن سورج نکلنے سے دو گھڑی بعد ہو گی اس کا والد اس کی پیدائش سے پہلے فوت ہو جائے گا اور بعد میں ماتا بھی فوت ہو جائے گی۔ جگت گرو کی شادی سملل دیپ کی شہزادی سے ہو گی شادی کے موقع پر اس کے چچا اور تین بھائی موجود ہوں گے۔ ایک غار میں پرس رام اسے تعلیم دے گا اور جس وقت سملل دیپ سے سمبالا میں آئے گا تو وہ تبلیغ شروع کرے گا جس پر اس کے رشتہ دار ناراض ہو جائیں گے۔ مصائب سے تنگ آ کر وہ شمالی پہاڑوں میں بھاگ جائے گا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اسی شہر (سمبالا) میں تلوار لے کر آئے گا اور سارا ملک فتح کرے گا جگت گرو کے پاس ایک گھوڑا ہو گا جس پر سوار ہو کر وہ زمین اور سات آسمانوں کی سیر کرے گا۔ (کلنکی۔ بیسواں باب)

کلنکی کی یہ پیش گوئی بہت مقبول ہوئی اس پر تحقیق کی گئی اور یہ نتائج سامنے آئے۔

نمبر ۱۔ جگت گرو (جگ = دنیا، گرو = استاد) معلم دنیا۔ معلم کائنات

نمبر ۲۔ وشنو بھگت (وشنو = اللہ، بھگت = بندہ) اللہ کا بندہ۔ عبداللہ

نمبر ۳۔ سومتی (سو = سکون۔ اطمینان، متی = دل) قلب مطمئن۔ لفظ آمنہ کا ترجمہ

نمبر ۴۔ ۱۲ بساکھ پیر کا دن۔ ہندی کیلنڈر میں ساکھ بہار کا مہینہ۔ ساکھ = بہار = ربیع (عربی میں ربیع بہار کو کہتے ہیں)

نمبر ۵۔ سملل دیپ۔ ہندو علوم میں دنیا کی تقسیم چھ دیپوں میں کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک دیپ جو عرب اور ایشیائے صغیر کے علاقے کا نام ہے۔

نمبر۶۔ پرس رام (پرس = بلندی، کلہاڑی۔ رام = خدا) جبرائیل؟
نمبر۷۔ سمبالا۔ کوئی شہر (علم نہیں کہ اسے سمبالا کیوں کہا)

کیا سمجھا جائے کون ہے جسے معلم کائنات کہا گیا؟ کون عظیم ہستی تھی جس کے والد کا نام عبداللہ تھا اور ماں کو آمنہ کہا جاتا تھا؟ تاریخ عالم میں ۱۲ ربیع الاول میں پیر کے روز کون سی عظیم ہستی پیدا ہوئی؟ جس کا والد اس کی پیدائش سے پہلے داغ مفارقت دے گا اور ماں بھی کچھ عرصہ بعد انتقال کر جائے گی اس قدر واضح تفاصیل تو صرف اور صرف ایک ہی ہستی پر آن ٹھہرتی ہیں۔ محمدؐ عربی!

وہی محمدؐ جنہیں ایک غار (غار حرا) میں پرس رام (جبرائیل) نے تعلیم دی۔

وہی محمدؐ کہ جن کی تبلیغ سے ان کے عزیز واقرباء اور رشتہ دار ناراض ہوئے۔ وہی محمدؐ کہ جو مظالم اور مصائب کے سبب سمبالا (مکہ؟) کے شمال میں واقع مدینے کی طرف ہجرت کر گئے جس کے جنوب میں (ثنیات) پہاڑیوں کا سلسلہ ہے یہ وہی محمدؐ تھے جنہوں نے سلمل دیپ کی شہزادی (عرب کی خدیجہؓ) سے شادی کی اور یہی محمدؐ تھے جنہوں نے مدینہ سے پلٹ کر تمام ملک عرب فتح کیا تھا اور براق (گھوڑے) پر زمین اور سات آسمانوں کی سیر (معراج) فرمائی۔[34]

---

جس طرح مسلمان اور عیسائی عیسیٰؑ کی آمد کے منتظر ہیں ویسے ہی بدھوں کو پانچویں اور آخری میتیہ کا انتظار ہے۔ ٹی ڈبلیو رئیس ڈیوڈ کی کتاب "شاہ ملندہ کے سوالات" (باب چہارم ۲۹) میں ایک مشہور بدھ روایت یوں درج ہے "انند نے مبارک شخص سے کہا جب تم چلے جاؤ گے تو ہمیں کون تعلیم دے گا؟" اور مبارک شخص نے کہا "میں نہ پہلا اور نہ ہی آخری بدھ ہوں جو دنیا میں آیا اور اپنے وقت پر ایک اور بدھ مبعوث ہو گا۔ بہت مبارک، معرفت کامل اور حکمت کردار والا۔ لاثانی عالم انسانی۔ حاکم جن و بشر اور ملائکہ۔ وہ تمہارے آگے وہی سچائیاں بیان کرے گا جو میں تمہیں سکھاتا رہا...... اس کے ساتھیوں کی تعداد ہزاروں میں ہو گی میرے پیرو کار تو سینکڑوں میں ہیں۔ انند نے دریافت کیا ہم انہیں کیسے پہچان پائیں گے؟ مبارک شخص نے جواب دیا اسے میتیہ/متریا کہا جائے گا۔[35]

آئندہ آنے والی ہستی کا نام متریا یا میتیہ ہو گا سنسکرت میں اس کے معانی دوست یا مہربان کے ہیں۔ پالی زبان میں یہ الفاظ دوستی۔ رحم اور ہمدردی کے معانوں میں آتے ہیں۔ گو یہ القابات رسول اکرمؐ پر بھی صادق آتے ہیں لیکن بدھ کے پیرو کار کسی اور ہی متریا سے ان القابات کا تعلق ظاہر کرتے ہیں ادھر عیسائی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ ظہور مسیحؑ کی طرف اشارہ ہے۔ (ویسے بھی بدھ اور عیسائی تعلیمات میں ایک عجیب سا تعلق اور مشابہت پائی جاتی ہے)

عہد نامہ قدیم کی روایات میں آئندہ آنے والے کا تذکرہ موجود ہے۔ "میں خداوند ان کے لئے ان کے بھائیوں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنے الفاظ اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ (استثناء۔ ۱۸۔ ۱۵:۱۸)

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہ نبی محمدؐ کی طرف اشارہ ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی بنی اسمٰعیل سے تھے۔ یہی دعویٰ وہ الیسع نبی کے مکاشفے کے بارے میں کرتے ہیں جس کے مطابق اس نے کشف کے عالم میں گدھے اور اونٹ پر دو سواروں کو دیکھا تھا۔ مسلمانوں کے مطابق گدھے پر سوار مسیح ہیں جو یروشلم میں اسی انداز سے داخل ہوئے اور اونٹ پر سوار محمدؐ ہیں جو فتح مکہ کے وقت اونٹ پر سوار تھے۔ استثناء کے بیان میں درج ہے کہ موسیٰؑ کو کہا جا رہا ہے کہ تم جیسا ہی بھیجا جائے گا۔ مسلمان قرآن کی اس آیت کی روشنی میں تورات کے بیان کو جانچ کر اس نبی کو محمدؐ قرار دیتے ہیں۔

ہم نے تمہاری طرف ایسا رسول بھیجا۔ ہے جیسا فرعون کی طرف بھیجا۔ (سورہ المزمل ۱۵)
غزل الغزلات (۵۔ ۱۰:۱۲) کے عبرانی نسخے میں ایک جملہ یوں درج ہے۔

وہ (محمد) عشق انگیز ہے۔ وہ میرا پیارا اور جانی ہے۔ اے یروشلم کی بیٹیو۔"

مسلمان لفظ محمد کو محمدؐ کے معنوں میں لے کر پیش گوئی کے معانی بشارت محمدیؐ لیتے ہیں جبکہ یہودی اس کے معانی عشق انگیز لیتے ہیں۔ سلیمانؑ کا ایک بیان بھی اس سلسلے میں قابل غور ہے۔ "میرا محبوب سرخ و سفید ہے وہ دس ہزار آدمیوں کے درمیان جھنڈے کی طرح کھڑا ہے۔" یاد رہے کہ فتح مکہ کے وقت جانثاران محمدؐ کی تعداد دس ہزار تھی اس کی طرف ایک واضح تر اشارہ یہ ہے "خداوند سینا سے آیا شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدوسی اس کے ہمراہ تھے اور اس کے داہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی۔" استثناء (۲۳:۱۔۲) سینا۔ موسیٰؑ۔ شعیر [illegible] یروشلم) سے

عیسیٰ ؑ اور فاران سے نبی اکرم ﷺ کا ظہور ہوا۔[36]

تورات کی مندرجہ بالا آیت کو عیسائی عیسیٰ ؑ کی بشارت قرار دیتے ہیں۔ "دیکھ تیرا بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ صادق ہے اور نجات دینا اس کے ذمے ہے۔ وہ فروتن ہے اور گدھے بلکہ جوان گدھے اور گدھی کے بچے پر سوار ہے" (زکریا ۹:۹) کے متعلق عیسائی دعوے دار ہیں کہ یہ یسوع ناصری کی طرف اشارہ ہے جب کہ مسلمان اسے حلیمہ ؓ دائی کے محمد ﷺ کو طفولیت گدھے پر سوار کر کے اپنے ساتھ لے جانے کی طرف پیش گوئی قرار دیتے ہیں۔

ادھر تورات اور زبور کی کچھ پیش گوئیاں عیسیٰ ؑ کے مبینہ حالات سے بے حد مشابہت رکھتی ہیں۔ یوں عیسائی حضرات عہد نامہ قدیم کے بیان کردہ آئندہ آنے والے شخص کو مسیح ناصری قرار دیتے ہیں لیکن خود عیسائیوں کی مقدس کتب میں آئندہ آنے والے کا تذکرہ موجود ہے۔

دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں (یوحنا ۱۴:۳۰)

مسیح نے فرمایا "میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا۔ یعنی سچائی کا روح" (یوحنا ۱۴:۱۶۔ ۱۷)

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے مفید ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہیں آئے گا۔" (یوحنا ۱۶:۷) مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ یہاں مسیح کا اشارہ محمد ﷺ کی طرف ہے۔ لیکن عیسائی اس سے انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جبرائیل یا روح کی طرف اشارہ ہے کیونکہ "اور بہت ہی تھوڑی مدت باقی ہے کہ آنے والا آئے گا اور دیر نہ کرے گا" (عبرانیوں ۱۰:۳۷) کے مطابق یہ مددگار مسیح کے بلند ہو جانے کے دس دن بعد نازل ہوا (اعمال ۲:۱۔ ۴) اور یہ روح قدس تھا۔

اوپر یوحنا ۱۴:۱۶ کے بیان میں لفظ مددگار تحریر کیا گیا ہے یہ لفظ Parakletos کے یونانی لفظ کا ترجمہ بتایا گیا ہے پیرا کلیطوس کا لفظ ایک بڑا معمہ بنا ہوا ہے کیونکہ فیرا قلیطوس یا فارقلیط کا لفظ عربی بائبل میں ملتا ہے جو مترجمین نے پیرا کلیطوس کے لئے استعمال کیا اور فارقلیط کا ترجمہ ہوتا ہے، تعریف کیا گیا اور یہی ترجمہ لفظ "محمد" کا ہے۔ بشپ مارش کا خیال تھا کہ عیسیٰ ؑ نے عبرانی زبان میں لفظ فارقلیط ہی کہا ہو گا جو یونانی ترجمہ میں پیرا کلیطوس بن گیا جس کے ایک معانی وعظ کرنے والا بتائے جاتے ہیں۔ یہ بھی محمد ﷺ سے متعلق ہو سکتے ہیں۔

حیات محمد ﷺ کے مصنف ولیم میور نے خیال ظاہر کیا ہے کہ بائبل کے عربی نسخوں میں لفظ فارقلیط کا استعمال نبی اکرم ﷺ کے ہم عصر کسی جاہل یا بدنیت پادری کی کارستانی ہے جو اس نے Perikalutas کا ترجمہ کرتے وقت کی ہے۔[37] ادھر قرآن کا بیان ہے کہ عیسیٰ ؑ نے نبی احمد ﷺ (محمد ﷺ) کی آمد کی پیش گوئی پہلے ہی فرما دی تھی۔

"..... اور اس رسول کی بشارت سناتا ہے جو میرے بعد تشریف لائیں گے۔ ان کا نام احمد ہے" (القرآن ۶۱:۶)

عیسائی حضرات شخص موعود کو جبرائیل قرار دیتے ہیں جو مسیح کے رفع آسمانی کے دس روز بعد ظاہر ہوئے لیکن وہ اس کے باوجود کسی آئندہ آنے والے کی ظہور کے منتظر رہے ہیں۔ بعض اسے دوسری صدی عیسوی کے دور کا مونتانس خیال کرتے ہیں۔ جو پیروکاروں کے نزدیک شخص موعود تھا۔ اور بعض مایوس ہو کر اسے کلیسیا کی تعمیر نو کی شکل میں تاویل کرنے لگے ہیں۔

شخص موعود کے متعلق سب سے واضح علامات برنباس کی انجیل (دیکھئے "انجیل برنباس") میں ملتی ہیں۔ انجیل کا یہ نسخہ آنحضور ﷺ کی پیدائش سے تین سال قبل منسوخ کر دیا گیا تھا اور اب بھی عہد نامہ جدید میں شامل نہیں کیا جاتا۔ یہ بہت بعد میں اتفاقاً دریافت ہوا تھا۔ اگر کسی بھی طرح اس کی تصدیق ہو جائے یا کم از کم محمد ﷺ کی پیدائش سے پہلے اس کا وجود تسلیم کر لیا جائے تو اس کی بیان کردہ باتیں زبردست انقلاب لا سکتی ہیں۔ برنباس نامی مسیحی حواری نے اس میں جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ مروجہ اسلامی تصور مسیح سے بے حد مشابہت رکھتے ہیں۔ شخص موعود کے بارے میں اس کا بیان ہے..... "مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کون سی نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟" کاہن سردار نے سوال کیا۔ یسوع نے جواب دیا "اس مسیح کا نام قابل تعریف ہے کیونکہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی اس وقت یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ملکوتی شان سے رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا اے محمد ﷺ انتظار کر کیونکہ تیری ہی خاطر جنت دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اسے بطور تحفہ تجھے دوں گا۔ پھر جو تیری تبریک کرے گا برکت پائے گا اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی۔ جب تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تیری بات سچی ہو گی۔ یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں ٹلے گا۔ سو اس کا اسم مبارک محمد ﷺ

ہے"[38]

(وی آنا کی امپیریل لائبریری میں محفوظ انجیل برنباس کے اطالوی نسخے کا بیان)

---

مسلمانوں میں ایک عرصہ سے ایک شخصیت متنازعہ چلی آ رہی ہے۔ یہ آئندہ آنے والی شخصیت "مہدیؑ" ہے۔ اگرچہ بعض روشن خیال اور ترقی پسندوں نے مہدی جیسی شخصیت کے آنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہ "یہ عقیدہ زبوں کاروں اور بے ہمتوں کے کارخانے کا مضروب ہے"۔

مینار دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
اب انتظار مہدی و عیسیٰؑ بھی چھوڑ دے

لیکن اہل اسلام کی اکثریت مہدی موعود کی شدت سے منتظر ہے۔

آنے والے آزمانے کی امامت کے لئے
مضطرب ہیں تیرے شیدائی زیارت کے لئے

اٹھ دکھا گم گشتہ راہوں کو صراط مستقیم
اک زمانے کو ہے میر کارواں کا انتظار

مسلمانوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ موعود مہدی امام حسن عسکریؑ کی زوجہ نرجس کے بطن سے پیدا ہوئے تھے مگر بچپن میں عام لوگوں سے پوشیدہ ہو گئے اور اگرچہ اب تک پوشیدہ طور پر "صحیح العقیدہ" لوگوں کی مدد کرتے ہیں تاہم باقاعدہ طور پر قیامت کے قریب ظاہر ہوں گے اور دین حق کی اشاعت کریں گے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ مہدی موعود کو ابھی پیدا ہونا ہے۔ دونوں گروہ اس سلسلے میں نبیؐ کے اقوال سے مدد لیتے ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ آمد کے موقع پر تمام کرہ ارض کی حکومتیں اور ادیان ان کے آگے سر تسلیم خم کر دیں گے اور صرف انہی کی حکمرانی ہو گی عیسیٰؑ زمین پر آ کر ان کی اقتداء میں نماز پڑھیں گے روایات کے مطابق مہدی موعود کے آنے سے پہلے بعض ایسے واقعات ظہور پذیر ہوں گے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ ظہور مہدی ہونے والا ہے۔ ان میں چند علامات یہ بیان کی گئی ہیں۔

۱۵ر رمضان کو خلاف معمول سورج گرہن اور آخر ماہ میں چاند گرہن ہو گا۔ (اسے کسوف و خسوف کہتے ہیں) زوال سے وسط عصر تک سورج رک جائے گا اور مغرب سے طلوع ہو گا۔ ایک ایسا ستارہ طلوع ہو گا جو چاند کی مانند فروزاں ہو گا۔ اس کے دونوں پہلو جڑ جائیں گے مشرق میں آگ بلند ہو گی جو تین یا سات روز بھڑکتی رہے گی۔ آسمان میں سرخی ظاہر ہو گی جو چہار اطراف پھیل جائے گی دریائے فرات میں طغیانی اس قدر ہو گی کہ پانی کوفہ کی گلیوں میں بہنے لگ جائے گا۔ بغداد میں دن کے پہلے حصے میں سیاہ آندھی آئے گی۔ ایک زلزلہ بغداد کی اکثریت آبادی کو زندہ درگور کر دے گا۔ اور وہاں خوف کا تسلط ہو جائے گا۔ جان و مال اور زراعت میں بے پناہ خسارہ ہو گا ٹڈی دل کے وقت بے وقت حملے فصلیں تباہ کر دیں گے۔ سورج کی نکیہ میں ایک چہرہ ظاہر ہو گا مردے قبر سے باہر آ جائیں گے اور پھر لگاتار ۲۴ دن تک ہونے والی مسلسل بارش مہدی کے ظہور کی آخری علامت ہو گی[39]۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی علامتیں بیان کی گئیں ہیں۔

مہدی کے عقیدے کی آڑ میں بہت سے لوگوں نے دعویٰ مہدویت کیا۔ اکثر نے علیحدہ فرقے کی طرح ڈالی ان مدعین مہدویت میں عبداللہ مہدی ابن محمد حبیب ابن امام صادق، محمد بن عبداللہ مہدی ہرغی، عباس فاطمی، محمد بن علی سنوسی، غلام احمد قادیانی اور مہدی سوڈانی زیادہ مقبول ہوئے ان افراد نے تاویل اور تردید سے کام لے کر اپنے آپ کو مہدی موعود ظاہر کیا۔

چودھویں صدی ہجری مہدی کے ظہور سے متعلق بڑی گہما گہمی اور افراتفری کا شکار رہی۔ اصحاب تاویل نے قرآن کی سورۃ سجدہ کے پہلے رکوع کی ایک آیت سے یہ مفہوم مراد لیا ہے کہ خدا آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امر کرتا رہے گا پھر وین آسمان پر چڑھ جائے گا اور اس سے پہلے کا عرصہ انسانی معیار کے مطابق ہزار سال ہو گا۔

حدیث نبوی میں پہلی تین صدی ہجری کو خیر القرون کہا گیا پس تاویل کی گئی کہ تیسری صدی ہجری کے بعد ہزار سال تک دین آسمان کی طرف اٹھتا جائے

گا۔ یہاں تک کہ چودھویں صدی میں مہدی آ جائے گا۔ بعض نے کہا کہ تیرھویں صدی کے اواخر یا چودھویں صدی کے اوائل میں مہدی موعود ظاہر ہو جائے گا۔

عبدالعزیز محدث دہلوی کا خیال تھا کہ "بعد بارہ سو ہجری کے حضرت مہدی کا انتظار کرنا چاہئے اور شروع صدی میں حضرت کی پیدائش ہے۔" خواجہ حسن نے کتابچہ شیخ سنوسی اور ظہور مہدی آخر الزمان میں لکھا کہ تمام عالم عرب مہدی کا منتظر ہے سنوسی کا خیال ہے کہ ۱۳۰۳ ہجری میں ظہور ہو گا جب کہ متعدد بزرگوں کی روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۴۰ ہجری تک لازماً مہدی آ جائیں گے ابن عربی نے پیش گوئی کی تھی کہ ۱۳۳۵ ہجری میں مہدی آ جائے گا۔ ادھر مقدمہ ابن خلدون کے مطابق ابن عربی کا قول تھا، ہجرت کے بعد خ ف ج کے گزرنے پر ظہور مہدی ہو جائے گا۔ جفری قواعد کی رو سے ہجرت کے حروف کی مقدار ۶۰۸ اور خ ف ج کی مقدار ۶۸۳ ہوتی ہے جن کا مجموعہ ۱۲۹۱ ہجری کے مساوی ہوتا ہے۔

یہ اختلافات جگہ جگہ ملتے ہیں مثلاً علامہ الشعرانی نے "الیوا قیت و الجواہر" میں پیدائش ۱۲۵۰ ہجری درج کی حجج الکرامہ فی آثار القیامہ کے بیان کے مطابق شاہ ولی اللہؒ نے تاریخ ظہور کے لئے لفظ چراغ دین استعمال کیا ابجدی اعتبار سے یہ ۱۲۶۸ ہجری ہوتا ہے۔ رئیس امروہہ مولوی محمد حسین نے مہدیؑ کے ظہور کا زمانہ ۱۳۰۰ ہجری لکھا میر عبدالحئی نے "حدیث الغاشیہ" میں کہا کہ امام مہدی چودھویں صدی کے سال ہفتم میں ظاہر ہوں گے جو ۱۳۰۷ ہجری بمطابق ۱۸۸۹ء ہے۔

دیکھا جائے تو یہ تمام دعوے اور پیش گوئیاں باطل ہو گئیں کیونکہ کوئی ایسا مہدی سامنے نہ آیا جس نے عالمگیر سطح پر انسان کو متاثر کیا ہو۔ لیکن مہدی کا انتظار پھر بھی جاری ہے۔ اس دوران ایک گروہ کی طرف سے بانی جماعت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے بارے میں دعویٰ مہدویت اور مسیحیت ہوا کہ مرزا صاحب نے کہا تھا کہ مسیح اور مہدی ایک ہی شخص ہیں جو غلام احمد کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اس سلسلے میں مختصر سا جائزہ ان تاویلات کا لیا جاتا ہے جو ظہور مہدی سے متعلق پیش گوئیوں کو مرزا صاحب پر چسپاں کرتی ہیں۔

ابو داؤد کی کتاب الملاحم میں نبیؐ سے منسوب ایک روایت کا بیان ہے کہ اللہ امت محمدیؐ کے لئے ہر صدی کے سر پر مجدد دین مبعوث فرمائے گا۔ کتاب حجج الکرامہ میں اس کی تفصیل (جو متنازع شخصیات پر مشتمل ہے) کچھ یوں ہے کہ پہلی صدی ہجری کے مجدد عمر بن عبدالعزیزؒ دوسری کے شافعیؒ و حنبلؒ پھر ابو شرح اور حسن اشعری پھر ابو عبیداللہ نیشاپوری اور قاضی باقلانی۔ پانچویں صدی کے غزالی پھر غوث اعظم پھر ابن تیمیہ اور معین الدین چشتیؒ پھر صالح بن عمر اور حافظ عسقلانی پھر جلال الدین سیوطی، دسویں صدی ہجری میں محمد طاہر گجراتی پھر مجدد الف ثانی پھر شاہ ولی اللہ پھر آخر میں تیرھویں صدی ہجری میں سید احمد بریلوی، چودھوی صدی کا مجدد کون تھا؟ یہ طے ہونا باقی ہے غلام احمد صاحب قادیانی کے متبعین یہ مجددانہی کو قرار دیتے ہیں۔ احادیث اور دیگر اقوال میں ظہور مہدی کی ایک اہم نشانی خلاف معمول سورج اور چاند گرہن لگنا ہے جسے کسوف و خسوف کہتے ہیں اور اس کے لئے رمضان کا مہینہ بیان ہوا ہے (بحوالہ سنن دار قطنی) ۱۸۹۴ء میں (بمطابق ۱۳۱۱ ہجری) رمضان کی تیرہ اور اٹھائیس تاریخ کو کسوف و خسوف واقع ہوئے تو صرف مرزا غلام احمد صاحب مدعی مہدویت تھے۔ اس بات کا ریکارڈ ۶ر اپریل ۱۸۹۴ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ سے مل سکتا ہے[40]۔ غلام احمد صاحب قادیانی سے متعلق سکھ مذہب کے بانی نانک کا ایک قول بھی بڑی مناسبت رکھتا ہے "تاں مردانے پچھیا گرو جی! بھگت کبیر جیہا کوئی ہور بھی ہوئیا اے؟" "سری گرو نانک جی آکھیا" مردانیاں ایک جٹیٹا ہوسی پراساں تو پچھے سو برس توں بعد ہوسی۔" اساں یعنی "ہم" صیغہ جمع ہے ظاہر ہوا کہ سب گوروؤں کے سو سال بعد موعود کا ظہور ہو گا۔ آخری گورو گوبند سنگھ عالمگیر کے دور میں آئے جن کے ٹھیک سو سال بعد غلام احمد کا ظہور ہوا۔ مزید تقویت اسے یوں ملتی ہے کہ "پھر مردانے پچھیا، جی! کیٹھڑی تھائیں اتے ملک وچ ہوسی؟ تاں گور جی نے کہیا، مردانیاں! وٹالے دے پرگنے وچ ہوسی" (جنم ساکھی بھائی بالا والی وڈی ساکھی ۲۵۱ مطبع مفید عام پریس منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز)[41] سلسلہ کلام میں آگے وٹالے یعنی بٹالہ کا ذکر آیا ہے جو ضلع گورداس پور مشرقی پنجاب کا شہر ہے جہاں مرزا صاحب نے جنم لیا۔ گرونانک کا ایک اور اشارہ بھی معنی خیز ہے "آون اٹھرتے جاون ستانوے ہور بھی اٹھ سی مرد کا چیلا (گرنتھ صاحب تنگ مجلّہ ۱۳۷) یعنی ۱۸۷۸ھ بمطابق ۱۸۲۱ء سے ۱۸۹۷ھ بمطابق ۱۸۴۰ء کے دوران ایک خاص مرد کا چیلا ظاہر ہو گا۔

مہدی کا ظہور کہاں سے ہو گا یہ بھی حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ حجج الکرام کے مطابق وہ خراسان سے آئیں گے کنز العمال کسی قحطان کا پتہ دیتی ہے۔ جواہر الاسرار کی روایت میں اس جگہ کا نام کدعہ بتایا گیا ہے۔ بحار الانوار میں کرعہ نامی بستی کا تذکرہ ہے۔ اور بہت سی روایات مشرق اور ہندوستان کا

تذکرہ کرتی ہیں جہاں مہدی پہلی بار سامنے آئے گا۔ جعفر صادقؒ سے روایت ہے کہ وہ مہدیؑ کعبہ سے پشت ٹیک کر اپنے ظہور کا اعلان کرے گا۔ غلام احمدی حضرات کعبہ سے ٹیک کا مقصد اسلام پر قائم ہونا اور کدعہ، کرعہ کادعہ اور قحطان کو قادیان قرار دیتے ہیں۔

ابن خلدون نے اس بارے میں یہ رائے دی کہ مہدی کا نام قوم اور دیگر تفصیلات اس قدر اختلافات کے ساتھ بیان ہیں کہ سوائے قلیل الدخل کوئی تنقید سے خالی نہیں۔ آئے دن اسلام پر بدترین حالات مسلط ہوتے رہے ہیں اور اخلاقی دیوالیہ پن عروج پر رہا ہے۔ ایسے میں ظہور مہدیؑ سے متعلق پیش گوئیوں کے بیان کردہ حالات میں سے کچھ مشترک ہو جاتے ہیں تو غلغلہ ظہور بلند ہو جاتا ہے جیسے بغداد سے متعلق پیش گوئیاں خلیج میں عراق امریکہ جنگ میں تقریباً پوری ہو گئیں تھیں اور بعض خوش فہموں نے صدام حسین کو مہدی کہنا شروع کر دیا تھا۔

مہدی کا تصور بنتا یا ٹوٹتا رہے انتظار کی کیفیت طاری رہتی ہے کیونکہ "عقل چاہتی ہے اور فطرت مطالبہ کرتی ہے دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانہ کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اس کا نام امام المہدی ہے جس کے بارے میں پیش گوئیاں نبیؐ کے کلام میں موجود ہیں۔" (تجدید و احیاء دین از مودودی) اور "احتیاج نوع انسانی بتاتی ہے کہ زمانے میں...... حجۃ اللہ (مہدی) کا وجود ضروری ہے...... یہی وجہ ہے کہ اس دور کے عقلمند جرمن بھی کہتے ہیں کہ اب اصلاح عالم کے لئے سپرمین ضروری ہے" (آثار قیامت و ظہور حجت سید عباس قمر زیدی الواسطی)

مہدی کے ساتھ ساتھ ایک اور آئندہ آنے والی شخصیت عیسیٰؑ کی ہے۔ عیسائی دنیا اور مسلمان دونوں ان کے ظہور کے منتظر ہیں۔ بائبل میں اس سے متعلق مندرجہ ذیل بیان ملتا ہے۔ جب مسیح صلیب کے بعد اٹھ کر شاگردوں کے پاس آئے اور پھر آسمان کی طرف بلند ہو گئے تو شاگرد اوپر دیکھنے لگے۔ تو دو سفید پوش گواہ آئے "اے گلیلی مردو تم کیوں کھڑے آسمان کی طرف دیکھتے ہو؟ یہی یسوع جو تمہارے پاس سے آسمان پر اٹھایا گیا ہے اسی طرح پھر آئے گا جس طرح تم نے اسے آسمان پر جاتے دیکھا ہے[42]" (اعمال ۱.۱۱) عہد نامہ قدیم میں ہے "ایک ہزار دو سو نوے دن ہوں گے۔ مبارک وہ جو انتظار کرتا ہے اور ایک ہزار تین سو پینتیس (۱۳۳۵) روز تک آتا ہے" (دانی ایل ۱۲.۱۲۹) لطف کی بات یہ ہے کہ عیسائی دنیا میں بھی ۱۹ ویں صدی کے دوران مسیحؑ کی آمد ثانی کا غلغلہ مچ گیا تھا جیسا مسلمانوں میں مہدی سے متعلق شور ہوا۔ مثلاً ہز گلوریس اپیئرنگ، کرائسٹس سیکنڈ کمنگ، دی کمنگ آف دی لارڈ، کتب میں اس بات کا اظہار کیا گیا۔ ۱۸۸۴ء میں عیسائی محققین کے ایک بورڈ نے کتاب " ملینیل وان " شائع کی جس میں تحقیق کے بعد آمد ثانی کا سال ۱۸۷۳ء قرار دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ ۱۹۱۴ء تک مسیح اپنے مقدسوں کو جمع کرتے رہیں گے۔ ۱۸۹۶ء میں لندن سے مسیحی عالم جے بی ڈمبل کی کتاب "The Appointed Time" شائع ہوئی۔ محقق کا خیال تھا۔

The new era by all the nine methods in both diagrams is 5896 1/2 our 1898 1/4

یعنی سب نوشتوں اور قاعدوں کی رو سے نیا دور (آمد مسیحؑ) آدم سے ۱/۲ ۵۸۹۶ ہے جو ہمارے (عیسوی کلینڈر سے) ۱/۴ ۱۸۹۸ء بنتا ہے[43]

لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا۔ یوں عیسائی دنیا مسیحؑ کی آمد ثانی کو کلیسا کے احیائے نو کی شکل میں پیش کرنے لگی لیکن بڑی تعداد میں لوگوں کے دل کی آواز یہی ہے "ہمیں معلم بھی چاہئے اور پیغمبر بھی...... غالباً ہمیں ایک مسیح کی ضرورت ہے اور "ہمیں سچے نجات دہندہ کی ضرورت ہے۔ ہاں ایسے نجات دہندہ کی جو ہمیں ان بیڑیوں سے آزاد کر دے کہ جس میں ہم بچپن سے ہی جکڑے جاتے ہیں" (علم الاخلاق اور تعلیم از جے۔ ایچ۔ میور)

مخصوص مسلم مکاتب فکر کے ہاں خمسہ مقدسہ یا پنج تن پاک خدا کے بعد سب سے بلند اور برتر ہستیاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ یہ پانچ پاک افراد محمدؐ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ ہیں۔ معتقدین اور متکلمین ان پانچ کا ذکر عموماً اور علیؓ کا تذکرہ خصوصاً پیشگوئیوں کے حوالے سے کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ نفوس مقدسہ کا تذکرہ قبل از اسلام قدیم مذاہب اور دیومالا میں موجود ہے اساطیر اور معینہ آسمانی کتب میں آہلی، ایلی اور ایلیاقسم کے نام سے ملتے ہیں جنہیں لفظ "علی" کی تبدیل شدہ شکلیں قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک حوالہ ایل کے بھٹناگر ایم اے آئی اے کی تصنیف بودھیا چمتکا مطبوعہ انکار پست کالیا کانپور ۱۹۲۷ء سے لیا گیا ہے۔ واقعہ یہ بیان ہے کہ ایک دن بدھ خواب سے چونک کر اٹھے اور رقت سے رونے لگے جس سے ان کا اتالیق اعلیٰ بھی چونک کر اٹھ بیٹھا اور دریافت کیا کہ کیا ہوا؟ بدھ نے بتایا "کسی پرم آتما نے مجھے اشیرباد دی کہ تمہاری تپسیا سپھل ہوئی جاؤ میرے نام کی مالا جپو جو چاہو گے مل جائے گا میرا نام آلیا ہے۔ مجھے ملنا ہو تو میرا مکان پوتر استھان میں پھٹی ہوئی دیوار کے پاس ہے۔ وہاں تمہیں بالک کے روپ میں ملوں گا مگر وہ سمے ابھی دور ہے یہ کہہ کر اس نے ایک چمکتی تلوار نکالی اور گرجدار آواز میں کہا دیکھ میں سنگھ ہوں مجھے پرمیشور نے سنگھ بنا کر بھیجا ہے۔ جا سنسار کو پاپو پرادھوں سے روک من کے

روگ ہٹا۔ ہردے کو ستھرا کر پرالیدھ ٹھیک ہو جائے گی میرے مہاراج آنے والے ہیں ان کا کمنامان اور میرے مہاراج کے مہاراج کا بھی"۔

یہ روایت بڑی معنی خیز ہے۔ خواب میں آلیا (ایلی/علی) دکھائی دیتا ہے جو اپنا مقام پوتر ستھان (پاک مکان) بتاتا ہے۔ (روایات کے مطابق فاطمہ بنت اسد کعبہ کے قریب پہنچیں اور اس کی ایک دیوار پھٹ گئی آپ اندر آ گئیں اور وہیں کعبہ میں علی کی ولادت ہوئی) ممکن ہے پھٹی ہوئی دیوار سے مراد اس واقع کی طرف اشارہ ہو۔ ایک اور واضح تر خبر یہ بیان ہے کہ میں سنگھ "شیر" ہوں اور مجھے پرمیشور نے سنگھ بنا کر بھیجا۔ یہ لفظ شیر خدا یا اسد اللہ کی طرف اشارہ ہے جو علیؓ کا لقب ہے پھر کہا میرے مہاراج (محمدؐ) آنے والے ہیں اور ان کے مہاراج (اللہ) کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرنا۔(44)

کیا یہ ایلیا علیؓ ہے؟ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد علیؓ کو واسطہ بنا کر مدد کی طالب ہوتی ہے اور "یا علی مدد" کا نعرہ بلند کرتی ہے ادھر بدھ بھی مصیبت کے وقت اسی ایلیا کو پکارتے ہیں بدھ کی یہ التجا "بدھ یوگیا" کہلاتی ہے۔ جس دور میں بدھ کو بدترین مخالفت اور عداوت کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے دعا کی "اے آلیا..... میری دستگیری کر اے پرماتما کے شیر (خدا کے شیر) ..... میری مشکل آسان فرما..... تیرا نام وہ ہے جو پرم آتما کا ہے (روایات کے مطابق علی خدا کا نام بھی ہے)۔ آکہ تجھے دیکھنا ہزاروں پرارتھناؤں کے برابر ہے (النظر علیٰ وجہ علی عبادہ۔ علی کا چہرہ دیکھنا گویا عبادت میں داخل ہے) ..... میری تکالیف تجھے معلوم ہیں تو ہی انہیں دور کر سکتا ہے۔ ادم آلیا۔ ادم آلیا ادم آلیا" (ماخذ رسالہ بدھ گیان از رام نرائن بنارسی مطبوعہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۵۴)۔

پیچھے ہم بدھ مت کی پیش گوئیوں میں متیریا کا تذکرہ دیکھ آئے ہیں جہاں متیریا کو رحمتہ اللعالمین بتایا گیا اسی سلسلہ کلام میں آنند نے بدھ سے متیریا کی مزید وضاحت پوچھی تو آپ نے کہا "اے آنند متیریا وہ ہے جو تمام رشیوں اور منیوں اور تمام مبعوث ہونے والوں کا سلسلہ بند کر دے گا۔ اس کے سر پر پنج پہلو تاج ہو گا جو سورج چاند کی طرح ہو گا۔ اس کے بڑے ہیرے کا نام "آلیا" ہو گا۔ یاد رکھ یہ تمام اجسام اطہر ابتداء سے پیدا ہو چکے ہیں مگر ان کے ظاہر ہونے میں دیر ہے۔ (بودھیا پر کاش ازوید شاستری لالہ ہرگوبند آبلوجیا مطبوعہ سرسوتی پریس بمبئی ۱۹۱۱ء)

معتقدین کا کہنا ہے کہ پنج پہلو تاج پنچتن پاک کی طرف اشارہ ہے اور بڑا ہیرا آلیا جو چاند کی مانند ہے جناب علیؓ کی طرف اشارہ ہے جن کے بارے میں ایک حدیث نبویؐ بھی ہے انا کالشمس علی کالقمر۔ پنچتن کا ایسا ہی حوالہ ہندو مت میں ملتا ہے جیسے رام چندر جی نے اجودھیا کے شاگردوں سے کہا کہ وہ راجوں کا راجہ اپنی روشنی کے ساتھ ظاہر ہو گا۔ جس کے ساتھ بڑا گروہ ہو گا۔ وہ پانچ کنگروں والا تاج پہنچے گا اور اس کے سب سے بڑے کنگرے کا نام "اہالیاہ" (ایلیا؟علی) ہو گا۔ (اجودھیا کا بن بلسی از شنکر داس مطبوعہ آگرہ (۱۹۲۳ء)

سید محمود گیلانی نے ہندو مت سے ایک اور حوالہ رسالہ کرشن بنیتی مولفہ پنڈت رام دھن شائع کردہ ساگری پسند کالیہ دہلی مطبوعہ ۱۹۳۱ء سے لیا ہے واقع کوروؤں پانڈوؤں کی لڑائی کا ہے کرشن جی تخلیہ میں جا کر دعا مانگتے ہیں "ہے پرمیشور، سنسار پرم آتما، تجھے اپنی ذات کی قسم جو آکاش اور دھرتی کا جنم کا دن ہے اور اس کی قسم جو تیرے پیارے کا پیارا ہے تیرے پریتم کا پریتم ہے۔ تجھے اسی کا واسطہ جو "آبلی" ہے جو سنسار کے سب سے بڑے مندر میں کالے پتھر کے نزدیک اپنا چمتکار دکھائے گا تو میری بنیتی سن جھوٹے راکشوں کو نشٹ کر اور سچوں کو فتح دے۔ ہے البیشور! ایلا۔ ایلا۔ ایلا"(45)

کرشن جی کی اس دعا سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آکاش اور دھرتی کے جنم کارن (محمدؐ صاحب لولاک لما باعث تکوین) کا واسطہ دیا جا رہا ہے پیار کے پیارے اور پریتم کے پریتم (محبوب خدا محمدؐ کے محبوب علیؓ) کا واسطہ دیا جا رہا ہے۔ جو آبلی (علیؓ) ہے جو سنسار کے سب سے بڑے مندر (کعبہ اللہ) میں کالے پتھر (حجر اسود) کے نزدیک چمتکار دکھائے گا۔ (پیدا ہو گا) اس واقع کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے۔ مسئلہ صرف لفظ ایلا کا رہ جاتا ہے جس کی تین بار تکرار ہوئی ہے اور پہلے ہم بدھ یوگیا میں اوم آلیا کی تین بار تکرار دیکھ آئے ہیں۔ کیا یہ علیؓ کا قائم مقام لفظ ہے؟ اس سلسلے میں ایک پنڈت کی تحقیق یہ ہے۔ "پراچین سے کی پرانی زبانوں میں ایک سنسکرت بھی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ سب سے پرانی بولی ہے۔ اس میں کوئی شاکھیا ایسے بھی ہیں جو آج کل عام لکھنے پڑھنے اور بولنے ہی نہیں آتے۔ اسی طرح کا ایک نام ایلا ہے "ایلا" اس کا مطلب ہے بڑے ہی اونچے درجے یا اونچے نام والا اور آبل یا آبلی یا آلی بھی اس سے نکلا ہے جیسا کہ عربی زبان میں کہتے ہیں۔ اعلیٰ، عالی، علی، تعالیٰ وغیرہ۔ پراچین ویدوں میں ایسے بہت سے لفظ ملتے ہیں جن کے پڑھنے والے شبہ کر سکتے ہیں کہ وہ عربی کے بگڑے ہوئے ہیں یا سنسکرت سے عرب میں چلے گئے ہیں" ("ناگر ساگر" از پنڈت کرشن گوپال مطبوعہ سمپورن پریس آگرہ شائع کردہ نارائن بک ڈپو آگرہ ۱۹۱۷ء)(46)

دنیا کے زیادہ تر مذاہب کے ہاں شخص موعود کا ذکر ملتا ہے۔ اگر ان گوں ناگوں عقائد کے مطابق زرتشتیوں کا فارسی الاصل "متیا" مذہب زرتشت کا نفاذ کرنے آجائے، ہنود کا کلنکی اوتار یا کرشن ویدک دھرم نافذ کرنے آن پہنچے، بدھوں کا آخری مہاتما اوتار بدھ مت کی حتمی اشاعت کی خاطر نازل جائے جین مت کے غلبے کے لئے آخری مہاویر اور جاپان کا ایمدہ آجائے اور بنی اسرائیل کو اقوام عالم پر مسلط کرنے کے لئے آخری اسرائیلی بھی ظاہر ہو جائے اور اسلام کا بول بالا کرنے مہدی و مسیح موعود پیدا ہو جائیں اور عیسائیت کو پھیلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ دوبارہ تشریف لے آ تو ایک بین الاقوامی تصادم اور بربادی کا ایک طویل سلسلہ شروع نہیں ہو جائے گا؟

ایسے میں ایک نئے نظریئے نے جنم لیا ہے "ہندو کہتے ہیں کہ وہ پورن برہم نش کلنک اوتار دھارن کریں گے مسلمانوں کا وشواس ہے کہ امام مہ کا پرادر بھاؤ ہوگا۔ سکھوں کا وشواس ہے کہ کلکی اوتار ہوگا اور عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ ایشور سے ایک ہو کر پدھاریں گے۔ پرنتواب یہ شیش ہے کہ ساری ستائیں پر تھک پر تھک ہونگی یا ایک ہی۔ اس کا اتر یہ ہے کہ نہیں یہ ایک ہی ہونگی۔ ہندو اسے اپنے درشٹ سے دیکھیں مسلمان اپنی سے۔ سکھ یا عیسائی اسے اپنی درشٹ سے دیکھیں گے (رسالہ ست یگ ستمبر 1941ء)

"آج کل کا زمانہ حیوانی زندگی کا زمانہ نیچ ہے اور جگ لوگوں کی ایسی خوفناک حالت سے مکتی کے لئے ایک اوتار کے آنے کی آرزو کر رہا ہے"۔

دو عظیم جنگوں کے بعد سے مارکسی تصور بیگانگی کی رو سے انسانیت کو شعور ذات کے زیاں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایسے میں وحدت ادیان اور وحدت انسان کے نظریئے کی روشنی میں آئندہ آنے والا انسانیت کا نجات دہندہ بھی ہو سکتا ہے جب وہ انسان کے معاشی سماجی اور نفسی مسائل کا کافی وشافی پیش کرے۔

اگرچہ مارکس اور فریڈرک اینجلس کا خیال یہ تھا کہ بیرونی عوامل جب کسی قوم سے فکر و عمل کی قوتوں کو سلب کر لیتے ہیں تو وہ وہماً کسی آنے وا نجات دہندہ کا پیکر تراش لیتی ہے۔ تاہم جس طرح مذہب اطمینان کی خاطر امید دلاتا ہے ویسے ہی آئندہ آنے والے کا انتظار اور یہ تصور انسانوں کو بڑ سکون اور تسلی سے آشنا کرتا رہا ہے۔

# حیات بعد از موت

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

روح کا عقیدہ یا "ادراک" پیدا ہونے کا نتیجہ مرنے کے بعد کی زندگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ عقیدہ جملہ مذاہب کا سنگ بنیاد۔ مذاہب کے مابین خدا کی ذات، طریقہ عبادات اور دیگر عقائد میں لاکھوں اختلاف ملے مگر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا عقیدہ سب کے ہاں مشترک ہے۔ صرف مت اس عقیدے سے مستثنیٰ ہے (یہ امر بھی غور طلب ہے کہ بدھ ازم مذہب ہے یا نہیں)۔

ازمنہ قدیم کی اقوام کے اثریات سے مرنے کے بعد کی زندگی کے عقیدے کا سراغ ملتا ہے۔ ان اقوام کے مقابر میں مردوں کے ساتھ کھانے پینے استعمال کی دیگر اشیاء مدفون پائی گئی ہیں۔ مصر کے فراعین کے اہرام خزانوں اور اشیائے خورد و نوش کے علاوہ غلاموں کے مجسموں سے بھرے ملے ہیں۔ ا عقیدہ تھا کہ دوسری دنیا میں مردے کو ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ ممی سازی اور حنوط کے طریقے بھی مرنے والے کو اگلی دنیا میں عمدہ اور نفیس جسم ف کرنے کے لئے وضع کیے گئے۔ فرعون کے سر پر چمکتا سنہری اژدھا پاتال میں ارواح خبیثہ کے شر سے فرعون کو محفوظ کرنے کے لئے بنایا جاتا تھا۔

ہندوستان میں ستی کی رسم کے تحت پتی کو اگلے جہاں میں پتنی کا ساتھ دلانا مقصود ہوتا تھا سومیری، آشوری اور وادی سندھ کی قدیم اقوام کا خیال تھ موت کے بعد آدمی ظلمات کی ملکہ کے حضور پیش ہوتا ہے۔

زیادہ تر مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ مردہ قبر میں زندہ کر دیا جاتا ہے اور فرشتوں سے کلام کرتا ہے۔ ایک عباسی خلیفہ نے مردے کا منہ گندم کے دا سے بھر کر بند کر کے دفنا دیا۔ چند روز بعد قبر دوبارہ کھولی تو منہ سے ایک دانہ بھی باہر نہ نکلا تھا اس کا موقف تھا کہ منکر نکیر سے گفتگو کا نظریہ جھوٹا ہے۔ وگ بصورت دیگر مردے کے منہ سے گیہوں کے دانے باہر گرے ملتے۔

سائنس موت کی ماہیت سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے اور فی الوقت وہ یہ ماننے پر تیار نہیں کہ عناصر کے اجزاء کے پریشان ہونے کے بعد "شعور اصل" برقرار رہتا ہے۔

لیکن سب سے عجیب امر مشاہدات کا وہ طویل ریکارڈ ہے جو زمانہ قدیم سے آج تک کے ان بے شمار افراد کے بیانات پر مشتمل ہے جو مرتے مرتے بچے ہوں یا جنہیں موت کی دنیا میں ایک قدم رکھ کر واپس پلٹ آنے کا موقع مل گیا ہو۔ طب و نفسیات کے شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد مریضوں کے بارے میں یہ عجیب بات بتاتے آئے ہیں کہ بسا اوقات نزع کے عالم میں لوگوں نے بیان دیا کہ انہیں کچھ غیر معمولی مشاہدات ہو رہے ہیں۔

ان طبی رپورٹوں نے سنجیدہ طبقے کو مجبور کر دیا کہ اس موضوع کے بارے میں حتمی طور پر ہاں یا نہیں کا فیصلہ دیا جائے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۷۸ء میں "دا امیج آف ورلڈ آرگنائزیشن" نے انس برگ (آسٹریلیا) میں حیات بعد از موت کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا جو ایک ہفتہ جاری رہی۔ اس مباحثے میں دنیا بھر کے چوٹی کے ایک ہزار ڈاکٹر، نفسیات دان اور مذہب کے ماہرین نے اپنی تحقیقات پیش کیں۔ معلوم ہوا کہ سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کو یقین ہو چکا ہے کہ شعور اور احساس کی کوئی نامعلوم شکل مرنے کے بعد برقرار رہتی ہے۔ تاہم مباحثے میں شریک بعض اہل علم نے مستند شہادتوں کی عدم موجودگی اور اپنے نکتہ نظر کے مطابق موت کے بعد کی زندگی کے تصور سے کلی طور پر انکار کرتے ہوئے اسے خود ساختہ قرار دے دیا آخر کار یہ طے پایا کہ یہ موضوع مزید تحقیق کا محتاج ہے کجا یہ کہ اسے محض من گھڑت کہہ کر نظر انداز کر دیا جائے۔(47)

۱۹۷۵ء میں ایک کتاب "لائف آفٹر لائف" شائع ہوئی جس کے مصنف ڈاکٹر ریمنڈ موڈی نے ڈیڑھ سو کے قریب ایسے افراد کے مشاہدات نوٹ کیے تھے جو مرنے کے قریب تھے اس ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اسے اس امر پر بڑی حیرت ہے کہ دل کی مریضوں کے وہ بیانات جو انہوں نے مرتے وقت دیئے تھے۔ تبت کی قدیم مردوں کی کتاب میں بیان کردہ مشاہدات سے کس قدر مشابہ ہیں۔ ڈاکٹر ایلزبتھ کیلر (شکاگو) نے آٹھ سال تک ہزاروں افراد کا دم توڑتے وقت گہرا نفسیاتی جائزہ لیا اور بیان کیا کہ طبی اصولوں کے مطابق تازہ مرے ہوئے افراد کے حواس بعد از مرگ کچھ دیر تک کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک اور ماہر نفسیات ڈاکٹر کارلس اور سس (نیویارک) طب کے شعبے سے آٹھ سو افراد سے انٹرویو کیے اور یہ معلوم کیا کہ بیشتر مرتے ہوئے مریضوں کی جذباتی کیفیات مشترک ہوتی ہیں۔(48)

اس مرحلے پر نزع کی کیفیت اور موت کا مزہ چکھ لینے والوں کے مبینہ مشاہدات کا مسئلہ سامنے آتا ہے حیات بعد از مرگ کے منکرین کا بیان اس سلسلے میں مختلف توجیہات پیش کرتا ہے۔

علم طب کے ماہرین کا خیال ہے کہ عالم اختصار (جب سانس اکھڑنے لگے) میں دماغ میں آکسیجن کی قلت اور کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس کا ارتکاز ہونے لگتا ہے۔ جس سے شعور معطل ہو جاتا ہے اور موہوم صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ کی رائے میں مرض الموت میں گرفتار مریض کو دی گئی نشہ آور ادویات ان عجیب مشاہدات کا تاثر پیدا کرتی ہیں جن کی حقیقت وہم سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ یہی سبب ہے اس تیز چمک یا روشن سرنگ کا جس کے دیکھنے کا دعویٰ مریض کرتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ مریضوں نے اپنے مردہ عزیز و اقارب سے نزع کے عالم میں کیسے ملاقات کی اور بعض عیسائیوں نے "مسیح" کا دیدار کس طرح کیا تو اس کا جواب ماہرین نفسیات یہ دیتے ہیں کہ درحقیقت لاشعور کی کارستانی ہے جو دم آخر سماجی رویوں اور مذہبی رجحانات کو ان صورتوں میں پیش کرتا ہے۔

لیکن ان "سادہ" توجیہات کو بھی تیقن کی حد تک درست نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ موت کی دنیا سے پلٹ آنے والوں کی زبانی بعض اوقات ایسی باتیں سننے میں آتی ہیں کہ شاہدین کو سخت اچنبھا ہوتا ہے۔ آسٹریلیا کی کانفرنس کے ایک مندوب کا بیان ایسا ہی تھا۔ طبی اصولوں کے مطابق وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر اسے بچانے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے اور لطف کی بات یہ تھی کہ وہ شخص اوپر سے ان لوگوں کو اپنی لاش پر جھکا کام کرتا دیکھ رہا تھا۔ اسے بدن کے بغیر گویا کسی بوجھ سے آزادی کے بعد عجیب سی بشاشت کا سا احساس ہو رہا تھا۔ مگر جس وقت ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششیں کامیاب ہونے لگیں تو اسے سخت کوفت ہوئی کہ وہ واپس بدن کے اندر بھیجا جا رہا ہے۔(49)

ایک اور شخص نے اس سے بھی عجیب بیان دیا اس کا کہنا تھا کہ ایک رات وہ کار میں سفر کر رہا تھا کہ سامنے سے ایک لڑکی نے مدد کا اشارہ دیا۔ وہ گاڑی روک کر اترا تو معلوم ہوا کہ اس لڑکی کو اپنی گاڑی کے پنکچر شدہ ٹائر تبدیل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ وہ بخوشی وہیں بیٹھ کر ٹائر تبدیل کرنے لگا۔ ناگہاں

ایک تیز رفتار گاڑی کی تیز روشنی نے اس کی آنکھیں چندھیادیں اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو بچا سکتا۔ ایک شدید تصادم ہوا اور وہ حواس کھو بیٹھا۔ کچھ دیر بعد اسے "محسوس" ہوا کہ وہ اپنے بدن سے نکل کر اوپر موجود ہے۔ نیچے کچھ ڈاکٹراس کے مردہ بدن میں زندگی کے آثار تیز کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور آس پاس پولیس بھی کھڑی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ لڑکی پریشان کن نظروں سے اس کی لاش کو دیکھ رہی ہے اور اس کا پرس موٹر پر دھرا ہوا ہے اور عین اس وقت ایک شرابی شخص لوگوں کی نظریں بچا کر پرس اپنی صدری میں اڑس لیتا ہے۔ نیچے ڈاکٹراس کے پھیپھڑوں پر جھٹکے دے رہے ہیں اسے محسوس ہوا کہ وہ واپس بدن میں داخل ہو رہا ہے اور اس کا تنفس بحال ہو رہا ہے۔ ہوش میں آتے ہی اس نے لڑکی کو اشارے سے قریب بلایا اور اس کے کان میں اچکے کی واردات کی اطلاع دی۔ لڑکی نے اسے حیرت سے دیکھا اور پاس کھڑے پولیس کے سپاہی سے یہ بات کہی۔ سپاہی فوراً شرابی کی جانب مڑا اور اس کی صدری سے پرس بر آمد کر لیا۔ یہ امر نہ صرف پولیس اور لڑکی کے لئے بلکہ اس شخص کے لئے بھی عقل سے ماورا تھا۔ یہ یقیناً حواس کا فریب نہیں تھا۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار واقعات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ موت کے بعد شعور کی کوئی ایسی شکل ضرور باقی رہتی ہے جسے مذاہب حیات بعد از موت کا نام دیتے ہیں، اور جو اہل سائنس کو تحقیق کی دعوت دیتی ہے۔

متعلقہ موضوعات

طائر روح کی پرواز

# آواگون / تناسخ

تناسخ کا عقیدہ واضح ترین طور پر اہل ہند میں ہندو مذہب کی نمایاں علامت کے طور پر نظر آتا ہے۔ جس کی رو سے مرنے کے بعد روح اپنے کرموں کے مطابق بار بار جنم لیتی ہے اچھے کام انسانی جون میں اور برے کام نیچ ذات یا جانوروں کی جون میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حتیٰ کہ انسانی نفسانی خواہشات کو مار کر روح کو پاک کر لے اور مکتی (نجات) حاصل کر کے آواگون کے چکر سے چھوٹ جائے۔ البیرونی اس بارے میں ہندو عالموں کی رائے نقل کرتا ہے "ایک ہی زندگی کی مدت نفس کے لئے اتنی کم ہے کہ وہ اس میں ان اکثر چیزوں کا جن پر دنیا مشتمل ہے احاطہ نہیں کر سکتا"[50]

آواگان کا عقیدہ قدیم یونانیوں کے علاوہ بدھ مت کا بھی جزو ہے۔ لیکن بعض اسلامی مذاہب میں بھی یہ عقیدہ نظر آتا ہے۔ جیسے نصیری عقیدہ کہ جناب علیؓ کا منکر جانور بن جاتا ہے اور عمومی طور پر گناہ گار نصیری، یہودی، سنی مسلم یا عیسائی کی شکل میں لوٹتا ہے۔ ان کے ہاں تناسخ ۷ مدارج میں منقسم ہے۔

ابن عربی نے فصوص الحکم میں بیان کیا ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جس میں تناسخ کی جڑیں مضبوط نہ ہوں۔ اس سلسلے میں اس نے بڑے دلائل بھی دیئے ہیں۔ جن کی تردید بہت مشکل تصور کی جاتی ہے۔

احمد بن حائط معتزلی کے مرید کہتے تھے کہ اول اول خدا نے ہر قسم کی مخلوق پیدا کر کے ایک قسم کو اس دنیا سے الگ کسی اور دنیا میں رکھا اور پھر جب کسی نے نافرمانی کی اسے اس کے بداعمال کے مطابق انسانی حیوانی شکل میں اس دنیا میں بھیجا۔ اس کے بعد وہ ایک سے دوسری شکل میں منتقل ہوتے رہیں گے۔ حتیٰ کہ ان کے گناہوں کے اثرات زائل ہو جائیں۔

آواگان عقیدے سے بڑھ کر حقیقت کی جانب گامزن ہے۔ دنیا بھر سے ایسے ناقابل تردید شواہد موصول ہوتے رہے ہیں جو آواگان کی حقیقت پر دال ہیں۔ خصوصاً انڈیا اس معاملے میں بڑا خوش نصیب رہا ہے۔ جہاں سے بے تحاشا رپورٹیں آتی رہی ہیں۔ غالباً وہاں کا مشہور ترین واقعہ پٹہ پرتی کے سائیں بابا کا ہے جو ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوا جس کے بقول وہ بھارت کے مشہور ترین روحانی شخص شہردی کے سائیں بابا کا دوسرا جنم ہے جو ۱۹۱۸ء میں وفات پا چکا تھا۔ ۱۴ برس کی عمر تک سائیں بابا عام سا لڑکا تھا لیکن بعد ازاں وہ ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو کر ویدانت کے فلسفے پر بلا تکان بولتا چلا جاتا۔ شعر کہتا اور مختلف زبانیں بولتا اور کرامتیں دکھاتا (دیکھیں کرامتیں)۔

۱۹۲۶ء میں دہلی کے ایک ہندو گھرانے میں ایک لڑکی شانتی دیوی نے جنم لیا۔ بچی اوائل عمر سے خاموش طبع تھی بعض اوقات اس کی ماں نے اسے ہوا میں

باتیں کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ جب شانتی ۷ سال کی ہوئی تو ایک روز ماں سے کہنے لگی کہ وہ پہلے متھرا نامی قصبے میں ایک جنم گزار چکی ہے[51]۔ ماں باپ کو بچی کی ذہنی سطح پر شبہ ہو گیا اور وہ اسے ہسپتال لے گئے لیکن ڈاکٹر خود بڑے حیران ہوئے بچی سے بات چیت کے نتیجے میں وہ کوئی خاص رائے قائم کرنے سے قاصر رہے اور والدین کو مشورہ دیا کہ بچی سے گفتگو کرتے رہا کریں اور اگر وہ اپنے دعوے پر قائم رہے تو پھر ہسپتال لے آئیں۔

جب بچی ۹ برس کی ہوئی تو کہنے لگی کہ متھرا کی زندگی میں اس کا نام لدگی تھا اور وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ ایک روز ایک شخص شانتی کے باپ سے کاروباری سلسلے میں ملنے آیا۔ دروازہ شانتی نے کھولا تو اس اجنبی کو دیکھ کر ساکت کھڑی ہو گئی ماں دوڑی دوڑی آئی تو شانتی نے کہا کہ پچھلے جنم میں وہ شخص اس کے شوہر کا چچازاد بھائی تھا۔ اس شخص نے اس بات کی تصدیق کی کہ فی الحقیقت اس کے چچازاد بھائی کی بیوی کا نام لدگی ہی تھا لیکن اسے تو مرے ہوئے بھی ۱۰ برس ہو چکے ہیں۔ شانتی کے والدین نے بیٹی کے علم میں لائے بغیر متھرا سے لدگی کے شوہر کو دہلی بلا لیا کہ دیکھیں شانتی کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔

جب وہ شخص ان کے ہاں آیا تو شانتی لپک کر اس کی طرف بڑھی اور خوش ہو کر کہنے لگی کہ یہ اس کا پچھلے جنم کا خاوند ہے۔ یہ شخص شانتی کے باپ کے ہمراہ اعلیٰ حکام سے ملا اور معاملے کی تفتیش کی دعوت دی۔ انڈیا حکومت نے سائنس دانوں کی ایک ٹیم معمے کے تجزیئے کے لئے روانہ کی۔ یہ لوگ شانتی کو متھرا لے آئے۔ یہاں شانتی پہلی بار آئی تھی لیکن علاقے سے بخوبی واقف تھی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی اور اسے چھکڑے پر بٹھا دیا گیا وہ گاڑی بان کو پتہ بتاتی رہی اور چھکڑا چلتا رہا۔ آخر کار اس نے ایک گلی کے باہر چھکڑا رکوا کر کہا کہ یہی اس کی رہائش گاہ تھی۔ آنکھوں سے پٹی اتاری گئی۔ سامنے ایک بڈھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ شانتی نے فوراً کہا کہ یہ میرے شوہر کا باپ تھا۔ اس نے اپنے دو بچوں کو بھی پہچان لیا مگر ایک تیسرے بچے کی شناخت نہ کر سکی یہ وہی بچہ تھا جسے جنم دیتے وقت لدگی مر گئی تھی۔ شوہر کی ماں اور بھائی کو وہ پہلے ہی ریلوے اسٹیشن پر پہچان چکی تھی اور ان سے متھرا کی مقامی بولی میں گفتگو کر کے سائنس دانوں کو مزید حیرت زدہ کر دیا تھا۔ کیونکہ شانتی کو والدین کے ہاں صرف اردو سیکھنے کا موقع ملا تھا۔

آخر کار سائنس دانوں نے رپورٹ پیش کر دی کہ شانتی کے بیانات ضرور درست ہیں مگر وہ اس معمے کی عقلی توجیہہ کرنے سے قاصر ہیں۔

---

ترکی کے شہر ادرنہ کے ایک سبزی فروش کے ۹ بچوں میں سے ایک چار سالہ بچہ اسماعیل ہے جو اپنے پچھلے جنم کا قصہ سناتا ہے۔ اس کے بقول اس کی پیدائش سے چھ برس پہلے۔ عابد سوز و لمس نامی پانچ بچوں کا امیر تاجر باپ جو قتل کر دیا گیا تھا اسماعیل کے روپ میں دنیا میں لوٹ آیا ہے۔

اٹھارہ ماہ کی عمر سے ہی اس کے عجیب و غریب رویئے سے اس کے والدین پریشان ہو گئے۔ بعد میں جب اس کی عمر محض دو سال تھی اس نے بتایا کہ کسی طرح ایک روز اصطبل میں تین آدمیوں نے حملہ کر کے اسے، اس کے دو بچوں اور حاملہ بیوی کو قتل کر دیا۔ یہ بتانے پر اس کے ماموں نے اسماعیل کو ڈانٹا تو اسماعیل نے اسے کہا کہ "تم بڑے ناشکرے آدمی ہو ایک زمانے میں جب تم میرے ملازم تھے تو میں نے تم سے فیاضانہ سلوک کیا تھا" یہ سُن کر ماموں چونک گیا کیونکہ حقیقت میں ایسا ہی تھا۔

جب یہ خبریں پھیلیں تو کچھ لوگ اسمٰعیل کو ساتھ لے کر میلوں دور عابد سوز و لمس کے علاقے میں لے گئے۔ جس کی بیٹی سترہ سالہ گلسرین کو دیکھتے ہی اسمٰعیل دوڑا اور گلے لگا کر کہنے لگا "میری بچی تو کیسی ہے؟ پھر گھر میں جا کر ایک عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ میری پہلی بیوی ہے جس میں نے اس لئے طلاق دی تھی کہ میری دوسری بیوی تمہیدی زیادہ خوبصورت تھی اور پھر پہلی بیوی کے ہاں اولاد بھی تو نہ ہوئی تھی"۔ پھر وہ نگرانوں کے ہمراہ اصطبل میں آیا اور پچھلے جنم کے قتل کی تاریخ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۶ء انہیں بتلائی اور قاتلوں کی بابت بتایا اور اس کی تفاصیل عین پولیس رپورٹ کے مطابق تھیں۔

ترکی کے ڈاکٹروں کی انجمن کے صدر ڈاکٹر رفعت نے پورے وثوق سے کہا کہ کوئی چار سال کا بچہ اتنی باتیں ذہن میں محفوظ نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی ایسی ایکٹنگ کر سکتا ہے۔

انی یار گلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر مینولینن نے ایک مرتبہ کہا کہ گو میرے پاس اس بات کے ۴۴ ثبوت موجود ہیں کہ ۴ سالہ اسمٰعیل مرحوم تاجر عابد سوز و لمس ہے لیکن میں اس بات کی کوئی سائنٹفک توجیہہ پیش نہیں کر سکتا کیونکہ میں تسلیم نہیں کرتا کہ انسان دوسرا جنم لے کر دنیا میں واپس آجائے گا۔

(دیکھئے "طائر روح کی پرواز")

# حوالہ جات

## باب اول


۱۔ اقبال کا علم الکلام ص ۶۰
۲۔ اسرائیل اور قرآنی پیشگوئیاں از علی اکبر
۳۔ Guiness Encyclopedia P:458
۴۔ انسان نے کیا سوچا
۵۔ People's Almanac II
۶۔ اقبال کا علم الکلام ص ۱۴۵ - ۱۴۷
۷۔ ایضاً ص ۱۴۷
۸۔ The Book Of Great Mysteries P:310
۹۔ ایضاً ص ۳۱۵
۱۰۔ ایضاً ص ۳۱۲
۱۱۔ Bible Facts
۱۲۔ سفرنامہ حجاز از قاضی سلیمان منصور پوری ص ۸۷
۱۳۔ Mysteries of unexplaind (Reader's Digest) P:301
۱۴۔ Modern Mysteries of the world P:255
۱۵۔ Mysteries of the world P:87
۱۶۔ Modern Mysteries of the world P:268
۱۷۔ عکس بولان کوئٹہ خاص نمبر
۱۸۔ Modern Mysteries of the world
۱۹۔ میری آخری کتاب۔ برق
۲۰۔ ایک اسلام از غلام جیلانی برق
۲۱۔ People's Almanac II P:266
۲۲۔ ایضاً ص ۱۲۶۵
۲۳۔ The Book of Great Mysteries P:71
۲۴۔ People's Almanac II P:1266
۲۵۔ On this day (Hamlyn) 13th Oct.
۲۶۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا
۲۷۔ انسان بڑا کیسے بنا، میخائل ایلین ص ۱۴۲
۲۸۔ ایضاً ص ۱۴۴
۲۹۔ علم الکلام۔ ادریس کاندھلوی
۳۰۔ تاریخ کا نیا موڑ۔ علی عباس جلالپوری
۳۱۔ اسرائیل قرآنی پیشگوئیوں کی روشنی میں۔ علی اکبر ص ۹
۳۲۔ بعثت محمدؐ۔ وسیم ڈار ص ۶
۳۳۔ اسرائیل اور قرآنی پیشگوئیاں ص ۹
۳۴۔ ایک اسلام۔ برق ص ۲۰۹، ۲۱۰
۳۵۔ بعثت محمدؐ۔ ص ۸
۳۶۔ ایک اسلام۔ برق ص ۲۱۲، ۲۱۳
۳۷۔ اسرائیل اور قرآنی پیشگوئیاں ص ۸
۳۸۔ ایضاً ص ۸
۳۹۔ الامام المہدی۔ سید محمد کاظم القزوینی
۴۰۔ ظہور امام مہدی۔ ص ۶۱
۴۱۔ ایضاً ص ۵۹
۴۲۔ مسیح کی آمد ثانی۔ گارڈن لنڈے ص ۶
۴۳۔ چودھویں صدی ہجری کا اختتام۔ اعظم اکبر ص ۴۸، ۵۰
۴۴۔ ایلیا ادیان عالم کا مرکز نجات۔ حکیم محمد گیلانی۔ ص ۳۸
۴۵۔ ایضاً ص ۷
۴۶۔ ایضاً ص ۸
۴۷۔ رجعت
۴۸۔ ظہور امام مہدی۔ ص ۹۴
۴۹۔ ایضاً ص ۹۵
۵۰۔ مارکس اینڈ اینجلس آن ریلجین
۵۱۔ World of incredible but true P:27

باب دوم

# اسرار تہذیب

# گمنام تہذیبیں ..... بے نام شہر

گم گشتہ تہذیبوں کے آثار کرہ ارض کے صحراؤں، جنگلوں اور پانی کے عظیم ذخائر کے نیچے بے مہری ایام کی تصویر بنے بیٹھے ہیں وہ ایسے شہر ہیں جن کی تعمیر کرنے والوں کی خبر نہیں۔ وہ کون تھے؟ کیا تھے؟ ان کا انجام کیا ہوا؟۔ ان شہروں کے کلچر اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا کسی دوسرے تمدن سے رشتہ قائم کرنا خارج از امکان ہے۔ ہم نے کتنی ہی نامعلوم تہذیبوں کو معلومہ تہذیبوں کے حوالہ سے جانا ہے لیکن کرہ ارض کے ان ملیامیٹ ہو جانے والے تمدنوں کو کس تہذیب سے منسلک کریں؟

ہم ان قدیم شہروں کے اصل ناموں سے بھی واقف نہیں۔ نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ انہیں کن لوگوں نے بسایا اور ان پر کیا گزری۔

ماضی کے لوگوں کا وطیرہ رہا ہے کہ وہ بعض تہذیبوں کے آثار سے واقف ہوتے ہیں مگر رفتہ رفتہ انکا پتہ اور تذکرہ اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ پھر کسی کو بھی یاد نہیں رہتا تب عرصہ بعد اچانک کوئی اس علاقے میں آنکلتا ہے۔ تو جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان کسی تمدن کے آثار پھر سے "دریافت" ہو جاتے ہیں۔

کتنی ہی تہذیبیں تنزل کا شکار ہو کر دوسروں کے ہاتھوں مغلوب ہو گئیں۔ قومیں غلام بنالی گئیں یا اپنے عظیم شہروں کی عظیم عمارتوں کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ امریکہ کی مثال لیں۔ ہسپانویوں کی آمد سے پیشتر کتنے ہی قبائل اپنی اصل شناخت کھو چکے تھے اور کتنی ہی پراسرار تہذیبیں پیوند خاک ہو چکی تھیں جن کے آثار نے بعد میں ان کے وجود کی خبر دی۔ حتیٰ کہ وہ زندہ تہذیبیں بھی جو مغرب نے امریکہ میں برباد کر کے رکھ دیں۔ ہم ان میں سے اکثر کے نام سے بھی واقف نہیں اور انہی ناموں سے پکارتے ہیں جو ہسپانویوں نے اپنی سمجھ کی حد تک سمجھے۔ ہم صرف اندازہ لگاتے ہیں کہ ان تہذیبوں کی قدامت کتنی ہو گی اور یہ کہ یہ لوگ محض جنگلی، وحشی اور احمق نہیں تھے۔ ازٹک قوم کی عظمت ہسپانویوں کی آمد سے پہلے دھندلا چکی تھی۔ وہ پستی کی اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ انسانی قربانی اور آدم خوری بھی کرنے لگ گئے تھے۔ اسی طرح دوسرے امریکی کلچر بھی روبہ تنزل تھے۔ لیکن ان کی عظمت کے کافی سے زیادہ ثبوت بہرحال موجود تھے۔

ہم نہیں جانتے کہ ملیامیٹ ہو جانے والے کتنی ہی تہذیبوں کے آثار ابھی تک دریافت ہونے کے منتظر ہیں۔ اس ضمن میں کافی ٹھوس مثالیں موجود ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں کمبوڈیا کے دو حیرت انگیز شہر "ان کور واٹ" اور "ان کور تھام" اور سری لنکا کے شہر "انورادھاپورا" اور "پولا ناروا" ایسے ہی عظیم قدیم حسین تعمیرات سے مزین شہر تھے جنہیں بہت عرصہ ہوا بھلا دیا گیا تھا۔ جنگل اگتے اگتے ان شہروں کے اندر تک چلے گئے تھے۔ وسطی امریکہ کے کئی گمشدہ شہروں کا سراغ پہلی مرتبہ فضائی سفر کے دوران ملا جب سبز جنگلوں کے درمیان سبزہ سے ڈھکے ایسے ڈھیر دکھائی دیئے جو اصل جنگل کے مقابلے میں خاصے باترتیب تھے۔ کھوج لگانے پر معلوم ہوا کہ مٹی اور سبزہ وغیرہ ہٹانے پر ان ٹیلوں کے نیچے عظیم اہرام نما عمارتیں موجود ہیں اور یوں جنگلوں میں شہر کے شہر نکل آئے جن کے نامعلوم باسی نامعلوم وجوہات کی بنا پر ان شہروں کو خالی کر گئے تھے۔

امیزون اور برازیل کے بارے میں عرصہ دراز سے روایت چلی آ رہی ہے کہ اندرونی جنگلوں میں ابھی تک پتھر کے زمانے کے لوگوں کا بسیرا ہے۔ یہ روایتیں ہسپانوی حملہ آوروں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ مثلاً پیرو پر قابض ہونے والے فرانسسکو لوپز کو ریڈ انڈین لوگوں نے بتایا کہ نمکین جھیل

کے درمیان ایک جزیرہ "مانو آ" ہے۔ جہاں عمارتوں کی دیواریں اور چھتیں سونے کی بنی ہوئی ہیں۔ یہ لوگ سونے کے برتنوں میں کھاتے پیتے ہیں حتیٰ کہ معمولی چیزیں بھی چاندی کی بنی ہوئی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں سورج کا مندر ہے جس کے باہر سونے کے بنے ہوئے بلاؤں کے مجسمے بنائے گئے ہیں۔ (1)

کیا امیزون کے گھنے جنگلات میں ایک بھرا پرا شہر موجود ہے جو دنیا سے کٹ کر پھلنے پھولنے والے ایک پراسرار قبیلے اور قوم کا مرکز ہے؟ کم از کم روایات یہی کہتی ہیں! مشہور ہے کہ وہاں کے لوگوں کے ہاں دولت کی ریل پیل ہے۔ یہ لوگ ہسپانویوں سے پہلے سے یہاں آباد ہیں۔ ان کی جلد سفید ہے۔ ان کی عمارتوں سے رات کے وقت روشنی کھڑکیوں اور روزنوں سے باہر نکلتی ہے مگر یہ لوگ روشنی کے لئے آگ کی بجائے کوئی اور نامعلوم چیز استعمال کرتے ہیں۔ ان کے پراسرار شہر کو انڈین قبائل کی آبادیوں نے گھیر رکھا ہے۔ ۱۵۹۵ء میں سروالٹر ریلے اس کی تلاش میں نکلا مگر ناکام پلٹ آیا۔

سترھویں صدی عیسوی میں ہسپانویوں نے اس کی تلاش شروع کر دی۔ فرانسسکو راپوسو کا کہنا تھا کہ ۱۷۴۳ء میں وہ جنگل میں گھومتے پھرتے ایک سطح مرتفع پر آ نکلا۔ وہاں سے اس نے ۴ میل کے فاصلے پر بہت بڑے شہر کے آثار دیکھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہر میں داخل ہو گیا۔ شہر بظاہر خالی تھا۔ اس کا کچھ حصہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا تھا لیکن عظیم الشان سنگین عمارتیں کسی عظیم تمدن کا پتہ دے رہی تھیں۔ ان پر نہایت مہین کندہ کاری بڑی مہارت سے کی گئی تھی۔ شہر سے باہر کھدی ہوئی کانوں کے آثار تھے۔ جہاں سے چاندی کی کچ دھات نکالی جاتی ہو گی۔ وہ لوگ ادھر ادھر گھوم رہے تھے کہ ان کی مڈبھیڑ سفید جلد والے انڈین لوگوں سے ہوئی جنہوں نے عجیب و غریب لباس پہن رکھا تھا۔ راپوسو اور اس کے ساتھی ان لوگوں کو دیکھ کر وہاں سے رفو چکر ہو گئے مبادا یہ لوگ انہیں مار ہی ڈالیں۔

ان کے بعد کئی مرتبہ شہر کی تلاش کے لئے ٹیمیں روانہ کی گئیں مگر ناکام رہیں ۱۷۶۴ء میں ایک مرتبہ سینکڑوں افراد پر مشتمل تلاش کنندگان کی ایک ٹیم جنگل میں گم ہو گئی اور پھر اس کی خبر نہ ہوئی۔ ایک اور موقع پر برازیلی فوج کے ۱۴۰۰ سپاہی جنگل میں گم ہو گئے۔ (2)

برطانوی فوج سے سبکدوش ہونے والے کرنل پرسی فاسیٹ کو گمشدہ شہر کی تلاش کے حوالے سے سب سے زیادہ مشہور ہونے کا اعزاز ملا۔ یہ شخص ۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران تلاش کی مہموں میں برابر شریک ہوتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ شہر برازیل میں دریائے امیزون کے معاون دریا "زنگو" کے آس پاس کہیں ہو سکتا ہے۔ فاسیٹ کو یقین تھا کہ یہ لوگ قدیم زمانے کی ترقی یافتہ تہذیب کی باقیات ہیں اور امکان ہے کہ جنگلوں میں ان کی طرح اور بھی شہر موجود ہوں جن کی بابت جدید دور کے مہذب انسان کو کچھ علم نہیں۔

یہ بات بعید از امکان نہیں کہ امیزون، گیانا اور وینزویلا کے علاقوں میں قدیم شہر مہذب انسانوں کی نظروں سے ابھی تک پوشیدہ ہوں۔ اس کی ایک اچھی مثال پیرو میں ایک پہاڑ پر واقع شہر ماچو پیچو ہے جو اس صدی کے شروع میں دریافت ہوا۔ اسی طرح کئی ہوا بازوں نے اطلاع دی ہے کہ پرواز کے دوران زمین پر سنگین عمارتوں والے شہروں کے آثار دیکھنے میں آتے ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جنگلوں میں کوئی ایسا قبیلہ، کوئی ایسی قوم ابھی تک دریافت نہ ہوئی ہو اور یہ لوگ اپنی قدیم روایات اور رسم و رواج کے وارث ہوں۔ یہ لوگ اپنے ان عظیم آباؤ اجداد کی باقیات سے ہوں جن کی نسل کو معدوم تصور کیا جا رہا ہو۔ انڈین لوگ ہسپانویوں کو اندرونی گھنے جنگلوں کی طرف اشارہ کر کے بتاتے تھے کہ وہ جس چیز کے پیچھے اتنا خوار ہو رہے ہیں ادھر کے قبائل کے ہاں بکثرت موجود ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اس حرکت کا مقصد ہسپانوی حملہ آوروں سے جان چھڑانا ہو اور انہیں اندرونی علاقوں کے وحشی قبائل سے ٹکرانا ہو مگر برطانوی مہم جو کرنل فاسیٹ کا بیان تاریخ دانوں اور سونے کی متلاشیوں کے لئے فکر انگیز ہے۔

"ایک بات یقینی ہے کہ جنوبی امریکہ بلکہ شائد تمام قبل از تاریخ دنیا کے معمے کا حل اسی بات میں مضمر ہے کہ ان شہروں کا محل وقوع مخصوص کر دیا جائے اور سائنسی تحقیق کی رسائی اس مقام تک ممکن بنائی جائے مجھے اتنا معلوم ہے کہ ایسے شہر ضرور موجود ہیں۔ میں نے بذات خود ان کا کچھ حصہ دیکھ رکھا ہے اور اسی وجہ سے میں خود کو وہاں جانے کے لئے مجبور پاتا ہوں۔ اگر منظم طریقے پر تلاش کی جائے تو عظیم تہذیبوں کی یہ باقیات مل سکتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے میں ماہرین کو یہ یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ برازیل میں قدیم تہذیبوں کے آثار موجود ہیں۔ میں کئی مقامات پر گھوما پھرا ہوں اور انڈینوں نے بارہا مجھے اگلے علاقے کے لوگوں اور ان کی تعمیرات کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بتائی ہیں۔"

کرنل فاسیٹ ۱۹۲۵ء میں برازیل میں گم ہو گیا تھا۔ تاہم اس کی ڈائری، جو بعد میں مل گئی تھی، کے آخری اندراج میں تحریر تھا کہ وہ گمشدہ شہر سے بس دو

تے کی دوری پر رہ گیا ہے۔③

کیا فاسیٹ اس پراسرار شہر کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جس کی تلاش میں وہ اتنے عرصے سے سرگرداں تھا؟ کیا شہر کے محافظوں نے اسے قتل کر یا؟ یا فاسیٹ نے بقیہ عمر اسی معاشرے میں بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا___ ہم نہیں جانتے۔

بالائی فضا سے سمندر کافی گہرائی تک نسبتاً صاف نظر آتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہوا بازوں نے کئی مرتبہ اطلاع دی کہ سمندر کے اندر کئی غرقاب انسانی تعمیرات کے نمونے دیکھنے میں آئے ہیں مثلاً. بحرہ ایجیہ کے آس پاس رومی تعمیرات قصبے اور بندر گاہیں غرقاب حالت میں موجو ہیں۔ ن کی تصاویر فضا سے اس وقت کھینچی گئیں۔ جب پانی صاف شفاف اور نسبتاً. ساکن تھا تاکہ اچھے نتائج آئیں کیونکہ عموماً. ایسے مقامات دھندلائے ہوئے رہتے ں۔

امریکی سواحل کے سمندر میں کئی غرقاب آثار دیکھے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آج جہاں اتنا بڑا سمندر ہے وہاں کبھی انسانی آبادیاں ہوا کرتی تھیں۔ ثلاً فلوریڈا سے کچھ فاصلے پر بہامس کے قریب ۱۹۶۸ء میں دو ہوا بازوں نے ہزاروں سال پرانے ان اہم رہائشی علاقوں کا سراغ لگایا جو اب پانی کے نیچے سمندر کی تہہ میں دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔

یہ دو ہواز باز رابرٹ برش اور ٹرگ ایڈمز تھے۔ وہ درحقیقت اس علاقے پر زیر آب تعمیرات کی تلاش میں ہی نکلے تھے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ۱۹۲۳ء ں ایک نامور پیش گو ایڈگر کیسی نے کہا تھا کہ بمنی Bimni (فلوریڈا) کے قریب گمشدہ سرزمین (دیکھئے "گمشدہ سرزمینیں") اٹلانٹس کے آثار ۱۹۶۸ء ۱۹۶۹ء میں دریافت ہو جائیں گے۔ اس پیش گوئی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوابازوں نے سب سے پہلے جزیرہ اینڈروس کے قریب کسی زیر آب تعمیر کے آثار کا پتہ گا لیا جس پر اسفنج اور سمندری گھاس نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ یہاں سے دریافتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ کبھی یہاں ایک پورا شہر کا شہر آباد تھا۔ کچھ گ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس علاقے میں انہوں نے دو عدد اہرام نما تعمیرات بھی دیکھی ہیں اور ایک جگہ بڑا سا محرابی دروازہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ خشکی کا ایک بہت بڑا ٹکڑا تھا۔ شائد برفانی عہد سے بھی پہلے یہاں انسانی آبادیاں تھیں۔ عہد برفانی کے خاتمے پر برف پگھلنے لگی تو سطح آب بلند ہو گئی اور یہ تمام آبادیاں رق ہو گئیں۔ اپنے چہرے پر یہ سوال لئے کہ انہیں کن لوگوں نے آباد کیا تھا اور ان پر کیا بیتی؟④

# پُراسرار تہذیبیں ..... گمشدہ تاریخ

علم انسانیات (انتھروپولوجی) اور علم آثار (آرکیالوجی) کے ماہرین کے نزدیک ان امور پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ انسانی تمدن کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی مروجہ نظریات کی رو سے کرہ ارض کے انسان تین بنیادی نسلوں اور ان کے مابین اختلاط سے ظاہر ہونے والی ذیلی نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تین نسلوں کا یہ نظریہ سامی مذاہب کی روایات کی یاد دلاتا ہے جس کی رو سے طوفان نوحؑ کے نتیجے میں کرہ ارض پر تمام انسان ہلاک ہو گئے تھے اور موجودہ انسان وحؑ کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو اس عظیم آفت میں بچا لئے گئے تھے۔

پہلے پہل انسانی چہروں کے خدوخال ایک دوسرے سے زیادہ مشابہ ہوں گے پھر آبادیاں دور دراز علاقوں میں منتقل ہوتی گئیں اور اپنے آپ کو ہر ایک نے بداگانہ ماحول کے مطابق ڈھال لیا۔ ۳ نسلیں گزرتے وقت کے ساتھ ممتاز ہوتی گئیں۔ ایک کاکیشائی (یورپی سفید فام) دوسری منگولی یا زرد رنگ کی ایشیائی نسلیں اور تیسری سیاہ فام یا نیگرو نسل بڑی نسلوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ جغرافیائی بنیادوں پر مزید چھوٹی نسلوں کی قسمیں بھی بیان ہوئی ہیں۔ یہ تمام نسلیں اور تہذیبیں اپنے اپنے ماحول اور جینیز کے مطابق جداگانہ اور مخصوص کلچر کی حامل ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑا معمہ ہے کہ یہ کرہ ارض پر کس انداز میں پھیلتی چلی ئیں اور ان کے درمیان کہاں کہاں روابط پیدا ہوئے۔ کئی نسلوں کا منبع غائب ہے۔ بہت سی اقوام کے Origion آپس میں ملتے ہیں لیکن دیگر نسلیں یوں علوم ہوتی ہیں کہ گویا آسمان سے ٹپک پڑیں۔

دنیا کی ایک قدیم تہذیب سومیری تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ قوم بابل کے قریب آباد تھی۔ مذہب، سائنس، ادب اور زندگی کے بے شمار شعبوں میں ان کی

ترقی کی رفتار حیرت انگیز تھی۔ تاریخ دان ان کی عظمت کے قصائد لکھتے نہیں تھکتے لیکن آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ سمیریا کے لوگ کہاں سے آئے تھے۔ یہی احوال حتی قوم کا ہے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کس نسل سے تعلق رکھتے تھے؟ امریکہ کے اصل باشندوں کا وجود بھی ایک معمہ ہے۔ یعنی یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ یہ لوگ خطہ امریکہ میں کب اور کہاں سے داخل ہوئے۔ کیونکہ یہ بات طے ہے کہ براعظم امریکہ میں انسان باہر سے ہی وارد ہوا۔

بہت سے ماہرین آثار قدیمہ اس نظریئے کو تسلیم کرتے ہیں کہ امریکی انڈین ابتداء میں سائبیریا سے خشکی کے ایک پل "بیرنگ سٹریٹ" سے امریکہ میں داخل ہوئے اور پھر جنوب تک پھیلتے چلے گئے۔ گو بیرنگ اسٹریٹ سے تاحال کوئی ایسے آثار نہیں ملے کہ جن کی بنیاد پر الاسکا (امریکہ) اور سائبیریا (ایشیاء) کے درمیان ۱۵ ہزار سال پہلے کسی ایسے خشک راستے کا نظریہ درست ثابت ہو سکے جو قدیم زمانے کے ابتدائی شکاریوں کی گزر گاہ کے طور پر کام آیا ہو مگر عمومی طور پر ہر کوئی اس نظریئے کو مانتا ہے۔ تاہم مہذب انڈین قبائل میں سے ایک بھی اس نظریئے کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ عجیب بات کہتے ہیں کہ وہ شمال مغرب کے بجائے مشرق سے یہاں آئے ہیں۔

وسطی امریکہ کے قبائل ازٹک، ٹولٹک اور مایا کا کہنا تھا کہ وہ مشرقی سمندر کے کسی جزیرے، ازٹلان یا اٹلان سے آئے ہیں۔ ازٹک لوگوں نے تو ہسپانویوں کو میکسیکو کے ساحل کے قریب ویراکروز کے نزدیک وہ جگہ بھی دکھائی جہاں بقول ان کے انکے آباؤ اجداد بحری سفر کے خاتمے کے بعد پہلی مرتبہ لنگر انداز ہوئے تھے۔

جب مایا جیسی ترقی یافتہ قوم کا سراغ ملا تو ہر طرف سے نظریات کی بھرمار ہو گئی کیونکہ کوئی اور انڈین اتنا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ اہراموں کے سبب کوئی انہیں مصری بتاتا تھا۔ کوئی ہندوستانی، کوئی ان کا تعلق "بنو اسرائیل کے گمشدہ قبائل" (دیکھئے) سے جوڑتا تھا۔ تو کوئی اوقیانوس، الاسکا اور کارتھیج سے۔ ادھر کچھ لوگ دلائل دے رہے تھے کہ مایا غرقاب ہو جانے والے افسانوی براعظم اٹلانٹس کے بچ جانے والے لوگ ہیں۔ (دیکھے "گمشدہ سرزمینیں) مگر مایا بذات خود کیا کہتے تھے؟

مایا تہذیب کے اولین محقق بشپ ڈی لانڈا کا بیان ہے کہ مایا کا خیال ہے کہ وہ مشرق سے آئے ہیں۔ گوئٹے مالا کے مایا کہتے ہیں کہ "قریج بادشاہ کے تین فرزندوں نے مشرق میں واقع اس سرزمین کی سیر کی جہاں سے ہمارے آباء آئے تھے۔" ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قدیم انڈین بھی مشرق سے آنے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ "عظیم جھیلوں" کے انڈینز کا عقیدہ ہے کہ ان کے اجداد ایک زمانے میں "طلوع ہوتے ہوئے آفتاب" کی طرف رہتے تھے۔ ہوپی انڈینز کی روایت ہے کہ وہ منطقہ حارہ سے بحری سفر کے ذریعے امریکہ آئے تھے۔ "ڈیلاویر" کے "لنی لناپی" کہتے تھے کہ وہ پہلی سرزمین سے آئے تھے جو بحر عظیم کے اس پار ہے۔ "سائی اوکس" کی روایت ہے کہ پہلے پہل تمام انڈین کے قبائل ایک تھے اور وہ سب ایک ایسے جزیرے میں رہتے تھے جو مشرق میں واقع تھا۔ لووا انڈینز کے روایتی قصوں میں تھا کہ پہلے سب لوگ ایک جزیرے پر رہتے تھے جہاں صبح کا ستارہ پیدا ہوتا ہے۔ جنوبی امریکہ میں چن چن شہر کے معماروں، چائمس کا بیان تھا۔ کہ ان کے اجداد "کے نوز" کشتیوں پر سوار ایک بڑے بیڑے کی شکل میں آئے تھے۔ ان تمام روایات کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر امریکی انڈین بیرنگ اسٹریٹ سے ہی آئے تھے تو پھر مشرق سے آنے کی روایت اتنی شدت سے ان میں کیونکر چلی آ رہی ہے؟

پراسرار تہذیبوں میں سے ایک اہم تہذیب "جزیرہ ایسٹر" کی تہذیب ہے۔ یہ جزیرہ جنوبی امریکہ کے مغرب میں سمندر کے بیچ الگ تھلگ موجود ہے۔ چلی اور پیرو یہاں سے قریب ترین فاصلے پر موجود ہیں۔ اور یہ فاصلہ بھی ۴ ہزار کلو میٹر بنتا ہے! خشک زمین کا قریب ترین علاقہ ایک جزیرہ پٹکارین ہے جو ۲ ہزار کلو میٹر دور واقع ہے۔ یہ جزیرہ صرف ۲۵ کلو میٹر لمبا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہاں کے باسی کب کہاں سے اور کیوں آئے۔ انہیں سمندر میں اتنا دور آنے کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی؟ پھر انہوں نے یہ جزیرہ تلاش کیسے کر لیا اور آخر اسی بے آب و گیاہ اجاڑ زمین پر رہنے کا فیصلہ کیوں کیا؟

یہ مردہ آتش فشانوں کے لاوے سے بننے والا نیم بنجر جزیرہ ہے۔ پانی کی سخت قلت ہے۔ دنیا کو پہلی مرتبہ اس کے وجود کی خبر ۱۷۲۲ء میں ہوئی۔ وہ ایسٹر کا دن تھا جب ایک ڈچ سیاح "روگے وین" یہاں وارد ہوا۔ وہ دور دور تک سمندر سے گھرے اس جزیرے پر ملی جلی نسل کے لوگوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ یہاں اس کا استقبال گہرے سیاہ، سفید اور سرخ بالوں والے لوگ کر رہے تھے۔

ایسٹر کے دن دریافت ہونے کی مناسبت سے اسے ایسٹر آئی لینڈ کا نام دیا گیا۔ روگے وین کے بعد یہاں کیپٹن کک آیا اور اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں ایک

برطانوی خاتون کیتھرین یماں آئی جس نے جزیرے کے حالات تحریر کیے جو اتفاقاً ضائع ہو گئے۔ مگر وہ دنیا والوں کو اس جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئی کیونکہ اس نے بتا دیا تھا کہ یہ چھوٹا سا جزیرہ عجائب اور اسرار سے بھرا پڑا ہے۔ چنانچہ ناروے کے ایک ماہر انسانیات "تھار ہیر دھال" کی معیت میں ۱۹۵۵ء میں ایک سائنسی تحقیقاتی گروپ یماں آیا اور اپنی دانست میں ان اسرار کو حل کر کے چلا گیا لیکن ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک مصنف ایرک وان ڈینیکن یماں آیا اور اس نے جزیرے کے بارے میں یہ رائے دی کہ عہد قدیم میں خلاء سے آنے والے لوگوں نے زمین کے باشندوں پر مہربانیاں کیں اور ان کی یادگار ایسٹر آئی لینڈ کے پراسرار مجسمے ہیں۔ مصنف نے اپنے نظریات ایک کتاب چیریٹس آف دی گاڈز میں پیش کئے جنہوں نے تہلکہ مچا دیا۔ تھار ہیر دھال کو چیلنج دیا گیا کہ وہ وان ڈینیکن کے سوالات کا جواب دے۔ اس بحث مباحثے میں جزیرے کی جانب لوگوں کی توجہ بڑھتی چلی گئی۔ گو بعد ازاں ڈینیکن کے نکالے ہوئے بیشتر نتائج غلط ثابت ہوئے مگر جزیرے کی پراسراریت میں کمی نہیں آئی مثلاً دنیا کے اس حصے میں واقع جزیرے پر رنگ برنگے لوگ کس طرح جمع ہو گئے۔ (۵)

جزیرے کے باسیوں کے بقول یماں دو نسلیں موجود تھیں جن میں سے ایک کو وہ "ہاناؤ ایپی" یا لمبے کانوں والے بتاتے تھے۔ جب کہ دوسری نسل "ہاناؤ مومو کو" یا چھوٹے کانوں والوں کی تھی۔ لمبے کانوں والے حکمران طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جزیرے کا رسم الخط "رونگو رونگو" (دیکھئے پراسرار تحریریں) پڑھ سکتے تھے۔ اور جزیرے کے پراسرار مجسمے بھی انہی کی یادگار تھے۔ چھوٹے کانوں والے محکوموں نے ان کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور چند مجسمے گرا دیئے تھے۔ (۶)

۱۷۲۲ء تک جزیرے کی آبادی چند ہزار نفوس پر مشتمل تھی لیکن ۱۹ویں صدی تک غلامی کی نحوست کی بدولت اصل باشندوں کی تعداد گھٹ کر صرف ۱۰۰ رہ گئی۔ باقی باشندے پیرو لے جائے گئے مگر سفر کی صعوبتیں، تشدد اور ماحول راس نہ آیا اور تقریباً سب ہی مرکھپ گئے۔ اب بھی جزیرے پر دودھ ایسی سفید رنگت والے لوگ موجود ہیں جن کے بال سرخ اور دہکتی آگ کی مانند ہیں۔ مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ جزیرے کے یہ لوگ قدیم حکمران "لمبے کانوں والے" لوگوں کی باقیات سے ہیں۔

یہ لوگ کہاں سے آئے؟ کوئی اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ دو نظریات اس ضمن میں یہ ہیں کہ یا تو یہ لوگ جنوبی امریکہ سے آئے تھے یا پھر بحرالکاہل کے دور دراز جزائر پولی نیشیا سے۔ تھار ہیر دھال پہلے نظریئے کا حامی تھا۔ اور اس کو ثابت کرنے کے لئے اس نے بالسا لکڑی کی ایک کشتی پر یماں تک سفر بھی کیا۔ مگر بعد ازاں کمپیوٹر تحقیق کے ذریعے بحری رووں اور دیگر شواہد کے مطابق جنوبی امریکہ سے آمد کا نظریہ درست ثابت نہ ہو سکا۔ تاہم جزیرے میں سفید جلد والے لوگوں کی موجودگی ایک معمہ ہی بنی رہی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ گوری رنگت والی قوموں کی آمد کی روایات دنیا کی دوسری سانولی اور سرخ اقوام میں بھی ملتی ہیں مثلاً آسٹریلیا کے اصل باشندوں نے یورپین لوگوں کو بتایا کہ ان کے آنے سے بہت پہلے یماں سفید رنگت کے لوگ آ کر جا چکے تھے۔ "انکا" ریڈ انڈین قوم کے حکمرانوں کی جلد مکمل طور پر سفید تھی۔ گویا حکمران طبقہ کسی اور ہی نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی طرح ایک قبیلہ سفید انڈینوں کا تھا جسے مکمل طور پر ختم کر دیا گیا تھا۔ مہذب انڈین قبائل کی روایات کے مطابق انہیں تہذیب سکھانے کا سہرا ان سفید لوگوں کے سر ہے جو مشرق سے آئے تھے۔ دیکھئے "خطوں کی دریافت"

مصر کی تاریخ ایک اور عجوبہ ہے۔

آج یماں کا عظیم اہرام شہرہ آفاق ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے ہم عصر یا بعد کے کسی بھی مصری مورخ نے اس کا ذکر تک نہیں کیا غیر مصریوں میں ہزاروں برس بعد یونانیوں اور رومنوں نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا۔

مصر کے فراعنہ سے پہلے مصری تہذیب معمولی نوعیت کی تھی۔ فرعونوں کا دور ایک بہت بڑی گتھی ہے۔ کیونکہ فرعونی تہذیب کی بنیاد یہی معمولی تہذیب تھی لیکن فرعونی مصر نے ایک دم سے ترقی کی۔ بالکل ایسے جیسے کہ تہذیب تعمیر اور فنون کسی قریبی کلچر سے در آمد کر لئے گئے ہوں مگر فرعونوں کی ہم عصر کوئی بھی تہذیب اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی جہاں سے مصری تہذیب نے اس قدر اثر لیا ہو۔ پھر یہ حیرتناک اور تیز ترقی کا عمل کسی طرح سرانجام پایا۔ کوئی نہیں جانتا۔ شائد ہی تاریخ میں کسی قدیم قوم نے اتنے متنوع شعبوں میں ترقی کی تیز رفتاری کا ایسا حیران کن کارنامہ سرانجام دیا ہو جیسا فراعنہ مصر کے ہاں نظر آتا ہے پھر یہ بھی ایک معمہ ہے کہ اچانک نمودار ہونے والی یہ تہذیب رفتہ رفتہ زوال کا شکار کیوں ہو گئی۔

کسی بھی اجڑی تہذیب کو دیکھ کر انسان کے دل میں سینکڑوں سوال جنم لیتے ہیں۔ ان سوالوں کا جواب تحقیق اور تاریخ سے ملتا ہے۔ لیکن خود تاریخ کی

حیثیت ایک بڑے معمے کی سی ہے جس کے بہت سے ٹکڑے گم ہیں۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ قدیم تاریخی اہمیت کے حامل نوادرات جو اس معمے کو حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں ان میں سے صرف ۱۰ فیصد میسر ہو سکے ہیں۔ باقی میں سے بعض کی دریافت باقی ہے۔ اور بیشتر انسانی غفلت یا دانستہ اور غیر دانستہ طور پر بربادی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کی ایک مثال امریکہ کی قدیم تہذیبیں ہیں۔ وہاں ہسپانویوں کی آمد سے قبل کئی قدیم نادر اور عجوبہ روزگار تعمیرات موجود تھیں جو نئے تعمیر کنندوں کے ہاتھوں زمین بوس ہوئیں اور ان کا سامان نئی تعمیرات کے مسالے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ (دیکھئے پراسرار تعمیرات) دوسری قسم کی مثال تاریخی ریکارڈ کی تباہی ہے جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

اوپر بتایا گیا ہے کہ تہذیبوں کے معموں کو سمجھنے کے لئے دو اہم کاموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ۱۔ تحقیق، تلاش اور جستجو۔ ۲۔ لکھی ہوئی تاریخ کا مطالعہ۔

تاریخ کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اس دور کے انسان سے تعلق رکھتی ہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا۔ یہ تاریخ جہالت اور تاریکی کا زمانہ کہلاتی ہے۔ علم آثار قدیمہ کے کھوجی اس کے بارے میں متحجرات اور قدیم آثار کے ذریعے اندازہ لگاتے ہیں۔ لیکن اس دور کے انسان کے بارے میں اندازے لگانے میں غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ اب تک کسی شے کی قدامت کا اندازہ لگانے کے لئے کسی آلے کو حرف آخر نہیں سمجھا جا سکتا۔ پہلے ایک طریقہ کاربن ڈیٹنگ کہلاتا تھا مگر اس کے ذریعے معلوم کردہ زمانے میں ہزاروں برس کا فرق پڑ سکتا تھا۔

آثار قدیمہ کی تلاش میں کئی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک مثال دی جاتی ہے۔

سب سے پہلے کسی تہذیب کا سراغ ملتا ہے یا لگایا جاتا ہے۔ اس مشکل مرحلے کے بعد کھدائی کا مشکل مرحلہ شروع ہوتا ہے جس میں خصوصی احتیاط برتنا پڑتی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر سرمایہ خرچ کرنا پڑتا ہے! تہذیبوں کا سراغ لگانا ایک خاصا مشکل کام ہے۔ اگر کسی قدیم تحریر یا ظاہری آثار سے براہ راست یا بالواسطہ اس بات کا اندازہ ہو بھی جائے کہ کسی علاقے میں کبھی انسانی آبادی ہوا کرتی تھی تب بھی تلاش کا کام اتنا سہل نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ایک نظریہ ہے کہ "انٹارکٹیکا کے خطے میں انسانی تہذیب کسی قدیم دور میں موجود تھی۔" اس نظریئے کے حق میں مختلف شواہد موجود ہیں مثلاً بعض قدیم نقشوں میں براعظم انٹارکٹیکا کی اصل حدود دکھائی گئی ہیں (دیکھئے "پراسرار نقشے") گویا زمانہ قدیم میں ایک دور ایسا بھی تھا۔ جب انٹارکٹیکا برف سے آزاد خشک زمین پر مشتمل تھا۔ نقشوں میں اس علاقے کا مفصل بیان بھی اس بات کا ثبوت ہے کیونکہ اس قدر تفصیل کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یہ علاقہ قدیم زمانے میں کسی خاص اہمیت کا حامل متصور ہوتا ہو گا جو بحری سفر میں پڑاؤ اور مقامی آبادی سے تجارت کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے۔ ان نقشوں میں خطے کے پہاڑوں دریاؤں اور ندیوں کے علاوہ قریبی جزائر کی نشاندھی بھی کی گئی ہے۔

انٹارکٹیکا کے اندرونی علاقوں میں برف کی موٹی تہہ صدیوں سے جمی ہوئی ہے۔ اب اگر برف کے نیچے زمین پر کسی آبادی کے قدیم آثار تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو پہلے برف کی اس قدر سخت اور ۲ میل موٹی تہہ کو توڑنا پڑے گا جو بے حد مشکل کام ہے۔ چنانچہ اگر یہاں آثار کی کھوج نہیں لگائی جاتی تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ محض ایک نظریئے کو ثابت کرنے کے لئے ایسا کام کرنا حماقت متصور ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نظریئے کو بعض شواہد سے تقویت بھی ملی ہے۔ مثلاً شمالی برفانی خطے میں کام کرنے والے بلڈوزروں کے ذریعے برف کی کم موٹی تہوں کو توڑنے کے نتیجے میں نیچے سے قبل از تاریخ عہد کے لمبے دانتوں والے شیر، اون دار شمالی ہاتھی (میمتھ) اور مسٹوڈان جیسے حیوانات منجمد حالت میں دستیاب ہوئے جو اس علاقے کے حیوانات نہیں ہیں۔ الاسکا اور کینیڈا کے انتہائی شمالی علاقے سے قدیم انسانی رہائش گاہوں کے آثار ملے ہیں۔ الاسکا میں پورٹ ہوپ اور پوائنٹ بیرو سے تو قدیم آبادیوں کے ایسے شواہد ملے ہیں کہ جو شہری زندگی کی جانب مائل تھیں۔ پورٹ ہوپ کے قریب قبل از تاریخ کے نسبتاً مہذب انسانوں کی یادگار وہ مقابر بھی تلاش کئے گئے ہیں جن میں آج بھی لاشیں موجود ہیں اور ان لاشوں کی کھوپڑیوں میں آنکھوں کی جگہ ہاتھی دانت کے بنے ہوئے گول گیند ٹھونسے ہوئے ہیں۔[7]

تاریخ کی دوسری قسم لکھی ہوئی تاریخ ہے جو تہذیب و تمدن کے معموں کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے لیکن یہ بھی اتنا سہل کام نہیں رہا۔ اول یہ کہ قدیم تمدن سے ملنے والی تحریر کو پڑھا نہیں جا سکا۔ (دیکھئے "پراسرار تحریریں") دوسرے یہ کہ انسانوں نے اپنی غفلت سے بہت بڑا تحریری ریکارڈ ضائع کر دیا ہے۔ مذہبی نظریاتی اختلافات، جہالت اور تعصب کے عوامل نے قدیم کتب خانوں کو برباد کر کے رکھ دیا۔

مثلاً جب سکندر اعظم فارس کے دارالحکومت پر قابض ہوا تو پرسی پولس کو روشن کرنے کے لئے تحریری ریکارڈ نظر آتش کر دیا گیا۔ ۱۴۶ ق م میں

قرطاجنہ مغلوب ہوا تو رومنوں نے کارتھیجی اور فونیشیائی کتب تباہ کر کے رکھ دیں۔ اور خود روما کے زوال کے ساتھ کتب خانوں پر توجہ کم ہوتی چلی گئی۔

سب سے شرمناک واقعہ اسکندریہ کی عظیم لائبریری کی بربادی کا ہے یہاں معلومہ دنیا سے ہر موضوع پر کتابیں لا کر جمع کی گئی تھیں جن میں نہایت نایاب نسخے اور ان کے تراجم بھی رکھے گئے تھے۔ جولیس سیزر شہر پر قابض ہوا تو اس وقت لائبریری سے دھواں اور شعلے بلند ہو رہے تھے۔ کیا یہ حرکت سیزر کے حکم پر ہوئی تھی؟ مورخین کا بیان ہے کہ سیزر نے اس کی ذمہ داری لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ علم کی قدر کرتا تھا اور خود بھی صاحب تصنیف تھا۔

اس واقعے کے بعد بھی لائبریری کی کئی قیمتی کتب بچالی گئی تھیں۔ مگر بعض مورخین کے مطابق اگلی تباہی نے یہاں جھاڑو ہی پھیر دیا۔ گو یہ متنازعہ تاریخی مسئلہ ہے مگر بعض کا کہنا ہے کہ جب مسلم خلیفہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں ۶۳۶ء میں اسکندریہ فتح ہوا تو خلیفہ اسلامی نے کہا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے یا تو وہ قرآن کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اگر یہ قرآن کے مطابق ہے تو ہمارے لئے قرآن ہی کافی ہے اور اگر اس کے موافق نہیں تو پھر مضرت رساں ہے لہٰذا ان کا تباہ کر دینا ہی بہتر ہے۔ مورخین الزام لگاتے ہیں کہ اس کے بعد مسلسل ۶ ماہ تک اسکندریہ کے حماموں کو گرم رکھنے کے لئے لائبریری کی صدیوں پرانی کتب آتش دانوں میں جلائی جاتی رہیں۔

عظیم دیوار چین بنانے والے شہنشاہ چی ہوانگ تی کے سر پر خبط سوار ہوا کہ آئندہ جب بھی چین کی تاریخ لکھی جائے اس کی ابتداء اس کے نام سے ہو چنانچہ طب، زراعت اور ارداح سے متعلق کتب کے علاوہ اسے جو کتاب بھی نظر آئی جلوادی تاکہ آئندہ آنے والے مورخین کو اس سے پہلے کی تاریخ کا علم ہی نہ ہو سکے۔[8]

ہسپانوی لٹیرے جب امریکہ پر قابض ہوئے تو ان کے ہمراہ آنے والے عیسائی مذہبی رہنماؤں اور مبلغین نے مقامی ریڈ انڈینوں کے قدیم روزنامچوں پر ناپاک ہونے کا فتویٰ لگا دیا چنانچہ انڈینوں کی ملنے والی ہر تحریر جلا دی گئی اور بعد ازاں بچ جانے والی تحریروں کا مطالعہ سخت دشوار ہو گیا۔

آثار قدیمہ اور لکھی ہوئی تاریخ گو تہذیبوں کے معموں کو حل کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں لیکن یہاں ایک اور قباحت ہے کہ اثریات کے ہر نمونے اور ہر تحریر پر اندھا دھند یقین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۲۸۸ ق م میں فرعون رعمسیس دوم کا دیش کی لڑائی میں حتی قوم سے شکست کھا گیا تھا۔ مگر فرعون نے اپنی شکست کو چھپانے کے لئے ایک عظیم یادگار تعمیر کرا دی۔ حتی قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی مگر رعمسیس دوم کی یادگار باقی رہی چنانچہ مورخین مسلسل فرعون کی "عظیم فتح" کا احوال درج کرتے رہے۔ تین ہزار سال سے زائد عرصہ گزرا جب موجودہ دور کے ماہرین کو معلوم ہوا کہ یہ سب ایک بہت بڑا تاریخی جھوٹ تھا۔ جو عیار فرعون کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یوں ہر آثار قدیمہ پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کیا جا سکتا۔

یہی حال لکھی ہوئی تاریخ کا ہے۔ گو تاریخ سے واقفیت کا اہم ذریعہ تحریری ریکارڈ ہے لیکن کیا ہر تاریخی واقعات بیان کرنے والی تحریر قابل اعتماد ہو سکتی ہے؟ شائد نہیں۔ مثلاً ہندو مذہبی صحائف میں غلو کے عنصر نے ان کی تاریخی اہمیت بہت کم کر دی ہے۔ ان کی رو سے قدیم کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ ۶۵ ہزار سال قبل ہوئی تھی۔

جب تک مغرب میں تاریخی واقعات کی اساس بائبل کو بنایا جاتا رہا۔ مضحکہ خیز مواقع آتے رہے۔ ۱۶۵۰ء میں ارماغ کے آرک بشپ جیمز اشر (آئرلینڈ) نے کہا کہ دنیا ۴۰۰۴ ق م میں پیدا ہوئی اس کے ہم عصر لائٹ فٹ نے جو کیمبرج کا وائس چانسلر تھا کہ آدم کو تثلیثی عناصر نے ۲۳ اکتوبر ۴۰۰۴ ق م میں پیدا کیا۔ مگر جب لاکھوں برس پہلے کے ڈائنو سار حیوانات کی ہڈیاں دریافت ہوئیں تو فلپ ہنری گوز نے پھلجھڑی چھوڑی کہ آدم و حوا کی پیدائش کے ساتھ ہی زمین میں حیوانات کے ڈھانچے پیدا کر کے دفن کر دیئے گئے تھے ــــ ایسی احمقانہ بات کرنے والا شخص کوئی عادی افیونی نہیں، بحری حیات کا مانا ہوا عالم تھا۔[9] ادھر مرا غلام احمد قادیانی صاحب کا خیال تھا کہ پہلا انسان ۳۹۸۸ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ یہ "عظیم" انکشاف کشف کے بل بوتے پر کیا گیا تھا۔ علیٰ ہذا القیاس تاریخ بیان کرنے والی ہر تحریر قابل اعتماد نہیں ہوتی۔

قدیم تحریروں کا ایک سقم بابائے تاریخ ہیرڈوٹس کی تاریخ میں نظر آتا ہے۔ اس نے کہیں بھی عظیم سمیری سلطنت اور اہل سمیر کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ لوگ جو ماضی قدیم میں کرہ ارض کی سب سے قابل فخر تہذیب کے حامل تھے۔ ان کا تذکرہ صرف ایک بابلی مورخ کے ہاں ملتا ہے جس نے ڈھائی سو قبل مسیح میں پہلی بار ان کا ذکر کیا کہ سمیری جنات یا دیووں کی قوم تھی۔[10] یوں قدیم تاریخ کی کسی بھی ایک کتاب پر مکمل طور پر تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔

# انسان کی قدامت..... تہذیب کی ابتدا

انسان کب سے مہذب سے ہوا؟

تہذیب کی ابتداء اس وقت سے ہوئی جب انسان نے زبان اور گفتگو کی ابتدا کی۔ پتھروں کو تراش کر توڑ کر کوئی بھونڈا سا اوزار بنانے کی کوشش کی۔ تصویر کشی، آگ کا استعمال، جانوروں کو پالتو بنالینا اور زراعت کی ابتدا تہذیب کے آغاز کے ابتدائی سنگ میل کہلائے جاسکتے ہیں۔

تنزانیہ (افریقہ) سے ڈاکٹر لوئیس لیکی نے انسان یا انسان نما مخلوق کے جو آثار دریافت کئے ہیں ان کا تعلق ۱۵ سے ۲۰ لاکھ سال پہلے سے ہے[11] چونکہ اس مخلوق سے صرف ایک دیوار نما تعمیر منسوب ہے۔ اس لئے اسے انسان قرار دینا مشکل ہے۔ مگر جہاں تک تراشے ہوئے پتھروں کو اوزار یا ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا تعلق ہے تو اس کا سراغ ایک لاکھ سال پرانے والونیٹ غار (فرانس) میں ملتا ہے۔ اسی طرح تنزانیہ کے علاقے اولڈووائی سے بھی اتنے ہی قدیم اوزار دریافت ہوئے ہیں۔

آگ پر انسانی دسترس کی کہانی بھی بڑی قدیم ہے۔ ۵ سے ۷ لاکھ برس پرانے آثار سے اس بات کا ثبوت ملا ہے کہ افریقہ، ایشیا اور یورپ میں انسان یا انسان نما مخلوق نے آگ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

موجودہ انسان ہولوسین دور سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کی ابتداء ۱۱ ہزار سال پہلے ہوئی اس سے پہلے جو دور گزرا ہے۔ اسے پلی آسٹوسین کہا جاتا ہے۔ جس کے دورانیہ کا تخمینہ ۵ سے ۲۰ لاکھ سال ہے۔ یہ بحث طلب موضوع ہے کہ تہذیب کی ابتدا ان ادوار کے سنگم پر ہوئی یا اس سے بھی پہلے۔

یورپ میں انسانوں کی ایک نسل نینڈر تھل کا راج ڈیڑھ لاکھ سال تک رہا۔ یہ بڑے بھاری بھرکم اور مضبوط لوگ تھے۔ جن کی پیشانیاں جھکی ہوئی تھیں۔ ۳۰ سے ۳۴ ہزار سال ہونے کو آئے انسانوں کی ایک نئی نسل کرومیگنون "کہیں سے" نمودار ہو گئی۔ یہ لوگ سیدھے کھڑے ہو سکتے تھے۔ ان کے دماغ کا سائز نینڈر تھل آدم سے بڑا تھا۔ دونوں نسلوں کے درمیان دشمنی ہو گئی۔ شاید خوراک کے حصول میں دونوں ایک دوسرے کے رقیب بن چکے تھے۔ بقا کی جنگ میں کرومنگینون کامیاب رہے اور نینڈر تھل کو بظاہر نابود کر دیا گیا۔

کرومیگنون لوگوں کا سراغ پہلی بار بحر اوقیانوس کی خلیج بسکے کے علاقے سپین اور فرانس کے ساحلی علاقوں میں ملا اب یہ کہنا بہت زیادہ غلط نہیں ہو گا کہ تہذیب انسانی کے اولین گہوارے مصر یا سومیر کے علاوہ بھی ہو سکتے ہیں۔

فرانس کے قصبے سالوترے Solutre سے ملنے والی سولوتری تہذیب ۲۰ سے ۲۲ ہزار سال پہلے موجود تھی۔ یہ اس عہد کے اعتبار سے وحشی لوگ نہیں تھے ان کے ہاں پتھروں پر خوبصورت تراش خراش اور ڈیزائن دیکھنے میں آئے ہیں۔ اتنے پرانے لوگوں کو آرٹ سے کیا کام۔ ان کے لئے تو جسم و جاں کا تعلق برقرار رکھنے کے لئے خوراک کی تلاش اور آگ کا حصول ہی کم مسائل نہیں ہونے چاہیں۔ ان کے ہاں بعض پتھروں کے بنے اتنے نازک خنجر اور تیروں کی انیاں ملتی ہیں کہ وہ شکار کے کام نہیں آ سکتی تھیں۔ پھر ان کا استعمال محض خوبصورتی یا کسی مذہبی نقطہ نظر سے ممکن ہے۔ غاروں میں ان کی تصاویر اس دور کے اعتبار سے خلاف توقع کافی دلکش ہیں ان کے علاقے سے ہڈی کی بنی ہوئی ایسی سوئیاں دستیاب ہوئی ہیں جن کے ناکے بہت چھوٹے ہیں گویا وہ باریک دھاگے یا بالوں کے لئے یا چمڑے کی سلائی کے لئے استعمال کی جاتی ہوں گی۔

لوزیک (فرانس) کی غاروں میں ۱۲ سے ۱۵ ہزار سال قدیم پتھر کے عہد کے انسانوں کی غاروں میں کی گئی تصویر کشی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ لباس کو خوبصورت بنانے کا ذوق رکھتے تھے۔ اس عہد سے تعلق رکھنے والی تصاویر یورپ اور افریقہ میں دیکھی گئیں۔ پہلے پہل یہی خیال کیا گیا کہ اتنے جدید لباس پہنے ہوئے لوگوں کی یہ تصاویر کسی موجودہ عہد کے انسان نے بنا کر جعل سازی کی ہے۔ مگر ذمہ دار افراد نے بڑے عرصہ تک کی عرق ریزی کے بعد معلوم کیا کہ فی الحقیقت یہ قدیم انسانوں کی ڈرائنگ ہے۔

یہ بات ابھی تک معلوم نہیں ہوئی کہ یہ لوگ غاروں میں اتنی مشکل جگہوں تک پہنچ کر کس طرح تصویریں بنا لیتے تھے۔ غاروں میں اندھیرا ہوتا تھا۔ روشنی کے لئے اس دور میں آگ کے علاوہ کوئی اور ذریعہ موجود نہیں تھا۔ مگر غاروں سے دھوئیں کے آثار تک نہیں ملے۔

امریکہ کے اصل باشندوں کی قدامت ایک معمے سے کم نہیں۔ بعض دریافتوں نے انسان کو سخت الجھن میں گرفتار کر دیا ہے۔ ریڈ انڈین لوگوں کے قدیم برتنوں پر بنائی گئی تصاویر اور بچوں کے قدیم کھلونوں کو ایسے جانوروں کی شکل میں بنایا گیا ہے جو ڈائنو سور عہد کے حیوان معلوم ہوتے ہیں جنہیں معدوم ہوئے لاکھوں برس ہو چکے ہیں۔ ہاتھی کبھی بھی امریکہ کا جانور نہیں کہا جا سکتا۔ مگر وسکانسن کے مقام پر فیل پہاڑی اور پیلنق Palenque (میکسیکو) کے مقام پر سونڈ اٹھائے ہوئے ہاتھیوں کی تصاویر اور ازٹک معبدوں پر بنے ہاتھیوں کے چہروں سے مغالطہ ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہاتھی امریکہ میں عام پایا جاتا تھا۔ کالی (کولمبیا) کے ایک ائیرپورٹ کی تعمیر کے وقت سونے کی کچھ ایسی پلیٹیں دریافت ہوئیں جن پر ہاتھی جیسے جانور بنے ہوئے ہیں۔ بگوٹا کے مقام پر زمانہ قبل از تاریخ عہد کا ایک ایسا مقام دریافت ہوا ہے جسے ہاتھی سے مشابہ مسٹوڈان نامی حیوانات کا قبرستان کہنا بے جا نہ ہو گا۔

پیرو میں مارکاہواسی کے مقام پر چٹانوں پر دریائی گھوڑوں اور شیروں کی تصاویر کھدی ہوئی ہیں۔ برازیل میں گینڈے سے مشابہ حیوانات کی تصاویر ملی ہیں۔ یہ سب حیوانات افریقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن امریکہ میں ان کی تصاویر کی موجودگی حیران کن ہے۔

بولیویا (جنوبی امریکہ) میں "ٹائی ہواناکو" کی پراسرار تہذیب کی قدامت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکا یہ ۱۵۰۰ سے ۱۵۰۰۰ سال پرانی ہو سکتی ہے۔ اس علاقے سے قدیم معدوم جانوروں کی ہڈیاں ملی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ برتنوں اور پرانے گھڑوں پر ان معدوم جانوروں کی تصاویر بھی بنی ہوئی ہیں جو یہاں سے دریافت کیے گئے۔ قبل از آدم عہد کے دریائی گھوڑے سے مشابہ حیوان ٹوکسوڈوں کی اشکال دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں قدیم انسان نے اس ڈائنو سار نسل کے حیوان کو دیکھ رکھا تھا۔[12]

۱۹۸۶ء میں فلوریڈا میں ایک تعمیراتی کمپنی کے مزدوروں کو ایک دلدلی زمین میں ۱۷۰ افراد کے ڈھانچے ملے۔ ۷۲۱۰ سال پرانے ان ڈھانچوں کا مل جانا ایک حیرت انگیز بات ہے۔ کیونکہ یہاں زمین تیزابی ہے۔ ایک شخص کی غیر معمولی وزنی کھوپڑی میں میگنیٹک ریزونینس آلات کی مدد سے سکڑا ہوا دماغ دیکھنے میں آیا۔ یہ ایک اہم دریافت تھی۔ قدیم انسان کا دماغ ملنے کا ایک اہم واقعہ۔ اس شخص کے دماغ کے ڈی این اے کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

یہاں سے ایک اور چیز بھی ملی۔ پہلے پہل تو سمجھا نہ جا سکا کہ یہ کیا ہے نہ تو گوشت تھا نہ ہڈی۔ شاید کوئی نباتاتی شے تھی۔ خوردبینی مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ پام کے بنے ہوئے ریشے ہیں گویا یہ کپڑے کا بنا ہوا ٹکڑا تھا۔ جو قدیم دور کے لوگوں نے کفن کے طور پر استعمال کیا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کی بنائی تین تاروں پر کی گئی تھی جو بلاشبہ ایک بہت ہی مشکل کام تھا۔

امریکہ میں انسان کی قدامت کا معمہ خاصا دلچسپ ہے نیو میکسیکو میں فالسم کے قریب ۱۰ ہزار سال قبل معدوم ہو جانے والے قوی الجثہ بھینسے "باس امریکانس" کے فاصل دریافت ہوئے تو معلوم ہوا کہ بھینسے کی ہڈیوں میں تراشے ہوئے تیر کے نوکیلے سرے پڑے ہیں۔ تسلی کی خاطر کہلایا گیا کہ یہ تیر کسی نئے زمانے کے جانور کی شرارت کے سبب ہڈیوں تک پہنچا دگرنہ کہاں ۱۰۰۰۰ سال پہلے کا زمانہ اور اس میں تیرانداز ریڈ انڈین شکاریوں کا وجود، لیکن مسئلہ تو اس وقت پیدا ہوا کہ ایک اور بھینسے کی پتھرائی ہوئی ہڈیوں میں ایک اور تراشہ ہوا تیر پسلیوں میں کھبا ہوا دریافت ہوا۔ گویا ۱۰۰۰۰ سال پہلے بھی امریکہ میں کوئی عقل مند مخلوق موجود تھی۔ بعد کی تحقیقات کے دوران فلوریڈا میں اونٹوں اور لمبوترے دانتوں والے ڈائنو سور عہد کے شیر کی ہڈیوں کے ہمراہ ملنے والے برتنوں اور تراشے پتھروں نے ناقابل تردید شواہد پیش کیے۔ پھر ۹ انچ لمبے پھل والے چقماق سے بنے نیزوں کی اینان سائیبریا میں ملی ہیں۔ واشنگٹن میں ۱۱ ہزار برس پہلے کے ایسے ہی نمونے ملے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں آبنائے میگلین کے قریب Cerro Sota, Fells Cave اور Pollo Aike کی غاروں میں ۹۰۰۰ ہزار سال پرانے گھوڑوں کی ہڈیاں اور انسانی ڈھانچے ایک ساتھ دریافت ہوئے۔ (قطع نظر اس سے کہ یہ پالتو گھوڑے تھے۔ یا بذریعہ شکار خوراک کے طور پر استعمال ہوئے)

ادھر جنوبی امریکہ میں انسان کی موجودگی کے شواہد کی قدامت حیران کن ہے۔ پیرو میں پسکو کے قریب پراسرار "نز کا خطوط" (دیکھیے پراسرار تعمیرات) کے قرب وجوار میں دو شہروں کے کھنڈرات دریافت ہوئے یہاں سے ملنے والے منقش برتنوں سے ایک حیرت انگیز بات ظاہر ہوتی ہے۔ ان برتنوں میں لاما نامی جانور کی جو تصاویر بنائی گئی ہیں ان میں اس حیوان کے پیروں میں پانچ انگلیاں دکھائی گئی ہیں۔ لاما جنوبی امریکہ کا قدیم جانور ہے۔ موجودہ دور کے لاما کے پیر میں دو، دو سم ہوتے ہیں۔ البتہ ارتقائی دور میں لاما کے پیر میں ۵ انگلیاں ہی ہوتی تھیں۔ مگر لاکھوں سال پہلے اب یہ معمہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ قدیم لوگوں کو اس بات کا پتہ کیسے چلا۔

بولیویا میں Toxodon نامی عہد عتیق میں پائے جانے والے حیوان کی تصاویر برتنوں پر نقش ملی ہیں۔ معدوم ہونے والے ان ہی ڈائنو سور کے مجسمے اور تصاویر امیزون کی وادی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ اور وسطی میکسیکو سے بھی۔

میکسیکو اور وسطی امریکہ کے کئی علاقوں میں اژدھے یا بڑی چھپکلیوں کی تصاویر حیرت انگیز طور پر چینی اژدھے سے شباہت رکھتی ہیں۔ تاہم میکسیکو میں کھدائی کے دوران ملنے والے ڈائنو سور کے مجسموں کی دریافت کے ساتھ یہ بھی علم میں آیا ہے کہ مقامی مزدوروں کے پاس خود بھی روائتی کھلونوں میں ڈائنو سور کے ننھے ننھے مجسمے موجود تھے۔

جو کچھ بھی ہو بہرحال اس بات کے ثبوت بڑھتے جا رہے ہیں کہ امریکہ میں انسان بہت قدیم دور سے موجود ہے۔

# تحریر کی ابتدا ..... پراسرار تحریریں

کہا جاتا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا کارنامہ فن تحریر کی ایجاد ہے۔

حروف تہجی کی ابتدا کیسے اور کب ہوئی ؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ مروجہ تاریخ کی رو سے اہل فونیشیا کو حروف کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ مگر اس بات سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ ان سے پہلے انسان نے لکھنا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ تحریر کی سمجھ آ جانے والی صورت اس سے پہلے بہت پہلے استعمال ہو رہی تھی۔ جس میں آوازوں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

مروجہ بیشتر حروف تہجی کی اساس، فونیشیائی یا سامی حروف تہجی قرار دیئے جاتے ہیں۔ جن کی جنم بھومی بائبلوس (لبنان) ہے جہاں ۴ ہزار سال پہلے یہ زیر استعمال تھے۔

ٹارٹسوس ایک بہت قدیم شہر تھا۔ جس کا تذکرہ اگرچہ یونانی مورخوں نے جا بجا کیا ہے مگر اس کی دریافت عمل میں نہیں آئی۔ (دیکھئے گمشدہ سرزمین) یونانی مورخ سٹرابو نے بتایا تھا کہ یہ لوگ قدیم زمانے سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اور ان لوگوں کے ہاں قوانین نظم کی شکل میں موجود تھے جن کے مسودوں کو یہ لوگ ۶ ہزار سال پرانا قرار دیا کرتے تھے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ جنوب مغربی سپین شمالی افریقہ اور جزائر کنری میں چٹانوں پر جو غیر تصویری نشانات ہیں شاید وہ ٹارٹسوس کے لوگوں سے اخذ کردہ طریقہ تحریر ہے جو ان علاقوں کی تہذیبوں نے اپنے معانی اور مطالب کے اظہار کے لئے استعمال کیا تھا۔[13]

حروف تہجی کی ابتدا کے بارے میں ڈاکٹر سائرس گورڈون اور ایک محقق ہوموران کا نظریہ یہ ہے کہ ان کی بنیاد بروج اور قمری مہینے کے دنوں کی تعداد پر رکھی گئی کیونکہ اصل حروف کی تعداد ۳۰ ہے۔ ابتدائی زمانے کے ملاح دنوں کے حساب کے لئے علامتیں رکھا کرتے ہوں گے۔ جنہوں نے آخر کار حروف کا روپ دھار لیا۔ یہ امر یقینی ہے کہ حروف اور اعداد کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ رہا ہے۔ عبرانی زبان میں ابجد ہوز حطی کلمن سعفص وغیرہ بالترتیب گنتی کے اعداد سے منسلک ہیں چنانچہ بعض اسرائیلی گھڑیوں پر اعداد کی بجائے حروف لکھے جاتے ہیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ حروف تہجی نے ریاضی سے جنم لیا۔ کریٹ سے ۱۹۰۸ء میں مٹی کی ایک گول لوح دریافت ہوئی۔ اس کے دونوں جانب علامات کا ایک سلسلہ چکر کھا کر مرکز میں ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ ماہرین اس جستجو میں ہیں کہ آیا یہ حروف تہجی ہیں یا بروج کا کوئی حساب ہے۔ اس لوح کے دونوں جانب یہ نقوش نرم مٹی میں ابھرے نشانات والی مہروں کو دبا کر بنائے گئے ہیں۔ ۱۲ ہزار سال پہلے کے دور میں ایسی علامات کا مقصد کیا تھا؟[14]

مغربی یورپ میں کھدائی کے دوران آثار قدیمہ سے دریافت ہونے والی ہڈیوں پر علامات لکھی نظر آتی ہیں۔ یہ اتنی قدیم ہیں کہ کوئی ماننے کو تیار نہیں کہ یہ کسی تحریر یا حروف تہجی کا اظہار تھیں۔ گلوزل (فرانس) سے ۱۹۲۴ء میں ایک لوح دریافت ہوئی جس پر بہت سی علامات حروف یا ہندسے کندہ ہیں جن میں بعض یونانی اور فونیشیائی حروف اور ہندسوں جیسے ہیں۔ اور باقی کی شناخت نہیں ہو سکی۔ کیا یہ ابتدائی قسم کے حروف تہجی ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے تو مروجہ تاریخ میں ترمیم کی ضرورت ہو گی کہ تحریر کی ابتدا مصریوں سے بھی ہزاروں سال پہلے شمالی یورپ کے نامعلوم لوگوں نے کر دی تھی۔

۱۹۷۱ء میں ماہر انسانیات الیگزنڈر مارشاک قدیم جانوروں کی ہڈیوں پر دیکھے جانے والے نشانات منظر عام پر لایا۔ ۳۲ ہزار برس قدیم دور سے تعلق رکھنے والی ہڈیوں پر اس عہد کے "نیم انسان" نے بڑے اہتمام سے مختلف اوزاروں کے ذریعے کچھ علامتیں یا (حروف تہجی) تراش رکھی تھیں۔ یوں یہ کہنا خاصا

دشوار ہو جاتا ہے کہ فن تحریر حقیقی معنوں میں کب شروع ہوا لیکن تحریر سے متعلق یہی ایک معمہ نہیں ہے۔ قدیم تحریروں کا سمجھنا بھی ایک الگ مسئلہ ہے مثال کے طور پر نینوا کے علاقے سے دریافت ہونے والی بے شمار الواح دنیا کے بڑے بڑے عجائب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ مگر کوئی ان کا ترجمہ نہیں کرتا۔ اس کا ایک سبب ماہرین کی کمی ہے۔ اسی طرح ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی قدیم تحریروں کا مسئلہ ہے جنہیں سرے سے سمجھا ہی نہیں جا سکا۔

یہ تو ایسی تہذیبیں تھیں جن کا پتہ ان کے مٹنے کے بعد ملا لیکن ایسی تہذیبیں بھی موجود ہیں جنہیں "مہذب انسانوں" نے خود ہی تباہ و برباد کر دیا اور ان کا قیمتی تحریری ریکارڈ ضائع کر دیا۔ اس ضمن میں ہسپانوی سب سے نمایاں ہیں یوکاٹان میں ہسپانوی بشپ ڈی لانڈا کو جو بھی مایائی تحریر ملی اسے نظر آتش کروایا کہ یہ سب شیطانی چرخہ ہے۔ صرف چار خوبصورت کتابیں کسی نہ کسی طرح بچ گئیں مگر انہیں پڑھنا کس قدر دشوار ہے۔ ڈی لانڈا کو اس حرکت کا شاید افسوس ہوا ہو کیونکہ پھر اس نے مایاؤں سے ان کے طرز تحریر کے بارے میں استفسار کیا تو یہی معلوم کر سکا کہ مایائی طرز تحریر ہیرو غلافی (مختلف شکلوں پر مشتمل) ہے۔ جس میں صرف چند حروف کی شناخت ہو سکی۔ یہ شناخت بھی کیا لطیفہ ہے۔ ہوا یوں کہ ۱۶ ویں صدی میں ڈی لانڈا نے بچے کھچے مایاؤں سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ بیچارے آئیں بائیں شائیں کرتے رہ گئے اور ڈی لانڈا نے اپنی کھوپڑی استعمال کرتے ہوئے اپنے آپ سے مایائی حروف تہجی کی شناخت کی۔ اس خود ساختہ حروف تہجی کے نظام نے بعد ازاں مایائی بشریات کے طالب علموں کو سخت پریشان کیے رکھا اور مایا تحریروں کے مترجم بعید از قیاس تراجم پیش کرتے رہے۔

آج کے مایا قبائل جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اس کے بارے میں یقین نہیں کہ وہ قدیم مایائی تحریر کے مطابق ہیں کیونکہ موجودہ مایا نسل اپنے آباؤ اجداد کی عظمت سے بالکل ناواقف ہے۔ مایائی ہیرو غلافی پر روسی ماہرین ایک عرصہ تک کام کرتے رہے مگر کمپیوٹر ریسرچ کے باوجود اس زبان کی مبادیات تک بھی نہ پہنچے اب تو ماہرین بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ ان تحریروں کا راز تو شاید اس وقت کھلے جب گھنے جنگلات میں کوئی ایسا قبیلہ دریافت ہو جائے جو اصل مایائی تہذیب کی باقیات سے ہو اور اب تک دنیا کی نظروں سے چھپا تحریروں کے راز کو سینے سے لگائے بیٹھا ہو۔ یہ تصور اس وقت پیدا ہوا جب چیاپاس کے برساتی علاقے سے لیکنڈون انڈین قبیلہ پناہ گزین ہوا جو ہسپانوی لٹیروں کے ہاتھوں مکمل معدومی سے بچ گیا تھا۔ اور قدیم مایائی رسوم و رواج پر کاربند تھا مگر انہیں بھی تحریر کا راز بھول چکا تھا۔

جنوبی امریکہ میں اینڈیز کے پہاڑوں اور دریائے امیزن کے آس پاس سے ناقابل شناخت تحریریں دستیاب ہوئی ہیں۔ زمانہ قدیم میں ان کی عظیم سلطنت میں طاعون پھوٹ پڑا تھا۔ پروہتوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ تحریر کا کام ترک کر دے کیونکہ طاعون کا سبب لکھنے کا عمل ہے۔

ان کالوگوں نے تحریر کا ایک متبادل ذریعہ اختیار کر لیا تھا۔ یہ بڑا دقیق ہے۔ اور تاحال مکمل طور پر سمجھا نہیں جا سکا۔ اسے قوپو کہتے ہیں۔ یہ رنگ برنگی رسیاں ہوتی تھیں۔ جن پر مختلف جگہ گرہیں لگائی جاتی تھیں۔ رسی کے ان گھٹوں میں دھاگوں کی جسامت، بنائی کا انداز، رنگت، تعداد، گرہوں کی شکل اور گرہوں میں وقفے دیکھ کر اعداد و شمار اور تحریر کا اس قدر پیچیدہ اور زبردست نظام قائم کر دیا گیا تھا کہ ایک قول کے مطابق سلطنت انکا میں ایک جوتا بھی گم ہو جاتا تو اس کا پتہ لگایا جا سکتا تھا۔ ان "گچھوں" کو پڑھنے کے لئے ایک خاص طبقے کے افراد مقرر کیے گئے تھے۔ جو عظیم ان کا سلطنت کی آبادی، علاقے، پیداوار اور افواج وغیرہ کا حساب ان گٹھوں کی شکل میں جمع رکھتے تھے۔[15]

بحرالکاہل کے دور دراز جزائر میں قدیم مقامی لوگوں کا مخصوص طرز تحریر دیکھنے میں آتا ہے جس کو ابھی تک نہیں سمجھا جا سکا۔ مثلاً کیرولین اور ایسٹر کے جزائر کا انداز تحریر۔ ایسٹر آئی لینڈ پر یورپی قدم پہنچے تو مقامی آبادی ۶۰۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ جس میں کئی لوگ جزیرے کی مقامی پراسرار تحریر "رونگو رونگو" پڑھ سکتے تھے۔ رونگو رونگو جزیرے کی چٹانوں اور تختیوں پر کندہ کی گئی تھی۔ یہ ہیرو غلافی قسم کا طرز تحریر تھا۔ جس میں ۵۰۰ مختلف انسانی شکلیں اور کچھ دوسرے ڈیزائن استعمال کیے گئے تھے۔

جزیرے والوں کے لئے ہسپانوی بیماریوں اور غلامی کے علاوہ بلاجواز قتل کے تحائف لائے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ۶۰۰ میں سے صرف ۱۰۰ افراد باقی بچ گئے۔ مگر تحریریں ــــ انہیں اب کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ جتنے پڑھے لکھے تھے سب مارے جا چکے تھے۔ اب کوئی نہیں جانتا کہ رونگو رونگو میں کیا بات کہی گئی تھی؟

لیکن یہ کوئی اتنا بڑا معمہ نہیں جتنا چونکا دینے والا عجوبہ آگے آ رہا ہے۔ جزائر ایسٹر کے وقوع سے دور بہت دور کرہ ارض کے عین مخالف سمت میں ایک ایسا طرز تحریر دیکھنے میں آیا ہے جو انسانی دماغ کو ہلا دیتا ہے۔ یہ مقام ہے پاکستان کی قدیم وادی سندھ۔ ساڑھے ۴ ہزار برس قبل یہاں پر ہڑپہ اور موہنجو داڑو کی

ایسٹر آئی لینڈ اور وادی سندھ سے ملنے والے انداز تحریر (اوپر اور نیچے) کا موازنہ

تہذیبیں پھل پھول رہی تھیں۔ جن کے ہاں انتہائی عمدہ منصوبہ بندی کے تحت عظیم شہر تعمیر کیے گئے تھے۔ جہاں پانی کا بہترین سسٹم قائم تھا۔ ۱۵۰۰ ق م میں شمال سے کوئی حملہ آور آئے اور ان ہرے بھرے شہروں کو مردوں کا شہر بنا ڈالا۔

یہ لوگ کتنے ترقی یافتہ تھے۔ ان کا اپنا ایک تحریری نظام تھا ان کے ہم عصر سمیری بھی عظیم لوگ تھے اور ان کا بھی اپنا جداگانہ انداز تحریر تھا۔ جسے پڑھ لیا گیا ہے مگر موہنجو دھڑو کے رسم الخط کی گتھی آج تک نہیں کھلی۔

جزیرہ ایسٹر اور موہنجو دڑو دو انتہائی ممکنہ فاصلے پر واقع ہیں کیا ۴۵۰۰ سال پہلے ان دو مقامات کے دوران کسی بھی تہذیبی ربط کے بارے میں کوئی گمان کر سکتا ہے؟ پھر اس حقیقت کی تشریح کس طرح کی جائے کہ اتنی متنوع تہذیبوں کے ہاں ایک ہی رسم الخط بلا مبالغہ محض ۱۹۔ ۲۰ کے فرق سے موجود ہے۔ اگر کوئی اسے ایک خوبصورت اتفاق کہے تو یہ ناانصافی ہو گی۔(16)

جزیرہ ایسٹر کی چٹانوں اور تختیوں کے نامعلوم رانگورانگور سم الخط کی ایک مسلسل عبارت اور موہنجو ڈارو کے پراسرار رسم الخط کی ایک مسلسل عبارت بالترتیب یوں ہے کہ موازنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ایسٹر آئی لینڈ کی اشکال میں دوہری لکیر نظر آ رہی ہے۔ جب کہ موہنجو ڈڑو کی تصاویر ایک لکیر سے بنی ہیں۔ ان دونوں تحریروں میں اتنی نمایاں مشترکہ خصوصیات کیوں موجود ہیں؟ اور دونوں جگہ ایک سی ترتیب کیا معنی رکھتی ہے؟

جزیرہ ایسٹر کا ایک باسی ٹاہیٹی میں رہ رہا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ٹاہیٹی کے بشپ جاسن کو بتایا کہ اسے جزیرے کی تختی پر کندہ جملہ لکھنا آتا تھا۔ مگر وہ اسے پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے یہ جملہ تحریر کیا اور اس کا مفہوم بتایا "انہوں نے رانگیٹی کے خدا سے دعا کی" اگر یہ ترجمہ درست تھا تو ایسٹر جزیرے کا وہ اصل باشندہ معمے کو مزید پیچیدہ بنا رہا تھا۔ کیونکہ رانگیٹی جزائر فرینڈلی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ جزائر ۱۵۰۰ میل دور کھلے سمندر میں واقع ہیں۔

دنیا کے دیگر علاقوں سے قدیم تحریروں کے بے شمار نمونے ملتے رہتے ہیں جن کے بارے میں علم نہیں ہوتا کہ انہیں کس نے تحریر کیا۔ کیا تحریر کیا اور کیوں تحریر کیا؟ ان میں پتھروں پر لکھی گئی نامعلوم تحریریں ہیں۔ جو مختلف مقامات پر دریافت ہوئی ہیں۔ مثلاً ایسونٹ نک (میسا چوسٹس) میں دریائے ٹمنش کے پاس ایک سخت چٹان پر ایک عجیب و غریب تحریر کندہ ہے جس کا اندازہ صدیوں پہلے کا ہے ۱۶۹۰ء میں کاٹن ماتھر نے ان کے بارے میں تحریر کیا "ڈائٹن کی چٹانیں نیو انگلینڈ کے حیرت انگیز اور قابل دید مناظر میں سے ہیں ان کی عمودی سطح پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ یہ تحریر کب اور کس نے لکھی تھی؟ اس چٹان پر قریباً ۱۰ سطور ہیں۔ جو ۱۰ فٹ لمبی اور ڈیڑھ فٹ چوڑی ہے۔ یہ شاندار دستاویز عجیب و غریب شکلوں پر مشتمل ہے۔ جو غالباً زمانہ قدیم میں یہاں کے باشندوں کے خیالات کا مجموعہ ہیں۔

اولین لوگوں میں سے ایک پیرس کا کاؤنٹ جیلین ہے جس نے ان کا عقدہ کھولنے کی کوشش کی اور ان کے معائنے کے بعد پیرس جا کر کچھ عرصے بعد اعلان کیا کہ یہ تحریر قدیم تیراکوں کی ہے جن کا تعلق انڈین قبائل سے تھا جو اس تحریر میں بتا رہے ہیں کہ انہوں نے اس جگہ سے نقل مکانی کرنے کے لئے کس طرح استخارے سے مدد طلب کی۔

۱۸۰۷ء میں ایک عالم سموئیل ہارس (ہارورڈ یونیورسٹی) نے مختلف تاویلیں پیش کیں اور کہا کہ یہ صوتی اعتبار سے بادشاہ، پجاری اور کلیسا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ۲۴ برس بعد ارابل نامی میری ہنڈسکی سکول ٹیچر نے یہ کہا کہ یہ تحریر ایک مہم کی تفاصیل ظاہر کرتی ہے۔ جو کہ بائبل میں موجود ہے جس کے مطابق سلیمان ؑ اور ہرم کے "اوفر" سے سونا حاصل کرنے کے لئے مہم کے روانہ ہونے کا ذکر ہے۔

۱۸۳۷ء میں ڈنمارک کے ایک سکالر کاول رافن نے اپنی تحقیق شائع کی اس کے مطابق یہ لیف ارکسن کے ایک ہزار عیسوی کے شمالی افریقہ کے ساحل تک کے بحری سفر کی روئیداد ہے۔ اس محقق کاؤل رافن نے نارووے کی زبان کے حروف ڈائٹن کی تحریر میں تلاش کیے ہیں رومن ہندسوں کے مطابق ۱۳۱ کا

درج شدہ ہندسہ رافن کے نزدیک سکنڈے نیویا کی قدیم زبان کا ۱۵۱ کا ہندسہ ہے جو ناروے کے نو آباد کاروں کے لیڈر اور اس کے ۱۵۰ ساتھیوں کی مجموعی تعداد کو ظاہر کرتا ہے۔ جنہوں نے مقامی انڈین قبیلے سے جنگ کی تھی۔[17]

ایک انڈین سکالر چنگ وک نے اسے دو انڈین قبائل کی باہمی آویزش کا تذکرہ قرار دیا ہے۔ جب کہ براؤن یونیورسٹی کے پروفیسر ای ڈی بی لاپر کے نزدیک یہ ایک انڈین قبیلے کے سردار "مائیگول کارٹی" کے سفر کی داستان ہے۔ ممکن ہے یہ درست ہو کیونکہ مائیگول اس لکھائی سے ۹ سال پہلے یعنی ۱۵۰۲ء میں نیو فاؤنڈلینڈ پہنچا تھا اور واپس پرتگال نہیں گیا تھا۔

پتھروں پر ملنے والی دیگر تحریریں جو امریکہ میں دریافت ہوئی ہیں وہ بھی اپنی اپنی جگہ پراسرار ہیں۔ اور اکثر وائی کنگ سے متعلق قرار دی جاتی ہیں۔ وائی کنگ جرمنی کے رہنے والے تھے لیکن سکنڈے نیویا سے گزر کر گرین لینڈ میں آباد ہو گئے تھے۔ کولمبس سے پانچ صدیوں پہلے اس جفاکش اور لٹیرا قوم کا ایک شخص لیف ایرکسن کشتیوں پر بہادر نوجوانوں کے ہمراہ اپنے ایک ہم نسل شخص "بجرنی" کے بیان کردہ سبز درختوں سے لدے ہوئے علاقے کی تلاش میں روانہ ہوا۔[18] بجرنی نے ۹۸۶ء میں گرین لینڈ جاتے ہوئے طوفان میں پھنس کر اس سرزمین کو دور سے دیکھا تھا۔ ایرک سن ہزار دقت سے اس سرزمین تک پہنچا جسے آج امریکہ کہتے ہیں اور ایرک سن کے بجائے کولمبس کی دریافت قرار دیتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ امریکہ میں کہاں تک گئے ڈائڈن سے آگے منی سوٹا میں ۱۸۹۸ء میں اولف مین نامی کسان کے کھیت سے کھدائی کے دوران چونے کے پتھر کی سل ملی جس کی پراسرار تحریر وائی کنگ کی کارستانی بتائی جاتی ہے۔ اس پتھر پر (زیادہ تر ماہرین کے مطابق) درج ہے۔ "ناروے سے تعلق رکھنے والے ہم آٹھ المانی اور بائیس دوسرے افراد نئے ممالک کی دریافت کے لئے ون لینڈ نامی جزیرے سے بحری سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم نے سکیریز جو اس پتھر کے شمال میں ایک روز کی دوری پر واقع ہے میں قیام کیا۔ ایک روز مچھلی کے شکار سے لوٹتے ہوئے ہم نے اپنے ۱۰ آدمی خون میں لت پت مردہ پائے۔ اس مصیبت سے ہمیں اے ڈیلیو ایم نے چھٹکارا دلایا۔ ہم نے دس افراد کو کشتیوں کی حفاظت کے لئے ساحل سمندر پر چھوڑا ہے۔ جو اس جزیرے سے اکتالیس (یا چودہ) دن کے فاصلے پر ہے ۱۳۶۲ء"

اس پتھر کو سنگ کنسنگٹن کہا گیا۔ اس سل کو دیکھنے والے سکنڈے نیویا کے افراد نے بیان کیا ہے کہ یہ ان کے اجداد کی تحریر سے مشابہ ہے۔ لیکن بالکل ویسی نہیں کیونکہ اس میں چند حروف اور ہندسے ایسے ہیں جو اس دور (چودھویں صدی) کے منسنانی رسم الخط میں نہیں ملتے۔ ہالینڈ کی تحقیق ہے کہ یہ سل اس مہم کی داستان بیان کرتی ہے جو ۱۳۴۸ء میں ناروے سے شروع ہوئی اور ۱۳۶۴ء میں مسٹر ایم فائرڈ (آئس لینڈ) پر اختتام پذیر ہوئی۔ ادھر بہت سے ایسے ماہرین ہیں جو اس سل کو جعل سازی قرار دیتے ہیں۔ لیکن ہالینڈ جس نے یہ سل خریدی اور اسے مہم کا بیان قرار دیتا ہے اپنی جگہ اڑا رہا۔

برازیل کے علاقے سے بھی ایسی تحریریں ملی ہیں جو کارتھیج اور فونیشیا والوں کے رسم الخط میں لکھی گئی ہیں۔ ۱۸۷۲ء میں برازیل کی "ریاست پرائبا" سے پتھر کی ایک تختی دریافت کی گئی۔ جس سے تاریخ دانوں میں بحث کے طویل سلسلے کی ابتدا ہو گئی۔ اس پر لکھا تھا "ہم سدون سے تعلق رکھتے ہیں کامرس ہمیں اس دور دراز ساحل پر چھوڑ گیا ہے جو پہاڑوں کی سرزمین ہے۔[19]"

آگے لکھا ہے کہ وہ لوگ خلیج عقابہ میں فونیشیا والوں کی بندرگاہ سے چلے تھے۔ (یہ مقام موجودہ اسرائیل کی پورٹ آف ایلاتھ کے قریب واقع ہے) اس پتھر کی تختی کو بھی بڑے عرصے تک جعلی کہا گیا۔ مگر کوئی اس امر کی توجیہ نہیں کر سکا کہ اس "جعلی سازی" کا فائدہ کیا ہے۔ محض تاریخی ریکارڈ میں عظیم تبدیلی کے خدشے کے پیش نظر اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ برانڈیز یونیورسٹی کا پروفیسر سائرس گورڈون سامی زبانوں کا محقق تھا۔ اس نے ۱۹۶۸ء میں رائے دی تھی کہ اس بات کا امکان بہت ہی کم ہے کہ ۱۸۷۲ء جیسے زمانے میں کوئی نام نہاد جعل ساز فونیشیائی انداز تحریر پتھروں پر کھودتا اور گاڑتا پھرتا ہو گا۔ جن کی بابت اس زمانے کے ماہرین لسانیات کو بھی واقفیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ ہاں بعد ازاں تحقیقات کے بعد ماہرین نے تسلیم کر لیا کہ یہ طرز تحریر بھی فونیشیائی ہے۔

۱۸۸۵ء میں لوڈوں کاونٹی (ٹینسی) سے ایک پتھر دریافت ہوا جس کی تحریر کے بارے میں اندازہ تھا کہ یہ "چیروکی" قوم کا خط ہے۔ جو مغرب میں جارجیا کی ریاست میں رہ رہے ہیں اور اس علاقے سے بھگا دیئے گئے ہیں۔ ۸۵ برس بعد جب پتھر کو الٹا کر کے دیکھا گیا تو بقول ڈاکٹر گورڈون یہ کنعانی زبان نکلی جسے اتنے عرصے تک الٹا رکھ کر حیرت زدہ نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ مگر کہاں کنعان کہاں امریکہ یہ تحریر یہاں کہاں سے آ گئی۔

۱۹۶۸ء میں جارجیا کا ایک شخص میٹکا لف چولہا جلانے کے لئے پتھر اٹھا رہا تھا تو اسے ایک پتھر پر کچھ لکھا ہوا معلوم ہوا۔ یہ پتھر جب ڈاکٹر گورڈون کو دکھایا گیا تو اس نے ایک مرتبہ پھر اسے Minoan طرز تحریر قرار دیا۔ جس میں کچھ اعداد اور دو دھاری کلہاڑے کی علامت بنائی گئی تھی۔ کولمبس میوزیم آف آرٹس

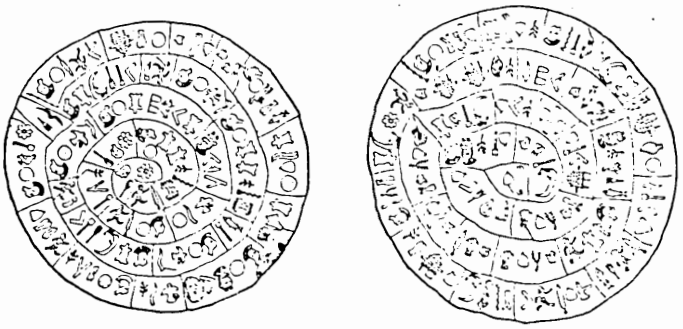

پراسرار تحریریں : ۱۹۰۸ء میں حاصل شدہ ان نشانات کا کوئی نظام تحریر وضع نہیں ہو سکا اور نہ ہی ان کے قدیم نظام طباعت کا کوئی اندازہ ہو سکا۔

کے ڈاکٹر جوزف مہان نے بھی اس کی تحقیق کی۔[20]

بعض اوقات پراسرار تحریریں عجیب مضحکہ خیز حالت پیدا کر دیتی ہیں ۱۹۳۷ء میں کاؤنٹی کارک (آئرلینڈ) میں ایک لڑکا زمین سے ایسا پتھر اکھاڑ لایا جس کی ایک ہموار طرف کچھ لکھا تھا۔ ماہرین کی تاویلات شروع ہو گئیں۔ ایک نے کہا کہ یہ یہود کے سمندری حملے کا بیان ہے دوسرے نے کہا کہ نہیں یہ ناروے کے ایک باشندے کی وحشیوں سے جنگ کا احوال ہے لیکن اصل بات کا اس وقت علم ہوا جب ایک روز ایک طالب علم نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے پتھر کو ایک طرف سے دیکھا۔ دوپہر کے سورج کی روشنی میں پتھر پر لکھا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں لکھا تھا "جون ۱۷۸۸ء آج مجھے دوبارہ سخت پیاس لگی۔"[21]

# پراسرار تعمیرات

دنیا کے سات قدیم عجائبات میں سے صرف ایک عجوبہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں سے محفوظ رہا ہے یعنی مصر کے اہرام، جن کی تعمیر کے دو ہزار برس بعد جا کر غیر مصریوں کو ان کے وجود کی خبر اس وقت ہوئی جب قریباً ۴۵۰ ق م میں یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے انہیں دیکھا اور انہیں "پائرمیس" کہا جو قدیم مصری لفظ "پیرمیس" بمعنی "عمودی بلندی" سے مشتق ہے۔ انگریزی لفظ پیرامڈ کی اصل بھی یہی ہے۔ جب کہ اردو لفظ اہرام کی اصل عربی ہے، جہاں ہرم کے معنی قدیم چیز کے ہوتے ہیں۔

سب سے بڑا اہرام خوفو یا چیوپس نامی فرعون نے تعمیر کرایا۔ جس کے نزدیک چھوٹے اہرام دیگر فرعونوں کے ہیں۔ غزہ کے یہ اہرام قاہرہ سے دس میل دور ہیں۔ نپولین کے ماہرین نے کہا تھا کہ ان تینوں اہراموں کے پتھروں کو استعمال کر کے پورے فرانس کے گرد دس فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی دیوار تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس سے تعمیر میں استعمال ہونے والوں پتھروں کی جسامت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

خوفو ۲۷۰۰ ق م کا واحد مصری حکمران تھا جس نے پچاس برس حکومت کی۔ اس کے ہرم کی خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ (سوائے گیلریوں اور کمروں کے) مکمل طور پر ٹھوس ہے۔ چھ ہزار چھ سو برس پرانی اس ساخت کی اتنی پائیدار اور مکمل نقل موجودہ دور میں بھی بنانا بہت مشکل تصور کیا جاتا ہے۔ اوپر جاتے ہوئے پتھروں کے ہر ردے کا حجم کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ۴۸۱ فٹ کی بلندی پر صرف ایک سل دھرنے کی جگہ رہ جاتی ہے۔ (لیکن اب اہرام کی بلندی امتداد زمانہ کے سبب ۴۵۰ فٹ رہ گئی ہے) اہرام کی بیرونی طرف ایک زمانے تک ہموار اور چکنی تھی۔ لیکن بعد میں مکانوں کی تعمیر کے لئے ان خوبصورت پتھروں کو نکال لیا گیا۔ یہ چونے کے پتھر تھے۔ جو سورج کی روشنی میں خوب چمکتے تھے۔

اہرام میں جو پتھر استعمال ہوئے ان میں سے بعض تیس ٹن وزنی ہیں۔ جب کہ اوسطاً وزن قریباً ڈھائی ٹن بنتا ہے۔ اہرام کا مجموعی وزن ۷ کروڑ ٹن ہے۔ ان وزنی سلوں کو جوڑنے کے لئے استعمال ہونے والا مسالہ اب تک نہیں بنایا جا سکا۔ کاریگروں نے اس خوبی سے سلوں کو جوڑا ہے کہ جوڑ دکھائی نہیں

دیتا۔ اس اہرام کی کئی گز موٹی دیواروں میں بمشکل ۰۰۰۸ء۰ فیصد فرق پایا گیا ہے۔

کرینوں کے بغیر اتنی عمدہ تعمیر کیوں کر ممکن ہوئی؟ ہر پتھر کو سیٹ کرنے کے لئے اٹھانا رکھنا بار بار کس طرح ممکن ہوا؟

ہیروڈوٹس کا بیان تھا کہ ایک لاکھ افراد ۲۰ برس تک مشقت کرتے رہے تب کہیں جا کر اہرام مکمل ہوا تھا۔ اتنے لوگ صحرا میں کھانا پانی کہاں سے حاصل کرتے تھے؟ ملکی معیشت ایسا شاہی خرچ کس طرح برداشت کر رہی تھی؟ کیا یہ لوگ غلام تھے؟

معلوم ہوا ہے کہ اہرام کی تعمیر غلاموں نے نہیں کی بلکہ وہ لوگ مزدور تھے، جنہیں گندم، لہسن اور دوسری اشیائے خوردنی کی شکل میں مزدوری دی جاتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں آکسفورڈ کے ڈاکٹر کرٹ نے نظریہ پیش کیا کہ درحقیقت سیلاب کے زمانے میں بے روزگار مصریوں کو مصروف رکھنے کی خاطر یہ عمارت تعمیر کرائی گئی تاکہ انہیں مفت خوری کی عادت نہ پڑے اور یہ عوامی بہبود کا ایک ذریعہ بنا رہے۔

مصر کے عظیم اہرام کے بارے میں ایک نظریہ یہ ہے کہ یہ محض فرعون خوفو کا مقبرہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی تاریخ کی گزشتہ تمام تر واقفیت اور دانائی کو محفوظ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جس کے چپے چپے سے علم و آگہی کا احساس عیاں ہے۔ جدید دور میں انسان معلومات اور یادگار اشیاء کو دھاتی بکسوں میں بند کر کے زمین میں دفن کر دیتے ہیں تاکہ اگلی نسلیں انہیں کھود کر دریافت کر لیں اور اپنے اجداد کی ترقی سے آگاہ ہو سکیں۔ ایسے بکسوں کو ٹائم کیپ. سول کہا جاتا ہے۔ بعض ماہرین غزہ کے اہرام کو بھی ایک ٹائم کیپ. سول کہتے رہے ہیں۔ جو قدیم اور جدید تہذیبوں کے سنگم پر کھڑا آنے والوں کو ماضی کے مالکوں کی حیرت انگیز بصیرت کا احوال سناتا ہے۔ (22)

خزانوں کی تلاش میں یہ اہرام بارہا نقب زنی کا شکار ہوتا رہا مگر پہلی بار دیکھنے والوں کو حیرت اور مایوسی ہوئی کہ وہاں سے کوئی دولت برآمد نہ ہوئی۔ اور تو اور بادشاہ کی ممی بھی مقبرے سے غائب تھی۔ نہ جانے اسے رکھا بھی گیا تھا یا نہیں۔ تب کہا گیا کہ اصل دولت تو وہ علم ہے جو اس ٹائم کیپ. سول میں چھپا ہوا ہے۔ المسعودی نے کہا تھا کہ فراعنہ نے اپنے اہرام کے معماروں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ عصری علوم و دانش کا نچوڑ بھی اس عمارت میں رکھ دیں تاکہ آئندہ آنے والے اس سے مستفید ہو سکیں۔

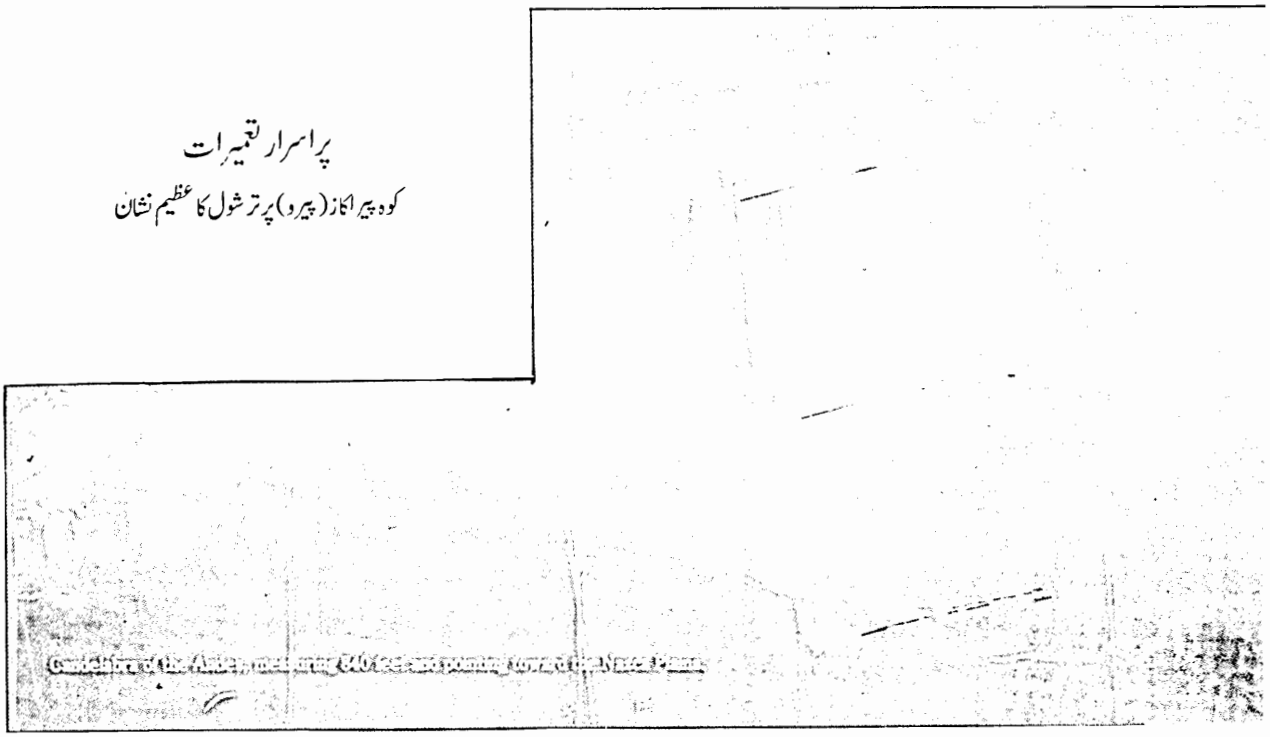

پراسرار تعمیرات

کوہ پیراکاز (پیرو) پر ترشول کا عظیم نشان

مصر پر عرب مسلم حملہ آوروں کو ان روایات کا علم تھا جن کے مطابق اہراموں میں زنگاری سے محفوظ حیرت انگیز اسلحہ اور نہ ٹوٹنے والے شیشے کا مضبوط سامان رکھا تھا۔ یہ روایت بھی تھی کہ سکندریہ کا روشنی کا مینار مضبوط شیشے کے ایک بڑے چبوترے پر تعمیر کیا گیا اور یہ تکنیک بھی فراعنہ مصر کی عطا کردہ تھی۔

عظیم اہرام کی اہمیت کا اندازہ انیسویں صدی کی ابتداء میں ہونا شروع ہوا۔ نپولین نے مصر فتح کیا تو فوجی انجینئروں نے مصر کا نقشہ بنانے کے لئے اہرام کو ایک سہل علامت کے طور پر چنا۔ اب جو کام شروع ہوا تو یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ اہرام کی مشرقی سمت عین مشرق کی جانب ہے قطب نما کے بغیر ہزاروں سال پہلے یہ حیرت انگیز کارنامہ کس طرح سرانجام دیا گیا؟ یہ معمہ بھی سامنے آیا کہ کیا زمین کے شمالی قطب کی سمت کا ادراک اتنا پہلے کیا جا چکا تھا۔

گزشتہ دو سو برس کے دوران فلکیات، تعمیرات، طبیعیات اور روحیت کے بے شمار ماہرین نے غزہ کے عظیم اہرام پر تحقیق میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں مگر تاحال اس کے معموں کی فہرست میں اضافہ ہی ہوتا چلا آرہا ہے۔

اہرام سازی کی روایت صرف مصر تک محدود نہیں ہے۔ دنیا بھر میں اہرام اور اہراموں سے مشابہ تعمیرات کا مشاہدہ ہوتا رہا ہے۔ ایک اصطلاح اہرامی پٹی سے چلتا ہے کہ مصر، میسوپوٹامیہ، یورپ، شمالی و جنوبی امریکہ، انڈیا، وسطی ایشیا، انڈونیشیا تک اہرام موجود ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا قدیم انسانوں کے ذہن میں اجتماعی طور پر اہرام کی پراسرار شکل میں کوئی خاص اہمیت تھی۔

اہرام کا بھوت اب تک انسان پر سوار ہے۔ ایک جانب جہاں جدید تعمیرات میں اہرامی عنصر دیکھنے میں آتا ہے۔ تو دوسری جانب عام استعمال کی اشیاء مثلاً دودھ اور جوس محفوظ کرنے کے لئے اہرامی شکل کے پیکٹوں میں بند کیے جاتے ہیں۔

چین کے شن سی صوبے میں دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکی فضائیہ نے اطلاع دی کہ یہاں فضا سے مٹی کے بنے ہوئے بہت سے اہرام دکھائی دیئے ہیں جو جسامت میں غزہ کے عظیم اہرام سے بھی دوگنا بڑے ہیں۔ ان کی تصاویر فضائیہ کے ریکارڈ میں محفوظ کر لی گئیں۔

سوویت رسالے ٹیکنالوجی آف یوتھ کی ایک اشاعت میں اس بات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ روسی خلائی جہاز لُنم نے چاند پر کچھ عجیب نشانات کی نشاندہی کی ہے۔ روسی ماہرین نے چاند پر اہرام کی مانند نوکدار ساختیں دیکھنے کا دعویٰ کیا جو ان کے مطابق بحر سکون (چاند کے ایک حصے کو دیا گیا نام) میں دکھائی دی ہیں۔[23]

تعمیرات کے حوالے سے ہندوستان کی تعمیراتی تکنیک اور انداز بھی کسی سے کم نہیں۔ یہاں عجیب و غریب جدت طرازیاں کی جاتی رہیں ہیں۔ مثلاً البیرونی کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے دیکھا تھا کہ ایک مندر میں ایک لوہے کا مجسمہ ایک کمرے کے بیچ فضا میں معلق ہے اور توہم پرستوں کا بتوں پر یقین پختہ کر رہا ہے۔ محمود غزنوی نے اس امر کا سبب دریافت کرنے کے لئے جب کمرے کی چھت سے چند اینٹیں نکلوائیں تو بت ایک جانب جھک گیا۔ اور مزید اینٹیں نکالنے پر زمین پر آگرا۔ پنڈتوں نے کمرے کے چاروں طرف ہر جانب مقناطیس جڑا دیئے تھے۔

مغل شہنشاہوں کے دور میں بھی تعمیراتی عجوبے موجود تھے۔ اکبر اعظم کے عہد کے ایک حکیم علی نے آگرے میں ایک حوض کے نیچے ایک روشن اور ہوادار کمرہ بنوایا جہاں وہ مطالعہ کرتا تھا۔ ملاقاتی ایک سیڑھی کے ذریعے پانی میں اتر کر کمرے میں داخل ہو جاتے لیکن چھت کے سوراخ سے کمرے میں ایک قطرہ پانی داخل نہ ہوتا۔ اکبر اور جہانگیر دونوں بادشاہوں کو یہاں آنے کا موقع ملا تھا۔ تزک جہانگری میں بھی اس کا حال درج ہے۔

اکبر اعظم کے عہد میں گجرات کا اکبری حمام بھی اس حوالے سے ممتاز ہے۔ روایات کے مطابق حمام کے نیچے ایک دیگر میں رکھا گیا مخصوص کیمیائی مادوں سے تیار شدہ دیا اپنی لو کی تپش سے پورے حمام کو گرم رکھتا تھا۔ یہ عجیب و غریب دیا ماضی میں تحقیقات کے دوران بجھ گیا اور پھر کبھی روشن نہ ہو سکا۔ نہ معلوم کس طریقے سے صرف ایک لو نہ صرف مختلف کمروں کے مختلف درجہ حرارت کو برقرار رکھتی تھی بلکہ حمام میں بھی بھاپ پیدا کرتی تھی۔

اس حمام کے حوالے سے یہ بات بھی حیرت انگیز ہے کہ اب پانی گرم کرنے کے لئے جلائی جانے والی لکڑیوں کی راکھ اور حمام کا گندہ پانی زیر زمین کہیں غائب ہو جاتا تھا۔

دہلی میں قطب مینار کے قریب لوہے کا ایک ۳۰ فٹ لمبا ستون کھڑا ہے۔ جو اشوک کا ستون کہلاتا ہے۔ چھ سو برس تک یہ ستون متر امندر میں پڑا رہا۔ اس پر ایک عدد گرودا (افسانوی پرندہ) نصب تھا۔ دسویں صدی عیسوی میں مسلمان اسے دہلی اٹھالائے۔ اور گرودا اکھاڑ کر الگ کر دیا۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ لوہے کا یہ ستون اب تک ویسے کا ویسا ہی کیوں ہے حالانکہ زنگاری کے عمل سے اسے کب کا ختم ہو جانا چاہئے تھا۔[24]

قطب مینار کے قریب ہی لوہے کا بڑا سا ٹکڑا دھرا ہے۔ جس میں بڑی عمدگی سے سوراخ کیے گئے ہیں۔ روایت ہے کہ انگریزوں کے دور میں ایک شخص گاہک کی خواہش کے مطابق چوکور، مستطیل، گول غرضیکہ ہر شکل اور ہر سائز کا لمبے سے لمبا سوراخ کر دیتا تھا ایک انگریز کپتان نے تجربے کی خاطر یہ سوراخ کروائے اور اس کے بعد کاریگر سے اس کا طریقہ دریافت کیا۔ لیکن اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔ لالچ، دھمکیاں، مار پیٹ کچھ بھی کارگر ہوتے دکھائی نہ دیا۔ تو کپتان نے اس کاریگر کے لڑکے کو باپ کے سامنے پیٹنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر بعد کاریگر نے کپتان سے کہا کہ میں یہ راز صرف اس شرط پر بتانے کو تیار ہوں کہ میرے بیٹے کو گولی مار دو۔ تھوڑی سی بحث کے بعد اس لڑکے کو ہلاک کر دیا گیا۔ اب کپتان نے طریقہ کار دریافت کیا۔ تو کاریگر گویا گونگا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ اس راز سے صرف میں اور میرا یہ بیٹا واقف تھے مجھے خطرہ تھا کہ یہ زدوکوب اسے زبان کھولنے پر مجبور کر دے گی پس وہ تو ختم ہو گیا۔ اب میں بھی ایک لفظ نہ بتاؤں گا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ کاریگر کوئی مخصوص چکنا نباتاتی مرکب استعمال کرتا تھا۔ جس سے لوہے میں ہر ساخت اور جسامت کا سوراخ کر لیا کرتا تھا۔

کیا کسی ایسے مرکب کا وجود ممکن ہے؟ اسی سے ملتی جلتی روایات دور ریڈ انڈین قبائل میں ملتی ہیں۔

دیگر تہذیبوں سے الگ تھلگ صدیوں ترقی کی حیرت انگیز منزلیں طے کرنے والی ریڈ انڈین اقوام کی تعمیرات دیکھنے والے پکار اٹھتے ہیں کہ بلاشبہ یہ لوگ نہایت عظیم فنکار تھے۔ ان لوگوں نے اہرام تعمیر کیے۔ پتھروں پر پیچیدہ نقوش بنائے اور نامعلوم طریقے استعمال کرتے ہوئے ہزاروں ٹن وزنی پتھر ایک سے دوسری جگہ منتقل کیے۔ یہ مصریوں سے بڑھ کر عظیم فنکار تھے۔ اہل مصر تو لوہے کے استعمال سے واقف تھے لیکن امریکہ کی سرزمین سے یہ دولت ریڈ انڈینوں کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ اور لوہے کے استعمال کے بغیر ایسے مکمل اور پیچیدہ نقوش بنانا کوئی مذاق نہیں۔

پیرو اور بولیویا کے علاقے میں انڈین قبائل کی چونکا دینے والی تعمیرات موجود ہیں۔ ان سنگین عمارتوں کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھروں کو اس

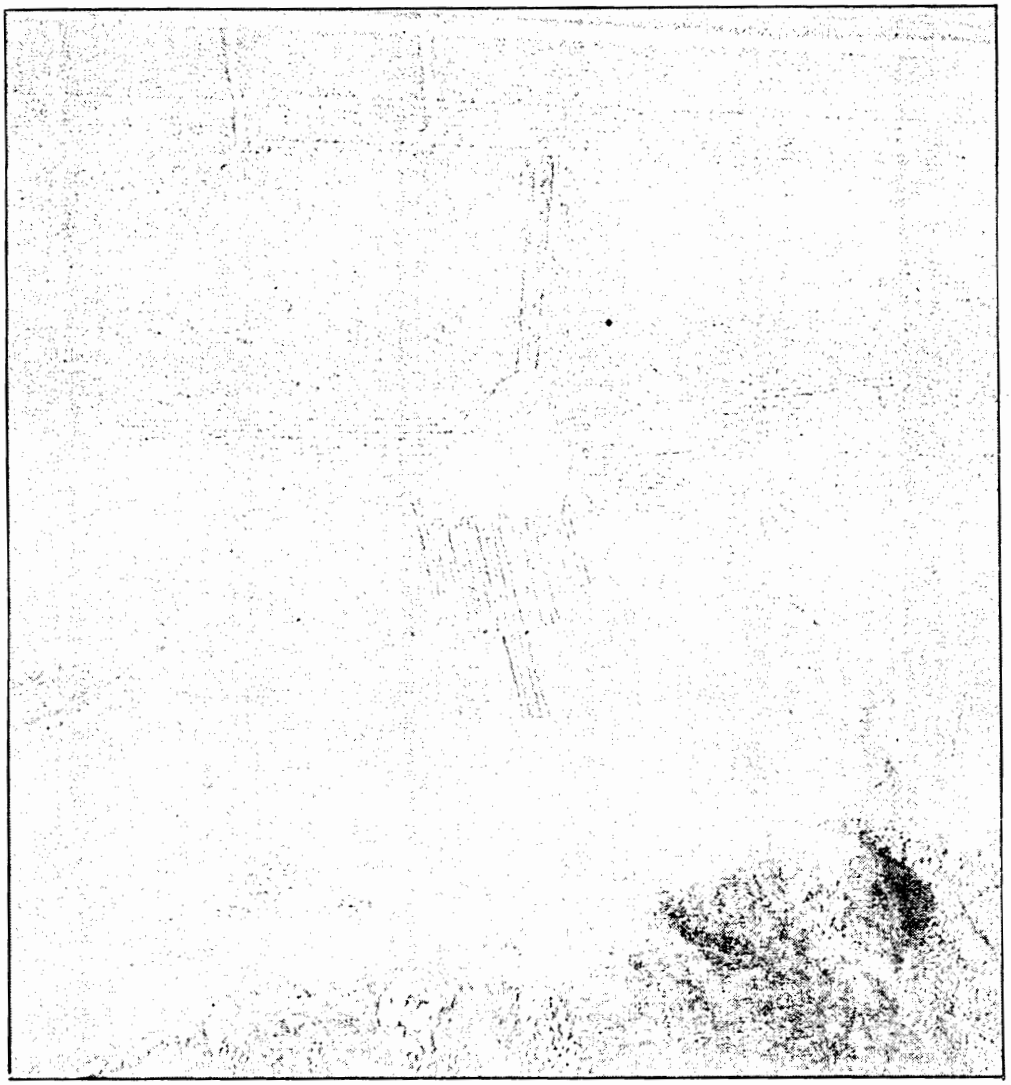

90 میٹر طویل شنکر فورے کی فہ تصویر صحرائے نزکا کی زینت ہے

عمدگی سے ایک دوسرے کے قریب رکھا گیا ہے کہ ان کے درمیان درز نہیں ہے۔ بعض پتھر قائمہ زاویہ کونوں کے ہیں اور بعض ۳۲ زاویوں کی سطحوں پر مشتمل ہیں۔ جو عین دوسرے پتھروں کے سطحوں کے ساتھ منطبق ہوتی ہیں۔ اس عجیب و غریب طرز تعمیر کا ایک ہی سبب دکھائی دیتا ہے یعنی زلزلہ سے بچاؤ۔ جیسا کہ ہسپانویوں کی تعمیرات زلزلوں میں برباد ہو جاتی تھیں۔ لیکن یہ قدیم تعمیرات زلزلہ پروف ثابت ہوئیں۔[25]

اتنے وزنی پتھر کیونکر لائے گئے؟ اتنی سطحوں کو فٹ کرنے کی خاطر بار بار پتھر کو دیوار میں لگانا اور پھر نکال کر تراشنا کیونکر ممکن ہوا۔ یہ کیا راز ہے۔ کہ تمام پتھر ایک دوسرے سے اپنی ساختوں سے منسلک ہو کر پوری عمارت کو ایک نظر نہ آنے والی زنجیر سے باندھ رکھے ہوئے ہیں؟ وہ کیسے اوزار تھے جو پتھر کو مخصوص زاویئے سے عمدگی سے تراشتے تھے؟

روایات بتاتی ہیں کہ قدیم معماروں کے پاس "نباتاتی محلول" تھا جس کے "تابکار" اثرات پتھروں کو نرم کر دیتے تھے۔ کرنل پی ایچ فاسٹ جو ۱۹۲۵ء میں برازیل میں کسی گمشدہ لیکن آباد انڈین شہر کو تلاش کرتا ہوا غائب ہو گیا تھا اسی خیال کا حامی تھا۔ اس کا بیان تھا کہ "سروڈی پاسکو" کے مقام پر امریکن کان

کنوں کو ایک بند برتن ملا تھا۔ (وہاں ایسے برتن جن کی شکل انسانی سر یا جسم یا پھر حیوانی شکل کی ہو، عام ملتے تھے۔ انہیں "ہوا کا" کہتے ہیں) ان ہوا کا میں عام طور پر سونا، غلہ یا مائعات کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ امریکیوں نے ایک مقامی کارکن کو اس ہوا کا میں موجود مائع کو پلانے کی زبردستی کوشش کی تو وہ بے چارہ گھبرا گیا اور ہوا کا کو پٹخ کر توڑ دیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ جہاں مائع گرا تھا وہاں چٹان نرم اور لچک دار سی ہو گئی ہے جو بعد میں سخت ہو گئی۔

ایک اور شخص کا قصہ مشہور ہے جو اپنے گھوڑوں کی تلاش میں گیا۔ واپس آنے پر اس نے ممیز و کھائی جو پگھل سی گئی تھی۔ اس سے لوگوں نے تصدیق کرائی کہ جنگل میں ان چھوٹے پودوں کے بیچ سے گزرا تھا جن کی موٹی پتیوں کا رنگ سرخ تھا اور جو روایات کے مطابق اس علاقے کے انکا نامی قبائل کے زیر استعمال تھیں۔ اسی طرح آئیوان سنیڈرسن کے بیان کے مطابق اینڈیز کے علاقے کی چھوٹی چڑیاں اچھلتے پانیوں کے اوپر سخت چٹانوں میں سوراخ کرنے کے لئے پہلے سرخ پتی سے رگڑ کر نرم کرتی ہیں اور پھر کرید کر سوراخ بناتی ہیں۔

لیکن چارلس برلیز نے ایک اہم نقطہ اٹھایا ہے "یہ بات قابل غور ہے کہ کرنل فاسٹ ایسے پتوں کا ایک نمونہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اور نہ ہی اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ پتھروں کو نرم کرنے والا مادہ ان برتنوں کو کیوں نرم نہیں کر دیتا جن میں اسے رکھا جاتا ہے۔ اور نہ ہی وہ گھوڑے کی ٹانگوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور نہ ہی اس پرندے کی چونچ پر جسے آئیوان سینڈرسن نے دیکھا تھا۔"[26]

چلئے یہ بات جھوٹ سہی لیکن تعمیرات تو اپنی جگہ قائم ہیں۔ اور اپنے بنانے والے پراسرار لوگوں کی بے پناہ ذہنی صلاحیت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اسے جھوٹ کہہ کر نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

جنوبی امریکہ میں سڑکوں کی تعمیر کرنے والے لوگوں نے پیرو کے مغربی کنارے پر زمین پر عجیب و غریب لمبی لمبی گہری لکیریں دیکھیں۔ انہیں پتہ چلا کہ یہ خطوط ۲۰۰۰ سال پرانی "انکا" نامی ریڈ انڈین قوم نے بنائے تھے۔ ۱۹۲۷ء میں پیرو حکومت نے علاقے کے سروے کے لئے ہوائی جہازوں کا استعمال کیا۔ جب پہلا جہاز پہلی مرتبہ ۳۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچا تو اس پر سوار ماہر نے ان پراسرار خطوط کو حیرت سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ صحرا میں یہ لکیریں بے ترتیب نہیں۔ بلکہ یہ خاص قسم کی شکلیں بنا رہی ہیں۔ جب جہاز ۶۰۰۰ فٹ کی بلندی پر پہنچا۔ تو پائلٹ اور وہ ماہر چونک اٹھے۔ ان کے سامنے چاروں طرف تاحد نگاہ آرٹ کی دنیا کا سب سے بڑا شاہکار موجود تھا۔

ایک بہت بڑی مکڑی، بہت بڑا بندر، مچھلی، کیڑے مکوڑے، پرندے، انسانی اشکال، سو سے زیادہ چکر کھاتی لکیریں، مثلثیں اور تیرہ ہزار بالکل سیدھے خطوط۔ ایک قاتل وہیل اور ایک ایسا شکر خورہ جس کے پروں کا پھیلاؤ ۲۰۰ فٹ سے زائد تھا، اس صحرا کے ڈرائنگ بورڈ کی زینت تھے۔ اس کے علاوہ بعض نامعلوم چیزوں کی اشکال بھی موجود تھیں۔[27]

اس سے پہلے کسی مہذب انسان نے ان شکلوں کو نہ دیکھا تھا کیونکہ زمین پر رہ کر ان کو پہچاننا ناممکن تھا۔ اور یہ محض بالائی فضا سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کو دیکھتے ہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ یہ کیسے اور کیوں بنائی گئیں؟

ایک عرصے تک ان پراسرار "تعمیرات" کو "انکا کی سڑکیں" کہا جاتا رہا۔ اور نزکا نامی شہر اور صحرا کی رعایت سے اب یہ "نزکا خطوط" کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ نزکا کے قدیم باسیوں نے بھاری پتھر گھسیٹ کر صحرا کی بھوری زمین کے نیچے کی زردی مائل بھوری زمین کو ظاہر کر کے یہ لکیریں کھینچی ہیں۔ یہ ۴۰۰ ق م سے ۹۰۰ء تک کے دوران صدیوں تک اتنی سخت مشقت کرتے رہے ہوں گے (انکا قوم کے آباء کا دور ۲۰۰ ق م سے شناخت کیا جاتا رہا ہے)

انکا کی سڑکیں کیسے تعمیر ہوئیں۔ ایک جرمن خاتون ماریا ریش نے تحقیق و جستجو کے بعد یہ کہا ہے کہ نزکا کے قدیم باسیوں نے بڑی اشکال کی تعمیر کے لئے مزدوری کے چھوٹے چھوٹے نمونے بنا رکھے تھے جیسا کہ نزکا کے صحرا کے قریب رہنے والے انڈینوں کا بیان تھا کہ انہیں ان نالیوں میں خشک لکڑیوں کے گٹھے کئی مقامات پر پڑے ملے تھے۔ ۳۰۰ سے ۵۰۰ عیسوی دور کے کپڑے کے وہ ٹکڑے جو نزکا سے دریافت ہوئے ہیں ان پر یہی اشکال چھوٹی جسامت میں بنائی گئی ہیں۔ کشیدہ کاری کے ان چھوٹے نمونوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا گیا کہ ان آرٹ کے شہ پاروں کے خالق زمین پر چلتے ہوئے ہر قدم کو کشیدہ کاری کے ایک ٹانکے کے برابر مانتے ہوئے صحرا میں اتنی بڑی تصاویر بناتے گئے۔[28]

لیکن ان ضخیم تصاویر کو کم از کم ۶۰۰ فٹ کی بلندی ہی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اس علاقے میں اتنا اونچا کوئی مقام ہے ہی نہیں جہاں سے اشکال بنانے کے

کام کی نگران کی جاتی پھر اتنی مکمل اور درست اشکال کو کس ذریعے سے دیکھ کر اتنی درستگی سے بنایا گیا؟

اس کا جو جواب دیا گیا ہے وہ اہل نزکا کی عظمت کو دو چند کر دیتا ہے۔ ۱۵۰۰ برس سے زائد پرانی قبروں سے ماہرین اثریات نے پرانے زمانے کے کپڑوں کے ایسے خوبصورت ٹکڑے حاصل کئے ہیں جن کی بنائی بہت مضبوطی سے کی گئی ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک امریکی ہوا باز جم وودمین نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ نالیوں یا خطوط کے اختتام پر بعض جگہ پتھر کی ایسی ساختیں نظر آئی ہیں جن پر چولہے کا گمان ہوتا ہے۔ اور قدیم برتن جو ملے ہیں ان میں سے بعض پر ایسی تصاویر موجود ہیں جن میں ایک گلوب سا دکھایا گیا ہے جس کے ساتھ گھاس پھوس کی بنی ہوئی "کے نو" کشتی دکھائی گئی ہے۔

اگر ان تین باتوں کو ذہن میں رکھا جائے تو نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اہل نزکا گرم ہوا کے غباروں میں بیٹھ کر فضا سے نیچے کی اشکال کا مشاہدہ کرتے تھے۔ قدیم کپڑے کی مضبوط بنائی کی بدولت اگر ایک بڑا سا غبارہ سی لیا جاتا تو اس میں سے ہوا کا اخراج زیادہ نہیں ہوتا ہو گا۔ اس کپڑے کے غبارے سے "کے نو" باندھ کر چولہوں سے گرم ہوا داخل کر کے غبارہ بھر لیا جاتا ہو گا اور بلند ہوتے ہوئے غبارے کے ساتھ بندھی کے نو میں بیٹھے ماہر نیچے کا جائزہ لے لیتے ہوں گے۔

نومبر ۱۹۷۵ء میں اس نظریئے کی تصدیق کے لئے وودمین نے مقامی انڈینوں کے بنے ہوئے کپڑے کے غبارے اور قدیم نزکا کے باسیوں کے معلومہ ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ایک انگریز ماہر جولین ناٹ کے ہمراہ کونڈر اول نامی غبارے میں صحرائے نزکا پر کامیاب سفر کر لیا۔

کیا نزکا انڈینز نے بھی یہی تکنیک استعمال کی تھی؟ اگر ایسا ہی ہے تو ہمیں اپنے فضا میں سفر کی تاریخ میں بھی ترمیم کرنا ہو گی۔

ان پراسرار شکلوں کی اہمیت کیا ہے۔ انہیں کیوں بنایا گیا؟ آیا یہ کوئی علامت ہیں۔ آگاہی کی یا خبرداری کی!؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کا بیڑا نیویارک کی لانگ آئی لینڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال کوسوک نے اٹھایا پہلے ہوائی جہاز کے ذریعے علاقے کی تصاویر حاصل کی گئیں پھر ایک سخت مشقت طلب کام شروع ہوا۔ ایک خط کے ساتھ ساتھ تپتی دھوپ میں صدیوں پرانی ریت کھرچی جانے لگی تاکہ زیادہ واضح تصاویر

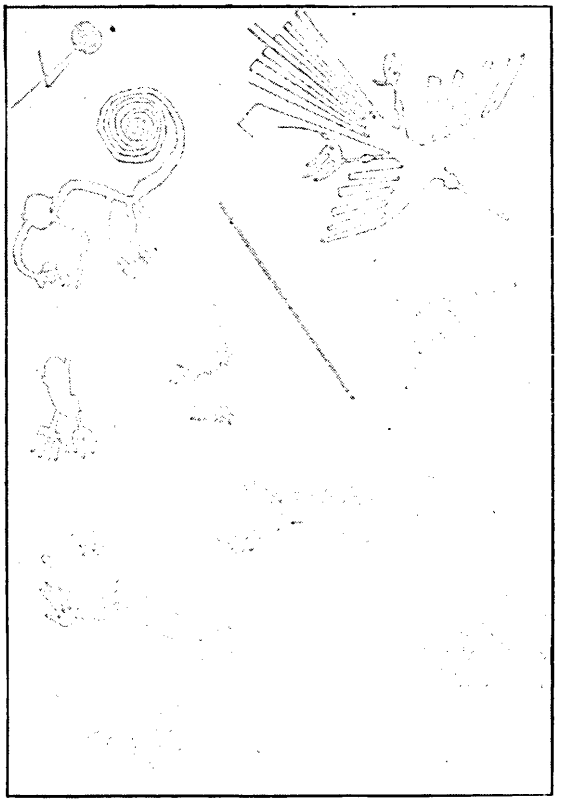

صحرائے نزکا کی مختلف تصاویر

## پراسرار تعمیرات

دہلی میں لوہے سے بنے اس قدیمی ستون پر کہیں زنگ کا نشان نہیں ہے

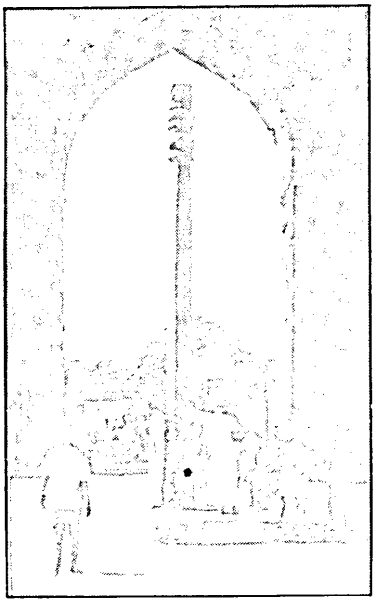

حاصل ہوں۔

ایک برس کی محنت کے بعد محض چند درجن اشکال صاف ہوئیں۔ دھوپ سے بچنے کے لئے وہ صبح صبح صفائی کا کام کرتے تھے۔ ۲۲ر جون ۱۹۴۰ء کی صبح طلوع ہوئی۔ ڈاکٹر کوسوک ایک ایسی طویل نالی کے عین سامنے کی پہاڑی پر کھڑے تھے جس سے بہت سی شاخیں نکل رہی تھیں۔ اینڈیز کے پیچھے سے طلوع ہوتے آفتاب کو دیکھ کر ڈاکٹر نے گویا ان لکیروں کا راز پالیا۔ کیا یہ بہت بڑا فلکیاتی چارٹ تھا جو ستاروں اور سیاروں کی سمتوں کا تعین کرتے ہوئے موسموں کے تغیر کی تشریح کر رہا تھا۔ تاکہ نزکا کے کسان فصلوں کی بوائی کے بارے میں جان سکیں؟ کئی صدیاں محض اسی مقصد کے حصول کے لئے اتنی سخت مشقت میں صرف کی گئیں؟

ڈاکٹر کوسوک اور جرمن خاتون ماریا کا خیال یہی تھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس عظیم فلکیاتی چارٹ میں جانوروں کی شکلیں مختلف سیاروں کو ظاہر کرتی ہیں۔ جہاں پرندے نسبتاً تیز رفتار سیاروں زہرہ اور مریخ اور مکڑی مشتری اور زحل وغیرہ کو ظاہر کرتے ہیں۔ جب کہ خطوط ستاروں کی پوزیشن کا اظہار ہیں۔ اس نظریئے کی بنیاد پر کہا گیا کہ جس وقت تصاویر بنائی جا رہی تھیں تو ان لکیروں کے حساب سے سورج چاند ستاروں کی پوزیشن وہ ٹھہرتی ہے جو ۵۰۰ء کے دور کو ظاہر کرتی ہے۔[29]

نزکا سے ۲۰۰ میل دور جنوب میں بھی اسی طرح کی شکلیں بنائی گئی ہیں۔ اسی طرح کولریڈو دریا کے پاس کیلی فورنیا میں بھی نزکا سے مشابہ شکلیں نظر آتی ہیں۔ جنہیں گو آج "موجاوانڈینز" کا کارنامہ قرار دیا جاتا ہے لیکن اہل موجاوان کے بارے میں کوئی واقفیت نہیں رکھتے کہ یہ کس نے اور کیوں بنائیں۔ موجاو کی ان شکلوں میں سے زیادہ تر ۱۸۸۰ء کے دوران ریلوے لائن کی تعمیر کے دوران تباہ ہو گئیں۔

پیرو میں "مارکاہواسی" کے مقام پر پہاڑیوں میں چٹانوں کو تراش کر انسانی چہرے، ببر شیر، اونٹ، دریائی گھوڑے اور مگرمچھ سے مشابہ حیوانی شکلیں تراشی گئی ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ صرف خاص خاص موقعوں پر واضح ہوتی ہیں جیسے گرمیوں کے دنوں میں جب سورج کی شعاعیں ان پر دائیں جانب سے ترچھی پڑیں تو یہ صاف نظر آتی ہیں۔

پیرو میں ہی پسکو Pisco نامی ساحل کے ساتھ کوہ پیراکاز پر ایک بہت بڑا نشان سا کھدا ہوا ہے جو ترسول یا شمع دان سے مشابہ ہے۔ بحرالوقیانوس سے آنے والے لوگوں کو ۸۰۰ فٹ جسامت کا یہ نشان بڑی دور سے نظر آتا ہے۔ یہ ایسی علامت کی مانند ہے جیسا کہ سڑک پر لگے سائن بورڈ پر بنی ہوتی ہے تاکہ مسافروں کی رہنمائی کی جا سکے۔ پیراکاز کی یہ علامت نزکا کے میدانوں کی جانب ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ بہت پہلے یورپی جب یہاں آئے تو انہوں نے ترسول کو دیکھ کر سوچا کہ اس کے تین نوکدار حصے باپ، بیٹا اور روح القدس کی علامت ہیں اور ترسول کی سمت گویا عناصر تثلیث کی اس خواہش کا اظہار ہے کہ یورپی اس سمت میں آگے بڑھ کر جنوبی امریکہ کے باشندوں کو غلامی اور عیسائیت کا طوق پہنا دیں۔

ترسول یا شمع دان کی یہ علامت کس لئے بنائی گئی؟ یورپی حملہ آوروں نے دیکھا تھا کہ ترسول کی وسطی نوک سے ایک بہت بڑا رسا جوڑا گیا تھا۔ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ دائیں بائیں کے دو پھلوں سے بھی کسی زمانے میں رسے جوڑے گئے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟

پیرو کے ایک شخص بیل ٹران گارسیا نے ایک عجیب بات کہی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ دراصل ایک بہت بڑا سسٹم تھا۔ جس میں مختلف جسامت کے رسوں سے مختلف اوزان باندھے گئے تھے اور رسوں کو چرخیوں پر سے گزارا گیا تھا۔ مختلف جگہوں پر نشان زدہ سیڑھیاں کھڑی کی گئیں تھیں جس سے یہ ـــــ ایک بہت بڑا اور زبردست زلزلہ پیما بن گیا تھا۔ جس کی مدد سے مدوجزر کا سراغ بھی مل جاتا تھا۔ گرسیا نے یہ بھی کہا کہ اس نظام میں نہ صرف پیرو بلکہ پورے کرہ ارض سے آنے والی زلزلے کی لہروں کو ریکارڈ کرنے کی اہلیت موجود تھی۔ اس کے اس دعوے یا اندازے کی تصدیق نہیں ہو سکی۔[30]

۲۰۰ق م میں میکسیکو کے جنوبی علاقے میں زاپوٹیک قوم کا راج تھا۔ یہ لوگ کہاں سے آئے اس بات کا علم نہیں۔ ان لوگوں نے آرٹ، تعمیرات اور فلکیات میں بڑی ترقی کی ان کا دارالسلطنت "مونٹی البان" تھا جس کے آثار میکسیکو کی ایک پہاڑی پر ملتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں ماہرین آثار قدیمہ نے یہاں سے اعلیٰ قسم کے نوادرات حاصل کئے جو زاپوٹیک قوم کے سورماؤں کے مقابر میں رکھے گئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ حیرت انگیز دریافت وہ زیر زمین ننھی منی سرنگیں ہیں جن کا ایک بہت بڑا اور پیچیدہ جال بچھا ہوا ہے یہ اتنی چھوٹی ہیں کہ آدمی تو دور کی بات ہے عام قد و قامت کے بچے کے لئے بھی ان میں داخل ہونا دشوار ہے۔

سرنگوں کی اونچائی بعض جگہ ۲۰ انچ اور کہیں کہیں محض ایک فٹ ہے جب کہ چوڑائی ۲۵ انچ کے قریب ہے۔ پہلے پہلے ماہرین کا خیال تھا کہ یہ نالیوں کا نظام نکاسی آب کے لئے ہے۔ مگر جب چند ایک نے ہمت کی اور بڑی مشکل سے پھنس پھنسا کر ان سرنگوں میں داخل ہوئے اور پشت کے بل گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھے تو ہر سرنگ کے آخر میں ایک عدد انسانی ڈھانچہ اور اس کے ساتھی قیمتی زرو جواہر پڑے ملے۔ ان سرنگوں کو کس طرح بنایا گیا کہ ان کا مقصد کیا تھا؟ ہم نہیں جانتے! [31]

جنوبی امریکہ میں اینڈیز پر قابض ہونے والے یورپین نے دیکھا کہ وہاں انکا نامی قوم ایک زبر دست نظام زندگی کے تحت علاقے کا نظم و نسق چلا رہی ہے۔ ان لوگوں کے شہروں، قلعوں اور محلات کی بنیادیں کسی پرانی تہذیب کی باقیات پر قائم ہوئی تھیں جن کے بارے میں ''انکا'' کو کچھ معلوم نہ تھا۔ یہ پچھلی قوم تعمیرات کے سلسلے میں حیرت ناک حد تک مہارت رکھتی تھی۔ ان کا طرز تعمیر انسانی ذہن کو چکرا دیتا ہے کہ اتنا قدیم انسان اتنا ذہین تھا؟ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جہاں سانس لینا دشوار ہوتا ہے۔ وہاں ہزاروں فٹ کی بلندی تک پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے خدا جانے یہ لوگ کس طرح اٹھا لائے اور انہیں نامعلوم اوزاروں سے تراش کر رکھ دیا۔ ڈیڑھ سو سے دو سو ٹن وزن کے پتھروں کو ہزار ہزار میل پرے سے دریاؤں، وادیوں، ندیوں، دلدلوں کے اوپر سے لا کر پہاڑوں کی بلندی پر منتقل کرنا دماغ کو ہلا ہی تو دیتا ہے (یہ پتھر مقامی نہیں اور فی الحقیقت دور دور سے لائے گئے ہیں)

بولیویا کے علاقے میں ۱۳ ہزار فٹ کی بلندی پر کسی قدیم تہذیب کے آثار موجود ہیں۔ یہاں پتھروں کو تراش کر ایک عظیم الشان شہر تعمیر کیا گیا تھا جہاں کسی زمانے میں ایک بہت بڑی آبادی ہوا کرتی تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس قدر بلندی پر ان لوگوں کی گزر بسر کس طرح ہوتی ہوگی؟ کیونکہ یہاں غلہ بھی نہیں اُگ سکتا اس قدر بلندی پر رہنے والے غنودگی کے مرض میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ اتنی بلندی پر حمل ضائع ہو جاتا ہے بلیاں تک نہیں رہ سکتیں۔ یورپ والوں نے آس پاس کے ''قویچوا'' اور ''ایمارا'' انڈین لوگوں سے پوچھا کہ یہاں کون رہتا تھا اور یہ شہر کس نے بنایا تھا مگر انہوں نے اس بارے میں عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ وہ اسے دیوتاؤں کا کارنامہ قرار دیتے تھے۔ ہسپانویوں نے دیکھا کہ سنگین معبدوں کی بنیادوں میں چاندی استعمال کی گئی ہے۔ انہوں نے سو سو ٹن وزنی پتھروں کے نیچے سے چاندی نکالنا شروع کر دی جس سے عظیم الشان شہر کی عظیم دیواریں اور معبد دھڑام سے آن گرے شہر کے حسین تعمیراتی اجزاء اور پتھر کئی برس تک لے جا کر ''لاپاز'' شہر کی نئی تعمیرات اور سڑکوں میں استعمال کیے گئے اور آج صرف وہ بھاری پتھر رہ گئے ہیں جن کو اٹھانا ناممکنات کی حد تک دشوار ہے۔ [32]

بولیویا میں ''ٹائی ہواناکو'' کے مقام پر واقع یہ شہر ویران کیوں ہو گیا؟ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ درحقیقت یہ مقام ایک بندر گاہ تھی جو مشہور جھیل ''ٹی ٹی کاکا'' کے کنارے واقع تھی (جیسا کہ بعض آثار سے اندازہ ہوتا ہے) مگر فی زمانہ ٹی ٹی کاکا جھیل خاصی دوری پر واقع ہے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے گہرے پانیوں میں سمندری جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ سطح سمندر سے بہت زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ارضیاتی تغیر و تبدل کے دوران یہ مقام بہت بلندی پر آ گیا اور یہاں کے لوگ مجبوراً شہر خالی کر گئے۔

اس مقام پر ۱۵ ٹن وزنی پتھر کا ایک دروازہ سا ہے جسے پتھر کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ مقامی انڈین اسے دروازہ آفتاب کہتے ہیں مگر ان ''ایمارا'' انڈین کو یہ معلوم نہیں کہ اس کا خالق کون ہے؟ یہ پتھر کوئی داخلہ یا حد بندی نہیں ہے۔ بس ویسے ہی بنایا گیا ہے۔ اس پر بنائی گئی محیر العقول اشکال پر غور و خوض کے بعد ماہرین نے بتایا کہ یہ فلکیاتی اعداد و شمار کا اندراج ہے۔ اور اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر کھرچ کر اشکال بنانے والے زمین کی حرکت سے آگاہ تھے۔ ایک اور معمہ یہ ہے کہ اس پتھر کی اشکال سے پتہ چلتا ہے کہ کام کرنے والوں کو جیسے اچانک کام چھوڑ کے جانا پڑا ہو اور وہ اشکال کو نامکمل ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ [33]

امریکہ میں بہت سی پہاڑیاں فی الحقیقت قدرتی پہاڑیاں نہیں بلکہ ایسی انسانی تعمیرات ہیں جو گرد و غبار مٹی اور اس پر اگنے والے نباتات کے سبب پوشیدہ ہو گئی ہیں۔ میکسیکو میں جنگوں کے دور میں ''پانچو ولا'' کے ایک فوجی دستے نے ایک پہاڑی کی چوٹی پر پوسٹ قائم کی جہاں سے وہ فیڈرل آرمی پر گولے برسایا کرتے۔ دھماکوں اور جھٹکوں سے اس پہاڑی پر بعض جگہ سے مٹی اکھڑ گئی۔ تب جا کر معلوم ہوا کہ کوئی پہاڑی نہیں۔ بلکہ قدیم اہرام ہے۔ جو ازٹک قوم نے تعمیر کیا تھا۔

جدید کئی منزلہ عمارتوں کی تعمیر سے قبل پورے امریکی خطے میں بلند ترین تعمیر ایک مایائی اہرام تھا جو گھنے جنگلات میں کھڑا تھا۔ اور صدیوں سے اس پر گھاس

پھوس اور درخت اگے ہوئے تھے۔ گوئٹے مالا میں نکال کے مقام پر واقع اس بلند ترین اہرام کی اونچائی ۲۱۲ فٹ ہے۔ اسے "نکال چہارم" کا نام دیا گیا ہے۔ میکسیکو میں ہی "چرچ آف کلولا" ایک عظیم الشان ازٹک اہرام نما معبد پر تعمیر کیا گیا جو ۲۰۰ فٹ اونچا ہے۔ اسے بھی پہلے پہاڑی ہی سمجھا جاتا رہا ہے۔

پیرو کے علاقے میں بھی کئی مقامات جنہیں مٹی کا ڈھیر خیال کیا جاتا تھا۔ فضائی سروے کے دوران اہرام نما تعمیرات ثابت ہوئے۔ ایکو ڈور کی ایک "پہاڑی" کے بارے میں روایات تھیں۔ کہ یہاں انڈینوں کے خزانے دفن ہیں۔ جن کی تلاش کے دوران اس مقام کو ہسپانویوں نے نظر آتش کر دیا تھا آثار قدیمہ کی تلاش کے دوران جب اس پہاڑی کو کھودا گیا۔ تو چوٹی پر سے ایک عجیب شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح کی تعمیر نظر آئی۔ جس کا مقصد نہیں سمجھا جاسکا۔ یہ مقام بھی بے حد پرانا معلوم ہوتا ہے۔ "انکا" قوم اسے پہاڑ قرار دیتی تھی۔ مگر ماہرین ارضی نے اس بات کی تردید کر دی ہے۔ گویا "انکا" کی قدیم روایات میں بھی اسکا تذکرہ نہیں تھا۔ اور یہ اس سے بھی بہت پرانی تعمیر ہے۔[34]

# خطوں کی دریافت

کسی سرزمین کی دریافت کے پیچھے مختلف عناصر اور وجوہات کار فرما ہو سکتی ہیں۔ سفر کی سہولت نئے راستوں اور تجارتی تعلقات کی تلاش یا بہتر رہائش، خوراک اور سبزے کی تلاش یا پھر سیاحت کا شوق۔

جدید تاریخ میں مختلف علاقوں کی دریافت کا سہرا بعض مخصوص افراد اور اقوام کے سر باندھا گیا ہے۔ مگر فی الحقیقت تحریری ریکارڈ اور "نو دریافت شدہ" خطوں کے باسیوں کی روایات اس کی تردید کرتی ہیں۔ مثلاً یہ خیال کہ قطب جنوبی کی بابت سب سے پہلے یورپی اقوام کو معلوم ہوا۔ حقیقت نہیں ہے۔

بادشاہ محمود غزنوی کے دربار میں ترکستان کے ایک سیاح نے بتایا کہ اس نے قطب جنوبی کا سفر کیا ہوا ہے اور وہاں سمندر پار ایک جگہ سورج کی گردش اس طرح سے ہے کہ وہاں رات بالکل نہیں ہوتی۔ بادشاہ نے خیال کیا کہ یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق دن اور رات ہر جگہ ہوتے ہیں چنانچہ اس نے سیاح کو کافر قرار دے کر سزائے موت تجویز کی مگر دربار میں موجود البیرونی اور دوسرے علماء نے بادشاہ کو اس اقدام سے باز رکھا اور سورۃ کہف کی آیت ۱۹۴ کا حوالہ دیا "اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا کہ ہم نے اس کے لئے پردہ نہیں بنایا۔"

سیاح کی جان بخشی ہو گئی۔ اس واقعہ سے اس بات کی شہادت مل جاتی ہے کہ انسان قطب جنوبی سے واقف ہو چکا تھا۔[35]

دانتے کے "طربیہ خداوندی" میں بھی ایک عجیب حوالہ موجود ہے۔ یوں لگتا ہے کہ دانتے جانتا تھا کہ Southern Cress جیسی کوئی چیز موجود ہے۔ حالانکہ اس بات کی خبر تو اہل یورپ کو بہت عرصہ بعد اس وقت ہوئی جب یورپی ملاحوں نے خط استواء عبور کر کے اس منظر کو دیکھا۔ طربیہ خداوندی کے اشعار میں دانتے کہتا ہے۔

میں دائیں جانب مڑا اور دیکھا
دوسرا قطب۔ اور دیکھے چار ستارے

اس سے پہلے سوائے اولین لوگوں کے۔ اور کسی نے بھی (انہیں) نہیں دیکھا تھا۔

آسمان ان کے شعلوں سے دمکتا نظر آتا تھا۔

ادشمال کی اداس سرزمین

(کیونکہ تو) انہیں دیکھنے سے محروم ہے۔[36]

امریکہ کی دریافت کا سہرا کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بہت پہلے ایک شخص لیف ایرک سن یہاں آ چکا تھا۔ بلکہ شواہد تو اس دریافت کا دورانیہ بہت ہی پیچھے لے جاتے ہیں۔

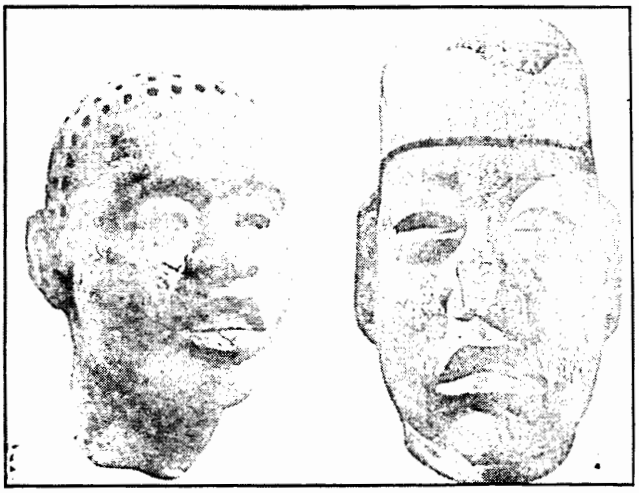

امریکہ سے ملنے والے ان مجسموں کے خدوخال چینی اور نیگرو ہیں

کیا ڈھائی ہزار سال پہلے پرانی دنیا کو امریکہ کے وجود کی خبر ہو چکی تھی؟

۲۴۰۰ سال پرانے افلاطون کے مکالمے "تمائس" میں ایک خاصا معنی خیز تذکرہ موجود ہے۔ گفتگو میں شریک ایک شخص کری ٹیاس کہتا ہے"۔ "ان دنوں اوقیانوس جہاز رانی کے لئے ٹھیک ہی تھا۔ وہ مقام جسے تم ہرقل کے ستون کہتے ہو اس کے سامنے ایک جزیرہ ہوا کرتا تھا جو لیبیا اور ایشیاء کے مجموعے سے بھی بڑا تھا۔ اس جزیرے سے دوسرے جزائر تک رسائی ممکن تھی اور ان جزیروں سے آگے۔ پورے علاقے کے سامنے اصل سمندر میں ایک بہت بڑا خطہ زمین ہے۔ واقعی ایک بہت بڑا خطہ زمین۔[37]

ان لوگوں کو اس کی خبر کیونکر ہوئی۔ کیا اس عہد میں انسان نے اتنا دور تک سفر کر رکھا تھا؟ شاید ایسا ہی تھا۔ پرانے لوگ دنیا کے بارے میں جتنا جانتے تھے۔ ہم ان کی معلومات کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہیں (دیکھئے پراسرار نقشے)۔

فرض کیا کسی دور دراز سرزمین پر ایک الگ نسل کا آدمی پہلی مرتبہ جاتا ہے تو وہاں کے لوگ اسے اور اس کی آمد کو بہت عرصہ تک یاد رکھیں گے اور وہ شخص واپس لوٹنے پر اپنی قوم کو سفر کی روداد سنائے گا۔ یوں ایک جانب ایک نئے آدمی کی آمد کی روایت اور دوسری جانب نئی سرزمین ملنے کے قصے پھیل جائیں گے۔ عین یہی صورت حال براعظم امریکہ اور انڈین اقوام کے بارے میں نظر آتی ہیں۔ کیونکہ وہاں کے لوگوں میں غیر انڈین افراد کی آمد کے چرچے یورپین اقوام کی آمد سے صدیوں پہلے سے چلے آتے تھے۔ جب کہ پرانی دنیا میں بھی ایسے شواہد ملتے ہیں کہ وہ کسی نئی تہذیب سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ مایا، ازٹک اور ٹولٹک اور ایسی ہی دیگر مہذب انڈین اقوام میں ایک قدر مشترک بیرونی علاقوں سے داڑھی والے، دیوتا، نیم دیوتا اور اساتذہ قسم کے افراد کی آمد کی روایت ہے۔ قدیم میکسیکو میں ایک ایسی ہی شخصیت کا پتہ چلتا ہے یعنی قوئے زل کوئل Quetzalcoatl ازٹک اور ٹولٹک کو اسی دیوتا کے گوئٹے مالا میں کوکوماز Kukumatz اور یوکاٹان کے علاقے میں کوکلکان Kukulcan کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ایک روایت میں تھا کہ قوئے زل کوتل طلوع آفتاب کی سرزمین سے آیا تھا۔ داڑھی والا یہ شخص سفید قبا میں ملبوس تھا۔ اس نے لوگوں کو دانش مندانہ قوانین دیئے۔ چیزیں بنانا سکھائیں اور ایک ایسی سلطنت قائم کی جہاں بھٹے انسانی قد کے برابر اگا کرتے تھے اور جہاں رنگین کپاس اگا کرتی تھی۔ پھر چند وجوہات کے سبب اسے سلطنت چھوڑنا پڑی۔ وہ اپنے قوانین، تحریر اور نغمے ساتھ لے گیا۔ کچھ عرصہ Cholula میں قیام پذیر ہوا۔ اور لوگوں کو اپنی دانش سے نفع دیا اور پھر آخر کار ساحل سمندر پر ایک دن آکر رونا شروع کر دیا اور پھر جلنے لگا اور پھر اس کا بچ جانے والا دل ستارہ صبح بن گیا۔ کچھ کا کہنا ہے وہ وہیں سے بحری سفر پر روانہ ہو گیا جہاں سے آیا تھا تاہم سب اس بات پر متفق تھے کہ اس نے ایک مرتبہ پھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔

سفید چمڑی والے اس قصے کے مرکزی کردار کے بارے میں بعض کی رائے ہے کہ غالباً کسی دور دراز ملک سے آنے والا ابتدائی کیتھولک مشنری تھا جو

چھٹی صدی میں آیا۔ لیکن ماہرین نے اس بات کو رد کر دیا ہے۔

قوئے زل کوتل، کوکلکان اور کوکوماز کے معانی ہوتے ہیں "پردار اژدھا" گوئٹے مالا میں کوئے زل کوتل جیسے شخص کو کل کان کی داستان کے مطابق کوکلکان شمال شہر ٹلا سے شہر بدر ہو کر ۱۱۰۰ء میں چیچن انزا کے علاقے میں چلا آیا اسے مقدس کنویں میں پھینکا گیا مگر وہ بچ نکلا اور مایاؤں نے اسے زندہ دیوتا کا مرتبہ دیا اور وہ یوکاٹان کا سب سے طاقتور سردار بن گیا لیکن اپنی عروج کے دور میں واپس آنے کا وعدہ کر کے پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔

قوئچ مایا نے گوئٹے مالا میں عالم دیوتا گوکو ماز Gucumatz کی آمد کا تذکرہ کیا ہے اسی طرح ادویات، تحریر اور کتب کا دیوتا اتزمنا Itzamna تھا۔

کولمبیا کے چب چاس Chib Chas اور Bochica بوچیکا کا سورج دیوتا کو ئزل کوتل سے مشابہ ہے۔ بوچیکا کی غیر معمولی روایت میں ہے کہ دیوتا اپنی بیوی کے ہمراہ اونٹوں پر سوار مشرق سے آیا۔

سیمے Same برازیل کا دیوتا استاد تھا جو کوئے زل کوتل کی مانند ڈاڑھی والا تھا اس نے سحر اور زراعت کی تعلیم دی۔

ہسپانوی مبلغ بشپ لانڈا جس نے مایا کا تمام تحریری ریکارڈ اور کتب کو جلا ڈالا تھا ایک عجیب روایت قلم بند کرتا ہے کہ مایا میں روایت موجود تھی۔ (لانڈا اور اس کے ساتھیوں کے اندازے کے مطابق روایت کا دور ۱۰۰۰ قبل از مسیح کا تھا)۔ لمبی قباؤں میں ملبوس افراد کا گروہ ووٹن (Votan) نامی دیوتا کی سرکردگی میں آیا مایا نے اسے کوئے زل کوتل کا پوتا قرار دیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں اور خود بھی مایا میں رشتہ داریاں قائم کیں شادیاں کیں اور Palenque کا شہر بسایا اور وہ اس دوران سمندر پار بھی جاتا تھا اور مزید لوگوں کو لاتا تھا۔"

ازٹک قوم پر جب کورٹیز حملہ آور ہوا تو پہلے پہل انہوں نے اسے Tonantiuh یعنی سورج کا بیٹا کہہ کر تعظیم کی لیکن بعد ازاں وہ پریشانی کے عالم میں دو گروہوں میں بٹ گئے کیونکہ کچھ کا کہنا تھا کہ اس خوفناک قتل عام اور لوٹ مار کو بزور قوت روکنے کی ضرورت ہے۔ جب کہ اکثر کے نزدیک کورٹیز سے لڑنا دیوتاؤں کو ناراض کرنا تھا۔

کچھ ایسا ہی بے چارے انکاؤں کے ساتھ ہوا جن کے ۲۰۰۰۰۰۰۰ جری نفوس اسی غلط فہمی میں صفحہ ہستی سے مٹ گئے کہ ان کے مدمقابل ان کا دیوتا ویرا کوچا Viracocha (معانی طوفانی سمندر) لوٹ آیا ہے۔[38]

بے چارے پیرو کے رہنے والوں کو بھی ہتھیار ڈالتے ہی بنی کہ وہ لٹیرے ہسپانویوں کو ویرا کوچا سمجھ بیٹھتے تھے اور سونے پر سہاگہ وہ پیش گوئی تھی جو بارھویں انکا Huayna Kapac نے کی تھی۔ اس نے مرتے وقت کہا تھا کہ تیرھویں انکا کے دور میں سفید چمڑی والے آفتاب کی جانب سے آکر اہل پیرو پر غالب ہو جائیں گے۔

یہی پیش گوئی تھی جس نے عظیم ان کا سلطنت کو جو جنوبی امریکہ میں کولمبیا، چلی اور بولیویا تک پھیلی اور منظم افواج پر مشتمل تھی برباد کر دیا۔ ایسی ہی پیش گوئیاں دوسری جگہوں پر ملتی ہیں۔ آخری ازٹک سردار کی بہن نے بھی سفید لوگوں کے سمندر سے آنے اور میکسیکو کے ساحل پر لنگر انداز ہونے کی بالکل درست پیش گوئی کی جس سے اس کا بھائی مونٹی زوما Montezuma اس قدر ناکارہ ہوا کہ ہسپانویوں کی آمد پر ذرہ بھر مدافعت نہ کر پایا۔

چیلم بالم Chilam Balam ایک مایا پروہت نے پیش گوئی کی تھی کہ تیرھویں دور کے خاتمے پر سفید آدمی ایک مرتبہ پھر یوکاٹان آئیں گے۔

یورپی اقوام نے قدیم امریکہ میں سفید اور سیاہ دونوں جلدی رنگوں کے آثار محسوس کئے تھے۔ پانامہ کے اٹلانٹک ساحل پر اٹلان نامی شہر میں انہوں نے ہلکے رنگ کی جلد والے لوگ بستے دیکھے جن کی خواتین کی رنگت نے انہیں ہسپانیہ کی خواتین کی رنگت یاد دلا دی۔

نہایت گہری سیاہ جلد والے انتہائی جنگ جو قبائل جنوبی امریکہ کے جنگلوں میں پائے گئے۔ پیرو میں ہسپانوی لٹیروں نے یہ بات محسوس کی کہ یہاں پر نسلاً حکمران طبقہ نسبتاً ہلکی جلد والا تھا اور ان لوگوں کے بالوں کی رنگت بھوری اور سرخ تھی جب کہ سورج دیوتا کی حسین بیویاں سب سے زیادہ سفید لڑکیاں تھیں۔

کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ انڈینز میں دوسرا خون بھی ماضی میں مل چکا تھا؟ یہی اہل پیرو مصریوں کی مانند مردوں کی ممی بناتے تھے اور دونوں کے طریقوں میں چند باتیں مشابہ تھیں۔ مثلاً خوشبو اور مصالحوں کا استعمال اندرونی اعضاء کا نکال لینا اور ممی کے ہمراہ قیمتی چیزوں کا تاکہ آئندہ دنیا میں کام آئیں

امریکہ سے ملنے والے پتھر پر فونیشیائی تحریر

دفن کرنا۔ اسی لئے عرصہ دراز تک پیرو میں مصر کی مانند مقابر کی لوٹ مار جاری رہی۔ تاہم ان ممیوں سے اتنا ضرور پتہ چلا ہے کہ واقعی ان کے بالوں کا رنگ وہی ہے جو ہسپانویوں نے بیان کیا تھا۔

کولکان کی تصاویر میں اسے سفید فام ڈاڑھی والا دکھایا گیا ہے حالانکہ انڈینز میں ڈاڑھی مفقود ہے۔ شاید وہ لیف ایرک سن (کولمبس سے بھی پہلے وائی کنگ نامی وحشی قبیلے کا فرد جس نے امریکہ دریافت کیا) کا ہم عصر ہو یا پھر فونیشیا کا یا روم کا۔ آئرش یا پھر کارتھیج کا۔ کچھ تک بندی کرتے ہیں کہ وہ عظیم آئرش جنگ جو سردار کوچولین Cuchaulain تھا کہ دونوں کے نام ملتے جلتے ہیں۔ یا پھر شاید سینٹ برنڈن ST.Brendan جس نے آئرلینڈ سے پادریوں کے ہمراہ ۴۸۴ عیسوی میں مغرب کا سفر کیا اور کبھی نہ لوٹا۔

داڑھی والوں کی کئی تصاویر اور شبیہیں جو کہ خصوصاً انڈین سے نہیں ملتی تھیں مایا کے چیچن انزا (یوکاٹان) اور ویراکروز کے قریب دستیاب ہوئیں ہیں وسطی امریکہ میں بھی اور خصوصاً ویراکروز سے مٹی اور پتھر کی ایسی انسانی صورتیں دریافت ہوئی ہیں جو غیر انڈین ہیں۔ بہت بڑے بڑے پتھروں پر پڑے بڑے نیگرو انسانی سر بنے ہوئے ملے ہیں۔ ۶ فٹ سے زیادہ لمبے اور ۲۴ ٹن وزنی سر جنگل کی مٹی میں Tres Zapotes میں ملے ہیں۔[39]

مونٹ البان Monte Alban میں رقاصوں کی ایک تصویر میں حبشی اور گورے دونوں قسم کے رقاصوں کے خدوخال واضح ہیں۔

مایائی ریکارڈ Popul Vuh میں بیان ہے کہ پہلے ایک سرزمین پر کالے گورے سب پرامن طور پر رہا کرتے تھے۔

ایک مصنفہ کانسٹنس اردن .Constance Irwin نے کہا کہ ان تصاویر میں دکھائے گئے نیگرو حبشی غلام ہیں جب کہ دوسرے افراد اہل فونیشیا ہیں جو ان غلاموں کو ساتھ لائے گئے۔ یہ مفروضہ اس لئے پیش کیا گیا کہ نیگرو کے علاوہ جو افراد دکھائے گئے تھے ان کے لباس جوتے اور خود فونیشیا یا پھر روم یا کارتھیج کے لوگوں سے مشابہ تھے۔ روم نے کارتھیج پر کامیاب حملہ کیا تھا شاید تبھی کارتھیجی فرار ہو کر یہاں اپنے حبشی غلاموں کے ہمراہ آ گئے۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حبشی غلاموں میں عظمت کا کیا پہلو تھا کہ ان کے سروں کے بڑے بڑے ٹنوں وزنی نمونے بنائے گئے۔

میساچوسٹس کی جھیل آساوومپ سیٹ کی ایک چٹان پر قدیم زمانے کے لوگوں کی ایک کھدی ہوئی تصویر بنی ہوئی ہے۔ جس میں ایک ایسا جہاز سا معلوم ہوتا ہے جو فونیشیا یا Minoan تہذیبوں کی کشتیوں سے مشابہ ہے۔ پہلی مرتبہ اس تصویر کا پتہ ۱۹۵۷ء میں اس وقت لگا جب خشک سالی کی وجہ سے جھیل کا پانی کم ہو گیا اور پانی میں ڈوبی ہوئی یہ پراسرار اشکال سے مزین چٹان باہر نمودار ہو گئی۔[40]

بحر اوقیانوس کی رویں امریکہ کی جانب سفر میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جزائر کنری اور شمالی استوائی رو کے ساتھ مل کر یہ رویں جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل کو جاتی ہیں۔ ہواؤں کا رخ بھی ان کا معاون ہو سکتا ہے۔ یہی موجیں بحرہ کریبین میں داخل ہوتی ہیں جہاں سے وینزویلا، کولمبیا اور وسطی امریکہ میں لنگر انداز ہوا جا سکتا ہے اور اسی طرح سے یوکاٹان اور ویراکروز تک پہنچا جا سکتا ہے سمندری لہروں کے اس طرز عمل کو مدنظر رکھتے ہوئے وینزویلا میں رومی سکوں

کی موجودگی اور برازیل میں فونیشیائی علامات (دیکھئے، پراسرار تحریریں) اور ایسی ہی دیگر حیرت انگیز باتوں کی تشریح کرنا ممکن ہے۔

اس کے برخلاف شمال میں بہنے والی خلیجی ندی اور بحراوقیانوس کی شمالی موجوں کے ذریعے کسی انڈین کا یورپ پہنچانا ممکن نہیں جیسے کہ بظاہر پہلی صدی عیسوی میں واقعہ پیش آیا جب ایک لمبی کینو میں تانبہ کی رنگت کے سوار نامعلوم مقام سے شمالی یورپ کو پہنچے اور جنہیں غلام کی حیثیت سے رومی گورنر Publius Metelus Cellar کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان میں سے ایک کے اوپری دھڑ کا رومی انداز میں مجسمہ بنایا گیا جو صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کے خدوخال انڈین ہی ہیں۔[41]

وائی کنگ اور امریکہ کے ابتدائی مسافروں نے بھی لہری رووں سے فائدہ اٹھایا ہوگا۔ چارلس مائیکل بوون Charles Michael Bowen نے امریکہ تک ہونے والے سفر پر تحقیق کے دوران ایک لفظ N.E.B.C یعنی NO European Before Columbus تخلیق کیا اور اس کی تردید میں ایک کتاب "ان سب نے امریکہ دریافت کیا" تحریر کی جس میں اس نے ۱۳۹۵ء کے سکاٹ شہزادے Sinclair اور وینس کے زینو برادران کے علاوہ ۱۳۵۵ء Norse Paul Knutson ویلز کے شاہ میڈوک ۱۱۷۱ء، وٹیکن کے بشپ Eric Gnupsson ۱۱۲۱ء، آئس لینڈ کے Thornfinn Karlseffnic ۱۰۱۰ء وائی کنگ کے لیف ایرک سن ۱۰۰۳ء اور Tkorvald Ericsson ۱۰۰۷ء کے بحری سفر کے حالات تحریر کیے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جو واپس لوٹے انہوں نے سفر کے حالات مبالغہ آمیزی سے بیان کیے اور ادھر امریکی قبائل نے انہیں پراسرار افراد کی آمد کے طور پر یاد رکھا۔[42]

مغرب کی جانب سے چینی افراد نے شمالی امریکہ دریافت کیا۔ ہائی بادشاہ (۲۲۵۰ ق م) "مشرق میں بحر عظیم" کو پار کرنے کا واقعہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح انہوں نے وہاں دور تک خشکی پر سفر کیا۔ یہاں تک کہ ایک عظیم پتھریلی دیوار والی منور وادی تک جا پہنچے (یہ غالباً عظیم کھائی Grand Canyon تھی۔) بدھ مذہب کے پیروکار چینی شخص Hwuishin (پانچویں صدی عیسوی) سے بھی پتہ چلا ہے کہ وہ "ایلوے کے پودوں" کے علاقے میں گئے جو غالباً میکسیکو یا وسطی امریکہ کا علاقہ تھا۔[43] شاید ایسے ہی چینی لوگ تھے جو ان قبائل کو اژدھے کے نشان سے روشناس کرا گئے۔ جو بعد ازاں کوکلکان دیوتا کے اظہار کے خاطر جگہ جگہ بنایا گیا۔

# پراسرار نقشے

ترکی بحریہ کے ایک افسر اعلیٰ کا نام "پیر ابن حاجی محمد" تھا۔ جسے لوگ پیر رائیس یا امیر البحر پیری کہا کرتے۔ وہ پہلے ایک قزاق ہوا کرتا تھا۔ ۱۵۱۳ء میں اس کے عملے کے نقشے سازوں نے بحراوقیانوس اور اس کے سواحلی علاقوں کا ایک نقشہ ہرن کی کھال پر بنایا۔

۱۹۲۹ء میں استنبول میں توپ کاپی عجائب گھر کے شاہی آثار کے چھان پھٹک کے دوران نقشہ بھی مل گیا۔[44] (اتاترک نے خلافت کے خاتمے کے بعد توپ کاپی محل خالی کرا لیا تھا۔) پہلے پہلے کوئی خاص توجہ نہ دی گئی مگر بعد ازاں اس میں بڑی عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ گو یہ نقشہ کولمبس کے امریکہ دریافت کرنے کے ۲۱ برس بعد بنایا گیا تھا۔ تاہم اس میں مغربی امریکہ اور افریقہ کے طول البلاد کو بالکل درست ظاہر کیا گیا تھا۔ یہ امریکہ کے بارے میں اس دور کے بالکل درست اعداد و شمار کا حامل تھا۔ جو بہت حیرت انگیز بات تھی۔

عرصہ دراز سے یہ خبر مشہور تھی۔ کہ کولمبس نے سفر پر روانگی سے پہلے استفادے کے لئے اپنے ہمراہ بہت سے قدیم نقشے بھی رکھ لئے تھے۔ یہ ایسے نقشے تھے جن میں اوقیانوس کو پار کرنے والے قدیم ملاحوں کے مشاہدات کا اندراج تھا۔ (گویا امریکہ کولمبس سے پہلے ہی دریافت ہو چکا تھا) پیر رئیس کے نقشے میں ایک جانب یہی بات درج تھی کہ اس میں ظاہر کیے گئے مغربی علاقہ جات کے لئے انہی نقشوں سے استفادہ کیا گیا ہے جو کولمبس نے اپنے پہلے بحری سفر میں استعمال کیے تھے۔ پیر رئیس کا یہ نقشہ اس بات کا پہلا ٹھوس ثبوت پیش کرتا تھا کہ فی الحقیقت امریکہ کے بارے میں کولمبس سے پہلے کے لوگ بھی آگاہ تھے۔

نقشے میں یہ بات بھی درج تھی۔ کہ امیر البحر رئیس نے یہ نقشہ بنانے میں اسکندر ذوالقرنین سے بھی پہلے کے قدیم نقشوں سے استفادہ کیا تھا۔ جس میں کرہ

ارض کے آباد علاقے دکھائے گئے تھے۔

پھر اس نقشے کو کافی عرصے تک نظرانداز کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ امریکی بحریہ سے سبک دوش ہونے والے ایک افسر کپتان آرلنگٹن میلری نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ایک انکشاف کر کے ہلچل مچا دی۔

انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقہ جات اور جزائر اس نقشہ میں ظاہر کیے گئے تھے۔ جنہیں "ملکہ ماڈ کا جزیرہ" کہتے ہیں۔ حیرت انگیز باتیں دو تھیں۔ اول یہ کہ انٹارکٹیکا کی جو حدود ظاہر کی گئی تھیں۔ وہ برف کی عدم موجودگی میں نظر آ سکتی تھیں (جب کہ انٹارکٹیکا پر برف ہزاروں برس سے مسلسل جمی ہوئی ہے۔) دوسرے یہ کہ ۱۵۱۳ء میں تو انٹارکٹیکا سرے سے دریافت ہی نہیں ہوا تھا دنیا میں کسے خبر تھی کہ کرہ ارض پر انٹارکٹیکا نامی علاقہ بھی موجود ہے۔ کجا یہ کہ اس کی حدود متعین کی جاتیں۔ یہ بھی مزے کی بات ہے کہ انٹارکٹیکا کی برف میں دبی ہوئی زمین کی حدود کا باقاعدہ طور پر اندازہ ۱۹۴۰ء - ۱۹۵۰ء کے دوران سائنس دانوں نے جدید زلزلہ پیما آلات کی مدد سے لگایا تھا ادھر ۱۵۱۳ء کے نقشے کے مطابق یہ بہت پرانی بات ہے۔ اس معمے کا حل کیا تھا؟ ایک محقق پروفیسر چارلس ،ایچ ،ہاپ گڈ نے ایک کتاب "قدیم سمندری بادشاہوں کے نقشے" میں اس کا جو حل تجویز کیا وہ بھی زیادہ متنازع ثابت ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ قدیم برفانی عہد سے پہلے جب کہ انٹارکٹیکا پر برف نہیں جمی تھی۔ پورے کرہ ارض پر ایک زبردست انسانی تہذیب پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ حکمت اور دانش میں موجودہ انسانوں سے بہت آگے



فرانسیسی عالم فلپ باخ نے 1737ء میں انٹارکٹیکا کا یہ نقشہ بنایا تھا جبکہ اس میں مندرجہ حقائق کی باقاعدہ تصدیق 1958ء میں ہوئی

تھے۔ پھر یہ تہذیب بغیر کوئی نشان چھوڑے صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ صرف ان لوگوں کے بنائے ہوئے کچھ نقشے باقی رہ گئے۔ جو صدیوں سے نسل در نسل منتقل ہوتے چلے گئے۔ انہی نقشوں کی نقول کی مدد سے پیر رئیس کے عملے نے اپنا نقشہ ترتیب دیا۔

ایک اور نظریئے کے مطابق خلاء سے آنے والی کسی ذہین مخلوق نے زمین کے ان نقشوں کو ترتیب دیا تھا۔ بعض لوگوں نے تو صاف کہہ دیا کہ صاحب پیر رئیس سے منسوب یہ نقشہ ہے ہی جعلی۔ کچھ نے کہا کہ نقشہ تو بے شک اصل ہے مگر میلری نے اسے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ ادھر بعض نے کہا کہ یہ سب محض اتفاق ہے۔ یونانیوں کی عادت تھی زمین کو اپنی عقل کے مطابق سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کیا ہے۔ وہ یہ کہتے کہ یوں ہونا چاہئے پس

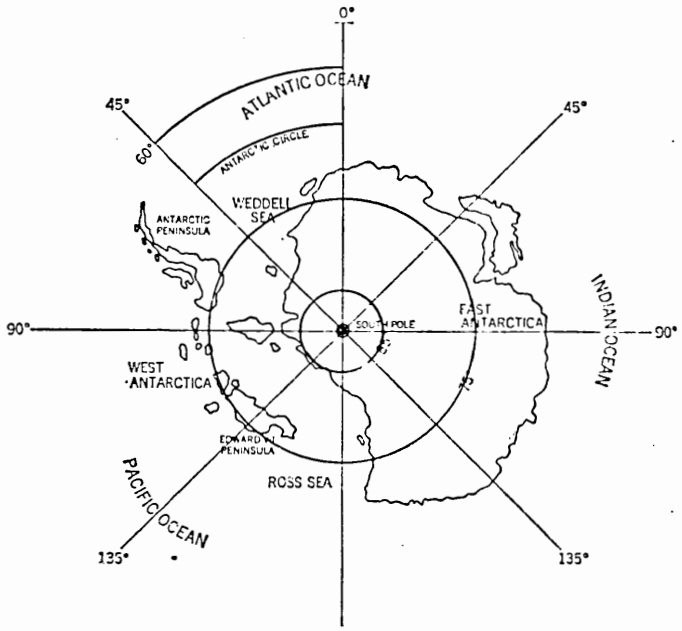


انٹارکٹیکا میں خشکی کی حدود جو برف ہٹنے کی صورت میں ہی نظر آسکتی ہے

انہوں نے انٹارکٹیکا کے مقام پر زمین دکھا کر کہا ہو گا کہ یہاں خشکی کا ٹکڑا ہونا چاہئے اور اتفاقاً وہاں ملکہ ماڈ کا جزیرہ موجود تھا۔

یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ پیر رئیس کے نقشے اور ملکہ ماڈ کے جزیرے کی اصل حد بندیوں میں کچھ فرق موجود ہے۔ مگر نقشے میں انٹارکٹیکا کا دکھلانا محض اتفاق بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ۱۹۴۹ء میں سویڈن، برطانیہ اور ناروے کے اشتراک سے انٹارکٹکا کا مشاہدہ کرنے والی ٹیم کے حاصل کردہ اعداد و شمار نقشے سے بہت مطابقت رکھتے ہیں (یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ پیر رئیس کا نقشہ قدیم نقشوں سے نقل کیا گیا تھا اور نقل کے اس مرحلے پر اس کے عملے سے غلطی کا امکان موجود ہے)

قدیم بری نقشوں سے اور بھی بڑی حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مثلاً ۱۷۳۷ء کا فلپ باخ نامی فرانسیسی عالم کا ایک نقشہ ہے۔ اس میں انٹارکٹیکا کے علاقے کے دو حصے دکھائے گئے ہیں۔ گویا پانی کی ایک بڑی گزرگاہ نے علاقے کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ اس بات کی تصدیق انٹرنیشنل جیوفزیکل ائیر ۱۹۵۸ء میں جاکر ہوئی۔[45] جدید ترین آلات کے ذریعے معلوم ہوا کہ اگر انٹارکٹیکا برف سے پاک کر دیا جائے تو نیچے سے خشک زمین کے دو حصے نظر آئیں گے۔ جنہیں مشرقی انٹارکٹیکا اور مغربی انٹارکٹیکا کہا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انٹارکٹیکا کی دریافت سے ایک صد سال پہلے کے لوگوں کو انٹارکٹیکا کے وجود اور اس کی ساخت کی خبر کیونکر ہوئی۔ جب کہ تاریخی روزنامچوں کے مطابق انٹارکٹیکا کا سال دریافت ۱۸۱۸ء مقرر کیا گیا ہے۔

۱۵۳۲ء میں بنائی جانے والی آرنیس فن Ornace Firrne کے دنیا کے نقشے کی نقل بھی اس اعتبار سے حیرت انگیز ہے کہ اس میں نہ صرف براعظم انٹارکٹیکا دکھایا گیا ہے بلکہ اس میں دریا بھی بہتے دکھائے گئے ہیں (موجودہ معلومات کی رو سے ان دریاؤں کی جگہ منجمد برف موجود ہے۔ گویا یہ نقشہ ان قدیم نقشوں کی موجودگی میں ترتیب دیا گیا تھا جو انٹارکٹیکا میں برف جمنے سے پہلے وہاں جانے والوں نے بنائے تھے)۔[46]

۱۴۸۷ء کے اسکندریہ کے ابن بن زارا نامی شخص سے منسوب نقشہ بھی عجیب ہے۔ اس میں بحیرہ روم اور بحیرہ ایجیہ کے ساحلی علاقے اور جزائر دکھائے گئے ہیں۔ لیکن اب ان میں سے بہت سے جزیروں کا وجود ہے ہی نہیں یعنی وہ ظاہراً دکھائی ہی نہیں دیتے۔ بلکہ زیر آب چلے گئے ہیں۔ گویا زارا کے نقشے میں دکھائے گئے جزائر کو عہد برفانی کے اواخر کے انسانوں نے دیکھ لیا تھا اور پھر قدیم نقشوں کے ذریعے ابن زارا کا نقشہ ترتیب دے دیا گیا۔

ترکی میں ہی ۱۵۵۹ء سے تعلق رکھنے والا حاجی احمد کا نقشہ ہے اس نقشے سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ بھی بڑا عجیب ہے اس میں خطہ امریکہ کے مغربی ساحل

دکھائے گئے ہیں اور تو اور ایشیاء اور امریکہ کے درمیان تعلق بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ اس سے اس نظریئے کو تقویت ملتی ہے۔ کہ بعض ماہرین علم الانسان کا یہ نظریہ درست ہے کہ الاسکا اور سائبریا کے درمیان قدیم زمانوں میں آخری برفانی عہد کے اختتام کے قریب آبنائے بیرنگ کے ذریعے تعلق تھا جس کے ذریعے منگول شباہت کے لوگ خطہ امریکہ میں داخل ہو گئے۔ مگر اس قدر قدیم "حقیقت" کی خبر حاجی احمد کو کیسے ہو گئی؟ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اس قدر قدیم زمانے میں جب ٹرگنومیٹری کے کروی اصولوں کا علم ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اور کوئی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھا کہ کرہ ارض گول ہے۔ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ٹرگنومیٹری کے اصول استعمال کرتے ہوئے یہ نقشے بنائے۔

ان تمام نقشوں کو دیکھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ یا تو قدیم زمانے کا انسان درست اندازے لگانے میں بہت ماہر تھا یا وہ تلاش اور دریافت کے ایسے طویل سفر طے کر چکا تھا۔ جن کی بابت مصدقہ تاریخی ریکارڈ خاموش ہے۔ وہ لوگ ایسے ذرائع اور وسائل رکھتے تھے۔ جنہیں بروئے کار لاتے ہوئے نقشہ کشی اور نقشہ سازی پر بے پناہ مہارت حاصل کر چکے تھے اور ہم ان ذرائع کے بارے میں کچھ معلومات نہیں رکھتے۔

# عالمی تہذیب کا نظریہ
# قدیم تہذیبوں کے مابین روابط

کیا کرہ ارض کے لوگوں کے درمیان عہد قدیم میں موثر روابط موجود تھے؟ کیا قدیم تہذیبیں ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق رہی ہیں یا ان کے درمیان افکار، عادات، معلومات اور سماجی تقاریب کا کوئی رشتہ موجود تھا۔

ماہرین تہذیب اس بات سے متفق ہیں کہ زمانوں کے دوران ذرائع رسل و رسائل اور مواصلات جیسے جیسے بڑھتے اور بہتر ہوتے گئے اقوام کے مابین روابط بڑھتے گئے۔ مفادات کے حصول اور تحفظ کے لئے غالب اور مغلوب اقوام کا سلسلہ چلا۔ ترقی یافتہ اور فاتح قوموں کے عقائد اور افکار مفتوح اور ترقی پذیر اقوام پر اثر انداز ہوئے۔

لیکن یہ کلیہ وقت کے ساتھ مشروط ہے یعنی جیسے مروجہ نظریات کے مطابق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترقی کا عمل تیز ہوا ہے ویسے ہی اقوام کے یہ روابط وقت کے ساتھ ہی فروغ پاتے رہے ہیں۔ یعنی ماضی میں جس قدر پیچھے بڑھیں تو قوموں کے مابین روابط کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے جائیں گے اور ایک ایسا لمحہ آئے گا جب اس کلئے کے مطابق چھوٹی بڑی غیر ترقی یافتہ انسانی آبادیاں ایک دوسرے سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر زندگی بسر کرتی دکھائی دیں گی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کسی ایک آبادی یا خطے کے لوگ اپنی ہی زندگی میں مگن نہ خود کسی سے متاثر ہو رہے ہوں گے اور نہ کوئی اور ان کی ابتدائی تہذیب سے کوئی اثر لیتا ہو گا۔

مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ گمشدہ تاریخ نے ماہرین کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ تہذیبوں کے درمیان نامعلوم زمانوں سے رابطے کے کوئی نہ کوئی ذرائع ضرور موجود رہے ہیں۔ اس کی ایک اہم مثال سیلاب عظیم کی روایت ہے۔ پوری دنیا کی متنوع اور بکھری ہوئی قدیم اقوام کے ہاں یہ تصور تھا کہ ماضی میں ایک خوفناک سیلاب آیا تھا جس سے ماسوائے چند افراد کے باقی تمام انسانی آبادی غرق ہو گئی تھی۔ یہ روایت دور دراز کی اقوام میں اس طور سے دیکھنے میں آتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کہ یہ ایک قصہ کیونکر اتنے وسیع پیمانے پر پھیل گیا۔ گو اس کہانی کے کردار مختلف جگہوں پر مختلف ناموں سے پکارے گئے ہیں لیکن سیلاب اور اس سے بچنے کا بنیادی فلسفہ سب کے ہاں یکساں چلا آ رہا ہے۔

خیال ہے کہ تمدن کے آغاز سے پہلے انسانی گروہ ارضی و سماوی آفات و دیگر اسباب کے زیر اثر کرہ ارض پر دور دور پھیل چکے تھے۔ براعظم امریکہ (شمالی و جنوبی) کسی زمانے میں انسانوں کے وجود سے خالی تھا۔ پھر شمال سے یہاں انسان نامعلوم طریقے سے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ جنوبی خطوں تک پھیل گئے۔ ان کی آمد کا واقعہ ۱۵ ہزار سال پرانا بتایا جاتا ہے۔ وہ جس راستے سے امریکہ میں داخل ہوئے تھے وہ زمینی تغیر و تبدل کے نتیجے میں ختم ہو گیا اور ان لوگوں کا رابطہ ایشیا سے ٹوٹ گیا۔ ان کی تہذیب پھلتی پھولتی رہی۔ باقی دنیا کو بظاہر پندرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں علم ہوا کہ امریکہ جیسی کوئی سرزمین بھی موجود

ہے جہاں انسان کی ایک بہت بڑی آبادی رہ رہی ہے۔

لیکن اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس حیران کن حقیقت کی تشریح کس طرح کی جائے کہ دیگر تہذیبوں سے الگ تھلگ رہنے والی امریکی اقوام کے ہاں کئی رواج، عادات، روایات اور علامات پرانی دنیا کی تہذیبوں سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں۔

عیسائی مشنریاں نئی دنیا کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے لئے جب وہاں پہنچیں تو مبلغوں نے یہ حیرت انگیز بات نوٹ کی کہ میکسیکو کی قدیم تہذیب میں صلیب کی علامت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں کفارہ، اقرار گناہ روزے اور معافی جیسے عیسائی اعتقادات بھی مروج ہیں۔ عیسائی مبلغ اس بات کی یہی توجیہ کر سکے کہ ضرور ان سے پہلے شیطان ان لوگوں کو بہکا گیا ہے تاکہ بعد ازاں اہل ایمان بھی گمراہ ہو جائیں۔(47)

پرانی اور نئی دنیا میں مشترکہ خصوصیات کا ایک اہم عنصر پتھروں اور دھاتوں پر کندہ کی گئی نقش گری اور کپڑے پر بنے ہوئے ڈیزائنوں میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ قدیم چینی ادوار سے تعلق رکھنے والی کشیدہ کاری اور میکسیکو کے علاقے میں ملنے والے نقوش اس مماثلت کی اہم مثال ہیں۔

ایک اہم علامت بھول بھلیوں کا اظہار ہے جو ایک جانب کریٹ اور مصر میں تو دوسری جانب شمالی اور جنوبی امریکہ کی انڈین تہذیبوں میں مشترکہ اسطور کے طور پر موجود ہے۔

سب سے زیادہ چونکا دینے والی علامت سواستیکا ہے۔ جو ایک ٹیڑھی میڑھی صلیب ہے۔ یہ علامت حیرت انگیز طور پر کرہ ارض کے دور دراز علاقوں کی تہذیبوں کے ہاں دیکھنے میں آئی ہے۔ آریائی ہند، مصری اہراموں، میسوپوتامیہ، ہڑپہ، موہنجو دڑو، چین، ایشیائے کوچک میں ٹرائے کے کھنڈرات میں مقابر کے علاوہ وسطی امریکہ کی مایا قوم کے ہاں یہ تواتر سے دیکھنے میں آتی ہے۔ بعض اسے خاص آریائی علامت قرار دیتے ہیں جو سورج کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں نر و مادہ کی تخصیص بھی بتائی جاتی ہے۔ اس کا اظہار دو طرح سے ہوتا ہے گھڑی وار سواستیکا مونث، اور منقلب گھڑی دار سواستیکا نر کی علامت ہے۔

یہ علامت اتنی اقوام میں کس طرح رواج پا گئی؟ اس کی اہمیت کیا ہے؟ ڈاکٹر مہدی حسن کی تشریح کے مطابق سواستیکا کی علامت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب کسی سطح پر متعدد صلیبیں ایک ترتیب سے بنائی جائیں۔ ان صلیبوں کے درمیان خالی جگہوں سے سواستیکا کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ قدیم زمانے میں خیال تھا کہ آدمی کی روح ایک پرندہ ہے جو قفس عنصری سے پرواز کر جاتا ہے۔ اس پرندے کے اظہار کے لئے صلیب کی علامت استعمال کی جاتی تھی۔ عمودی لکیر پرندے کے چونچ دھڑ اور دم کو ظاہر کرتے تھے۔ جب کہ صلیب کی افقی لکیر آسمان کو بلند ہوتے ہوئے پرندے کے کھلے ہوئے پروں کا اظہار تھا۔ بہت سی صلیبیں بنانے کا مقصد یہ تھا کہ ارواح آسمان کو صعود کر جاتی ہیں(48) مگر روح کو ظاہر کرنے کے لئے سواستیکا کی علامت کا سہارا کیوں لیا گیا اور یہ پورے کرہ ارض پر کس طرح پھیلا۔ اس کی ایک توجیہہ طبیعات کے دو ماہرین نے کی۔

یونیورسٹی آف ٹیکساس کے دو طبیعات دانوں سی جے ران سم C.J.Ransom اور ہانز شلوٹر Hans Schluter نے ایک تجربے کے دوران ہائیڈروجن پر برقناطیسی شعاعوں کے اثرات کا تجزیہ کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ گیس نے عجیب شکل اختیار کر لی ہے۔ یہ شکل تھی سواستیکا جو آریائی ہند کے ہاں مقدس علامت تھی مگر دور حاضر میں ہٹلر کے حوالے سے تشدد کی علامت قرار پائی ہے۔ ان سائنس دانوں نے عجیب بات کہی کہ صدیوں پہلے بالائی فضا سے کسی شہابئے کا گزر ہوا ہو گا جس پر زمینی کشش ثقل کے اثرات کے نتیجے میں سواستیکا کا ایک بڑا سا نشان آسمان میں ظاہر ہوا۔ کرہ ارض پر بسنے والے مظاہر پرست قدیم لوگوں نے اس عجیب علامت کے ظہور کو تقدس کا حوالہ دے دیا ہو گا اور یہ ہر اس تہذیب میں بنایا گیا جنہوں نے اسے آسمان میں دیکھ لیا تھا۔(49)

لیکن اگر سواستیکا کے اتنی تہذیبوں میں رواج پانے کا سبب یہی مظہر تھا تب بھی یہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے کہ امریکی خطے میں قدیم دنیا کے رسوم و رواج کیسے در آئے۔ اوقیانوس کے آر پار تہذیبوں سے ایسے مشترک امور سامنے آئے ہیں کہ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ

۱۔ یا تو ماضی قدیم میں بین الاقوامی روابط اور رسل و رسائل کا مضبوط تعلق موجود تھا جس کے بارے میں ماہرین کو اندازہ لگانے میں ناکامی ہوئی ہے

یا

۲۔ کرہ ارض پر مختصر یا طویل دور تک ایک عدد بین الاقوامی عالمی تہذیب کا وجود ہوا کرتا تھا جو بہت قدیم زمانے میں انتشار کا شکار ہو گئی اور اتنے عرصے میں لوگوں کے ذہنوں سے اس کی یاد ختم ہو گئی مگر کرہ ارض کے انسانوں کے ہاں اس مشترکہ تہذیب کے اثرات یکساں رسوم و رواج، عقائد اور افکار کی شکل میں موجود ہیں جن میں گردش ایام کے ساتھ معمولی معمولی تبدیلیاں بھی پیدا ہوئی ہیں پہلے نظریئے کی رو سے یہ کلیہ غلط ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کا گراف

بڑھا ہے۔ یعنی جوں جوں پیچھے جائیں ترقی کا عنصر کم سے کم ہوتا چلا جائے گا۔ ایک غلط نظریہ یہ ہے کہ ماضی قدیم کی اقوام کے ہاں دانش کا تناسب اتنا کم نہیں جتنا نئی اور پرانی دنیا کے روابط کے لئے(دیکھئے "خطوں کی دریافت" اور "نئی اور پرانی دنیا کے لسانی روابط" (50)

# نئی اور پرانی دنیا کے لسانی روابط

قوموں اور تہذیبوں کے مابین تعلق اور تہذیبوں کے ایک دوسرے سے متاثر ہونے کا مطالعہ کرنے والے ماہرین لسانیات نے خطہ امریکہ اور یوریشیائی مقامی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے حیرت انگیز مشابہتیں دریافت کی ہیں۔ ان دریافتوں سے اس نظریئے کو تقویت ملتی ہے کہ امریکہ اور یوریشیا کی اقوام کے درمیان کبھی کوئی تعلق ضرور رہا ہے جس کے بارے میں معلومہ تاریخ خاموش ہے۔

یورپ سے میری لینڈ اور ورجینیا تک رسائی حاصل کرنے والوں نے دیکھا کہ مقامی لوگ دریا کو "پوٹوماک" کہتے ہیں۔ یونانی زبان میں دریا کو پوٹاماس کہا جاتا ہے۔ ازٹک لوگ اپنے ابراموں کو "ٹیو کالی" کہتے تھے محققین کہتے ہیں کہ یونانی الفاظ "تھیوس" اور "کالیاس" سے لفظ ٹیو کالی مشتق ہے دونوں صورتوں میں اس لفظ کے معانی ہوتے ہیں "دیوتا کی رہائش گاہ" (51)

ہوائی کی مقامی بولی اور چند یونانی الفاظ کا موازنہ حسب ذیل ہے۔

| یونانی الفاظ | ہوائی زبان | معانی |
|---|---|---|
| ایٹوس | ایٹو | عقاب |
| میلوڈیا | سیلی | گیت |
| نواس | نونو | دانش |

کیا اس مشابہت کو محض اتفاق کہا جائے یا اسے کوئی معنی خیز اشارہ سمجھا جائے؟

ہوائی کے باشندے سر پر پروں سے بنی ہوئی ایسی ٹوپیاں پہنتے ہیں جن کی شکل یونانی جنگی خود سے مشابہت رکھتی ہے۔

سکندر اعظم نے مغربی ہندوستان میں زخمیوں اور ناکارہ سپاہیوں کو بحری بیڑے کے سربراہ Nearch کے ہمراہ خلیج فارس کی طرف بھیجا تھا۔ مگر وہ لوگ کبھی منزل پر نہ پہنچے۔ گمان غالب ہے کہ غرقاب ہو گئے ہوں گے۔ تاہم بعض محققین بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں کہ یہ گمشدہ جہاز راستے سے بھٹک کر جزائر ہوائی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ (52) شائد اس لئے یونانی زبان اور یونانی آرٹ کی جھلک ہوائی اور امریکہ کے قدیم تمدنوں میں ملتی ہے۔

چند اور موازنے حسب ذیل ہیں۔

| ازٹک | یونانی | ازٹک | بربر قبائل |
|---|---|---|---|
| دیوتا ٹیو | تھوس | پانی اٹل | اٹل |
| گھر کالی | کالیا | | |

دیوتا کی رہائش گاہ. ٹیو کالی. تھیوس کالیا

| | ایمارا انڈین زبان | عبرانی/عربی |
|---|---|---|
| بادشاہ | ملکو | ملک/ملک |
| | ازٹک | ترکی (وسط ایشیائی) |
| پہاڑی | ٹیپک | ٹیپی |
| | ازٹک | قدیم مصری |

| | | |
|---|---|---|
| مگرمچھ | سپاک ٹلی | سبک |
| | ازٹک | لاطینی |
| تتلی | پیاپلو۔ ٹل | پیپی لیو |

مایالوگ پروہت کو بالام کہتے تھے۔ قدیم عبرانی میں باعلیم کا لفظ ساحر کے لئے مستعمل تھا۔ فونیشیائی زبان میں سورج دیوتا کو شاپاش کہتے تھے۔ شمالی کیلی فورنیا کا انڈین کلاماتھ قبیلہ سورج کو شاپاش کہتے تھے۔ ہوپی انڈین سورج دیوتا کو تائیوا کہتے تھے۔ جاپان میں سورج کو تائیوا پکارا جاتا تھا۔

جنوبی امریکہ میں سونے کی دھات سورج سے منسوب تھی۔ ان کا سونے کو سورج کے آنسو کہتے تھے جنوبی امریکہ کے جنوب مغربی خطے میں سورج کو "کواراسی" کہتے تھے۔ جب کہ فونیشیائی زبان میں سونے کو کاروس کہا جاتا تھا۔ نیوزی لینڈ کی ماؤری زبان اور انکا کی سرکاری زبان قویچوا کے تقابلی مطالعے سے حیرت انگیز مشترکہ باتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔[53]

| ماؤری زبان | قوایچوا زبان |
|---|---|
| مونا (محبت) | مونے (محبت) |
| نوکو (میرا) | نوکا (میں) |
| کری (جلد) | کارا (جلد) |
| موتو (قطع کیا) | موتو (قطع کیا) |
| پورا (درمیان) | پورا (درمیان) |
| کورا (سردار) | کراکا (سردار) |
| کمارا (شکرقندی) | کملرا (شکرقندی) |

| قویچوا انڈین زبان | | قدیم سمیری زبان |
|---|---|---|
| جھوٹ | للو | لول |
| سرکنڈہ | سوکو | سگ |
| نوکری | کوسورو | کاشر |

| جزائر ہوائی کی بولی | قدیم یونانی زبان |
|---|---|
| ایٹو (عقاب) | ایٹوس (عقاب) |
| نونو (خیال) | نوس (ذہانت) |
| مانوآ (سوچنا) | منتھانو (سیکھنا) |
| میلی (گانا) | میلوڈھیا (میلوڈی) |
| لاہوئی (لوگ) | لااوس (لوگ) |
| ہکی (آنا) | ہکانو (آمد) |
| نوکو (رہنا) | نائیو (رہائش پذیر ہونا) |

جنوبی امریکہ کے سب سے بڑے ملک برازیل کا نام بھی ایک معمہ ہے۔ آئرش روایات کے مطابق مغرب میں دور کہیں ایک جزیرہ یا سرزمین ہے جسے

آئی برازیل Ily Bzaril کہتے ہیں۔ قدیم سامی زبانوں میں لفظ برازیل کا مفہوم "لوہے کا جزیرہ" ہوتا ہے اور جدید عبرانی زبان میں B.R.Z.L کا مفہوم بھی یہی ہے۔ گویا الفاظ برازیل کی دریافت سے پہلے رائج تھے مگر حقیقت یہی ہے کہ واقعی دور مغرب میں ایک ایسی سرزمین ہے جہاں لوہے کی بہتات ہے اور جسے برازیل کا نام دیا گیا ہے۔[54]

# گمشدہ دانش..... ناپید علوم

بیسویں صدی کے ترقی یافتہ ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہے کہ ترقی کا عمل گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ کہ ہم سے پہلے ماضی میں جتنی اقوام گزری ہیں وہ فکر و دانش میں اس دور کے انسانوں سے کہیں پیچھے تھیں۔ ماضی کے بارے میں عمومی رویہ یہ ہے کہ وہ جہلاء کا دور تھا۔ مگر موجودہ معیار کی بنیاد پر جن معاشروں اور تہذیبوں کو نیم مہذب یا سادہ خیال کیا جاتا ہے وہاں کی تاریخ اور آثار قدیمہ جو شواہد پیش کرتے ہیں، وہ جدید انسان کے خود ساختہ تصورات کی نفی کرتے ہیں۔ قدیم تہذیبوں کے ہاں بعض علوم و فنون کے بارے میں اس دور کے اعتبار سے بڑے ایڈوانس قسم کی ایجادات اور تصورات دیکھنے میں آئے ہیں۔

قدیم لوگوں کے ہاں مادے کی ساخت پر غور و فکر نے حیرت انگیز حقائق پیش کئے۔ ڈیموکرئٹس میں اہل فونیشیا کے حوالے سے درج ہے کہ وہ اس بات کے قائل تھے کہ ایٹم (مادے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ) فی الحقیقت قابل تقسیم ذرہ ہے۔ بدھ اور ہندو صحائف میں قدیم مفکروں کی خیال آفرینی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ بنیادی ذرات کے باہمی تعلقات سے بحث کرتے ہیں۔ گو ان افکار کو متصوفانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جدید جوہری نظریئے اور ان قدیم تصورات کے مابین حیرت انگیز مشابہت پائی گئی ہے۔

بدھ مت کی پرانی تحریروں میں مالیکیولوں کے کیمیائی تعاملات کا تذکرہ ہے۔ وہاں مالیکیولوں کو نرسل کے بنڈلوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نرسل ایک ہی گٹھے میں آپس میں کس طرح جڑے ہوتے ہیں اور دوسرے گٹھوں سے ان کا تعلق کس طرح ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ نرسل کے گٹھے کو کھولنے کی اہمیت کیا ہے اور نرسلوں کو باہمی قوت ہٹا کر الگ کرنے سے پیدائش کا نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

۱۹۴۵ء میں ہندو یوگی "پارام ہنسا یوگا نندہ" نے ایک انکشاف کر کے دنیا کو حیرت زدہ کر دیا۔ اس نے بتایا کہ ہندو فلسفہ ویس سیکا (Vaisesika) کی وجہ تسمیہ در حقیقت سنسکرت لفظ "ویسی آس" Visesas ہے جس کا مفہوم "جوہری انفرادیت" Atamic Individuality ہوتا ہے۔ سنسکرت کے محفوظ ریکارڈ کے مطابق آٹھویں صدی ق م میں ایک شخص "آولوکیا Aulukya نے اپنے الفاظ میں جو تصریحات پیش کیں وہ مادے کی ایٹمی ساخت کے جدید نظریئے سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے افکار میں اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ وہ فکری طور پر ایک بہت بلند مقام حاصل کر چکا تھا۔ وہ ابعاد اور Relativity کے علاوہ کاسمک، شعاعوں، مالیکیولوں کی حرارت کے زیر اثر تبدیلی اور توانائی کی تمام شکلوں کی حرکی توانائی میں تبدیلی پر بات کرتا نظر آتا ہے۔[55]

یہ امر بھی بہت حیران کن ہے کہ قدیم اقوام کے ہاں ریاضی کے پیچیدہ مسائل حل کئے جاتے تھے جن کی بابت آثار قدیمہ کے مطالعے کے دوران معلوم ہوا۔ بابل کے قدیم باسی ہمزاد مساوات حل کر سکتے تھے۔ وہ صفر سے بھی واقف تھے اور ۲۰ ہندسوں (سنکھ، دہ سنکھ) تک کی لمبی لمبی حسابی رقوم کی استعمال کرنے پر قادر تھے (اندازہ کریں کہ بابلیوں کے صدیوں بعد آنے والے رومی صفر سے عدم واقفیت کی بناء پر سلطنت سے متعلق اعداد و شمار کا حساب کرنے میں ناکام ہوئے۔ اور یہ بھی ان کی تہذیب کے زوال کا سبب ٹھہرا) بابلی اساس دس کے علاوہ بارہ اور ساٹھ کی اساس پر کام کرنے پر بھی قادر تھے۔

صفر کا استعمال سب سے پہلے کس نے شروع کیا؟ یہ بھی ایک معمہ ہے بابلی صفر کی عددی حیثیت سے واقف تھے اور جہاں صفر لکھا ہوتا وہ جگہ خالی چھوڑ دیتے کہ یہاں کوئی قیمت نہیں۔ قدیم چین میں بھی یہی طریقہ کار استعمال ہوتا رہا مگر آخر کار اس طریقے سے صفر کا اظہار ختم کر دیا گیا۔

بعض کا خیال ہے کہ صفر کی ایجاد کا سہرا قدیم ہندوستانیوں کے سر ہے۔ ادھر وسطی امریکہ میں قدیم مایا ریڈ انڈین قوم کے ہاں بھی صفر استعمال ہوتا آ رہا تھا۔[56] انہوں نے دنیا کا سب سے اچھا کیلنڈر بنا لیا تھا۔ انڈین اقوام پہیئے سے بھی واقفیت رکھتی تھیں مگر اس جانب ان کا رویہ غیر معقول تھا۔

ہسپانوی حملہ آوروں نے اینڈیز، وسطی امریکہ اور میکسیکو کے علاقے میں اس عجیب بات کا مشاہدہ کیا کہ ان علاقوں میں شاندار سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ پہاڑوں میں سے سرنگیں اور پانی کے ذخائر پر سے پل گزارے ہوئے ہیں۔ کھائیوں پر لٹکتے پل بنا رکھے ہیں گویا نقل و حمل کے لئے ایک بردست نظام ہے مگر حیرت انگیزبات یہ ہے کہ کوئی گاڑی کوئی چھکڑا نہیں۔ وجہ اگر یہ مان لیں کہ امریکہ میں گھوڑے گدھے نہیں ہوتے تھے۔ مگر لاما جانور تو تھا۔ اور تو اور ہتھ گاڑی کا استعمال بھی نہیں تھا۔ سامان لوگ خود اٹھا کر لاتے لے جاتے تھے یا جنوبی امریکہ میں پالتو لاما کی پیٹھ پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہاں کی "انکا" قوم نے تو انسانوں کی ایک خاص "نسل" پال رکھی تھی جسے صرف تیز رسل و رسائل اور نقل و حمل کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ انہیں چیسقوئس کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ اس قدر تیز طرار ہوا کرتے تھے کہ ان کا بادشاہوں کے لئے تازہ سمندری مچھلی دارالحکومت تک لے آتے تھے۔ مگر سڑکوں کا مسئلہ اپنی جگہ ہے۔ آخر ان کا مقصد کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امریکی انڈین پہیئے سے ناواقف تھے۔ مگر یہ بات اس وقت غلط ثابت ہو گئی جب انڈین علاقوں سے بچوں کے ایسے ننھے منے کھلونے دریافت ہوئے جن میں پہیئے نصب تھے۔ پانامہ اور میکسیکو کے مختلف علاقوں سے پہیئے دریافت کیے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ امر باعث حیرت ہے کہ انڈین لوگوں نے پہیئے کا استعمال کھلونوں تک ہی کیوں محدود رکھا؟ زندگی کے بعض شعبوں میں ان کی ترقی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور بعض باتوں سے ان کی ناواقفیت حیرت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ مثلاً طب و صحت کے معاملے میں ان کی واقفیت حیران کن تھی۔

پیرو کی قدیم انکا قوم کو طب کے شعبے میں بعض امور پر خصوصی دسترس حاصل تھی۔ مثلاً وہ انسانی کھوپڑی میں جراحی کے عمل سے ہڈی کا ایک ٹکڑا ہٹا کر وہاں سونے یا تانبہ کی ٹکیہ سی نصب کر دیتے۔ یہ لوگ دانتوں کی بھرائی اور ان پر خول چڑھانے میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے امراء اپنے دانتوں میں قیمتی پتھر جڑوایا کرتے تھے۔ ان کے ہاں ادویات کا استعمال بھی اعلیٰ طریقے سے ہو رہا تھا۔

قدیم مصر میں دماغ کی سرجری کا کوئی ایسا طریقہ مستعمل تھا جس کی بابت آج تک واضح رپر سمجھا نہیں جا سکا۔ قدیم ہندوستان میں شواہد موجود ہیں کہ وہ لوگ دماغ کی سرجری کے علاوہ بچے کی پیدائش میں بھی جراحت کا استعمال کر سکتے تھے اور پلاسٹک سرجری پر بھی دسترس رکھتے تھے۔

ہندی طب میں ادویات عمر بڑھانے، دانتوں کو پائیدار بنانے، نظر کی کمزوری کے سدباب، جلد کو خوبصورت بنانے اور یادداشت تیز کرنے کے کاموں میں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ باد میں اضافہ کے لئے ان کے ہاں تیر بہدف نسخوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔[57]

بحرالکاہل کے جزیرے پونیپ کے سحری اور توہم پرست طبیبوں نے بعض طبی مسائل پر خاصی گرفت حاصل کر لی تھی۔ پونیپ پر ایک تحقیقی کتاب کے مصنف سیلی موریل کا کہنا ہے کہ یہ جادوگر طبیب سوزاک، تشنج، دل کے دورے سے بچاؤ کی تیر بہدف ادویات کا علم رکھتے تھے۔ یہ لوگ حمل روکنے پر بھی قدرت حاصل کر چکے تھے۔[58]

۱۸۵۳ء میں برطانوی ادارہ برائے ترقی سائنس کو سر ڈیوڈ بریوسٹر Sir David Brewster نے ایک عجیب چیز پیش کی یہ ایک بہت عمدہ عدسہ تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ یہ نینوا میں ان آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران ملا تھا جو ۶۶۰ ق م کے دور سے تعلق رکھتے تھے (جب کہ عدسوں پر باقاعدہ کام انیسویں صدی میں شروع ہوا)۔ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہ ہوا کہ اسیریائی لوگ عدسے کو بڑا کر کے دیکھنے کے لئے استعمال کرتے ہوں گے۔ کسی نے اسے سجاوٹ کی چیز خیال کیا اور کسی نے زیور بتایا۔ اسی قسم عدسے بعد ازاں دنیا بھر میں دریافت ہوئے۔ مگر لیبیا، عراق، میکسیکو ایکواڈور اور وسطی آسٹریلیا سے دریافت ہونے والے ان عدسوں کی اصلیت پر کہیں تو شک کیا گیا اور کہیں عجائب گھر میں رکھ کر "استعمال ــــ نامعلوم" کا عنوان دے دیا گیا۔ میکسیکو کے قدیم اولمک قبائل کے آثار سے لاونیٹا کے مقام پر ایسے مقعر عدسے ملے ہیں جن کے بارے میں علم نہیں کہ وہ کس طرح اور کس لئے بنائے گئے تھے۔[59]

۱۹۳۶ء میں ایک جرمن انجینئر و لہلم کونگ Wilhelem Konig کو بغداد میں تعمیراتی کام کے سلسلے میں بلایا گیا۔ ایک روز اسے ۱۷۰۰ برس پرانی ایک عمارت کے کھنڈر سے ایک عجیب چیز ملی۔ یہ ایک مٹی کا برتن تھا۔ جس کے اندر تانبے کا بنا ہوا سلنڈر نصب تھا۔ سلنڈر کے اندرونی اطراف میں اسفالٹ کی تہہ تھی۔ اوپر اسفالٹ کا کاک سا لگا ہوا تھا جس کے وسط میں لوہے کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ درحقیقت ایک برقی بیٹری تھی۔[60]

ہم کہتے ہیں کہ بنجمن فرینکلن اولین شخص تھا جس نے بجلی کا سراغ لگایا لیکن صدیوں پہلے برقی بیٹری استعمال کرنے والوں کی اس ایجاد کو کہاں رکھا جائے جو یہ ثابت کرتی ہے کہ ہزاروں برس قبل میسوپوٹیمیا میں لوگ نہ صرف بجلی سے واقف تھے بلکہ اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔

بجلی کا کچھ ایسا ہی استعمال جنوبی امریکی کے عظیم انکا قوم سے پہلے کے "چیمو قبائل" Chimu کے ہاں نظر آتا ہے۔ پیرو میں چن چن Chan

Chan کے مقام پر جب ان قبائل کے آثار کی باقیات تلاش کی جارہی تھی تو وہاں سے بڑے خوبصورت زیورات اور عام استعمال کی ایسی اشیاء دریافت ہوئیں جو اگرچہ تانبے کی بنی ہوئی تھی مگر ان پر چاندی یا سونا کا ملمع چڑھا ہوا تھا۔ ایسی چیزیں بھی ملیں جو چاندی پر برق پاشیدگی کے ذریعے سونا چڑھا کر بنائی گئی تھیں۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ چیمبو تہذیب کسی ایسے طریقے سے واقف تھی کہ پگھلے ہوئے سونے یا چاندی کے ابخرات کو تانبے پر چپکا دیا جائے۔ اگر برق پاشیدگی کے بجائے یہ طریقہ بھی استعمال ہوتا ہو گا تب بھی یہ امر ایک معمہ ہے کہ وہ سونے چاندی کے بخارات کس طرح سے حاصل کرتے ہوں گے؟[61] یہ چیمو لوگ یورپی اقوام کی جنوبی امریکہ آمد سے بہت پہلے غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ان کا تہذیب کو عروج ہوا تھا جو برقی ملمع کاری یا وہ جو بھی طریقہ تھا اس سے ناواقف تھے۔ دیگر قدیم امریکی انڈین نامعلوم طریقوں سے سونے کے زیورات کو اس قدر نزاکت سے بنا لیتے تھے کہ ان میں سوئی کی نوک جتنے اجزا سے نقش گری کی گئی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ قیمتی پتھروں کو کس طرح تراش لیا کرتے تھے وہ سونے کے چھلوں میں ان پتھروں کے ننھے منے اور سوراخ دار ٹکڑے جڑ دیتے تھے کولمبیا کے چپ چاز اور پیرو کے چائمس انڈین بھی دھاتوں پر ملمع چڑھا لیتے تھے۔

قدیم لوگوں کے ہاں روشنی کا حصول بھی ایک بہت بڑا معمہ ہے۔ جنوبی امریکہ میں انکا اور قبل از انکا تہذیبوں کے کھنڈرات کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ یہ اندر ہی اندر تعمیر کا کام کرتے رہے لیکن روشنی کس طرح استعمال کی۔ کیونکہ ان "جنگلیوں" نے کھنڈرات کے اندر جا کر آگ کو ہی روشنی کا ذریعہ بنانا تھا مگر اندر کہیں بھی کالک اور دھوئیں کے آثار نظر نہیں آتے۔ جو بڑھکتی ہوئی آگ سے لازماً بلند ہوتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی مصر قدیم میں دکھائی دیتا ہے۔ غزہ کے اہرام بنانے والوں نے روشنی کا کوئی نامعلوم انتظام کر رکھا تھا۔ کیونکہ اندر گیلریاں اور دیواریں تراشنے اور ان پر حسین نقوش و نگار اور تصاویر بنانے کے لئے اچھی خاصی روشنی کی ضرورت ہو گی۔ مگر وہاں بھی دھوئیں کے کوئی آثار نہیں جنہوں نے ان خوبصورت تصاویر اور در و دیوار پر جم کر یہ ثبوت دیا ہو کہ مصریوں نے آگ کو روشنی کا ذریعہ بنایا تھا۔ کہا گیا کہ دھوئیں کے نشانات اچھی طرح مٹا دیئے گئے مگر ان نشانات کو بھی تو کسی روشنی میں ہی مٹایا گیا ہو گا۔[62]

ایک نظریئے یہ ہے کہ ان لوگوں نے آئینوں کے ذریعے بالواسطہ طریقے پر روشنی کا انتظام کرنے کی تکنیک استعمال کی ہو گی۔ مگر یہ طریقہ تو کلاسیکی ادوار میں بہت بعد میں جا کر دریافت ہوا تھا۔

ادھر جنوبی امریکہ میں امیزون کے گھنے جنگلات کے بارے میں اب تک کہا جاتا ہے کہ وہاں گمشدہ قبائل بڑے بڑے شہروں میں رہائش پذیر ہیں اور راتوں کو ان کے مکانات سے بڑی پراسرار قسم کی روشنی نکلتی دکھائی دیتی ہے۔ معلوم نہیں یہ لوگ کس ذریعے سے یہ روشنی حاصل کرتے ہیں۔

روما قدیم میں رہائش گاہوں کو روشن رکھنے کا عجیب نظام تھا جس کے تحت روشنی بالواسطہ طریقے سے عمارتوں کے اندر تک پہنچتی تھی۔ عمارت سازی میں دیواروں اور فرشوں میں مضبوط قسم کا شیشہ استعمال ہوتا تھا۔ رومیوں نے پانی کی ترسیل کے لئے پمپوں اور والووں کا نظام بنایا تھا۔ اس کی پائیداری کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ نظام اب تک زیر استعمال ہے۔

ان کے ہاں تفریح کے لئے مصنوعی بحری جنگیں لڑی جاتی تھیں اور پانی کا ایسا زبردست نظام قائم کیا گیا تھا کہ ذرا سی دیر میں اسٹیڈیم میں اس قدر پانی بھر دیا جاتا کہ بحری جہاز بہ آسانی اندر داخل ہو سکتے اور بحری جنگ کا مظاہرہ کرتے۔

ٹیس بائس Ctesibius اسکندریہ کا ایک عالم تھا۔ اس دور میں روم میں ایسی عمارتیں بنانے کا رواج تھا کہ اگر آگ لگ جاتی تو لوگوں کے لئے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ٹیس بائس نے اس کے پیش نظر آتش کشی کے لئے ایک عمدہ پمپ ایجاد کیا تھا۔

کریٹ میں ۲۵۰۰ ق م میں اعلیٰ قسم کے غسل خانے اور بیت الخلاء استعمال ہو رہے تھے۔ روما قدیم میں لوگ بوائلروں میں ابالا گیا گرم پانی نلکوں سے حاصل کرتے تھے۔ ان کے ہاں تھرماس بوتل کی ابتدائی شکل بھی موجود تھی جس میں خوراک کا ٹمپریچر یکساں رکھا جاتا۔ وقت کی پیمائش آبی گھڑیوں سے کی جاتی (دن رات کو ۲۴ کے بجائے ۱۲ گھنٹوں میں تقسیم کر رکھا تھا) بھاری بھر کم پتھر کرینوں کے ذریعے اٹھائے جاتے تھے جنہیں چند غلاموں کے ذریعے چلایا جاتا۔

بارود چینیوں کی ایجاد ہے مگر یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا بارود سازی کا طریقہ انہوں نے اتفاقاً معلوم کر لیا تھا۔ یا انہوں نے کسی اور سے سیکھا کیونکہ قدیم ہندوستان کے لوگ بھی بارود کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے رہے تھے۔ چینیوں نے منگولوں کے خلاف بارودی راکٹ استعمال کیے تھے۔ ادھر اسکندر اعظم

کے خلاف اہل ہند نے دھماکہ خیز مواد استعمال کیا تھا۔ چینیوں کے پاس تیر، تلوار اور نیزے تھے۔ مگر وہ روسی فوجیوں کو جن کے پاس بندوقیں تھیں اپنے بارودی راکٹوں کے ذریعے ہی شکست دینے میں کامیاب ہوئے۔

قدیم بازنطینی بحری جہازوں میں ایک عجیب اسلحہ استعمال ہوتا تھا یہ آج کے نیپام بم کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ ان لوگوں نے گندھک، سالٹ پیٹر اور نفتا کو ملا کر ایسا کیمیائی مرکب بنالیا تھا جو دشمن بحری جہازوں پر پھینک دیا جاتا تو از خود بھڑک اٹھتا اور پانی ڈالنے پر بھی نہیں بجھا کرتا تھا۔ وہ لوگ اس مرکب کو ہوا بند ڈبوں میں بند رکھتے تھے۔ بعد ازاں ایسے ہتھیار بھی بنالئے گئے جنہیں اس دور کی بندوق کہنا غلط نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ آتش گیر مادہ ایک ہی آدمی ہلکے اسلحے سے پھینکنے پر قادر ہو چکا تھا۔ (63)

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ارشمیدس نے پانی کو نیچے سے اوپر منتقل کرنے کے لئے مشہور ارشمیدس کا پیچ ایجاد کیا مگر اس سے صدیوں پہلے مصری لوگوں کے ہاں بھی یہی طریقہ استعمال کرنے کے آثار ملے ہیں جو وہاں عام طور پر رائج تھا۔

ویسے ارشمیدس کمال کا شخص تھا۔ اس اکیلے شخص نے اپنے شہر پر نازل ہونے والے حملہ آوروں کو بہت عرصہ تک نچائے رکھا۔ وہ ساحل پر بیٹھے بیٹھے دشمنوں کے بحری جہازوں کو مخصوص قسم کے آتشی شیشوں سے دور سمندر میں ہی نظر آتش کر دیتا۔ اس نے رسوں اور چرخیوں سے سمندر میں ایک ایسا جال بچھا دیا تھا کہ جو بحری جہاز اس کی زد میں آتا وہ اسے سمندر میں الٹ کر غرق کر دیتا۔

۶۰۰ ق م میں یونانی سائنس دان ثالیس ملطی (Thales Of Miletus) نے شائد بھاپ کی طاقت کا راز پالیا تھا۔ یونانی سائنس دان ہیرو نے تو بھاپ سے چلنے والا ٹربائن بھی تخلیق کر لیا تھا۔ مگر اس کی یہ ایجاد اس دور میں خاص توجہ حاصل نہ کر سکی۔ چونکہ غلاموں کی صورت میں انسانی قوت با آسانی میسر تھی۔

بحیرہ ایجیہ سے ایک حیرت انگیز دریافت ہوئی ہے۔ اندازہ ہے کہ اسے غرق ہوئے دو ہزار برس ہو چکے تھے۔ پچاس برس تک یہ عجائب گھر کی زینت رہی۔ تب جا کر یہ معلوم ہوا کہ یہ ستاروں کا ایک قدیم کمپیوٹر ہے۔ تفصیل اس اجمال کی کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۰۰ء میں یونانی غوطہ خور سمندر سے اسفنج نکال رہے تھے کہ ان کی نظر ایک قدیم غرقاب بحری جہاز پر پڑی جو قدیم یونانی مجسموں کو تجارت کے لئے لے جاتے ہوئے ڈوبا تھا۔ یہ لوگ کانسی کے ان مجسموں کو بڑی مشکل سے باہر نکالنے لگے۔ وہاں انہیں ایک عجیب چیز ملی۔ یہ کانسی کے کچھ ٹکڑے تھے۔ جو صدیوں پرانی لکڑی میں کسی طرح جڑے ہوئے تھے۔ غوطہ خور اسے بھی نکال لائے مگر انہیں سمجھ نہ آیا کہ یہ ہے کیا بلا۔ شاید کسی مجسمے کے ٹکڑے یا بچوں کا کوئی بڑا سا کھلونا۔ جب لکڑی خشک ہوئی تو انہیں یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ یہ تو کوئی دقیق میکانکی نظام ہے۔ جس میں بہت سی کلیں (Gears) لگی ہیں اور اس میں مختلف سمتیں اور اعداد و شمار بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

محققین سالہا سال اس پر غور کرتے رہے پروفیسر سٹائس Stais نے اس کا استعمال دریافت کیا ڈین میرٹ Dean Merrit نے حروف کا طرز تحریر دیکھ کر معلوم کیا کہ اس مشین کا تعلق پہلی صدی ق م سے ہے۔

ڈیرک ڈی سولا پرائس Derek De Solla Price اور جارج سٹمائر George Stamires نے مختلف ڈائلوں اور اعداد و شمار کی جانچ پڑتال کی۔

نتائج حیرت انگیز تھے۔ یہ ایک زبردست قسم کا پلانیریم تھا جس میں بروج کی مختلف پوزیشنیں، چاند کی حرکات، سیاروں کی گردشوں اور فلکیات کے بارے میں ایک ایسا میکانکی نظام بنایا گیا تھا جس سے کسی بھی مرحلے پر کسی بھی فلکیاتی جسم کی بابت معلومات حاصل کی جا سکتی تھیں۔

پروفیسر پرائس کا کہنا تھا کہ اس جیسی کسی بھی مشین کا تذکرہ تاریخ میں نہیں ملتا اور نہ ہی کوئی اور آلہ دریافت ہوا ہے۔ جو اس قدر پیچیدہ طریقے پر بنایا گیا ہو۔ شاید یہ کوئی ایسا علم تھا جو زمانے کی گردش کے تحت معدوم ہوتا چلا گیا اور تہذیب نو کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ (64)

(متعلقہ موضوعات دیکھئے
"پراسرار نقشے"
"پراسرار تعمیرات"
"قدیم فلکیات")

# قدیم فلکیات

سمیری تہذیب کی باقیات کا مطالعہ کرنے والے بعض ماہرین نے ایسے انکشافات کیے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سمیری تہذیب ہزاروں برس پہلے کرہ ارض پر موجود تھی اور اپنی قدامت کے اعتبار سے سمیری بڑی حیرت انگیز صلاحیتوں کے مالک اور خاصے ترقی یافتہ لوگ تھے۔ یہ بات آج تک ایک راز ہے کہ سمیری کہاں سے آئے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ سمیریوں کا بیان تھا کہ وہ خلاء میں نظام شمسی کے ایک دور دراز سیارے سے آئے ہیں۔ اس سیارے کو وہ اپنی زبان میں نبیرو کہتے تھے۔

سمیری قوم کی فلکیات کا علم غیر معمولی تھا۔ وہ نظام شمسی کے بارہ اجسام گنواتے تھے۔ محققین پہلے گیارہ اجسام کے بارے میں یہی خیال کرتے ہیں کہ یہ سورج چاند اور نظام شمسی کے نو معلومہ سیارے ہیں۔ جب کہ بارھواں جسم یا دس واں سیارہ جسے سمیریوں نے نبیرو کہا، ان کے علم میں نہیں۔ گو دور حاضر میں اس نظریئے پر خاصا کام ہو رہا ہے کہ پلوٹو کے بعد کوئی سیارہ ڈھونڈ نکالنا بعید از قیاس نہیں (دیکھئے دسواں سیارہ) لیکن سمیریوں نے اس کا بیان یوں کیا ہے کہ گویا وہ نظام شمسی کے بارے میں ہزاروں برس پہلے اتنا کچھ جانتے تھے جتنا ہمارے موجودہ سائنس دان بھی نہیں جانتے۔ سمیریوں کے بتائے ہوئے بارہ اجسام اور ان کا معلومہ اجسام سے تعلق اس طرح بنتا ہے۔

۱۔ اپ سو (سورج) ۲۔ مم مو (عطارد) ۳۔ لاہامو (زہرہ)
۴۔ کی (زمین) ۵۔ کن گو (چاند) ۶۔ لہتو (مریخ)
۷۔ کشاء (مشتری) ۸۔ انشر (زحل) ۹۔ انو (یورنیس)
۱۰۔ ایئے (نپچون) ۱۱۔ گاگا (پلوٹو) ۱۲۔ نبیرو (؟)

جرمنی میں برلن کے عجائب خانے میں سمیری آثار میں ایک مہر کو ۲۴۳ اے وی کا نمبر دیا گیا ہے۔ اس میں نظام شمسی کے اظہار میں سورج کے گرد گیارہ اجسام کو گردش دکھایا گیا ہے۔ گیارھواں جسم سمیریوں کے نزدیک نبیرو سیارہ ہے

سمیری فلکیات سے استفادہ کر کے اسے سائنس دانوں کے سامنے پیش کرنے والی سب سے متنازعہ شخصیت عمانویل ولکاوسکی کی ہے۔

عمانویل ولکاوسکی Immanuel Vilkovsky روس میں پیدا ہوا۔ ۱۹۳۹ء میں امریکہ چلا آیا۔ گیارہ برس بعد اس نے اپنے قدیم تواریخ کے مطالعے کو ایک کتاب Worlds in Collision میں پیش کیا۔ کتاب کا شائع ہونا تھا کہ ایک تہلکہ مچ گیا۔ مصنف کے نظریات تھے ہی اتنے عجیب و غریب کہ عوام الناس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑے شوق سے پڑھا ادھر سائنس دانوں نے اسے خوب لعنت ملامت کی۔ ایک برطانوی ماہر فلکیات نے کہا کہ یہ کتاب جھوٹ کا پلندہ ہے۔ میں نے اسے نہیں پڑھا اور نہ کبھی پڑھوں گا۔ ایک اور ماہر فلکیات نے کہا کہ یہ متحرک کرداروں کی ایجاد کے دور کی بدترین کتاب ہے۔ لیکن سائنس کی دنیا میں اب تک اس کتاب کو بیکار محض نہیں قرار دیا جا سکا۔

ولکاوسکی نے سائنس دانوں سے پہلے یہ کہہ دیا تھا کہ زہرہ نظام شمسی کا وہ واحد سیارہ ہے جس کی گردش دوسرے سیاروں کی گردش کے متضاد ہے اس نے یہ بھی بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ سورج اور سیاروں میں مثبت اور منفی برقی بار موجود ہیں۔ آئن سٹائن نے کہا تھا کہ زہرہ کا درجہ حرارت منفی ۲۵ درجہ فارن ہیٹ ہو گا۔ ولکاوسکی نے اس کے برخلاف زہرہ کا درجہ حرارت ۸۰۰ درجہ فارن ہیٹ بیان کیا اور بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ مریخ کی سطح پر آتش فشاں موجود ہیں۔

نامور ماہر آثار قدیمہ چارلس برلز نے ولکاوسکی کی موت سے کچھ عرصہ پیشتر اس سے ان امور کی واقفیت کا ذریعہ معلوم کیا اور اس امر پر حیرت کا اظہار کیا کہ ولکاوسکی نے سائنس دانوں سے پہلے ہی بعض فلکیاتی حقائق کی بابت کس طرح سے درست خبر دی تو ولکاوسکی نے اس سے کہا "تم جانو کہ برطانوی عجائب گھر میں ہزاروں بابلی مٹی کی ایسی الواح پڑی ہیں جن کو تا حال نہ تو شائع کیا گیا ہے اور نہ ہی ان کا ترجمہ ہوا ہے۔ جو بھی انہیں پڑھنے کی تکلیف کرتا ہے تو اسے ان

الواح سے نظام شمسی کے بارے میں دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہے "۔[65]

عمانویل ولکاوسکی نے زہرہ کی پیدائش کے بارے میں عجیب نظریہ دیا اس کا کہنا تھا کہ سیارہ مشتری کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر دمدار ستارہ بن گیا جو مریخ سے ٹکراتے ہوئے آگے کو نکل گیا اور آج زہرہ سیارے کی شکل میں موجود ہے گویا زہرہ سیارہ سورج سے پیدا نہیں ہوا۔

ادھر سمیریوں کا بیان بھی غیر معمولی ہے وہ زمین کی سورج سے پیدائش کے نظریئے کو نہیں مانتے بلکہ ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک سیارے "تیامت" کی باقیات ہے۔ اس کا قصہ وہ یوں بیان کرتے ہیں کہ دسواں سیارہ نبیرو کروڑوں برس پہلے اس نظام شمسی کا حصہ نہیں تھا بلکہ ایک دمدار ستارے کی مانند بیضوی مدار میں گھوما کرتا تھا۔ اس دور میں مریخ اور مشتری کے درمیان ایک اور سیارہ پایا جاتا تھا۔ جسے سمیری تیامت بتاتے ہیں۔ یہ سیارہ اب موجود نہیں ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب زمین نامی سیارے کا وجود بھی نہیں تھا۔ واقعہ یوں ہوا کہ نبیرو سیارہ اپنے مدار پر گھومتے گھومتے ایک بار نظام شمسی میں آ گھسا تو اس کی کشش کے زیر اثر زحل سیارے کے ذیلی چاند الگ ہو کر نبیرو کے ساتھ ہو لئے۔ اور آگے بڑھتے ہوئے سیارہ تیامت سے اس قدر زور سے جا ٹکرائے کہ اس کے دو ٹکڑے ہو گئے بالائی ٹکڑا مریخ سے اس طرف جا پڑا اور ایک نئے مدار میں گردش کرنے لگا۔ اور یہی ٹکڑا موجودہ کرہ ارض ہے۔ لیکن تیامت کے دوسرے زیرین ٹکڑے کا کیا حشر ہوا؟

سمیریوں کا کہنا ہے کہ نبیرو سیارہ اپنی گردش کو جاری رکھے ہوئے جب بہت عرصے بعد دوبارہ نظام شمسی میں داخل ہوا تو ایک بار پھر اس جگہ سے گزرا جہاں پچھلے تصادم میں تیامت کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ اس کی راہ میں تیامت کا باقی ماندہ زیرین حصہ آ گیا اور اس بار جو تصادم ہوا تو یہ بڑا ٹکڑا ٹوٹ کر چھوٹے چھوٹے لاتعداد ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ (فی الحقیقت مریخ اور مشتری کے درمیان پتھریلی چٹانوں کے ٹکڑوں کا ایک مکمل ہالہ سا موجود ہے۔ جو ایک فلکیاتی معمہ کی سی حیثیت رکھتا ہے)۔

سمیریوں کی کہانی کے مطابق پہلے تصادم کے بعد نبیرو بذات خود، انو، ائیا اور گاگا (یورینس، نیپچون اور پلوٹو) سے ٹکراتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسی تصادم کے نتیجے میں یہ تینوں سیارے اپنے اپنے محوروں پر ایک جانب جھک گئے۔

بغیر دوربین کے قدیم سمیریوں نے ایسے عجیب و غریب انکشاف کیسے کر لئے؟ ساڑھے چھ ہزار سال پرانی سمیری تہذیب کا علم الافلاک ان کی عظمت، لیاقت اور ذہنی زرخیزی کی دلیل ہے۔

میسوپوٹامیہ کے اثریات کا مطالعہ کرنے والے آج بھی اس بات پر انگشت بدنداں ہیں کہ بابلیوں نے فلکیات کے بارے میں دوربینوں کے بغیر اس قدر تفصیلی علم کیونکر حاصل کر لیا تھا۔ ایک ماہر آثار قدیمہ "رالن سن" کا کہنا تھا کہ اس امر کے واضح اشارے موجود ہیں کہ اہل بابل مشتری کے چار چاندوں اور زحل کے سات ذیلی چاندوں سے متعلق واقفیت رکھتے تھے۔

بابلی روایات میں سیارہ "زہرہ کے سینگوں" کا تذکرہ ملتا ہے ماہرین کے مطابق یہ زہرہ کی مختلف حالتوں کے بارے میں بیان ہے۔

ایک مثال برج عقرب کی ہے۔ ستاروں کے اس مجموعہ کو بغیر دوربین کے دیکھیں تو یہ بچھو سے بظاہر کوئی مشابہت نہیں رکھتا لیکن دوربین سے دیکھنے پر یہ حیرت انگیزیات معلوم ہوتی ہے۔ کہ سیاروں کے بیچ ایک دم دار ستارہ موجود ہے۔ جو بچھو کی شکل میں دم کا کام دیتا ہے۔ اور یوں برج عقرب مکمل بچھو کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قدیم ادوار میں بغیر دوربین کے انسانوں نے بچھو کی صورت کی شناخت کیسے کر لی؟ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وسطی امریکہ کی قدیم مایا قوم کے ہاں بھی برج عقرب مقامی زبان میں بچھو سے ہی معنون کیا جاتا ہے۔

یونانی اصنامیات کے مطابق یورنیس نے اپنے بچوں کو نگل کر بعد ازاں اگل دیا تھا۔ کیا اس تمثیل کے پیچھے کوئی عظیم فلکیاتی مشاہدہ ہے؟ جدید دوربینوں کی مدد سے معلوم ہوا ہے کہ سیارہ یورنیس کے چاند گردش کے دوران سیارے کے پیچھے چھپ جاتے ہیں گویا سیارہ انہیں نگل چکا ہے۔ پھر وہ سیارے کے پیچھے سے نمودار ہوتے ہیں گویا سیارہ نے انہیں اگل دیا ہے۔ مگر یہ مشاہدہ صرف دوربین سے ممکن ہے۔[66]

گلیلیو نے ۱۶۱۶ء کے قریب زہرہ سیارے کی مختلف شکلیں دریافت کیں۔ اس سال سروالٹر ریلے نے دنیا کی تاریخ لکھتے ہوئے کہا کہ یہ امر بہت حیران کن ہے کہ کئی قدیم اقوام کے ہاں زہرہ کی مختلف حالتوں کا تذکرہ موجود ہے۔

سیاح ہیروڈوٹس نے ایک یونانی ماہر فلکیات تھیلز کا تذکرہ کیا ہے۔ جس نے ۲۵ مئی ۵۸۵ ق م میں سورج گرہن سے بہت پہلے اس کے وقوع کی بالکل

درست پیش گوئی کر دی تھی۔ یاد رہے کہ سورج گرہن کی پیش گوئی کے لئے کم از کم تین مقامات جو ۱۲۰ طول البلد پر ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر واقع ہوں کا تعین ضروری ہوتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تھیلز نے اتنے پرانے وقتوں میں مقامات کا تعین کیونکر کیا تھا اور پھر اتنی دوری پر واقع مقامات سے رابطے کا کیا ذریعہ مقرر کیا ہو گا۔[67]

قدیم مصنفین ہومر اور ورجل کی رزمیہ داستانوں میں مریخ کو جنگ کا دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ اس کی سرخ آتشیں رنگت سے یہ بڑا خونخوار اور خونریز سمجھا جاتا رہا ہے۔ ان داستانوں کے مطابق مریخ دیوتا نے جنگ کی رتھ کو دو جنگی اسپ بھگائے پھرتے ہیں ایک گھوڑے کا نام فوبوس (بمعنی خوف) اور دوسرے کا ڈیموس (بمعنی پریشان کن، شور انگیز) ہے اس روایت کے پیچھے بھی شاید کوئی فلکیاتی مشاہدہ کارفرما تھا۔ کیونکہ ۱۸۷۷ء میں جب اساف ہال نامی شخص نے مریخ کے دو ذیلی چاند دریافت کئے تو انہیں مریخ دیوتا کا رتھ کھینچنے والے گھوڑوں کے نام سے ہی معنون کیا۔ مریخ کے دو چاندوں کو گھوڑوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ یا یہ ایک اتفاق تھا؟

مایا لوگ جو یوکاٹان (امریکہ قدیم) کے علاقے کے ریڈ انڈین تھے۔ بلا کے فلکیات دان تھے۔ انہوں نے شمسی سال کی بالکل درست پیائش کر لی تھی۔ قدیم دنیا کے باشندوں کو اب آ کر پتہ چلا ہے کہ شمسی سال کی عین پیائش کیا ہے۔ مگر مایا نامعلوم تکنیک اور ذرائع سے بہت پہلے سے اس بارے میں جان چکے تھے۔ ان کے خیال میں شمسی سال ۳۶۵ء۲۴۲۰ دنوں کا ہوتا تھا۔ جدید علم کے مطابق زمین ۳۶۵ء۲۴۲۲ ایام میں سورج کے گرد چکر مکمل کرتی ہے (۰۰۰۲ء۰ - کا فرق کوئی معانی نہیں رکھتا)۔[68] مایا لوگ چاند اور سیاروں کی گردش کے وقت کو بھی جانتے تھے۔ اور سورج یا چاند گرہن کی پیش گوئی بھی کر لیتے تھے۔ پانچ ہزار سال پہلے انہیں معلوم تھا کہ ہر ۱۰۴ برس بعد چاند زہرہ اور سورج ایک ہی خط پر آ جاتے ہیں۔

یہ حقیقت کہ زمین گول ہے قدیم تہذیبیں اس سے آگاہ تھیں۔ قدیم ہندو صحیفے سریا سدھانتا نے کیسی عجب بات کہی ہے۔ "اس کرہ ارض پر ہر کہیں لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا علاقہ اوپر ہے۔ مگر یہ تو خلاء میں ایک کرہ ہے۔ پھر اوپر اور نیچے کا سوال چہ معانی؟"

قدیم مصر میں بچوں کو یہ بتایا جاتا تھا کہ زمین گول ہے اس امر کا ثبوت "سقارہ" سے ملنے والی ہیرو غلافی تحریر سے ہوا ہے۔[69] ..

یونانی سائنس دان "ایراٹوشینز" نے مشرق میں سکندریہ میں دوپہر کے سورج کی شعاعوں کا زاویہ دیکھ کر زمین کے محیط کی اندازاً پیائش کی جو اصل پیائش سے محض چند سو میل کم تھی۔

۱۹۴۰ء کی دہائی کے اواخر میں فرانس کے دو ماہرین بشریات مغربی افریقہ کے ایک قبیلے ڈوگون کے حالات معلوم کرنے کے لئے گئے جو ابھی تک اپنی اصل شکل و صورت میں قائم چلا آ رہا تھا۔ ماہرین کو معلوم ہوا کہ ڈوگون والے آسمان کے سب سے زیادہ روشن ستارے شعریٰ یمانی Sirius کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ شعریٰ یمانی کے گرد اس کا ذیلی چاند سائرس بی گردش کرتا ہے۔ گو یہ ذیلی چاند ۱۸۶۲ء میں دوربین کے ذریعے دریافت ہوا تھا اور اس کی پہلی تصویر ۱۹۷۰ء میں اتاری گئی تھی۔ مگر مغربی افریقہ کے اس قبیلے کو یہ حیرت انگیز بات معلوم تھی کہ سائرس بی۔ سائرس اے (شعرائے یمانی) کے گرد پچاس برس میں چکر مکمل کرتا ہے۔ اور اس کا مدار دائروی نہیں بلکہ بیضوی ہے۔ ڈوگون اس کی شکل ریت پر بنا کر دکھاتے ہیں اور ماہرین دانتوں تلے انگلی داب لیتے ہیں۔ ڈوگون والوں کو اس بات کا بھی پتہ ہے کہ زحل سیارے کے گرد دائرے موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ انہیں یہ علم خلاء سے آنے والے لوگوں نے صدیوں پہلے دیا تھا۔[70]

فرانسیسی محقق اور ماہر بشریات جین پیئر ہیلاٹ Jean Pierre Hallat نے ۵۸ - ۱۹۵۷ء کا دور وسطی افریقہ کے کوتاہ قامت EFE قبیلے کے ہمراہ اتوری جنگل میں گزارا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ اف لوگ زحل سیارے کو "نو چاندوں والا ستارہ" کہتے ہیں۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات تھی کہ انہیں اس حقیقت کا علم کیونکر ہوا کیونکہ مہذب انسان کو اس بات کی خبر ۱۸۹۹ء میں ہوئی تھی۔ اگرچہ ۱۹۸۰ء میں خلائی جہاز وائجر نے زحل کا دسواں چاند دریافت کر لیا ہے۔ لیکن اف کے قبیلے نے غلط ہی کیوں نہ جانا ہو یہ بات حیران کن ہے کہ انہیں اتنے سارے چاندوں کا علم کیسے ہوا جب کہ ان میں سے ایک بھی ننگی آنکھ سے نہیں دیکھا جا سکتا۔[71]

۱۷۲۶ء میں لندن سے ایک کہانی شائع ہوئی نام تھا "گولیورز ٹریولز" یہ وہی مشہور قصہ جس میں ایک شخص بونوں اور دیوؤں کی دنیا کی سیر کرتا ہے۔ اس کہانی کا خالق "جوناتھن سوئفٹ" تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

"لاپوٹا کے ماہرین افلاک" اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اجرام فلکی کے مشاہدے میں صرف کرتے ہیں۔ اور اس مقصد کے لئے وہ شیشے استعمال کرتے ہیں جو (ہمارے شیشوں سے) بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔ ان کی بڑی سے بڑی دوربین بھی تین فٹ سے زیادہ لمبی نہیں مگر وہ ہمارے سو گز لمبی دوربینوں سے زیادہ بڑا کر کے دکھاتی ہے اور اس سے ستارے بھی واضح دکھتے ہیں۔ اس بناء پر انہیں ہمارے یورپی فلکیات دانوں پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ انہوں نے دس ہزار ساکن ستاروں کی ایک فہرست ترتیب دے رکھی ہے۔ جب کہ ہماری بڑی سے بڑی فہرست میں اس کی ایک تہائی تعداد بھی موجود نہیں۔ اسی طرح انہوں نے مریخ کے گرد گردش کرنے والے دو چھوٹے ستارے یا سیٹلائٹ بھی دریافت کر لئے ہیں (ان میں سے ایک دوسرے کی نسبت مریخ سے زیادہ قریب ہے) یہ اندر والا سیارہ مریخ کے قطر کے تین گنا فاصلے پر جب کہ دوسرا باہر والا مریخی قطر کے پانچ گنا فاصلے پر گردش کر رہا ہے۔ پہلا دس گھنٹے میں اپنی گردش پوری کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا ساڑھے اکیس گھنٹے میں۔ ان کے گردشی اوقات کا مربع لیا جائے تو یہ اس تناسب کے قریب آتا ہے۔ جو مریخ کے مرکز سے ان کے فاصلے کا مکعب لینے سے حاصل ہو گا۔ اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر بھی کشش ثقل کا وہی قانون لاگو ہوتا ہے۔ جو دوسرے اجرام فلکی پر اثر انداز ہو رہا ہے۔"

جوناتھن سوئفٹ تو ۱۷۲۶ء میں مریخ کے چاندوں کا ذکر اتنی تفصیل سے کر رہا ہے۔ لیکن تاریخی اور سائنسی اعتبار سے اس واقعے کے ۱۵۱ برس بعد ۱۸۷۷ء میں ایک امریکی ماہر افلاک نے مریخ کے دو چاند جو صرف دوربین سے نظر آ سکتے ہیں۔ دریافت کئے جنہیں آج فوبوس (خوف) اور ڈیموس (ڈر) کہا جاتا ہے۔ سوئفٹ نے ایک کا دورانیہ گردش دس گھنٹے بیان کیا تھا جو جدید اندازے کے مطابق سات گھنٹے ۳۹ منٹ بنتا ہے۔ جب کہ ساڑھے اکیس گھنٹے دورانیہ گردش رکھنے والے بیرونی چاند کے بارے میں حالیہ تحقیق ۳۰ گھنٹے ۱۸ منٹ کا وقت ظاہر کرتی ہے۔[72]

جوناتھان سوئفٹ نے ایسے عجیب و غریب حقائق بیان کرنے کے لئے کون سے ذرائع استعمال کئے۔ ہم نہیں جانتے۔

# حوالہ جات

## باب دوم


1. Mysteries From Forgotten worlds P:149
2. ایضاً ص ۱۴۹
3. World of incredible but True P:45
4. Mysteries from Forgotten Worlds P:95
5. Mysteries of the world By chrintopher Pick P:56
6. Encyclopedia of mysterious places P:244
7. Mysterious from Forgotten Worlds P:78
8. ایضاً ص ۴۳
9. ایضاً ص ۱۲
10. تاریخ اقوام عالم۔ جلد اول سیفی نوگانوی ۱۹۷۸ء
11. Mysteries from forgotten Worlds P:156
12. ایضاً ص ۳۴
13. ایضاً ص ۱۶۴
14. ایضاً ص ۱۶۷
15. ایضاً ص ۶۴
16. ایضاً ص ۱۲۹
17. ناقابل یقین سچائیاں۔ سجاد حیدر وائی کنگ۔ منور جاوید
18. Mysteries from forgotten worlds P:142
19. ایضاً ص ۱۴۵
20. Stranger than science
21. Mysteries from forgotten Worlds P:67
22. ایضاً ص ۸۶
23. ایضاً ص ۵۷
24. ایضاً ص ۷۹
25. ایضاً ص ۸۱
26. The World's Greatest Mysteries (G;Brown P:153)

27 Unsolved Mysteries of the Universe (R.Cavindish) P:34

28 Mysteries of the World (Christopher Pick P:44)

29 Mysteries from forn P:36

30 ایضاً. ص ۳۷

31 World of incredible but true P:238

32 Mysteries from forgotten Worlds P:82

33 ایضاً. ص ۸۴

34 ایضاً. ص ۸۴

35 تین مسلمان سیاح تابش صدیقی ص ۶

36 Mysteries from Forgotten Worlds P:49

37 ایضاً. ص ۵۳

38 ایضاً. ص ۱۳۶

39 ایضاً. ص ۴۷

40 ایضاً. ص ۱۴۳

41 ایضاً. ص ۱۳۹

42 ایضاً. ص ۱۴۰

43 ایضاً. ص ۱۴۳

44 People's Almanac II P:1264

45 World of incredible But True P:33

46 Mysteries From forgotten Worlds P:29

47 ایضاً. ص ۱۷۳

48 Swastik: A Nazi Symble Or Enijna (By Ishrat Hussain- Frontir Post)

49 World of incredib but P:34

50 ایضاً. ص ۱۷۴

51 ایضاً. ص ۱۷۵

52 World of incredible but true P:7

53 Mysteries from forgotten worlds ch:10

54 ایضاً. ص ۱۴۴

55 ایضاً. ص ۱۶۶

56 ایضاً. ص ۵۱

57 ایضاً.

58 ایضاً. ص ۱۲۵

59 ایضاً. ص ۵۸

60 Unsolved Mysteries of Universe P:19

61 Mysteries from forgotten Worlds P:32

62 Mysteries from forgotten Worlds P:33

63 ایضاً. ص ۵۵

64 ایضاً. ص ۴۱

65 World of incredible But P:31

66 Mysteries from forgotten Worlds P:48

67 ایضاً. ص ۴۹

68 Gods Graves And scholars, 1980 (P:423)

69 Mysteries from Forgotten Worlds P:53

70 Worlds Greatest Mysteries Govry Brown P:143

71 - Worlds of incredible lent true P:125

72 Peoples Almanac II P:1355

باب سوم

# اسرار فطرت

# کائنات کا آغاز

یہ کائنات کیونکر پیدا ہوئی؟ اس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ یہ وہ سوال ہے جس نے کونیات اور طبیعات کے ماہرین کو ایک عرصہ سے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔

ابتدا میں کچھ نہ تھا۔ نہ مادہ تھا نہ توانائی پھر نہ معلوم کیوں کر عدم سے وقت کا وجود ہوا۔ اور یہیں سے کائنات کی پیدائش کا عمل شروع ہوا یا جس لمحے تخلیق کائنات کی ابتدا ہوئی اسی لمحے وقت کا آغاز ہوا۔ "کائنات کا تمام مادہ ایک جگہ اکھٹا تھا۔ زبردست دھماکہ ہوا اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر یہ تمام مادہ دور تک بکھر گیا۔ پھیلاؤ کا عمل زبردست تیزی سے ہوا۔ کائنات نے ۱۰ کی قوت ۸۰ کی نسبت سے اضافہ پایا لیکن پھر فوراً پھیلاؤ کا عمل سست پڑ گیا"۔[1] خالص توانائی ٹھنڈی ہو کر مادی صورت اختیار کرنے لگی۔ اربوں سال گزرتے گئے ٹھنڈک شدید تر ہوتی گئی اور کہکشائیں وجود میں آنے لگیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جو بیسویں صدی میں کائنات کی پیدائش کے حوالے سے بہت مشہور ہوا۔ اسے آج ہم بگ بینگ یا عظیم دھماکے کا نظریہ کہتے ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق تمام عناصر چند سیکنڈوں میں معرض وجود میں آ گئے تھے اور دھماکے کے بعد سے تمام کہکشائیں دھماکے کے مرکز سے باہر کی طرف فرار ہو رہی ہیں۔

کہکشائیں متحرک ہیں۔ اس بات کا پتہ اس حقیقت سے چلا ہے کہ دور دراز کی کہکشاؤں کے پیچھے ایک لکیر سی نظر آتی ہے۔ جو کہکشاؤں سے نکلنے والی روشنی ہے اور اس روشنی کو Red Shift ریڈ شفٹ کہتے ہیں۔

بگ بینگ پر تنقید کرنے والے ماہرین فلکیات میں سے ایک پاکستان کے ایم سلیم ہیں۔ اپنے اعتراضات اور نظریات انہوں نے اپنی کتاب "پراسرار کائنات کا معمہ" میں پیش کئے ہیں۔ ان کے خیال میں کہکشائیں ایک سیدھی سمت میں فرار نہیں ہو رہیں بلکہ ایک بہت بڑے دائرے کی صورت میں اپنے اپنے بڑے بڑے ستاروں کے جمگھٹوں کے گرد گھوم رہی ہیں لیکن یہ چکر اس قدر طویل ہوتا ہے کہ کروڑوں برس میں مکمل ہوتا ہے اس لئے دور کی کہکشائیں سیدھا سفر کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے ہم زمین کو مسطح محسوس کرتے ہیں حالانکہ یہ گول ہے۔ صرف ریڈ شفٹ کی موجودگی کہکشاؤں کے فرار کا ثبوت نہیں کیونکہ کہکشائیں اپنے گول مداروں کا صرف ایک فیصد فاصلہ بھی لاکھوں برسوں میں مکمل کرتی ہیں اور بہت بڑے دائرے کی ننھی سی قوس سیدھا خط ہی معلوم ہوگی۔ بگ بینگ کہتا ہے کہ جو کہکشاں جس قدر دور ہوگی اتنی ہی زیادہ تیزی سے سفر کرے گی۔ اب دوربینی مشاہدہ سے ایسی دور دراز کہکشاؤں کا سراغ لگایا گیا ہے۔ کہ جن کے ریڈ شفٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روشنی کی رفتار سے متحرک ہیں۔ لیکن کائنات تو اس سے بھی آگے ہے۔ اب ان کہکشاؤں سے آگے لازماً ایسی کہکشائیں ہونی چاہئیں۔ جو روشنی سے زیادہ رفتار سے حرکت کر رہی ہوں اور ان کے بعد روشنی کی رفتار سے دوگنا، تین گنا اور یہ رفتار کا سلسلہ بگ بینگ کے مطابق بڑھتے چلا جانا چاہئے۔ لیکن طبیعات روشنی سے زیادہ تیز مادی اشیاء کے وجود سے انکار کرتی ہے اور اگر ایسا ہی مشاہدہ ادھر کی کہکشاں سے ہو تو ہماری کہکشاں کو لازماً روشنی سے زیادہ تیز رفتار دکھائی دینا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہے ہمارا مشاہدہ یہ نتائج اس وقت بھی دے سکتا ہے کہ یا تو ہم کائنات کے مرکز میں

بیٹھے یہ مشاہدات نوٹ کر رہے ہو یا بالکل کنارے پر موجود ہوں (اور یہ دونوں باتیں امکان سے باہر ہیں) ۔ بگ بینگ کے ماننے والے ایک دلیل بعید کہکشاؤں میں کثافت کے مشاہدے کی دیتے ہیں لیکن درحقیقت ان کہکشاؤں میں بے پناہ فاصلے ہیں لیکن دوری کے سبب وہ ملی جلی نظر آتی ہیں اور یہی مشاہدہ ہماری کہکشاں سے متعلق ان کہکشاؤں سے کیا جا سکتا ہے گویا ہماری کہکشائیں ایک دوسرے میں مدغم نظر آئیں گی۔ لہٰذا یہ دلیل بھی بے وزن ہے۔

بگ بینگ کے مطابق کائنات کی تمام کہکشائیں ایک ہی لمحہ میں دھماکے سے بکھر کر وجود میں آئیں (یہ گویا کن فیکون والا معاملہ ہوا کیونکہ اس امر میں چند سیکنڈ ہی صرف ہوئے ہوں گے) ۔ ماہر فلکیات ایم سلیم کے مطابق اگر ایسا ہی ہوا تو ہر طرف کی کہکشائیں ایک ہی جیسی دکھائی دینی چاہئے اور ہر ایک پر ایک جیسی کیفیات وارد ہوتی ہے دکھائی دینی چاہئیں لیکن اس کے برعکس کہیں بوڑھی دم توڑتے سورجوں کی کہکشائیں نظر آتی ہیں اور ایک جگہ تو ہائیڈروجن کے بادلوں میں ایک نئی کہکشاں کچی حالت میں جنم لیتے بھی نظر آ گئی ہے۔ یوں فنا اور پیدائش کے مختلف سلسلے نظر آنا بگ بینگ کے خلاف ہے۔

ایم سلیم کن فیکون اور شخص خدا کے تصور سے انکار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس انہوں نے خدائی صفات کی حامل ایک عجیب چیز کی نشاندھی کی ہے۔ جو عقائد کے بیان کردہ خدائی اوصاف میں سے بیشتر اہم خواص کی حامل ہے یہ ہے خلا۔ وہ خصوصیات جن سے متصف ہونے پر خلاء کو خدائی صفات کا حامل کہا گیا ہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

تمام کائنات میں سب سے بڑا اور سب سے عظیم "خلاء" ہے اس کی کوئی حد نہیں کوئی ابتداء کوئی انتہا نہیں۔ اس کی بڑائی کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ان گنت عظیم ترین کہکشائیں خلاء کے جس حصے سے ایک مرتبہ گزر جائیں تو دوبارہ کبھی وہاں سے ان کا گزر نہیں ہوتا۔

خلا ایک ہے، واحد۔ تمام کائنات نوع نوع کی مادی صورتوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر کوئی ہر جانب یکساں صورت اور یکساں خواص رکھنے والی ہے تو وہ خلا ہے۔ سیاروں اور ستاروں کے علاوہ فلکی اجسام میں سے کوئی بھی بالکل اس جیسا نہیں۔ خلا کا تسلسل کہیں ختم نہیں ہوتا۔

خلا کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ اس کائنات میں صرف خلا ہی خود آ Self Existance ہے باقی مادہ توانائی میں اور توانائی مادے میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اور یہ سلسلہ خلا میں جاری ہے۔ مادی چیزیں اپنے وجود کے لئے خلا کی محتاج ہیں کیونکہ مادہ جگہ گھیرتا ہے اور یہ جگہ خلا فراہم کرتا ہے لیکن خلا کسی کا محتاج نہیں وہ بے نیاز ہے۔ مادی اشیاء تغیر کا شکار رہتی ہیں اور کوئی مادی شکل ہمیشہ کے لئے برقرار نہیں۔ اسے آخر کار زوال آتا ہے۔ جب کہ خلا ابدی اور لازوال ہے۔

خلا کی چوتھی بعد .Fourth Dimension وقت ہے۔ ہر شے ترقی و تنزلی کے لئے خلا کی اس بعد کی محتاج ہے۔ پیدا ہونے سے مرنے تک کے مراحل کو وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یوں خلا کی یہ بعد عروج بھی دیتی ہے۔ زوال بھی۔ وقت ہر شے پر قادر ہے۔ چونکہ خلا سے وقت کو اور وقت سے خلا کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا خلا کی صفت یہ ہوئی کہ یہ زندگی اور موت دینے پر قادر ہے۔ کائنات کے ذرے ذرے میں خلا سمایا ہوا ہے۔ خلا ہر جگہ موجود ہے۔ ٹھوس ترین شے کے ایٹموں میں بھی خلا موجود ہے۔ فلم لیب کے سائنس دان لیڈر مین کے مطابق اگر تمام کہکشاؤں کے مجموعی مادے سے خلا باہر نکال دیں تو یہ سوئی کی نوک کے برابر مادہ رہ جائے گا وہ بھی ضد مادہ سے ٹکرانے پر فنا ہو جائے گا اور پیچھے لازوال خلا رہ جائے گا۔ کائنات میں مادہ ہر جگہ موجود نہیں صرف اور صرف خلا ہی ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔[2]

کائنات کی پیدائش کا معمہ سامنے ہے۔ آخر مادہ کہاں سے آیا؟ توانائی کیسے پیدا ہوئی؟ وقت کیسے پیدا ہوا؟ عدم سے وجود کیونکر برآمد ہوا؟ ماہر ارتقا سمپسن نے "ارتقاء کا مفہوم" میں کہا ہے۔ "کائنات کے آغاز اور سلسلہ علت و معلول کی اولین کڑی کا مسئلہ لاینحل ہے اور سائنس اس تک نہیں پہنچ سکتی..... یہ اولین کڑی ایک راز ہے اور میرا خیال ہے کہ ذہن انسانی اس راز کو کبھی نہ پا سکے گا۔ ہم اگر چاہیں واپنے طریق پر اس علت اولیٰ کے حضور اپنا سر جھکا سکتے ہیں لیکن اسے اپنے ادراک کے دائرے میں کبھی نہیں لا سکتے۔"

# معمہ وقت

کتنے ہی سائنسی قوانین ہیں جن میں وقت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ مگر اس کلید کی ماہیت اور تعریف کیا ہے؟ آئن سٹائن سے ایک مرتبہ یہی سوال ہوا تو اس نے کہا تھا کہ وقت اس پیمائش سے بڑھ کر کچھ نہیں جو گھڑی کے ذریعے کی جائے۔

آگسٹائن نے کہا تھا کہ "کوئی مجھ سے پوچھے کہ وقت کیا ہے تو مجھے معلوم نہیں ہو گا کہ وہ کیا ہے۔ جب کوئی اس کے بارے میں استفسار نہ کرے تو میں جانتا ہوں کہ وقت کیا ہے۔"

وقت کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اسی لمحے جب کائنات کی ابتداء ہوئی وقت نے جنم لیا۔ مادے کی پیدائش یا تغیر و تبدل سے پہلے وقت کا وجود بے معنی ہے۔ ایک زمانے میں جب یہ سوال کیا جاتا کہ تخلیق کائنات سے قبل خدا کیا کر رہا تھا؟ تو مذہبی علماء کا جواب ہوتا کہ وہ تخلیق کائنات سے پہلے اس قسم کے سوالات پوچھنے والوں کے لئے جہنم کی تیاری میں مصروف تھا۔ لیکن پھر عیسائی عالم آگسٹائن ولی نے جواب یوں دیا کہ وقت تو ہے ہی کائنات کی صفت (اور کائنات کو خدا نے پیدا کیا) یوں کائنات کی ابتداء سے قبل وقت کا وجود تھا ہی نہیں۔[3]

چونکہ وقت، فاصلے کی طرح، واقعات اور اشیاء کو جدا کرتا ہے اس لئے اسے چوتھی بعد کہا گیا ہے۔[4] ہم بلاواسطہ وقت کی پیمائش نہیں کر سکتے۔

ہم وقت کو جس انداز سے ناپتے ہیں۔ اس کے پیچھے ہمارا یہ خیال کار فرما ہوتا ہے کہ وقت ایک رفتار سے چل رہا ہے۔ حالانکہ یہ ایک مفروضہ ہے۔ ہمارے احساسات کی رو سے وقت کی رفتار یکساں نہیں رہتی۔ مثلاً آپ کسی دل پسند کام میں مشغول ہیں تو وقت گزرنے کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ ادھر جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوں یا کسی خوشگوار چیز کا انتظار ہو تو وقت کی گھڑیاں چیونٹی کی رفتار سے چلتی محسوس ہوں گی اور ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط معلوم ہو گا۔ آئن سٹائن نے اس معاملے میں ایک بڑی خوبصورت مثال دی تھی۔ "جب کوئی آدمی کسی حسین لڑکی کے ساتھ ایک گھنٹہ بیٹھتا ہے تو یہ عرصہ اسے ایک منٹ کا لگتا ہے لیکن اسے گرم چولہے پر ایک منٹ بیٹھنے دیں تو ایک گھنٹے سے زیادہ معلوم ہو گا۔"[5]

اس مثال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وقت کا تعلق ہمارے محسوسات سے ہے۔ لیکن اگر صرف محسوسات ہی وقت کی پہچان ہیں تو کیا ماضی، حال، مستقبل کا جداگانہ وجود بھی ہے یا یہ ہمارے خود ساختہ عنوانات ہیں اگر نہیں تو اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ وقت کا دھارا بہے جاتا ہے اور اشیاء اور واقعات کو پیچھے چھوڑتا قصہ پارینہ بناتا اور ناقابل واپسی ماضی کے سپرد کرتا ہوا آگے آگے کو کسی نامعلوم مستقبل کی طرف رواں دواں رہتا ہے؟

ہم نہیں جانتے کہ وقت کیا ہے؟ کیا اس کا کوئی خارجی وجود بھی ہے یا یہ محض انسانی ذہن کی پیداوار ہے؟ کیا یہ ساکن ہے یا متحرک؟ کیا ماضی حال اور مستقبل علیحدہ علیحدہ خولوں میں محفوظ ہیں یا تینوں باہم ساتھ ساتھ ہیں؟ کچھ کا خیال ہے کہ مستقبل پہلے سے وجود رکھتا ہے اور ہم آئندہ کی جانب اس طرح سفر کرتے ہیں جیسے گاڑی سٹیشنوں کی طرف اور ماضی کی بابت کہا گیا ہے یہ کسی فلم کی ریل کی مانند کائنات میں محفوظ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وقت کی پیمائش کا واحد طبیعیاتی بالواسطہ ذریعہ Entropy کا مظہر ہے۔ اور کوئی طریقہ موجود نہیں جس سے براہ راست وقت کو ظاہر کیا جا سکے۔ یہ Entropy کیا ہے؟

کائنات بھر میں انتشار ابتری اور بوسیدگی کا عمل جاری و ساری ہے۔ یعنی ہمہ وقت ہر شے بربادی کی جانب بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ تخریب یا ناکارگی کا یہ مظہر Entropy ہے۔ یہ وہ عمل ہے جسے واپس نہیں پلٹایا جا سکتا۔ تھرموڈائنامکس یا حرحرکیات کا دوسرا قانون کہتا ہے کہ ایک نظام میں حرارت گرم اشیاء و مقامات سے سرد اشیاء و مقامات کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ نتیجتاً اشیاء میں بے ترتیبی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ انٹروپی کو سمجھنے کے لئے تاش کے پتوں کی مثال لی جا سکتی ہے اگر تاش کے پتوں کو مکمل ترتیب دے کر پھینٹنے کا عمل شروع کیا جائے تو ترتیب بگڑتی چلی جاتی ہے اور سارے سیٹ ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بے ترتیب ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس کی ایک اور اچھی مثال شیشے کے ثابت گلاس کا میز سے گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا عمل ہے۔ اگر کیمرے سے اس عمل کی فلم بنا کر دیکھی جائے تو ہمیں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئے گی مگر جب فلم کی ریل کو الٹا چلایا جائے گا تو فرش پر موجود گلاس کے ٹکڑے آپس میں اکٹھے ہو کر گلاس بنا دیں گے جو اچھل

کر میز پر چڑھ جائے گا۔ ہم ایک دم سے کہہ سکیں گے کہ فلم الٹی چلائی گئی ہے۔ کیونکہ حقیقی زندگی میں ہم نے کبھی اس طرح کا عمل ہوتے نہیں دیکھا۔ (6)

جوں جوں وقت گزر رہا ہے انٹروپی بڑھ رہی ہے۔ اس عمل نے ماضی سے مستقبل کو ممیز کر دیا اور وقت کو ایک سمت دی یعنی کم انٹروپی سے زیادہ انٹروپی کی طرف جسے عرف عام میں وقت کا تیر Arrow of Time کہتے ہیں فی زمانہ وقت کے تین تیر بیان ہوئے ہیں۔ جن کی بناء پر الگ الگ اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وقت گزر رہا ہے۔

وقت کا پہلا تیر حرحرکیاتی تیر Thermodynamic Arrow of time ہے۔ اس کا پتہ بڑھتی ہوئی ابتری سے چلتا ہے جیسے گلاس کے ٹوٹنے کی مثال۔

وقت کا دوسرا تیر نفسیاتی تیر ہے۔ یعنی ہم محسوس کرتے ہیں کہ وقت گزر رہا ہے یا اس کے بہنے کا تاثر ہے جس کی وجہ سے ماضی ہمیں یاد ہے مگر تیر کے بڑھنے کے رخ کی جانب مستقبل کی خبر نہیں۔

تیسرا وقت کا کائناتی تیر Cosmological Arrow ہے۔ یعنی یہاں کہکشاؤں کے پھیلتے چلے جانے کو وقت کی سمت کے لئے معیار بنایا گیا ہے۔

اگر وقت کا پہلا تیر الٹا چل جائے تو انتشار کے بجائے ارتکاز کا سلسلہ شروع ہو جائے ٹوٹے برتن جڑنے لگیں۔ بلب کی روشنی پلٹ کر بلب میں گھسنے لگے اور تاش کے پتے واپس ترتیب اختیار کر لیں۔

اگر وقت کا دوسرا تیر الٹ چل جائے تو ہمیں مستقبل اچھی طرح یاد ہو مگر ماضی کی کوئی خبر نہ ہو۔ اس صورت میں بقول سٹیون ہاکنگ جس وقت گلاس ٹوٹا پڑا ہو گا تو وہ میز پر پڑا یاد ہو گا مگر جس وقت وہ میز پر ہو گا تو یہ بات بھول جائے گی کہ وہ ٹوٹا ہوا تھا۔

وقت کا کائناتی تیر الٹا چل پڑنے کا مطلب وہ ہے جسے کائنات کا اختتام قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں ایک دھماکہ ہوا تھا جس سے تمام مادہ دور دور بکھر گیا۔ اس سے کہکشائیں بنیں مگر دور تک بکھرا دینے والے دھکے کا ایسا اثر باقی ہے کہ کہکشائیں اب تک دور سے دور تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی ہیں۔ وقت کا تیسرا تیر الٹ گیا تو یہ قریب آ کر ایک دوسرے کو سرے کی طرح پیس کر رکھ دیں گی۔

# زندگی کا آغاز

کرہ ارض پر زندگی کس طرح شروع ہوئی؟ اس کے متعلق تین باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ یہ کہ زمین پر زندگی ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے۔ یا زمین ایک خالی سیارہ تھا جہاں خلا سے زندگی وارد ہوئی اور پھل پھول گئی یا پھر مخصوص حالات کے تحت زمین پر زندگی از خود نمودار ہو گئی۔

پہلا نظریہ امکان سے باہر ہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ زندگی شروع سے ہی زمین پر موجود ہے بلکہ ارضیات دانوں کے مطابق کرہ ارض کے ابتدائی ادوار میں یہاں اس قدر گرمی تھی کہ زندہ مادے کا وجود ہی خارج از امکان تھا۔

دوسرے نظریئے کے مطابق خلا سے کوئی ایسا شہابیہ پتھر یا گرد وغیرہ کا ذرہ کرہ ارض پر آن گرا جس پر کہکشاں میں کہیں دور اس وقت موجود زندگی کی کوئی صورت موجود تھی۔ یہاں ماحول ساز گار ملا تو زندگی کی داغ بیل پڑ گئی۔ تب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہوا تو اس دور دراز واقع سیارے پر زندگی پہلی بار کس طرح سے پیدا ہو گئی۔ پھر اس بات پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ زندہ مادہ اتنی دور سے بخیر و عافیت زمین تک کیسے منتقل ہو گیا اور راستے میں موجود انتہائی سرد اور سخت گرم ماحول اور کاسمک شعاعوں سے کس طرح بچ کر آ گیا۔ گزشتہ دو دہائیوں میں اس نظریئے پر کیے گئے اعتراضات کو بعض ماہرین نے دور کرنے کی کوشش کی ہے گو معلومہ کائنات میں زمین ہی ایک ایسا مقام ہے جہاں زندگی پائی گئی ہے لیکن ان ماہرین کے نزدیک اگر اس بات سے یہ سمجھ لیا جائے کہ کرہ ارض ہی کائنات میں زندگی کا محور ہے تو یہ ویسی ہی احمقانہ بات ہو گی جیسے کوپرنیکس سے پہلے کے لوگ زمین کو کائنات کا مرکز سمجھا کرتے تھے۔ ان ماہرین میں کرک اور گل (۱۹۷۳ء) Crick & Orgel، ہوئل Hoyle اور وکرم سنگھ (۱۹۸۱ء) پیش پیش ہیں۔

ان کی تحقیقات کے مطابق زمین پر گرنے والے شہابیوں کے خوردبینی تجزیئے کے دوران کچھ ایسے ننھے منے رکاز سے دیکھنے میں آئے ہیں جن کی شباہت وائرس یا بکٹیریا قسم کے ابتدائی جانداروں سے ملتی جلتی ہے۔ خصوصاً دور حاضر کے ایک بکٹیریا Pedomicrobium کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان خوردرکاز جانداروں نے زمین پر پہنچنے پر کس طرح سے جسم و جاں کا تعلق برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہوگی۔

پیڈو مائکر وبیم بیکٹیریا توانائی کے حصول کے لئے نمکیات سے آکسیجن کو لوہے کی فیرس سے فیرک شکل میں یا مینگنیز کو منتقل کر دیتے ہیں۔ (شاید یہی وجہ ہے کہ ۳۸۰۰ ملین سال پہلے کی چٹانوں کے درمیان فیرک دیکھنے میں آیا ہے۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب فضا میں پودوں کی فوٹوسنتھی سز کے ذریعے آکسیجن جمع ہونے کا عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ جسے ہم فیرس کو فیرک میں بدلنے کا ذمہ دار ٹھہرائیں لہٰذا مائیکرو بیم قسم کے ابتدائی جانداروں نے فضاء میں آکسیجن کی عدم موجودگی کے دوران توانائی کے حصول کے لئے نمکیاتی آکسیجن کو لوہے کی فیرس قسم کو فیرک بنا ڈالا ہوگا) (7)

چلئے مان لیا کہ کائنات میں کہیں دور دراز سے پیڈو مائکر وبیم قسم کے جاندار موجود تھے یا ہیں جنہوں نے زمین پر آکر یہاں زندگی کی افزائش کی مگر سوال یہ ہے کہ وہ اتنا لمبا راستہ کس طرح سے بخیر و عافیت طے کر آئے۔

بروش Bruch (۱۹۶۷ء) کا کہنا ہے کہ بیرونی خلاء سے زندگی کی در آمد کے سلسلے میں مخالفین نے اپنے اعتراضات کو بڑا بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ کیونکہ یہ بات بعید از امکان نہیں کہ مائیکروب جاندار خلاء سے منجمد حالت میں زمین پر صحیح سالم پہنچ جائیں (منجمد حالت جیسا کہ دمدار ستارے برف کے بنے ہوتے ہیں۔ میں سپور خراب نہیں ہوتے)۔ رہا سوال شعاعوں کا تو منجمد گولوں کے گرد کسی مادے کی ممکنہ تہہ سے ایسے جانداروں کو سورج کی قاتل بالائے بنفشی شعاعوں اور سورج کی پروٹان ہواؤں کے خلائی اثرات کے علاوہ زمین کے کرہ ہوائی کی رگڑ سے پیدا شدہ حرارت سے بچانا بھی ممکن ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب بھی ممکن ہے کہ خلاء سے زندگی کسی شکل میں زمین تک آج بھی پہنچ رہی ہے۔ مگر اس کے لئے تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔

زندگی کی ابتداء سے متعلق تیسرا نظریہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ چونکہ زندہ اجسام کو تشکیل دینے والے تمام عناصر کرہ ارض میں پائے جاتے ہیں لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ابتداء یہیں زمین پر خاص حالات کے تحت ہوئی۔ کسی بھی زندہ شے کے تجزیئے سے یہ بات معلوم ہوگی کہ زندہ اجسام میں چھ بنیادی اجزاء یا عناصر لازماً ملیں گے۔ یہ عناصر ہیں ہائیڈروجن، ہیلیم، کاربن، نائٹروجن، آکسیجن اور نی اون۔ مقداری اعتبار سے یہ عناصر مجموعی طور پر کائنات مادے کا ۹۶ فیصد حصہ بناتے ہیں۔

گویا زندگی ان چھ عناصر کے اشتراک عمل سے ظہور پذیر ہوئی مگر کیسے؟ حیاتیات کی رو سے زندگی کی ابتداء یک خلوی جانداروں سے ہوئی ہوگی مگر حق یہ ہے کہ انسان اب تک چھ بنیادی عناصر کے استعمال سے یہ یک خلوی حقیر ترین مخلوق کے وجود کو ڈھال کر اس میں زندگی ڈال دینے میں کامیاب نہیں ہوا۔ سوال یہ ہے کہ تاریخ کے کسی نامعلوم دور میں وہ کون سے عوامل تھے اور وہ کیسے حالات تھے جن کے سبب ان چھ عناصر سے زندہ خلیات کی تشکیل ہوئی؟

یہ بھی ظاہر ہے کہ چھ بنیادی عناصر کے درمیان کیمیائی تعامل تبھی وقوع پذیر ہوا ہوگا جب توانائی استعمال ہوئی۔ یہ توانائی کہاں سے آئی؟ روسی سائنس دان الیگزینڈر اوپارن کا کہنا تھا کہ یہ توانائی سورج کی شعاعوں اور زمینی تابکار مادوں سے حاصل کی گئی ہوگی۔ ۱۹۵۰ء میں اس نظریئے کی تجرباتی تصدیق کی خاطر شکاگو یونیورسٹی میں ایک نوجوان طالب اسٹینلے ملر نے مشہور تجربہ کیا اس نے میتھین امونیا اور ہائیڈروجن گیسوں کے گرم آمیزے میں آبی بخارات کی موجودگی کے دوران برقی شرارے گزارنے شروع کیے اور یہ شغل ایک ہفتہ جاری رہا۔

تجربے کے اختتام پر دیکھا گیا کہ آمیزے کے اجزاء پر کیا بیتی۔ معلوم ہوا کہ میتھین میں موجود ۵ ٪ کاربن نے ایک مرکب امائنو ایسڈ بنا ڈالا ہے۔ یہ اطلاع بڑی سنسنی خیز ثابت ہوئی۔ امائنو ایسڈ ایسا کیمیائی مرکب ہے جو لحمیات یا پروٹین کی تشکیل کرتا ہے۔ جو حیاتی نشوونما کے لئے عمل انگیز ہے۔ ملر کے بعد سے تجربات کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا اور انسان کو خلیہ کے جسم کے بعض حصے خود سے بنانے آ گئے۔ ان نامیاتی اجزاء میں خلیاتی جھلی بنانے والے چربیلے اجزاء "لپڈز" اور خلیاتی مرکز کے اہم ترین حصے ڈی این اے کے ساختی اجزاء نیوکلیر ٹائیڈ کی تخلیق سرفہرست ہے۔

ملر کے تجربے کی روشنی میں کہا گیا کہ دن رات اور گرمی سردی جیسے عوامل کے تحت سادہ امائنو ایسڈ سے پروٹین کے پیچیدہ تر سالمے بنے ہوں گے اور یہی کچھ دوسرے سادہ تر اجزاء کے ساتھ ہوا ہوگا۔

مگر اصل مسئلہ وہی ہے کہ اگر غیر خلیاتی اجزاء سے نامیاتی مرکبات بن سکنے کی تجرباتی تصدیق ہو بھی گئی تو اب اس معاملہ کی چھان بین کی جائے کہ آخر ان نامیاتی اجزاء نے ایک زندہ خلیہ کس طرح بنالیا۔

پروٹین جن بنیادی اجزاء سے مل کر بنتی ہے وہ ۲۰ قسم کے امائنو ایسڈ ہیں۔ مختلف امائنو ایسڈ مخصوص ترتیبوں سے آپس میں جڑ کر مختلف اقسام کی پروٹین بناتے ہیں۔ یہ پروٹین مزید مراحل سے گزر کر پروٹینی "گولے" بناتی ہے۔ اور یہ گولے خلئے میں خوراک اور فالتو اجزاء کی نقل و حمل کے علاوہ نئے خلئے کی پیدائش میں کام آتے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ پروٹینی کروں کے گولوں پر اگر روشنی کی برقناطیسی شعاعیں پڑیں تو وہ ان سے متاثر ہوتے ہیں۔ گولوں میں موجود یہ روشنی سے متعلق حس، زندہ اجسام کے اعصابی خلیوں میں پیدا ہونے والے سگنل سے متعلق حساسیت سے مشابہ ہے۔

کیلی فورنیا میں ساک انسٹی ٹیوٹ کے کیمیادان نے ایک تجربہ یوں کیا کہ ایک محلول میں ۴ مختلف اقسام کے پروٹینی کرے ڈال دیئے۔ جب اس محلول میں نیوکلئیک ترشے کا ایک ریشہ ڈبویا تو چاروں کرے اس ریشے سے آکر چپک گئے۔ اس کے نتیجے میں R.N.A سے مشابہ ایک شکل وجود میں آئی۔ یہ اس امر پر ایک دلیل ہوئی کہ R.N.A بغیر کسی مدد کے خود ہی نامیاتی اجزاء کی تعداد میں اضافہ کر سکتا ہے یعنی کسی پروٹینی عمل انگیز کی مدد کے بغیر بھی یہ ممکن ہے۔

میری لینڈ لیبارٹری کے ڈائریکٹر مچل ہوبش نے اطلاع دی کہ جب امائنو ایسڈ اور پروٹین پانی میں ڈالی جائیں تو ان میں ابتدائی قسم کا تنطق دیکھنے میں آیا ہے۔ ہوبش کے خیال میں جینیاتی تسلسل اور جینز کی ترتیب نے اپنا کام پہلی مرتبہ اسی انداز میں شروع کیا ہو گا۔

کیمیادان اے جی سمتھ (گلاسگو یونیورسٹی) نے ایک قدیم نظریئے اور عقیدے کی سائنسی توجیح کی ہے۔ اس کی تحقیق ہے کہ زندگی کی ابتداء مٹی سے ہوئی چنانچہ آر این اے کے بجائے بنیادی اکائی مٹی کو قرار دیا جانا چاہئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آر این اے بذات خود مٹی کے سادہ مگر مسلسل کیمیائی تغیر سے بننے والی ارتقاء یافتہ شکل ہے۔ سمتھ کا کہنا ہے کہ مٹی سلی کون، ایلومینیم، آکسیجن اور ہائیڈروجن کی قلموں سے بنی ہے۔ جس لمحے یہ قلمیں جسامت میں بڑھ رہی ہوتی ہیں تو اتفاقاً سلی کون کی جگہ ایلومینیم آجاتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں برقی چارج کے زیر اثر جینیاتی ترتیب پیدا ہو جاتی ہے۔ ایمس ریسرچ سنٹر کے جیمز لالس نے اس ضمن میں کہا ہے کہ برقی چارج کے زیر اثر ذرات مل جاتے ہیں تو مٹی کی خشک سطح پر نمی نمودار ہو جاتی ہے۔

موسمی تغیر کے دوران ماحول سے توانائی کا مٹی میں انجذاب یا اخراج ہوتا رہتا ہے۔ شاید ایسی تبدیلیوں کے دوران نامیاتی مالیکیولوں کی داغ بیل پڑی ہو یہ مالی کیول مٹی کے ماحول میں نمو پاتے رہے اور ایک مرحلے پر ڈی این اے وجود میں آگیا ہو اور زندگی کا ارتقائی سفر شروع ہو گیا ہو۔[8]

المختصر زندگی کے متعلق بنیادی معمہ یہ ہے کہ زندگی کرہ ارض سے باہر سے آئی یا یہیں پیدا ہوئی یا بیک وقت دونوں طریقوں سے آغاز ہوا۔ یہ ابھی تک غیر یقینی ہے۔ شاید ماہر ارتقاء سمپسن نے اپنی تصنیف Meaning of Evolution میں ٹھیک ہی کہا تھا "زندگی کی ابتداء کیسے ہو گئی؟ نہایت دیانت داری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں..... اس معمہ کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کے قریب پہنچا جا رہا ہے..... لیکن اس معمہ کا آخری نقطہ (یعنی زندگی کا نقطہ آغاز) وہ مقام ہے جو سائنس کے انکشافات کی دسترس سے باہر ہے اور شاید انسان کے حیلہ ادراک ہی سے باہر۔"

# خلائی مخلوق کی تلاش

رات کے وقت آسمان کے چمکتے ہوئے تاروں کی طرف ٹکٹکی باندھے کتنے ہی لوگ ہوں گے جن کے ذہن میں یہ بات آئی ہو کہ کیا معلوم دور کہیں کسی سیارے پر زندگی اپنی کسی شکل میں جلوہ گر ہو۔

صدیوں سے قدیم اقوام کی روایات سے ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہم اس عظیم کائنات میں تنہا نہیں ہیں یہ تو دیو مالا سے متعلق ہے۔ لیکن مذہبی صحیفے بھی اس کا اشارہ دیتے ہیں۔ خود قرآن مجید میں بیان ہے۔

"اور اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے ارض و سماوات کی تخلیق کی اور ان دونوں میں جاندار مخلوق کو پھیلا دیا۔ اور وہ

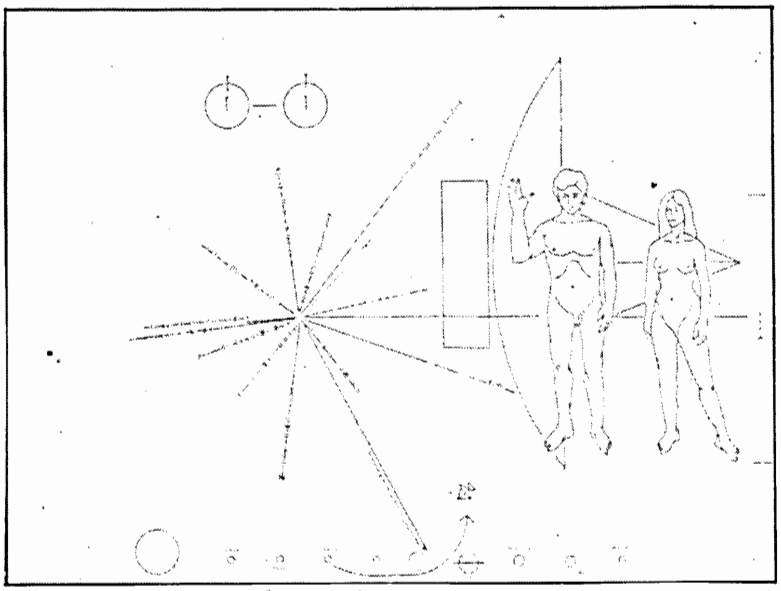

1972ء میں بھیجے گئے خلائی جہاز پر بنائی گئی اشکال

(اللہ) اس پر قادر ہے کہ جب چاہے انہیں آپس میں ملا دے" (۴۲/۲۹)

اس وسیع کائنات میں ان گنت آسمانی اجسام ہیں جن میں سے بہت کم کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں۔ کیا ایسا ہونا ناممکن ہے کہ کسی ستارے کے سیارے پر وہی حالات پیدا ہوئے ہوں جو زمین پر پیدا ہوئے تھے۔ جنہوں زندگی کی داغ بیل ڈال دی؟ یقیناً ایسا ہونا ناممکن نہیں بلکہ بہت امکان ہے کہ وہاں ارتقاء کے بعد انسان جیسی یا اس سے کم یا زیادہ ذہین مخلوق بھی ہماری طرح کائنات میں زندگی کی متلاشی ہو (بلکہ اس کا سراغ لگا چکی ہو)۔

ایسی ذہین مخلوق کے نظریئے کو ذہن میں رکھتے ہوئے انسان نے اس سے رابطے کی خاطر مختلف کوششیں کیں۔ فرانسیسی موجد چارلس کراس کا ارادہ تھا کہ ایک بہت بڑا آئینہ بنایا جائے اور اس سے چکا چوند پیدا کی جائے تاکہ مریخ کی مخلوق کو انسان کے وجود کی خبر ہو جائے۔ ایڈیسن کے کارکنوں نے بھی دس میل پر محیط بلبوں سے ایک سلسلہ بنانے کا منصوبہ پیش کیا جسے دس منٹ کے وقفوں سے جلایا یا بجھایا جانا تھا تاکہ مریخ کے باسیوں کو خبر ہو جائے۔ تاہم دونوں منصوبوں پر عملدر آمد نہ ہو سکا۔[9]

۱۸۹۸ء میں جب مشہور سائنس فسانوں کے خالق ایچ جی ویلز کی تصنیف "وار آف دی ورلڈز" منظر عام پر آئی۔ تو اس سے خلاء میں ذہین مخلوق کی تلاش کے بارے میں ایک اور رویہ ظاہر ہوا۔ عوامی سوچ یہ تھی کہ بہت ممکن ہے کہ کہیں دور کوئی مخلوق ہمارے اشاروں کو دیکھ کر ہماری طرف آ جائے اور آنے والے دشمن بن کر آئیں اور سیارے پر قبضے کی خاطر نوع انسان کے خاتمے سے بھی دریغ نہ کریں لہٰذا ایسی صورت حال جیسا کہ ویلز کے ناول سے ظاہر ہوتی تھی کہ مریخی مخلوق کرہ ارض پر حملہ آور ہو کر انسانوں کا تیا پانچا کر دیتی ہے، سے بچنے کے لئے اس سے رابطے کی کوشش ترک کر دینی چاہئے۔ اس سلسلہ میں اس فرانسیسی پبلشر پر بھی بہت دباؤ ڈالا گیا جس نے اعلان کیا تھا کہ جس نے کسی غیر زمینی مخلوق سے رابطہ قائم کیا اسے ایک خطیر رقم بطور انعام دی جائے گی۔ لیکن مریخی مخلوق سے رابطہ اس پیش کش سے مستثنیٰ ہے کیونکہ یہ بالکل قریب واقع ہے اور اس سے رابطہ زیادہ دشوار نہ ہو گا۔

ایک خیال ہے کہ ریڈیو اور ٹی وی کے سگنل خلاء میں دور تک جاتے ہوئے گو کمزور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن امکان ہوتا ہے کہ کہیں انہیں وصول کر لیا جائے ادھر خلاء سے آنے والے سگنلوں کو وصول کرنا بھی ایک مسئلہ ہے۔ فرض کریں ایک ذہین مخلوق ہماری طرح سگنلوں کے ذریعے رابطے کی کوشش میں مصروف ہے تو ہمیں کیا معلوم کہ وہ کس فریکوئنسی پر رابطے کی کوشش کر رہی ہے پھر پورے سیارے پر تمام ریڈیو اسٹیشن مخصوص فریوئنسی پر سگنل بھیجتے اور وصول کرتے ہیں تاکہ ایک دوسرے کی نشریات آپس میں الجھ نہ جائیں۔ ان لاکھوں سگنلوں میں سے ایک خلائی مخلوق کا سگنل تلاش کرنا از حد دشوار ہے۔

۱۹۴۳ء میں ڈچ فلکیات دان ہینڈرک کرسٹوفل وان ڈین ہلسٹ نے اس سلسلے میں کہا کہ ہائیڈروجن جو سادہ ترین عنصر ہے کاایک ایٹم توانائی کی سطحی تبدیلی کے دوران ۲۱ سم طویل طول موج کے ریڈیو سگنل خارج کرتا ہے۔ ایٹمی طبیعیات اور ریڈیو سگنل سے واقفیت رکھنے والی کوئی بھی تہذیب کائنات میں سب سے زیادہ پائے جانے والے اس عنصر کے طول موج کے سگنل ارسال کرے گی۔

اس بنیاد پرویسٹ ورجینا (امریکہ) میں ۱۹۶۰ء میں ایک سائنس دان ڈاکٹر فرینک ڈریک نے دعویٰ کیا کہ جب اس نے ۸۵ فٹ قطر کے انٹینا کا رخ طاؤ سیٹی اور ایپسیلون ایری دانی کے ستاروں کی جانب کیا جو ہم سے قریب ترین (گیارہ نوری سال دور) واقع ہیں تو وہاں سے اسے ریڈیو سگنل موصول ہوئے۔ (اس تجربے کو "اوزما" کانام دیاگیاجوایک تصوراتی سرزمین "اوز" کے نام سے لیاگیاتھا) لیکن ڈریک کے اس دعویٰ کی کوئی زیادہ اہمیت محسوس نہیں کی گئی کیونکہ ڈریک اس بارے میں مزید وضاحت پیش کرنے سے قاصر رہا تھا تاہم اس نے ایک اور منصوبے پر کام کرتے ہوئے ایک مساوات پیش کی۔

1Fi Fc L e F N:RFp N

جس کے مطابق ہم "N" یعنی کائنات میں پائی جانے والی ذہین تہذیبوں کی تعداد کااندازہ لگا سکتے ہیں لیکن اس مشکل مساوات کی صرف پہلی مقدار کی قیمت کا تعین ہو سکا ہے۔ (10)

ڈریک کی سرکردگی میں ۱۹۷۲ء میں ایک ایسا خلائی جہاز چھوڑا گیا جس کے ایک جانب زمین کا خلاء میں مقام، مرد عورت کی تصویر جس میں مرد ہاتھ بلند کئے گویااستقبال کر رہاہےاور رابطے کے لئے ہائیڈروجن کی طول موج درج ہے۔ اس منصوبے جسے پائنیر پراجیکٹ کانام دیاگیاتھا کامقصد یہ تھا کہ اس خلائی جہاز کو دیکھ کر ذہین خلائی مخلوق ہم سے رابطے کی کوشش کر سکے۔ عملے کے اراکین چار برس تک اس کے ذریعے ریڈیائی پیغامات نشر کرتے رہے لیکن جواب نہ ملا اور جہاز کاعمیق خلاؤں میں سفر جاری رہا۔ لیکن رڈیاتھ نامی مصنف کے مطابق یہ سب اس وقت اکارت جائے گاجب کوئی ذہین مخلوق مرد کا بلند ہاتھ دیکھے گی وہ اسے خبردار اور دور رہنے کااشارہ سمجھے گی جیسا کہ مصنف کا بیان ہے کہ پنجرے میں بند بندروں کے قریب ہاتھ بلند کرنے سے وہ خوفزدہ ہوتے ہوئے دور ہٹ گئے مبادا مصنف ان پر حملہ آور ہو رہا۔

۱۹۷۷ء میں وائجر خلائی کیپسول پر دو عدد ویڈیو ڈسکس خلاء میں بھیجی گئیں جن پر بیسویں صدی کا طرز زندگی دکھایا گیا ہے۔ پرندوں اور جانوروں کی آوازوں کے علاوہ ۵۵ مختلف انسانی زبانوں میں امن کے کلمات درج ہیں۔ لیکن بہت وقت لگے گاجب یہ جہاز نظام شمسی کو پار کر پائے گا اور دوسری کہکشاؤں میں داخل ہو گا۔

تحقیق اور جستجو جاری ہے۔ امریکہ کے ایک ادارے "سرچ فار ایکسٹرا ٹیریسٹریل انٹیلی جنس" جسے عرف عام میں سیٹی SETI کہا جاتا ہے ناسا کی امداد سے میٹا نامی پراجیکٹ کے لئے ۸۰ فٹ کی ریڈیو ٹیلی سکوپ تیار کرائی ہے۔ جس کے ذریعے خلاء میں آنے والی غیر معمولی موجوں کا تجزیہ کیا جاسکے گا۔ سوٹ کیس نامی آلہ خودکار طریقے پر ریڈیو بینڈ کی ۱۲۸۰۰۰ اور میٹر چینل جو ۸۰۴ ملین دھاریوں کا تجزیہ کر سکتا ہے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

یہی ادارہ ۱۹۹۲ء میں ایک سات سالہ منصوبہ شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس دوران ایسے آلات استعمال کیے جائیں گے جو ۷۰۰۰۰ ریڈیو چینل شناخت کر سکیں گے اور جدید ترین کمپیوٹر استعمال ہوں گے۔

کیازمین سے الگ کائنات میں زندگی کے سراغ کی تلاش ایک لاحاصل اور احمقانہ تصور ہے؟ کہا نہیں جاسکتا۔ کیاان دس ملین کہکشاؤں میں سے کسی بھی کہکشاں (جن میں سے بعض چار چار سو ملین ستاروں پر محیط ہیں) کسی کے سیارے پر زندگی کا تصور محال ہے؟ سائنس کا بیان ہے کہ صرف ہماری کہکشاں کے پانچ فیصدی ستاروں کے ذیلی سیارے جن کی تعداد لاکھوں میں پہنچتی ہے زندگی کے وجود کے امکان کے حامل ہیں۔ اور ان تک رسائی ............ ہم شاید اتنا طویل انتظار نہ کر سکیں۔

# ڈائنوسورز کیوں ختم ہو گئے؟

ڈائنوسورز کے معانی ہوتے ہیں خوفناک چھپکلی یہ اصطلاح ۶۳ سے ۲۳۰ لاکھ سال قبل کے میسوزوئک عہد کے رینگنے والے جانوروں کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جن میں سے کچھ تو قد میں ایک معمولی چوزے کی جسامت کے اور بعض ایک ۹۰ فٹ سے زائد طویل اور ۵۰ ٹن سے زیادہ وزنی ہوتے تھے اور دنیا کے تمام علاقوں سے ان کے شواہد مل چکے ہیں۔

سوال جس نے بہت عرصے سے سائنس دانوں کو پریشان کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اتنے بڑے اور بھاری بھرکم، بے پناہ قوت کے مالک حیوانات آخر کیوں صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور اتنی بڑی پوری پوری نسلوں کی تباہی کے اسباب کیا ٹھہرے؟

مختلف ادوار میں مختلف جوابات دیئے جاتے رہے اور ان کا انکار ہوتا رہا کہ یہ کلی طور پر ان کے خاتمے کی وجہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً خیال یہ تھا کہ چونکہ ان کے جسم بہت بڑے اور سر بہت چھوٹے تھے۔ لہٰذا ناکافی دماغ ان کے خاتمے کا سبب ٹھہرا، ذہانت کی کمی نے انہیں نابود کر دیا یا ارضیائی تغیر و تبدل بڑے پیمانے پر واقع ہوئے ہوں گے تو پانی سے نئی زمینیں نمودار ہوئیں ہوں گی اور پانی اکثر علاقوں سے خشک ہو گیا ہو گا۔ سبزہ خشک ہو گیا ہو گا۔ پس بڑے ڈائنوسور وافر غذا کی دستیابی نہ ہونے کے سبب ختم ہوتے چلے گئے۔ تاہم چھوٹے ڈائنوسور مزید چند لاکھ سال تک باقی رہے۔ غذا کی کمیابی سے سبزہ خور ختم ہوئے اور یوں گوشت خوروں پر بھی زندگی تنگ ہو گئی ہو گی۔

ایک اور غیر معمولی مشاہدہ یہ ہے کہ اگرچہ عموماً حیوانات کی نسلیں، مخالفین کی آمد کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ گھٹتی ہوئی آخر کار ختم ہو جاتی ہیں لیکن رینگنے والے ان جانوروں کی نسل جس میں کئی اقسام کے حیوانات کی کئی ہزار تعداد ہو گی یکایک مکمل طور پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور معدوم ہونے کا سلسلہ وقت کے اتنے قلیل عرصے پر محیط ہے کہ بجا طور پر جغرافیائی اور ارضیاتی تغیر اور تبدل کو اس خاتمے کا واحد ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے۔ کیونکہ یہ تبدل باقاعدگی سے اور مقامی طور پر اثر انداز ہوئے۔

ایک اور خیال موسمی تغیر کو اس کا ذمہ دار بتاتا ہے کہ ممکن ہے ارضیاتی تغیر کے ساتھ موسموں میں تبدیلی واقع ہوئی ہو۔ ڈائنوسور سرد خون والے حیوان تھے۔ لہٰذا جسمانی درجہ حرارت تبدیل نہ کر سکنے کے سبب سرد موسم کو برداشت نہ کر پائے اور ختم ہو گئے ہوں گے۔

ایک خیال کسی شدید قسم کی بیماری کے پھیلنے کا ہے۔ جس نے پورے کرہ ارض پر پھیل کر ان عظیم الجثہ حیوانات کو ختم کر ڈالا۔ یا پھر ممالیہ ان کی تباہی کے ذمہ دار ٹھہرے ہوں گے۔ یہ دودھ پلانے والے حیوان اگرچہ اس دور میں آج کی بلی سے زیادہ بڑے نہ ہوں گے۔ لیکن ممکن ہے کہ شروع جیسے چھوٹے کسی ممالیہ نسل کے حیوان کو ان بڑے رینگنے والے جانوروں کے انڈے پھوڑ کر کھانے کا چسکا لگ گیا ہو۔ کیونکہ یہ خزندے (رینگنے والے حیوان) اتنے بے پرواہ ہوتے تھے کہ انڈے دے کر چھوڑ دیتے تھے۔ گو ابتدائی لاکھوں برس کے دوران درجہ حرارت مستقل رہنے کے سبب انڈوں سے بچے نکل آتے ہوں گے لیکن بعد ازاں موسمی تغیر نے انڈے خراب کرنے شروع کر دیئے اور رہی سہی کسر ممالیہ جانوروں نے انڈے کھا کر پوری کر دی۔

امریکا کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر لوئس الوریز اٹلی سے لائی گئی کیچڑ کی ایک تہہ پر یونیورسٹی آف کیلے فورنیا میں ۱۹۷۴ء میں کام کر رہے تھے۔ انہیں ایک عجیب بات معلوم ہوئی۔ اس مٹی میں عنصر اریڈیم موجود تھا لیکن عمومی سطح سے ہٹ کر ۳۰ گنا زیادہ! کیوں؟

ڈاکٹر لوئیس الوریز اور ان کے بیٹے والٹر نے اس نایاب عنصر کو بنیاد بنا کر ایک نظریہ ۱۹۸۰ء میں پیش کیا اور ۱۹۸۳ء میں اس کی دوسروں کی جانب سے کچھ توثیق ہوئی۔ بعد ازاں اسے لوئس والٹر نظریات کہا جانے لگا۔ اس نظریئے کے مطابق ۶۵ ملین سال پہلے خلا سے آنے والی کوئی چٹان (Meteor) کبھی زمین سے آ ٹکرائی جس سے زبردست گرد و غبار اٹھا اور فضا میں چھا گیا اور چند سالوں بعد جب مطلع صاف ہوا تو کئی حیوانات کی انواع ہی مٹ چکی تھیں۔[11]

زمین پر آج تک ۲۰۰ بڑی چٹانیں ریکارڈ ہوئیں ہیں جن میں سے کچھ کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ اس اعتبار سے پوری نسل مٹا دینے والے کائناتی پتھر کا سائز اتنا بڑا ہونا چاہئے کہ اس کا پیدا کردہ گڑھا کم از کم ایک میل گہرا اور کئی میل چوڑا ہو۔ لیکن کوئی ایسا گڑھا خشکی پر نظر نہیں آیا۔ ثانیاً اریڈیم کی شدید بوچھاڑ جو ہیروشیما پر گرنے والے کروڑوں ایٹم بموں کے برابر توانائی خارج کرتی ہو گی اس سے تو کوئی جاندار باقی نہ بچنا چاہئے تھا لیکن حیوانات بچے رہے جبھی تو

آج کی دنیا اتنے حیوانات سے بھری پڑی ہے۔

ڈاکٹر لوئس کے ساتھی فلکیات دان فریڈ وہپل نے اب ذرا سی ترمیم کر کے نظریہ کو قابل قبول بنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ بجائے خشکی پر گرنے کے اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ایسی چٹان پانی میں آگری تھی تب بہت ممکن ہے کہ شدید حدت کے عمل سے زمین کئی میل موٹے بھاپ کے ایک کمبل سے ڈھک گئی ہو گی اور گرنے کے مقام سے ابلتے پانی کی ایک لہر چلی ہو گی جس نے نباتات کے ایک بڑے علاقے پر سے گزرتے ہوئے انہیں ختم کر کے جانوروں کا خوراک کا ذخیرہ ختم کر دیا ہو گا۔ سمندروں کے گہرے سرد ترین حصوں کے حیوان اور خشکی کے بہت چھوٹے جسامت کے اور اعلیٰ تحول Metabolism. کا نظام رکھنے والے حیوانات بچ گئے ہوں گے۔(12)

رہا اس عظیم چٹان کا مسئلہ کہ وہ کہاں گئی اور اب بھی کسی (زیر آب ہی سہی) جزیرے کی شکل میں کیوں دکھائی نہیں دیتی؟ تو ڈاکٹر وہپل نے کہا کہ زمین کی اندرونی پلیٹوں کی حرکت، سے یہ چٹان پھسلتی چلی گئی اور شمالی یا جنوبی امریکہ تک بحرالکاہل کے اندر ہی اندر عام مواد کی طرح جا پہنچی اور وہاں دب کر رفتہ رفتہ زمین کے اندرونی پگھلے ہوئے مادے کے مرکز "کور" تک جا پہنچی اور اب بھی لاوے کی شکل میں باہر آتی ہو گی۔

لوئس والٹر نظریات کی ابتدا بڑی مخالفت ہوئی لیکن شکاگو یونیورسٹی کے ڈیوڈ راوپ اور سیپکوسکی نامی دو ماہرین رکازیات نے ایک نیا نظریہ دے کر ان نظریات کو سہارا دیا ہے۔

انہوں نے اپنے مشاہدات کی بنا پر یہ نظریہ پیش کیا کہ ایک دور جو ۲۶ ملین سال پر محیط ہوتا ہے اس کے خاتمے تک کئی نسلیں مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ ۲۶ ملین سال میں ہی کیوں؟ کس سست روعمل کے نتیجہ میں جو ۲۶ ملین سال کے عظیم عرصے میں تکمیل کو پہنچتا ہے۔ انواع کے خاتمے کا واقعہ وقع پذیر ہوتا ہے؟

اس سلسلے میں کئی توجیہات پیش کی گئیں جن میں سے ایک دسویں سیارے کو بنیاد بنا کر کی گئی ہے کہ نظام شمسی میں ہم پلوٹو کے بعد پائے جانے والے سیارے کو دریافت نہیں کر پائے ہیں جس کا نمبر دسواں بنتا ہے۔ اس سیارے کی قوت جاذبہ بالواسطہ انواع کی تباہی کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

ایک اور شہرت یافتہ توجیہہ "نیما سس توجیہہ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ نی. ماسس بھی دسویں سیارے کی مانند ایک فرضی فلکیاتی جسم ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہمارے سورج کا پڑوسی ستارہ ہے۔ لیکن اس لئے دریافت نہیں ہو سکا کہ یہ بہت تاریک ہے۔ اس کا مدار بیضوی۔ ہے۔ ۲۶ ملین سال بعد نی. ماسس ہمارے نظام شمسی کے نزدیک ہوتا ہے۔ اس موقع پر وہ پلوٹو کے گرد بادل کی صورت میں موجود شہاب ہائے ثاقب کو اپنی قوت جاذبہ سے کشش کرتے ہیں۔ اور یہ شہاب ثاقب تیزی سے بڑھتے ہوئے راستے میں زمین سے ٹکراتے ہیں۔ اور شاید ایسا ہی کوئی شہاب ثاقب زمین سے ٹکرایا ہو جسے لوئس اور والٹر نے اپنے نظریئے کی اساس ٹھہرایا ہو۔(13) یہاں ایک بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ نایاب عنصر اریڈیم کی شہاب ثاقب اور سطح ارضی میں مقدار کا شماریاتی موازنہ ہی ڈاکٹر لوئیس کے لئے ڈائنوسور کی بربادی کا نظریہ پیش کرنے کا سبب بنا جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ ادھر بعض مقامات سے جو ڈائنوسور عہد کی زمینی سطحیں زیر مشاہدہ ہیں وہاں بھی اریڈیم کی غیر معمولی مقدار لوئس والٹر نظریات کو تقویت دے رہی ہے۔ لیکن شماریاتی بنیادوں پر ہی ثبوت فراہم کئے جا رہے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں کہ یک لخت تمام کرہ ارض پر جانوروں کی نسلیں نابود ہو جائیں۔

یہ بات بھی ابھی تک واضح نہیں کہ معدومی کا شکار مخصوص نسلیں ہی کیوں ہوئیں؟ معدومی کا یہ واقعہ Cretaceous عہد میں پورے کرہ ارض کی سطح پر وقوع پذیر ہوا۔ یہ واقعہ پانی اور خشکی ہر دو جگہ پر نباتات اور حیوانات کی خاص خاص انواع کے ساتھ پیش آیا جبکہ بعض بڑی جسامت کی نسلیں اس کے اثر سے بچ نکلیں۔(14) معلوم ہوا ہے کہ ڈائنوسورز کے آخری امور، عہد حاضر کے بڑے جانوروں کے ساتھ مشترک تھے۔ پھر کیا سبب ہوا کہ معدومیت کے شکنجے میں مخصوص قدیم حیوانی نسلیں ہی جکڑی گئیں ـــــ یہ قدرت کا ایک بڑا معمہ ہے۔

# زندہ رکاز اور زندہ مدفون مخلوق

رکاز یا فاسل کسی زندہ جسم کے آثار ہوتے ہیں جو کلی یا جزوی طور پر اس کی شکل کو ظاہر کرتے ہیں یہ کئی شکلوں میں ملتے ہیں۔ بعض لاکھوں سال تک دبے رہنے کے سبب پتھرا جاتے ہیں۔ جنہیں متحجرات کہتے ہیں (حجر۔ پتھر) عموماً ڈائنوسور کی شناخت انہی رکاز کی بدولت ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دور قدیم یا جدید کا کوئی حیوان کسی جگہ دبا پڑا ہو اور اس میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہوں؟ بظاہر ناممکن سی بات ہے اور باوجود اس کے کہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن تردید بھی ممکن نہیں۔

۱۷۶۱ء میں پیرس سے شائع ہونے والے سائنسی رسالے "دی اینول رجسٹر The Annual Register میں زمین کی کھدائی کے دوران ملنے والے کئی ایسے حیوانات جن میں زندگی کے آثار تھے اور جو بہت پہلے سے معدوم تصور کیے جاتے تھے کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس رسالے میں فرانس کے شاہ ہنری سوم کے درباری جراح ایمبرائز پیئر کا واقعہ درج ہے۔ جس میں اس نے بتایا ہے کہ پیرس سے باہر میوڈن میں وہ اپنے باغ میں مزدوروں کے پتھر توڑنے کے کام کی نگرانی کر رہا تھا کہ ایک پتھر میں اسے ایک بہت بڑا زندہ ٹوڈ دکھائی دیا۔ جس کے ارد گرد دیکھنے سے پتہ نہ چل سکا کہ آیا کوئی سوراخ ہے جہاں سے یہ ٹوڈ اندر داخل ہوا ہو۔ یہ سولہویں صدی کا واقعہ ہے۔

اسی رسالے میں بتایا گیا ہے کہ فرانس کے بحیرہ روم کے ساحل پر واقع ہاربر پر مزدور لوگ اکثر چونے کے پتھر توڑ کر ان میں خولدار مچھلی نکالتے ہیں جو حیرت انگیز طور پر تازہ اور لذیذ ہوتی ہے۔

مینڈکوں کے نکلنے کی خبریں اتنی تعداد میں اور بادثوق ذرائع سے ثابت ہونے لگیں تو سائنس دانوں نے بھی باقاعدہ تجربات شروع کر دیئے۔ ۱۸۲۵ء میں ویسٹ منسٹر کے ڈین ڈاکٹر فرینک بک لینڈ نے ۱۲ عدد ٹوڈ مینڈک گھر میں بنائے ہوئے ریت کے پتھر اور چونے کے پتھر کے سانچوں میں ڈال کر کچھ کو شیشے کی چادر سے ڈھکا اور باغ میں ۳ فٹ نیچے دفن کر دیا۔

ایک سال بعد دیکھا گیا تو ریت کے پتھر میں بند تمام ٹوڈ مر چکے تھے۔ جب کہ شیشے کے نیچے رکھے گئے نہ صرف زندہ تھے بلکہ ان میں سے دو موٹے بھی ہو گئے تھے۔ تاہم دوبارہ اور زیادہ احتیاط سے دہرائے جانے پر یہ تجربہ بھی ناکام رہا۔ دراصل پہلے تجربے میں شیشے کی چادر ٹوٹ گئی تھی اور بہت ممکن تھا کہ اس کے ذریعے کیڑے مکوڑے اندر جا کر مینڈکوں کی خوراک بنتے رہے ہوں۔ (15)

اس کے بعد کافی عرصہ تک بڑے ظالمانہ طریقے پر تجربات جاری رہے جیسے ۲۳ ستمبر ۱۸۶۲ء کے دی ٹائمز The Times کی اشاعت میں فرانسیسی تجربہ کرنے والے کا واقعہ درج ہے۔ جس نے ۲۰ عدد ٹوڈ پلاسٹر آف پیرس میں بنے ہوئے ہوا بند خانوں میں ڈال کر زمین کی گہرائی میں دفن کر دیئے اور ۱۲ سال بعد ان میں سے چار زندہ اور صحت مند حالت میں پائے گئے۔

اس عہد کے اخلاقی حلقوں میں اس امر کی شدید مذمت کی گئی اور بک لینڈ کے بیٹے نے دی ٹائمز میں ۱۸۵۱ء کی بڑی نمائش کے ڈائریکٹرز کو خط لکھا جو اس وقت ویلز سے ایک کان سے ملنے والے کوئلے کے ٹکڑے سے نکلنے والے زندہ ٹوڈ بطور ثبوت نمائش کرنے والے تھے۔

اگرچہ زندہ دفنانے کے اذیت ناک تجربے تو ختم ہو گئے تاہم چٹانوں سے اور زمین کی تہوں سے زندہ جانوروں کے نکلنے کا سلسلہ بند نہ ہوا۔ مثلاً اکتوبر ۱۸۶۲ء میں لنکن شائر کے مقامی اخبارات میں زمین کے ۷ فٹ نیچے ایک تہہ سے زندہ ٹوڈ کے نکلنے کا واقعہ شائع ہوا۔ ۳ سال بعد دو سو ملین سال پرانی مگنیشیم اور چونے کے پتھر کی ۲۵ فٹ گہرائی میں ایک تالاب کی کھدائی کے دوران پائی جانے والی چٹان سے فورمین جیمز بیل کو زندہ ٹوڈ ملا جس کی رنگت چٹان کی رنگت جیسی ہی تھی۔ ابتداً اسے سانس لینے میں مشکل پیش آئی تاہم پھر کچھ دیر بعد اس کی رنگت بھی معمول کے مطابق ظاہر ہو گئی افسوس کہ یہ صرف دو دن تک مزید زندہ رہا۔

لیکن سب سے زیادہ حیرت ناک اور پیچیدہ واقعہ اس سے بھی پہلے یعنی ۱۸۵۶ء کا ہے۔ شمال مشرقی فرانس کے علاقے جورا میں ریلوے لائن بچھانے کے دوران پہاڑی علاقے میں انجینئرز کو جیوراسک عہد کی ایک عظیم چٹان کا سامنا کرنا پڑا۔ دھماکہ خیز مواد استعمال کر کے چٹان توڑ دی گئی۔ گرد و غبار بیٹھ گئی تو مزدور

سامان لے کر آگے بڑھے تاکہ ٹوٹی چٹان کو لاد کر دور پھینک آئیں لیکن اچانک سب گھبرا کر واپس بھاگ آئے۔

چٹانی دراڑ سے بطخ کی جسامت کا ایک سیاہ پرندہ نکل رہا تھا اس کی ایک لمبی خوفناک چونچ سی تھی جس پر تیز دانت لگے ہوئے تھے اور اس کے اگلے بازوؤں کے درمیان ایک چمڑے کی جھلی گاڑھے تیل میں لت پت ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ پرندہ آہستہ سے تھرتھرایا اور اپنے پنکھ پھیلائے۔ اس نے اڑنے کی ایک ناکام سعی کی اور پھر مر گیا۔ کارکن اس کی لاش اٹھائے قریبی قصبے گرے کے عجائب خانے میں لے آئے جہاں ایک ماہر نے اسے دیکھتے ہی بتادیا کہ یہ زمانہ قبل از تاریخ کا رینگنے والے جانوروں کی نسل کا اڑنے والا حیوان ٹیروڈکٹائل ہے۔ ماہرین ارضی کے مطابق یہ تہہ ۱۵۰ ملین سال پہلے وجود میں آئی تھی۔

السٹریٹیڈ لندن نیوز Illustrated London News کے مطابق چٹان میں پرندے کا بنایا ہوا خلا موجود تھا۔ یوں نظر آتا تھا کہ جیسے پرندہ کیچڑ میں دفن ہو گیا جو بعد ازاں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سخت چٹانی شکل اختیار کر گیا اور پرندے کی شکل کا خلاء اندر باقی رہ گیا۔ لیکن وہ سانس کس طرح لیتا رہا اور اتنے طویل عرصے تک زندہ کیونکر رہا۔ غذا کہاں سے حاصل کرتا رہا اور سخت دباؤ جس نے چٹان بنا دی تھی اس سے پچک کیوں نہ گیا؟ (16)

۱۸۷۳ء میں سان فرانسسکو میں بلیک ڈائمنڈ نامی کان میں کھدائی کے دوران چٹان سے ایک اندھا زندہ مینڈک برآمد ہوا جس کی موجودگی کا نشان سخت چٹان میں موجود تھا۔ یہ صرف ایک دن زندہ رہ سکا اور اس دوران صرف ایک ٹانگ کو حرکت دیتے ہوئے زندگی کا ثبوت دیتا رہا۔ اس مینڈک اور چٹان کو سان فرانسسکو سائنس اکیڈیمی کے حوالے کر دیا گیا۔

۱۸۸۱ء کے اپریل کی ۲۲ تاریخ کو نواڈا (امریکہ) کی وائینڈ ویسٹ کان کے ایک ملازم نے پتھر توڑنے کے دوران چند کیڑے دیکھے جو بظاہر مردہ تھے۔ لیکن کچھ دیر بعد تقریباً سب "زندہ" ہو گئے۔ افسروں نے ان کیڑوں اور چٹان کے اس خول والے حصے کو جو انسانی مٹھی کی جسامت کا تھا کان کنی کے شعبے میں بھجوا دیا۔ جنہوں نے بعد ازاں اسے کارکنوں کی غلط فہمی پر محمول کیا۔

۱۸۸۲ء میں امریکہ میں ہی ایری زونا کی لوہے کی کان "لانگ فیلو" سے لوہے کی کچ دھات میں مردہ بھنورے پائے گئے جنہیں "ال پاسو" بھیج دیا گیا۔ جہاں ماہر طبقات الارض زیڈ ٹی وہائٹ نے انہیں سفید کاغذ پر جو ایک صندوق میں پڑا تھا رکھ دیا جہاں چند ہفتوں بعد ان میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے بلکہ خوردبینی مشاہدے کے دوران وائٹ نے ایک بھنورے کو سفید رنگت کا بچہ جنم دیتے دیکھا۔ یہ مخلوق کچ دھات کے ہمراہ سمتھ سونین انسٹی ٹیوٹ (واشنگٹن) بھیجی گئی جہاں اس کی کوئی توجیح نہیں پیش کی جا سکی۔

کیمبرج کے ایک سائنس دان ڈاکٹر ای ڈی کلارک کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ۲۷۰ فٹ کی گہرائی میں ان لوگوں نے بہت پرانے مردہ "سی ارچن" نامی بحری حیوان اور ۳ عدد چھوٹے نیوٹ حاصل کیے یہ سب چاک کی چٹان سے نکالے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے نیوٹ بڑی احتیاط سے علیحدہ کیے اور انہیں خشک کرنے کے لئے کاغذ میں لپیٹا اور دھوپ میں رکھ دیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ان میں حرکت پیدا ہوئی۔ دو تو کچھ ہی دیر بعد ختم ہو گئے جب کہ تیسرا متحرک رہا۔ ڈاکٹر نے اسے اٹھایا اور دیہ دیکھنے کے لئے کہ پانی میں اس پر کیا گزرتی ہے اسے آرام سے تالاب کے پانی میں رکھا جہاں وہ ڈاکٹر کی مٹھی سے تیزی سے پھسل کر آگے کو نکل گیا۔ کبھی نظر نہ آنے کے لئے، بہرحال کلارک کے پاس دو مردہ نیوٹ موجود تھے۔ اس نے مقامی تالابوں سے نیوٹ نسل کے تمام جانوروں میں سے ایک ایک حاصل کر لیا لیکن کوئی ایک بھی ان قدیم چانے دار نیوٹوں سے مشابہت نہیں رکھتا تھا۔

ڈاکٹر کلارک کے لیکچر سننے اور محفوظ شدہ نیوٹ دیکھنے کے بعد ایک ماہر حیاتیات رچرڈ کوبلڈ (کیمبرج) نے فخریہ طور پر اعلان کیا "یہ مکمل طور پر کسی ایسی معدوم نوع سے تعلق رکھتے ہیں جس کے بارے میں پہلے کچھ علم نہیں تھا۔" (17)

(دیکھئے "زندہ ڈائنوسار")

# AURA ہالہ نور

زمانہ قدیم سے روحیت کے ماہرین کا دعویٰ تھا کہ وہ زندہ اشیاء کے اردگرد روشنی کا ہالہ سا دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جو عام افراد کی نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی فرد کے گرد اس ہالہ کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر وہ اس کی صحت کی بابت پہلے سے بتا سکتے ہیں۔

ظاہر ہے روحیت کے ماہرین کی اس بات کو بہت عرصے تک جھٹلایا جاتا رہا مگر ۱۹۳۹ء میں کچھ ایسے چونکا دینے والے انکشافات ہوئے جنہوں نے اہل سائنس کو اپنا رویہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ دو روسی ماہرین Semyon اور Velentina Kirlian نے برقی فیلڈ میں مختلف زندہ اشیاء کی تصویر کشی کے تجربات شروع کیے تو یہ راز کھلا کہ ان تصاویر میں اجسام کے کناروں پر سے نور سا پھوٹتا دکھائی دیتا ہے۔ اور تو اور بدلتے ہوئے مزاج اور کیفیت کے ساتھ ساتھ نور کی کرنوں کی رنگت میں بھی تبدیلی آتی دیکھی گئی۔ یہ ایک نئی دریافت تھی۔

آج اس طریقہ کار کو "کرلیانی تصویر کشی" کہا جاتا ہے۔ گو دنیا بھر میں اس امر کی شہرت ہو چکی ہے۔ مگر اب تک ان روشنی کے ہالوں کی حقیقت سے پردہ نہیں اٹھا کہ ان کی نوعیت اور اصل منبع کیا ہے؟ یہ طے ہے کہ یہ روشنیاں زندہ اجسام سے مخصوص ہیں کیونکہ پتھر اور مردہ اجسام کے گرد یہ نہیں پائی گئیں۔

بعض کا دعویٰ تھا کہ یہ محض برقی اثرات کا تماشہ سا ہے۔ مگر فی الحقیقت جب گلاب کے ایک پتے کی تصویر اتار کر اس کا ایک حصہ توڑ کر فوراً دوبارہ تصویر کشی کی گئی تو دیکھنے میں آیا کہ ٹوٹے ہوئے حصے کے مقام پر بھی روشنی کے ہلکے سے خطوط اصل شکل کی نشاندھی کر رہے ہیں۔ پھر یہ ہالہ نور تازہ تازہ مرے ہوئے اجسام کے گرد بھی نسبتاً ہلکی سی روشنی کی صورت میں موجود رہ کر غائب ہو جاتا ہے۔

کیا یہ ہالہ نور قوت حیات کی موجودگی کی علامت ہے؟ جو زندہ اجسام میں موجود رہتی ہے اور ان اجسام سے کچھ کچھ باہر کو نکل رہی ہوتی ہے؟

جہاں تک انسان میں برقی اثرات کا تعلق ہے تو امر واقعہ ہے کہ اعصاب اور خلیات میں برقی نظام جاری و ساری ہے اور اس بنیاد پر کسی ایسے برقی فیلڈ کی موجودگی حیران کن نہیں جو خلیاتی سطح پر آنے والی خراب تبدیلیوں کی نشاندہی بدلتی رنگت کے حوالے سے کرے۔ مگر قوت حیوانیہ کے مدعین کا اصرار ہے کہ ہالہ نور بلاشبہ قوت حیات کی موجودگی کی نشاندہی کرتی ہے (دیکھئے روح)۔

طب کی دنیا میں ہالہ نور کی دریافت کئی تبدیلیاں لائی۔ تحقیقاتی میدان میں اس پر سنجیدگی سے کام ہوا۔ انیسویں صدی میں انسانی ہالہ نور پر کام کرتے ہوئے شعبہ طب سے منسلک افراد نے بڑی کار آمد معلومات فراہم کیں۔ مثلاً ۱۸۸۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر چارلس فیر .DF.Charles Fere نے اعتناق

ہالہ نور

پتے کا ایک حصہ توڑنے کے فوراً بعد لی گئی تصویر

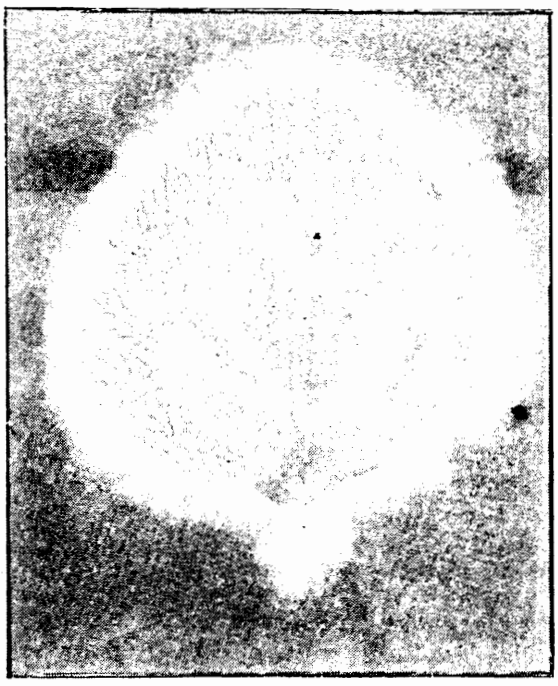

ہالہ نور

الرحم کے مریض کے سر اور ہاتھوں کے گرد نارنجی روشنیوں کا ہالہ مشاہدہ کرنے کی رپورٹ دی۔

مگر اس کے ساتھ ہی طبی دنیا میں نت نئے غیر مصدقہ طریقہ ہائے علاج کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ مثلاً ۱۹۶۰ء کی دہائی میں Somatography کا طریقہ متعارف ہوا۔ جس میں نام و نہاد ماہر مریض کی تصویر کے ہالہ پر مساج کر کے گویا بیماری کا تدارک کرتا یا پھر مریض کے بدن سے کچھ فاصلے پر ہوا میں ہی ہاتھ پھیرا جاتا۔[18]

علوم مخفی کے ماہرین اور مذہبی سکالرز بھی اس سلسلے میں پیچھے نہیں رہے۔ عیسائی علماء کے خیال میں مذہبی تصاویر میں مقدس ہستیوں کے سروں کے گرد آرٹسٹ جو روشن دائرہ بنا کر ان کے تقدس کا اظہار کرتے ہیں یہ فی الحقیقت اس ہالہ نور کی علامت ہوتی ہے۔ یہ گویا زمانہ قدیم کے "صاحب نظر" لوگوں کے بیان کے مطابق آرٹسٹوں کی فن کاری ہے۔ کیونکہ مذہبی تصاویر میں سر کے گرد ہالہ بنانے کی روایت عیسیٰؑ سے پہلے کے دور سے چلی آ رہی ہے۔

ماہرین علوم اشراق کا دعویٰ ہے کہ ہالہ نور کسی فرد کے بدن سے باہر ایک اور نورانی جسم "جسم اثیری" ہے۔ اور جو لوگ اس پر قابض ہو جائیں وہ باہر از جسم مشاہدات کی اہلیت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

# روشن اور آتشیں گولے

۲۴ سالہ نوجوان غسل خانے میں کھڑا تھا باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ یکایک ایک چمکتا ہوا گولہ سا کھڑکی کے راستے غسل خانے میں داخل ہوا۔ نوجوان کے پیروں کے گرد چکر لگائے اور پھر اچک کر ہاتھ دھونے کے بیسن میں اتر گیا اور اچانک بغیر کسی آواز کے نظروں کے سامنے غائب ہو گیا۔

یہ واقعہ Rev.John Henry Lehn کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں پیش آیا۔ وہ روشن گیند نامعلوم کہاں سے نمودار ہوئی تھی۔ اس کی جسامت گریپ فروٹ جتنی ہو گی اور اس سے زرد رنگ کی روشنی نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ روشن گیند غسل خانے کی کھڑکی کی جالی میں سے اس طرح گزر کر کمرے میں داخل ہو گئی تھی کہ جیسے اس کے راستے میں کچھ بھی نہ ہو کھڑکی کی جالی کو کوئی نقصان نہیں ہوا اور نہ ہی ہنری کی ٹانگوں کو اس وقت تکلیف ہوئی جس وقت یہ گولہ ان کا طواف کر رہا تھا۔ گویا یہ سرد قسم کی روشنی کا گولہ تھا لیکن یہیں ہاتھ دھونے کے بیسن کے کاگ کی فولادی زنجیر پگھل کر ٹوٹی پڑی تھی۔ ایک طرف تو جالی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دوسری طرف گولے کی حدت نے فولاد کو پگھلا دیا۔ کیا عجیب تضاد تھا؟[19]

عینی شاہدوں کے مطابق یہ روشن گولے چند انچ سے لے کر کئی کئی فٹ قطر کے ہو سکتے ہیں ان کی رنگت سفیدی مائل اور آتشیں سرخ ہوتی ہے۔ بعض اوقات سبز اور دوسرے رنگوں میں بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ اکثر یہ ایک دھماکہ کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایک دم سے بغیر کوئی اثر چھوڑے اس طرح اوجھل ہو جاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ یہ ہوا کے خلاف بھی اڑ سکتے ہیں۔ بسا اوقات ان سے ہلکی سی بھنبھناہٹ کی سی آواز سنائی دیتی ہے اور جب گزر جائیں تو گندھک کی بو محسوس ہوتی ہے۔ یہ چند لمحوں سے لے کر کئی کئی منٹ تک موجود رہتے ہیں۔

سب سے حیران کن بات جو عینی شاہدوں نے بیان کی ہے، یہ ہے کہ یہ گولے اپنی مرضی سے حرکت کرتے ہیں۔ جیسے انہیں سوجھ بوجھ ہو کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ نامعلوم وجوہات کی بناء پر گھروں کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کسی سوراخ، درز یا کھڑکی سے اندر داخل ہونے کے بعد یہ کچھ دیر مٹر گشت کرتے ہیں۔ کبھی انسانوں کا پیچھا کرتے ہیں پھر خاموشی سے یا دھماکے سے غائب ہو جاتے ہیں۔

۱۹۶۷ء میں Vincent Gaddis نے ایسے مختلف واقعات اپنی کتاب Mysterious Fires And Lights میں درج کیے جن سے پتہ چلتا تھا کہ یہ گولے انسانوں کو باقاعدہ پہچانتے ہیں۔ گیڈس نے اپنی کتاب میں فرانسیسی فلکیات دان Camille Flammarion کے حوالے سے بھی واقعات درج کیے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر ایک روشن کرے نے باقاعدہ ایک مکان کے بیرونی دروازے کو کھولنے کے لئے اندر کی طرف زور آزمائی کی۔ ایک اور موقع پر ایک گولہ ایک درخت کے اوپر دکھائی دیا جہاں سے وہ سنبھل سنبھل کر شاخوں پر سے اترتا آہستگی سے زمین پر آ گیا اور قریب موجود باڑے کے دروازے کی طرف بڑھا جہاں کھڑے ہوئے دونوں بچوں میں سے ایک نے اسے زور سے ٹھوکر لگائی تو یہ بھیانک آواز سے پھٹ گیا۔ بچوں کو تو کچھ نہ ہوا مگر اندر

باڑے میں کئی جانور مر گئے۔

جنوب مغربی فرانس کے ایک گاؤں میں ایک روشن کرہ ایک فارم ہاؤس کی چمنی میں سے ہو کر اندر آ گیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس نے کچھ نہ کہا اور آگے ملحقہ باورچی خانے میں مٹر گشت شروع کر دی۔ ایسے میں یہ اتفاقاً ایک کسان کے پیروں سے ٹکرا گیا مگر کسان کو کچھ فرق نہ پڑا۔ پھر یہ حرکت کرتا ہوا جانوروں کے باڑے میں گیا اور وہاں کھڑے ایک سور کے جسم سے مس ہو کر غائب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی سور مر گیا۔[20]

ہوائی جہاز اڑانے والوں نے اطلاع دی ہے کہ انہیں بھی روشن کروں کا سامنا ہوا ہے۔ یہ کرے ہوائی جہاز کی کھڑکیوں کے شیشے سے گزر کر اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں ایک روسی مسافر طیارہ بحیرہ اسود پر اڑ رہا تھا۔ اس کے کاک پٹ میں ایک روشن کرہ داخل ہوا اور پیچھے کی جانب حرکت کرتا ہوا۔ مسافروں کے سروں سے گزر کر جہاز کی دم کی طرف نکل گیا۔[21]

اب تک جتنی بھی رپورٹیں موصول ہوئیں ہیں ان کے مطابق روشن کرہ کبھی بھی انسانوں کو جسمانی نقصان نہیں پہنچاتا۔ تاہم اس سے مشابہ ایک اور چیز آتشیں کرہ Fire Ball ہے۔ یہ دہکتی ہوئی آگ کا گولہ ہوتا ہے جو تکلیف دینے کے اعتبار سے کوئی تخصیص نہیں کرتا۔

۱۰ر مئی ۱۹۶۱ء کی رات منی سوٹا کے علاقے ایگل بینڈ کا رہنے والا رچرڈ وگٹ اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اس نے گاڑی چلاتے ہوئے دیکھا کہ کوئی تین فٹ قطر کا ذرا سا لمبوترا آگ کا ایک گولہ تیزی سے اس کی گاڑی کی طرف آ رہا ہے۔ وہ کوشش کے باوجود تصادم سے بچ نہ سکا۔ گولہ گاڑی کی ونڈ سکرین پر ٹکرا کر اس زور سے پھٹا کہ شیشہ ٹوٹ گیا گاڑی سخت گرم ہونے لگی۔ رچرڈ نے باہر چھلانگ لگا دی۔ شیشہ اتنا گرم تھا کہ اسے ہاتھ نہیں لگایا جاتا تھا۔ یونیورسٹی آف منی سوٹا کے سائنس دان اس واقعے کی کوئی توجیہہ پیش نہ کر سکے۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکتے تھے کہ گاڑی پر آسمانی بجلی گری ہے کیونکہ اس رات آسمان بالکل صاف و شفاف تھا۔

۲۹ر مئی ۱۹۳۸ء کو آگ کا ایک کرہ انگلینڈ کے ایک گاؤں میں زمین پر آ گرا۔ نو افراد جل گئے۔ اس روز بھی آسمان بالکل صاف تھا۔ گویا یہ آسمانی برق والا معاملہ نہیں تھا۔

لیکن ان تمام واقعات سے بڑھ کر سب سے زیادہ شہرت اور اہمیت کا حامل تنگسکا کے آتشی گولے کا قصہ ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء کا واقعہ ہے جون کی ۳۰ تاریخ تھی، صبح کا وقت تھا. یکایک ایک ٹوٹا ستارہ مغربی چین کی فضاؤں میں زور دار آواز سے نمودار ہوا اور وسطی سائبریا میں دریائے تنگسکا کے قریب بھیانک

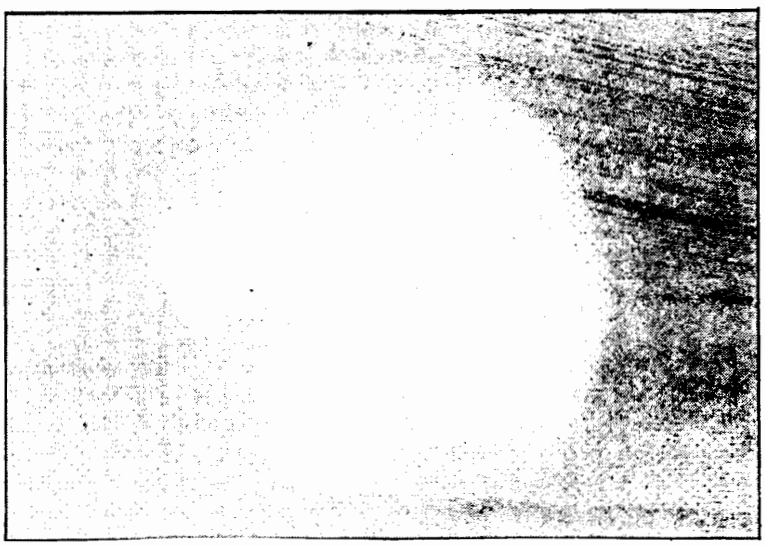

روشن اور آتشیں گولے اس کی تصاویر 1974ء میں لی گئیں

آواز سے پھٹ گیا۔ تیز چمک اور ہولناک آوازیں وقوعہ سے پانچ سو میل دور تک محسوس کی گئیں۔ اس رات شمالی یورپ کی بلائی فضاؤں میں ایک حیرت ناک منظر دیکھا گیا۔ برلن، لندن اور کوپن ہیگن کے لوگوں نے دیکھا کہ فضا زرد اور سفید بادلوں سے پھوٹتی ہوئی روشنی سے منور ہے۔ روشنی اس قدر ہے کہ دور کی چیزیں بھی نظر آ رہی ہیں۔ "تنگسکا" کے واقعے سے بے خبر ہونے کے سبب یورپی فوری طور پر اس منظر کی تشریح نہیں کر پائے اور اس بارے میں ان میں اختلاف رائے پیدا ہوا۔

انقلاب روس کے بعد جب حالات پرامن ہوئے تو ۱۹۲۷ء میں روسی سائنس دان لیونڈاے کولک کی سرکردگی میں شہاب ثاقب کے علاقے کی طرف ایک معائنہ ٹیم روانہ ہوئی۔ یہ لوگ شہاب ثاقب کے ماہر تھے۔ متعلقہ علاقے میں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ بارہ میل رداس کے دائرے میں جو بھی چیز آئی ہے برباد ہو چکی ہے۔ صنوبر کا جنگل سطح زمین پر بچھ گیا ہے اور دور دور تک سیاہ ہموار زمین نظر آ رہی ہے۔ لیکن مرکز میں ایک عجیب تماشہ دکھائی دیا۔ یہاں درخت سیدھے کھڑے تھے اور ان کی بیرونی سطح خاکستر ہو چکی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ گویا راکھ کے سمندر میں ٹیلی فون کے سیاہ کھمبوں کا ایک جزیرہ کھڑا ہے۔ اور سب سے زیادہ حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس علاقے میں شہابئے کا نام ونشان تک باقی نہ تھا۔

یہ ایک معمہ بن گیا۔ جب کبھی شہاب ثاقب سطح زمین سے ٹکراتا ہے تو وہاں ایک دہانہ سا بنتا ہے۔ "تنگسکا" میں ایسے کسی دھانے کا سراغ نہ ملا۔ کہا گیا کہ یہ ضرور کوئی دمدار سیارہ تھا۔ جو برف اور نکل اور لوہے کے ٹکڑوں سے مل کر بنتا ہے۔ جب یہ کرہ ہوائی میں شدت سے داخل ہوا تو رگڑ کی بدولت بے پناہ حدت پیدا ہوئی جس نے نہ صرف درختوں کو جلا دیا بلکہ ستارے کا اپنا جسم بھی تحلیل ہو گیا۔ اس دوران شدت سے دھماکہ ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ماہرین فلکیات اس دمدار ستارے کو زمین کی طرف بڑھتے ہوئے کیوں نہ دیکھ سکے؟

جنگ عظیم دوم کے ایٹمی دھماکوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک روسی انجینئر الیگزنیڈر کازانسف نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دراصل یہ خلائی مخلوق کا جہاز تھا جو زمین پر اترنے کی کوشش میں تباہ ہو گیا۔ اور "تنگسکا" کا علاقہ اس کی چتا بن گیا۔

ایک اور تصور یہ ہے کہ یہ حادثہ کسی ضد مادہ ٹوٹے ستارے سے تصادم کے نتیجہ میں ہوا۔ جب بھی مادہ ضد مادہ آمنے سامنے آئیں تو یہ دونوں ایک دوسرے کو تحلیل کر دیتے ہیں۔ فنا کا یہ عمل ہائیڈروجن بم کے ایٹمی دھماکے سے ہزار گنا زیادہ شدت سے واقع ہوتا ہے۔

ایک امکان یہ ہے کہ یہ بلیک ہول کی کارستانی ہے۔ یہ دراصل کوئی سوراخ نہیں ہے۔ بلکہ یہ نظریہ ہے کہ جب ستارے مرتے ہیں تو ان کا مادہ اس قدر شدت سے سکڑتا ہے کہ اگر روشنی کی شعاع بھی گزرے تو ان کی کشش ثقل سے گرفتار ہو کر رہ جاتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ضرور کوئی تیز رفتار سیاہ سوراخ زمین سے آ ٹکرایا تھا اور گولی کی طرح الگ ہو گیا۔[22]

لیکن اس کے باوجود کوئی نظریہ ایسا نہیں جو اس پراسرار آتشی گولے اور وسطی سائبریا میں اس کے اثرات کے متعلق ایسے دلائل پیش کرے جو تمام سائنس دانوں کے نزدیک شک سے بالا اور قابل قبول ہوں۔

# کیا فلکی اجسام انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں؟

علم نجوم کی بنیاد اس نظریئے پر ہے کہ اجرام فلکی انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ معترضین اس نظریئے کو باطل قرار دے کر علم نجوم کی حقیقت کے منکر ہیں۔ کیا اجرام فلکی واقعی بے اثر ہیں؟ شاید نہیں۔

مارچ ۱۹۵۱ء کا واقعہ ہے .R.C.A یعنی ریڈیو کارپوریشن آف امریکا کے رسالے میں ایک ریڈیو انجینئر جان۔ ایچ نیلسن کا مضمون شائع ہوا۔ اگرچہ یہ خالص تکنیکی نوعیت کا رسالہ تھا لیکن نیلسن کے مضمون نے عوام الناس میں ہل چل سی مچا دی۔ کارپوریشن کے سائنس دانوں نے بہت پہلے اس امر کا مشاہدہ کیا تھا کہ کرہ ارض کے قریب پڑوسی سیاروں کے مقام کی تبدیلی ریڈیائی امواج پر اثر انداز ہوتی ہے۔ .R.C.A کی جانب سے اس موضوع پر تحقیق کی دعوت کسی ماہر فلکیات نے قبول نہ کی۔ چنانچہ ریڈیو کارپوریشن نے نیلسن کو مقرر کر دیا کہ وہ معلوم کرے کہ آیا سیاروں کی ترتیب کے دوران ہی نشریاتی رابطہ خراب ہوتا ہے یا کارپوریشن کے سائنس دانوں کو مغالطہ ہوا ہے۔

نیلسن نے ۱۹۲۰ء سے درج شدہ ریڈیائی رابطے کی خرابی کے ریکارڈ کا تفصیلی جائزہ لینا شروع کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سورج کی نسبت سے قریبی سیاروں کے درمیان جب بھی مخصوص زاویہ پیدا ہوتا ہے تو ریڈیو نشریات ضرور متاثر ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر زمین کے دو پڑوسی سیاروں کے درمیان قائمہ زاویہ بنے تو برقناطیسی طوفان آنے لگتے ہیں۔ اس کے برعکس سیاروں کے درمیان ۶۰ یا ۱۲۰ کے زوائے ہوں تو میڈیم ویو نشریات بہتر طور پر موصول ہوتی ہیں۔

نیلسن کی یہ تحقیق R.C.A. کے رسالے میں شائع ہوئی تو عام لوگوں کو بھی اس دریافت میں خاصی دلچسپی محسوس ہوئی۔ مگر نیلسن نے جو اعداد و شمار دیئے تھے یعنی اجرام فلکی کی پوزیشن اور اس کے ریڈیائی نشریات پر اثرات اسے محض اتفاق کہہ کر رد کیا جا سکتا تھا تاآنکہ وہ خود ان اعداد و شمار کی بناء پر مستقبل میں آنے والے ریڈیائی نشریات میں گڑبڑ کی پیش گوئی کرتا۔ چنانچہ نیلسن نے اس کی کوشش کی اور خوب کی کیونکہ نشریات میں ممکنہ خرابی سے متعلق اس کی ۸۰ فیصد پیش گوئیاں درست ثابت ہوئیں۔ پھر وہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہا اور اس نے اپنے جدولوں میں نظام شمسی کے سارے سیاروں کی پوزیشنوں کا اندراج شروع کر دیا اور اس مرتبہ نشریاتی رابطے میں برقناطیسی لہروں کے طوفان کے سبب پیدا ہونے والی خرابیوں کے بارے میں اس کی پیش گوئیاں ۹۳ فیصد تک درست ثابت ہوئیں۔[23]

نیلسن کی یہ تحقیق گویا فلکیات کے میدان میں ایک نیا سنگ میل ثابت ہوئی۔ آج تحقیق و جستجو ہمیں اس مرحلے پر لے آئی ہے کہ ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ فی الحقیقت علم نجوم کے بنیادی تصورات محض مفروضے نہیں ہوتے بلکہ ان کی اساس ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اور کرہ ارض پر آنے والی طبعی تبدیلیوں اور اجرام فلکی کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور موجود ہے۔

ڈاکٹر روڈولف Dr. Rudolf Tomascheck ورلڈ جیو فزیکل کاؤنسل کے چیئرمین تھے انہوں نے کرہ ارض پر آنے والے ۱۳۴ بڑے زلزلوں کے دوران اجرام فلکی کی پوزیشن کا اندراج حاصل کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ ان زلزلوں کے دوران مشتری، یورینس اور نیپچون سیارول، کا کسی طرح سے ہاتھ ضرور رہا ہے۔ روسی سائنس دان Dr. Podshibyakin نے سورج کی سطح پر آنے والے طبعی تغیرات اور سوویت یونین میں سڑک کے حادثات کے درمیان کوئی تعلق موجود ہونے پر اصرار کیا۔ ڈاکٹر پوڈشیبیا کن نے اس بارے میں یہ اعداد و شمار ۱۹۶۷ء میں شائع کرائے جو انہوں نے اپنی تعیناتی کے دوران کئی برس تک بڑی محنت سے اکٹھے کئے تھے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق سورج کی سطح پر جب بھی کبھی مقناطیسی امواج میں طوفانی ہلچل پیدا ہوتی ہے تو کرہ ارض پر سڑک کے حادثات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ (عام دنوں کی نسبت ان حالات میں بعض اوقات حادثات کے تعداد ۴ گنا زائد دیکھی گئی ہے)۔ ڈاکٹر پوڈ نے یہ بھی کہا کہ مغربی جرمنی کے سائنس دانوں نے بھی تحقیقات کے بعد ڈاکٹر پوڈ جیسے نتائج حاصل کئے۔ پوڈ نے اس سلسلے کی ایک سائنسی توجیہہ بھی پیش کی۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ سورج کی سطح پر آنے والے طوفانوں کے دوران بالائے بنفشی شعاعوں کا بے پناہ اخراج ہوتا جس سے زمین کا کرہ ہوائی بھی متاثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ یہ شعاعیں فضا کے ذریعے انسانی جسم پر اثر انداز ہو کر انہیں سست کر دیتی ہے اسی سبب حادثات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔[24]

امریکہ کے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے ماہر حیاتیات ڈاکٹر فرینک اے براؤن Dr. Frank A.Brown کی تحقیقات بھی خاصی دلچسپی ہیں۔ ان کا شعبہ تحقیق "حیاتیاتی گھڑیاں" Biological Clocks ہے یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ کرہ ارض پر موجود ہر زندہ شے کا وقت کے ساتھ گہرا رشتہ ہے۔ ہم جو یہ سوتے ہیں جاگتے ہیں اور پودے رات کے وقت جس قسم کی آہستہ حرکت کرتے ہیں۔ یہ سارا نظام گویا گھڑیوں کی طرح سے کام کرتا ہے۔ جنہیں بائیولوجیکل کلاک کا نام دیا گیا ہے۔

یہ بات بذات خود ایک معمہ ہے کہ یہ حیاتیاتی گھڑیاں آخر کام کس طرح کرتی ہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ یہ دراصل فضا میں برقی چارجوں کے پیدا ہونے کی صورت میں جانداروں کا ردعمل ہے دوسرے کہتے ہیں کہ نہیں ہر جاندار کے اپنے جسم میں کوئی عضو گھڑی کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر فرینک اے براؤن نے ان دونوں مفروضوں میں وزن محسوس نہ کیا۔ دس برس کے مسلسل تجربات کے بعد انہوں نے بڑے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے۔ شواہد سے پتہ چلتا تھا کہ حیاتیاتی گھڑیوں کا یہ تال میل براہ راست سورج اور چاند کا مرہون منت ہے۔ تجربہ گاہ میں چوہوں کے مشاہدے کے ذریعے پتہ چلا کہ اگرچہ چوہوں کو اندھیرے کمرے میں چاند بالکل بھی دکھائی نہیں دیتا تاہم چاند طلوع ہونے کے بعد یہ اور چست ہو کر اچھل کود کرنے لگتے ہیں۔ رویئے میں اس تبدیلی کا سبب چاند کا طلوع ہونا تھا۔

اسی طرح سیپیوں کے خاندان کے ایک جانور "اویسٹر" سے بھی بڑی کار آمد باتوں کا علم ہوا یہ جانور عام مشاہدے کے مطابق پانی کے مد آنے پر خول کو کھول کر غذا حاصل کرتا ہے جب کہ جزر کے وقت اس کا خول بند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات فرض کر لی گئی تھی کہ اویسٹر کے خول کے کھلنے بند ہونے کا انحصار صرف اور صرف جوار بھاٹے پر ہے۔ مگر جب ڈاکٹر براؤن انہیں سمندر سے نکال کر ایسے تاریک ڈبوں میں رکھ کر منتقل کر رہا تھا جن میں سورج یا چاند کی کرن پہنچنے کا احتمال نہ تھا تو سمندر سے ہزار میل دور واقع لیبارٹری میں اویسٹرز کا ردعمل تبدیل ہو گیا۔ اور وہ مقامی اوقات کے مطابق سے اس اوقات میں خول کھولنے بند کرنے لگے جب مقامی طور پر جوار بھاٹا آنے کا امکان ہوتا۔ ایک رات کے اندر اندر اویسٹرز کے اندر خول کی حرکت میں آنے والے اس انقلابی تبدیلی کا واحد سبب چاند کی کشش بھی ہو سکتی تھی۔ کیونکہ یہاں لیبارٹری میں تو کوئی جوار بھاٹا نہیں آ رہا تھا جسے اویسٹرز محسوس کرتے دوسرے یہ کہ اویسٹرز نے عادتاً بھی اپنی پرانی رہائش گاہ اور ماحول کے مطابق خول کو حرکت دینے سے اجتناب کیا اور موجودہ مقام کے حساب سے ہی خول کھول لئے۔ (25)

۱۹۶۰ء میں ڈیوک یونیورسٹی امریکہ کے سائنس دان Dr. Leonard Ravitz کا تحقیقی مقالہ شائع ہوا۔ لیونارڈ کی تحقیق سے معلوم ہوتا تھا کہ چاند انسانی زندگی پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس نے انسانی بدن سے وقتاً فوقتاً خارج ہونے والے برقی چارجوں کے بارے میں یہ بات نوٹ کی کہ چارجوں کے اخراج کی شرح براہ راست چاند کے گھٹنے بڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ چنانچہ جس وقت آسمان پر مکمل چاند موجود ہو تو اس وقت چارجوں میں تغیر بے پناہ ہوتا ہے۔ لیونارڈ کے زیر علاج ذہنی مریضوں سے اس معاملے میں کافی کار آمد معلومات حاصل ہوئیں۔ کیونکہ ان کی کیفیت چاند کے ساتھ ہی تبدیل ہوتی تھی۔ لیونارڈ نے مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اپنے مریضوں کے جذبات میں آنے والے تغیرات کی پیش گوئی کرنے کی اہلیت حاصل کر لی۔

یوں چاند کے بارے میں قدیم ادوار سے منسوب توہمات آخر کار سائنٹفک بنیادوں پر حقائق کا درجہ حاصل کر رہی ہیں کیونکہ چاند کے ساتھ مریضوں کو پاگل پن کا دورہ پڑنے کی روایت بہت پرانی ہے۔ اسی طرح سے زچگی کے دوران بھی قمری اثرات کو محض توہم پرستی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۳۸ء میں جاپانی سائنس دان نے ۳۳۰۰۰ بچوں کی پیدائش کے وقت اجرام فلکی کی پوزیشن کا احوال ملاحظہ کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ بیشتر بچے اس وقت پیدا ہوئے جب بدر کامل تھا۔ ۱۹۶۷ء میں ایک امریکی ماہر جینیٹیات نے ۵ لاکھ کے قریب بچوں کی پیدائش کے اندراج کے ذریعے یہی نتیجہ نکالا۔

خواتین میں خاص وقفوں کے بعد بیضہ دانی سے انڈے کا اخراج ہوتا ہے۔ چیکو سلواکیہ کے ایک ماہر نفسیات Eugen Jonas نے انڈے کے اخراج اور چاند کی مختلف شکلوں کے درمیان حیرت انگیز تعلق کی نشاندہی کی۔ جوناس نے مشرقی یورپ کی خواتین کے لئے ایک چارٹ بھی بنایا جس کی مدد سے حمل کو یقینی بنانے کے لئے ایام معلوم کرنے کا طریقہ درج ہے۔ یہ چارٹ ۹۸ فیصد تک درست نتائج دیتا ہے۔

ماہواری کے بارے میں یہ تصور بڑا پرانا ہے کہ اس کا دورانیہ دو کامل چاندوں کے درمیانی عرصے کے مساوی ہوتا ہے۔

سویڈن کے ایک کیمسٹ Dr.Svante Arrhenius نے قریباً گیارہ ہزار خواتین کے کوائف کے اندراج کے بعد یہ کہا کہ عموماً خواتین میں ماہواری نیا چاند طلوع ہوتے وقت اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ ادھر جرمنی کے دو ماہر چودہ برس کے دوران دس ہزار خواتین کے مخصوص ایام کے تجزیئے کے بعد انہیں نتائج پر پہنچے۔ (26)

زخموں سے خون رسنے اور چاند کی کشش کے درمیان بھی کوئی تعلق ضرور موجود ہے۔ امریکہ کے ایک طبیب Dr.Edson Andrews نے بارہا یہ بات نوٹ کی کہ مریضوں کے زخموں سے جریان خون چاند کی مختلف کیفیتوں کے وقت مختلف ہوتا ہے۔ گلے کے ۱۰۰۰ کے قریب آپریشنوں کے دوران ڈاکٹر نے محسوس کیا کہ مریضوں میں خون غیر معمولی طور پر بہہ رہا ہے۔ دیکھنے میں آیا کہ ۸۲ فیصد مریضوں میں یہ حالت اس وقت واقع ہوئی جب چاند کے پہلے یا تیسرے ربع کا آغاز ہوا تھا۔ ایڈسن کا کہنا ہے کہ یہ اعداد و شمار اتنے نتیجہ خیز نکلے ہیں کہ مجھے ڈر ہے کہ میں کہیں ساحر قسم کا طبیب نہ بن جاؤں اور صرف سیاہ راتوں میں آپریشن نہ شروع کر دوں۔ ان دریافتوں کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ماہرین علم نجوم کا یہ بنیادی دعویٰ. حقیقت پر مبنی ہے کہ اجرام فلکی انسان اور کرہ ارض کے ماحول پر غیر معمولی اثر ڈالتے ہیں لیکن یہ اثرات آخر کس طرح واقع ہوتے ہیں؟

ڈاکٹر براؤن اسے سبب اور مسبّ کے قانون کے تحت بیان کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ سورج اور چاند انتہائی قلیل مقدار میں کوئی نامعلوم قسم کی توانائی تمام جاندار اجسام کو فراہم کرتے ہیں۔ یہ معمولی مقدار کی توانائی بھی زندہ اجسام میں حیاتیاتی تعاملات کو دھکا دے کر کام شروع کرا دینے کو کافی ہوتی ہے۔ یعنی ایک زنجیری

عمل شروع ہوتا ہے۔ لیکن براؤن کی اس توجیہہ کی تصدیق نہیں ہو سکی کیونکہ نہ تو اب تک کسی دھکے سے تعاملات کے شروع ہونے کا سراغ ملا ہے اور نہ ہی کسی "نامعلوم قسم کی توانائی" کی خبر ہوئی ہے۔

متعلقہ مضمون
دیکھئے علم نجوم

# دسواں سیارہ

کیا ہمارا نظام شمسی نویں سیارے پلوٹو تک محدود ہے؟ یا ابھی کسی اور سیارے کی دریافت کا امتحان باقی ہے۔ یہ بات بعید از امکان تو نہیں کہ پلوٹو کے بعد کوئی اور بھی سیارہ موجود ہو۔ ماہرین فلکیات کا کیا کہنا ۱۸۴۶ء میں جب یورنیس دریافت ہوا تو ان کا خیال تھا کہ یہی ہمارے نظام شمسی کی حد ہے مگر ان کی یہ خوش فہمی ۱۹۳۰ء تک ہی برقرار رہی کیونکہ اس سال نواں سیارہ پلوٹو دریافت ہو گیا تو ان کا بیان تھا کہ بس یہی تھا ہمارے نظام شمسی کا آخری سیارہ۔ اب اگر کہیں کہ صاحب اس سے آگے بھی کوئی سیارہ موجود ہو سکتا ہے تو ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں۔

قدیم سمیری قوم کی الواح سے پتہ چلتا ہے کہ نظام شمسی میں ایک بڑا سیارہ پلوٹو کے بعد موجود ہے مگر اس بارے میں ہماری معلومات محدود رہی ہیں[27]۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ۱۷۸۱ء تک ہمیں صرف پہلے چھ سیاروں کا علم تھا مگر اس سال سر ولیم ہرشل نے خلاء میں ایک نیا سیارہ تاکا جسے یورنیس کا نام دیا گیا۔ یہ سیارہ یورنیس اپنے مدار میں مستحکم نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ کوئی بیرونی قوت اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ اس بیرونی قوت کی ڈھنڈیا پڑی تو ۱۸۱۶ء میں نیپ چون سیارہ مل گیا۔ مگر اب پھر وہی مسئلہ سامنے آیا کہ حساب و کتاب کے مطابق جہاں اس نئے سیارے کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ یہ وہاں نہیں تھا گویا ایک اور بیرونی طاقت کے زیر اثر نیپ چون بھی اپنے مدار میں غیر مستحکم تھا۔ تلاش شروع ہوئی اور ۱۹۳۰ء میں معلوم ہوا کہ ایک ننھا سا سیارہ پلوٹو موجود ہے کیا یہی ننھے میاں نیپ چون کے مدار پر اثر انداز ہو رہے ہیں؟ شاید نہیں۔ سیدھی سی بات ہے پلوٹو جیسا چھوٹا سیارہ یورنیس اور نیپچون جیسے بھاری بھرکم پہلوان سیاروں کو کس طرح متاثر کر سکتا ہے۔ ضرور کوئی بڑا اور طاقتور سیارہ موجود ہے۔ کچھ نے اسے لوکی کا نامی دیا کچھ نے سیارہ ایکس کہا۔ چند منجموں نے ولکن پکارا

شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دسویں سیارے کے موجود ہونے کے قوی امکانات ہیں بیشتر سیاروں کے ذیلی دم دار ستاروں کے گروہ موجود ہیں مثلاً مشتری کے ۵۰، زحل کے ۶، یورنیس کے ۳، نیپ چون کے ۸ اور پلوٹو کے ۵ دم دار ستارے ہیں۔[28] اس تناظر میں خلائے بسیط ۷۰ کھرب میل کے فاصلے پر ۱۶ کے قریب ایسے ہی دنبالے موجود ہیں لیکن یہ کس سیارے سے متعلق ہیں معلوم نہیں۔ فی الوقت انہیں دسویں سیارے سے منسوب کیا جا رہا ہے۔

ہیلی کے دمدار ستارے کا مدار بظاہر بے ترتیب سا تھا۔ ماہرین فلکیات کے خیال میں اس میں بھی دسویں سیارے کا ہاتھ رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں کیلی فورنیا کی لارنس لور مور لیبارٹری کے فلکیات دان جوزف بریڈی نے کمپیوٹر کے ذریعے یہ نتائج حاصل کیے۔ ہیلی کے دمدار ستارے کی یہ بے ترتیب سی گردش معلومہ سیاروں کے زیر اثر نہیں ہو رہی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ ایک بہت بڑا اور بہت طاقتور سیارہ سورج کی گردشی مستوی سے ۱۲۰ درجے پر واقع ہو سکتا ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ ۶ ارب میل ہو گا۔ ۱۹۷۲ء - ۱۹۷۳ء کے دوران ماہرین فلکیات کی تلاش ناکام ثابت ہوئی۔ بریڈی سے اختلاف رائے کیا گیا اور کہا گیا کہ اس قدر کشش کے حامل سیارے کا اثر اتنا ہونا چاہئے تھا کہ بڑے سیاروں کے مدار وسیع تر ہو جاتے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

اگر فی الحقیقت بریڈی کا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے تو اس قدر دور واقع سیارے سے اگر سورج کی طرف دیکھا جائے گا تو یہ محض ایک چمکتا ہوا چھوٹا سا ستارہ نظر آئے گا۔ چنانچہ اس سیارے پر درجہ حرارت مطلق صفر ہو سکتا ہے۔ اس کی سطح پر گیسوں کا انجماد ہو سکتا ہے۔ ہاں اگر سیارے میں آتش فشاں یا تابکاری کے اثرات ہوئے تب یہ اس قدر سرد نہ ہو گا۔ سورج کے گرد اس کا ایک دور ۴۶۴ برس پر محیط ہو سکتا ہے۔ ۱۹۷۸ء تک خیال تھا کہ سیارے کی کمیت زمین سے ۲۸۶ گنا زیادہ ہو گی (۱۹۷۹ء - ۱۹۸۱ء) کے دوران امریکہ میں فلنڈرن اور اس کے چار رفقائے کار نے کشش ثقل پر تحقیق کے دوران اندازہ لگایا کہ سیارے کا حجم زمین سے دگنا ہو سکتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی کمیت زحل کی کمیت سے تگنی ہو گی۔[29] ستمبر ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر ہیر تگٹن (یوایس نیول

آبزرویٹری ) نے اعلان کیا کہ ممکنہ سیارے کی تلاش کے لئے ان کی توجہ خلاء کے ایک مخصوص حصے پر مرکوز ہو رہی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ دسواں سیار ہمارے نظام شمسی کا سست ترین سیارہ ہے۔ ہیر نگٹن کی توقعات کو کچھ سہارا ملا ہے کیونکہ ۱۹۸۳ء میں روانہ کئے گئے خلائی جہاز پائنیر نے جو تصاویر ارسال کی ہیں ان کی رو سے ایک سیارہ ہمارے نظام شمسی کی حدود پر واقع ہے اور بہت سست روی سے گردش میں مصروف ہے۔ کیا معلوم یہی دسواں سیارہ ہو؟

# موت..... زندگی کا منطقی انجام

ہر وہ شے جو زندہ ہے اسے آخر کار موت کا تلخ جام پینا ہی پڑتا ہے۔ کسی جان لیوا حادثے یا بیماری سے قطع نظر موت کا سب سے بڑا بہانہ عمر ہے۔ انسان بچپن، لڑکپن اور جوانی کی منازل کو طے کر کے دور حیات کے اس مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے۔ جس سے اگلی منزل یقینی طور پر موت ہوتی ہے۔ زندگی کا یہ آخری مرحلہ بڑھاپا ہے۔ انسان بوڑھا کیوں ہو جاتا ہے؟ سائنس دان اس بات کو واضح طور پر نہیں سمجھ سکے ہیں۔ خیال ہے کہ جب کسی خلئے سے کوئی نیا خلیہ جنم لیتا ہے تو نئے کی نسبت پرانے خلئے میں عمر کے اعتبار سے ایسے کیمیائی مادے موجود ہوتے ہیں جنہیں بڑھاپے کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر راک فیلر یونیورسٹی ( نیویارک ) کی سائنس دان یوجینا وانگ نے ایسے خلیوں کا مطالعہ کیا جو تقسیم کے عمل کو جاری نہ رکھ سکے ہوں۔ ان خلیات کی پروٹین سے یوجینا نے اینٹی باڈیز کی شناخت کی۔ اس کیمیائی مادے کو سٹیٹن Statin کہا گیا ہے اور یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مادے کا کام کیا ہے؟ شاید یہ بڑھاپے کا ایک سبب ہو۔[30]

خلیات کے اندر تعمیری و تخریبی عوامل کے نتیجے میں فاضل چارج شدہ ذرات ریڈیکل پیدا ہوتے ہیں۔ بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ خلیاتی "کچرہ" رفتہ رفتہ تمام خلیات کو مار ڈالتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ یہ فاضل مواد عمر کے خاتمے میں کس طرح کردار ادا کرتا ہے۔

ایک نظریہ دماغ کو بڑھاپے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور ایک تھیوری کے مطابق جسمانی غدودوں سے نکلنے والی رطوبتیں بڑھاپا طاری کرتی ہیں۔ رطوبتوں والے نظریئے کو اس حقیقت سے بھی تقویت ملتی ہے کہ تجربات کے دوران ان چوہوں کی عمر بڑھ گئی جن کے جسم سے پچوٹری غدود ابتدائی عمر میں نکال کر ہارمونی رطوبتیں اضافی طور پر دی گئی تھیں۔ چنانچہ خیال ہوا کہ پچوٹری گلینڈ جو دماغ میں واقع ہوتا ہے، بڑھاپے سے متعلق رطوبات خارج کرتا ہے۔ مگر حتمی طور پر کوئی ایسا ہارمون دریافت نہیں ہوا جو عرصہ حیات تنگ کرنے پر مامور ہو۔

سائنس دانوں نے بڑھاپے کے عمل کو سمجھنے کے دوران کئی انکشافات بھی کئے ہیں۔ مثلاً یہ جو کہا جاتا ہے کہ بڑھاپے میں آدمی سٹھیا جاتا ہے اور یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ سائنس نے اس کی تردید کر دی ہے۔ وہ افراد جو ۶۵ کے پیٹے میں تھے تجزیئے کے دوران معلوم ہوا کہ ان میں سے ۸۵ فیصد کی یادداشت کمزور نہیں ہوئی تھی۔ تحقیقات جاری ہیں امید تو نہیں کہ ہم موت پر قابو پالیں۔ مگر یہ امکان ضرور موجود ہے کہ بڑھاپا آنے کے عمل کو دھیما کر دیا جائے۔

# قیامت..... کائنات کا انجام کیا ہو گا؟

سائنسی بنیادوں پر قیامت کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یعنی اس امر کی کھوج لگائی جا رہی ہے کہ کائنات کا انجام کیا ہو گا؟ اس بارے میں تین نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ کائنات ایک دھماکے کے نتیجے میں مادہ کے بکھر جانے اور ٹھنڈے ہو کر کہکشاؤں کی صورت میں ظاہر ہو جانے پر بنی اور کہکشائیں خلاء میں دھماکہ کے مقام سے پرے تیزی سے فرار ہو رہی ہیں۔ کہکشائیں ایک دوسرے سے پرے ہٹتے ہوئے ٹھنڈی ہوتی چلی جا رہی ہیں اور یہ ٹھنڈ آخر کار اس قدر ہو جائے گی کہ اجرام فلکی معدوم ہونے لگیں گے اور یہی انجام ہو گا۔

دوسرے نظریئے کے مطابق کائنات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ یہ سلسلہ رک جائے گا اور اجرام فلکی ایک دوسرے کی طرف کھنچنے

یں گے اور آخر کار زبردست تصادم کے نتیجے میں کائنات آگ کا ایک گولہ بن جائے گی۔

تیسرے نظریئے نے بڑی تباہی کے تصور سے انکار کرتے ہوئے یہ خیال پیش کیا ہے کہ متحرک کہکشائیں ست ہو کر آخر کار سکون کی حالت اختیار کر لیں ں اور یہ قرار کی حالت ہمیشہ قائم رہے گی۔[31]

ان امکانات کا سائنسی جواب دینا صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ کسی طرح یہ معلوم ہو جائے کہ پوری کائنات میں کہکشاؤں کی صورت میں جتنا مادہ ہے اس کی مقدار کتنی ہے۔ کیونکہ اگر یہ پتہ چلے کہ کائناتی مادہ بہت کثیف ہے تو اس نظریئے کو تقویت ملتی ہے کہ کہکشائیں پلٹ کر آئیں گی اور آپس میں مرتکز ہو جائیں گی کیونکہ کثیف مادے کی تجاذبی قوت اثر انداز ہو گی۔

چند برس قبل سائنس دانوں کا دعویٰ تھا کہ انہوں نے کل کائنات میں موجود تمام کہکشاؤں ان میں موجود مادے کی مقادیر اور ان کے مابین فاصلے کے ور کہکشاؤں کی رفتار کا بالکل درست علم ہے۔ مگر بعد ازاں انکشاف ہوا کہ انسان نے اب تک اصل کائنات کا ایک فیصد دیکھنے کی صلاحیت حاصل کی ہے۔ بقیہ ۹۹ فیصد کائنات اس کی نگاہوں سے اوجھل ہے۔

اپنی کم علمی کا یہ ایک ثبوت کافی ہے۔ شاید کائنات کو سمجھنے میں سائنس کو واضح نظریات کا سہارا نہیں ہے۔ کیونکہ نظریاتی اعتبار سے کہکشاؤں کا جو طرز مل معلوم کیا گیا ہے۔ حقیقت میں وہ اس سے انحراف کر رہی ہیں سائنس دان الجھن کا شکار ہیں اور آپس میں اختلاف رائے بھی موجود ہے۔ معلومہ اور نامعلومہ کائنات کے بارے میں ان کی بحثیں جاری ہیں۔

ایلن گوتھ کا کہنا ہے کہ کائنات ارتکاز سے شروع ہوئی اور انتشار کی جانب بڑھی فی الوقت کائنات دو انتہاؤں کے بین بین موجود ہے۔ گوتھ نے کہا "ہماری کائنات ارتکاز و انتشار کی پل صراط پر پہنچ چکی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ آنے والا وقت ہمیں کس طرح گرائے گا۔ انتشار کی طرف گرنے کا مطلب ہو گا کہ ابھی کائنات مزید وسیع ہو گئی اور ارتکاز کی طرف (پلٹ کر) گرنے کا مطلب ہر شے کا مٹ جانا ہے۔"[32]

# حوالہ جات

## باب سوم


۱۔ ماہنامہ سائنس میگزین ۴۱۔ ص ۳۸

۲۔ پراسرار کائنات کا معمہ۔ ایم سلیم

۳۔ وقت کا سفر سٹیفن ہاکنگ۔ (ناظر محمود) ص ۲۰

۴۔ The Guiness Encyclopedia P:6

۵۔ جدید سائنس کی کامرانیاں۔ میلون برگر ص ۱۱۳

۶۔ وقت کا سفر۔ ص ۱۴۹

۷۔ Gray's Anatomy

۸۔ سائنس میگزین ۴۱۔ ص ۱۵

۹۔ The world's Greatest Mystries (G. Brown) P:139

۱۰۔ سائنس میگزین ۴۱ ص ۳۲

۱۱۔ Encyclopedia of Dinosours P:243

[2] The world's Greatest Mystries G.B P:60

[3] سائنس میگزین ۴۱۔ ص ۱۸

[4] Encyclopedia of Dinosour P:243

[5] The world's Greatest Mystries P:70

[6] ایضاً ص ۷۰

[7] ایضاً ص ۷۱

[8] The World Great Mystries J. Grant P:56

[9] The Book of Great Mystries B. (Collin Wilson P:93)

[20] ایضاً ص ۹۴

[21] Modern Mystries of the world (Janet & collin P:133)

[22] People's Almanic II P:1267

[23] The Book of Great Mystries P:455

[24] ایضاً ص ۴۵۶

[25] ایضاً ص ۴۵۷

[26] ایضاً ص ۴۵۶

[27] دیکھیے "قدیم فلکیات"

[28] People's Almanac II P:588

[29] ہماری کائنات سید قاسم محمود ص ۸۲

[30] سائنس میگزین ۴۱ ص ۳۷

[31] ہماری کائنات ص ۱۰۸

[32] سائنس میگزین ۴۱ ص ۴۰

# باب چہارم

# اسرار آدم

# انسان کی پیدائش

پیدائش کا عمل قدیم دور سے بڑا پراسرار سمجھا جاتا رہا ہے۔ پتھر کے دور کا انسان بھی ایک نئے جیتے جاگتے وجود کی آمد کو حیرت سے دیکھتا ہو گا۔ پیدائش کے عمل کو سمجھنے کے لئے بڑی جدوجہد کی گئی ہے لیکن بہت سے پہلو ابھی تک تشنہ ہیں۔

آسانی کے لئے ہم اس کے مختلف مدارج طے کر لیتے ہیں۔ پہلے مردانہ جرثومہ عورت کے جرثومے سے مل کر ایک ساخت "زائی گوٹ" بناتا ہے۔ پھر زائی گوٹ میں خلیوں کی تقسیم شروع ہوتی ہے اس کے بعد جسامت میں اضافہ ہوتا ہے نشوونما کے اگلے مرحلے میں خلیوں میں تفریق کا آغاز ہوتا ہے کہ کس خلئے کو کون سی ساخت یا عضو کی تشکیل میں حصہ لینا ہے۔ یہی مرحلہ جسے بروزیت کہا جاتا ہے پیچیدہ ترین مراحل میں سے ایک ہے۔ اس کے بعد پیدائش وقوع پذیر ہوتی ہے۔

صدیوں سے اس معمے کا کھوج لگانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ شکم مادر میں جنین کی نشوونما کس طرح ہوتی ہے۔ ارسطو نے اس بارے میں دو تصورات پیش کیے۔ پہلا تصور تھا پری فارمیشن۔ اس نظریئے کے مطابق مرد یا عورت کے جنسی جرثوموں میں ایک نہایت چھوٹا نظر نہ آنے والا مکمل انسان اپنے ننھے منے اعضاء کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

دوسرا تصور "ایپی جینی سس" کا ہے جو یہ کہتا ہے کہ اعضاء بذات خود انڈے یا مردانہ جرثومے سپرم میں موجود نہیں ہوتے بلکہ نشوونما کے دوران پیدا ہوتے ہیں۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی جنین کا مطالعہ کتنا مشکل کام ہے۔ معاشرتی سطح پر اسے انسانی زندگی سے کھیلنے کے مترادف قرار دیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا سائنس دانوں نے ابتدائی قسم کے حیوانات کے انڈوں پر کام کیا۔ جو نہ صرف آسانی سے مل جاتے ہیں بلکہ بڑی تعداد میں ہونے کے علاوہ جلد نمو پاتے ہیں۔

جرمن سائنس دان "ول ہلم رو" یا روکس نے ۱۸۸۸ء میں چھپکلی سے ملتے جلتے جل تھلیے سلامنڈر پر تحقیق کی۔ سلامنڈر کا انڈہ نشوونما کے ابتدائی مرحلے میں دو واضح حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ روکس نے ان میں سے ایک حصے میں ایک سوئی گرم کر کے داخل کر دی یوں انڈے کا آدھا حصہ مار ڈالا۔ دوسرا حصہ نمو پاتا رہا اور ایک روز اس نے سلامنڈر کے جسم کا آدھا حصہ بنا دیا۔ شاید یہ نظریہ درست تھا کہ خلیوں میں اعضاء پہلے سے موجود ہوتے ہیں جبھی تو خلئے کا وہ حصہ جسے جلا دیا گیا تھا۔ جسم کا آدھا دھڑ بنانے میں ناکام رہا تھا اور دوسرے زندہ حصے نے اپنے اندر موجود باقی دھڑ کی تشکیل کر دی تھی۔

لیکن روکس کے ایک ہم عصر ہانز ڈریش نے ایک نئی بات بتائی۔ اس نے سی ارچن نامی حیوان کے انڈے کو اس وقت دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جب کہ انڈے کے دو حصے واضح ہوتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ آدھے انڈے نے حیوان کا مکمل جسم تشکیل دیا حالانکہ اسے بھی آدھا جسم بنانا چاہئے تھا اس نے کہا کہ ایپی جینی سس کا نظریہ حقیقت سے قریب ہے۔

تجربات اور بحث جاری رہی اور آخر کار ہارنز ڈریش کے خیال سے سب متفق ہو گئے تاہم مسئلہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ گویا حقیقت ہے کہ جنسی خلیوں

میں انسان مکمل طور پر اصل شکل و صورت میں لیکن نہایت چھوٹی خورد بینی جسامت میں موجود نہیں ہوتا۔ (اور اگر ایسا ہوتا تو نشوونما کی تشریح بڑی آسان ہو جاتی) تاہم اگر ایک ننھا سا جسم پھیلتے پھیلتے ایک بھاری بھرکم انسان کی شکل اختیار نہیں کرتا تو پھر جنین یہ ہاتھ پاؤں، ناک نقشہ کیوں کر بناتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بے حد پیچیدہ امر ہے۔

شروع میں اس سلسلے میں دو گروہ سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ جو قوت حیوانیہ اور روحانیت کا حامی تھا یہ دعویٰ کرتا تھا کہ نمو کا عمل عام طبیعی، کیمیائی اور میکانکی بنیادوں پر سمجھنا ممکن نہیں وہ اس کی تشریح روحانی قوانین کی روشنی میں کرتے۔ مبینہ روحانی اور آسمانی کتب میں بھی اس سے متعلق مواد وافر مقدار میں موجود ہے۔ خود قرآن مجید میں خدا کا دعویٰ ہے کہ انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ رحم مادر میں کیا ہے۔

ایک دوسرا گروہ مادہ پرستوں کا ہے جو روحانیت پر یقین نہیں رکھتے۔ اس گروہ نے پہلا میدان اس وقت مارا تھا جب پری فارمیشن کی تردید ہو گئی تھی کیونکہ پری فارمیشن کے حامی قوت حیوانیہ کے نظریئے سے متفق تھے۔ اس گروہ کے خیال میں نشوونما کی تشریح طبیعی قوانین کے مطابق کی جا سکتی ہے۔

دوسرے گروہ کے افراد تجربات میں لگے رہے اور انہیں زندگی کی اساس ڈی این اے کا پتہ لگا کہ یہی خلیات سے متعلق پیغامات ارسال کرتا ہے۔ ڈی این اے خلئے کے مرکز میں واقع کروموسوم نامی ساختیں بناتا ہے۔ یہی ڈی این اے احکامات صادر کرتا ہے کہ خلیات کون سی ترتیب پائیں گے۔ سائنس اب تک ان احکامات کی ماہیت سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے۔

لندن کے مڈل سیکس ہسپتال کے پروفیسر لیوس وولپرٹ کی تحقیق ہے کہ ایک بار کسی خلئے کو اس کے مقام کا "علم" ہو جائے تو وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا بننا ہے۔ اس کی تشریح ان ہی کی زبانی سنیں۔ "ایک لمحے کے لئے تصور کریں کہ خلیات محدودی انداز Co-Ordinate Pattern میں کسی جگہ جمع ہیں۔ بالکل یوں سمجھیں کہ جیسے وہ کسی تھیٹر ہال میں ہیں ہر کسی کا اپنا قطار نمبر اور سیٹ نمبر ہے اسی طرح ہر ایک کے پاس اپنا اپنا الگ پروگرام ہے۔ اس بات کے پختہ شواہد موجود ہیں کہ ان خلیات کا اپنا اپنا الگ پتا بھی موجود ہوتا ہے۔ جو ان کو بتاتا ہے کہ کہاں جانا ہے اسی وجہ سے شہادت کی انگلی ہاتھ میں خاص جگہ تشکیل پاتی ہے۔ اور انگوٹھا اپنی مقامیت قائم رکھتا ہے۔ یہی باقی اعضاء اور حصوں کا حال ہے۔"

اس کے مطابق مثلاً اگر مرغی کے چوزے میں کسی ایسے خلئے کو لگایا جائے جو پروں کی تشکیل کرتا ہے اور بجائے پروں کے اس جگہ پاؤں کا جوڑا آ جائے تو وہ جگہ کی تبدیلی سے پاؤں کی تشکیل نہیں کرے گا بلکہ پاؤں کے قریب پر بناڈالے گا۔ اس کا تجربہ روکس کے شاگرد پسی مین نے کامیابی سے کیا اور ایک ایم بریو کے دو اعصابی نظام پیدا کر دکھائے تھے۔ یہ معمہ کہ خلیوں کو کیوں کر یہ پتہ چلتا ہے کہ انہیں کس جگہ جا کر نصب ہونا ہے۔ کچھ کیمیائی مادوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خلیوں کی مقامیت کا تعین کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی تحقیق طلب امور میں سے ہے کہ کیمیائی اجزاء کیونکر ایسا کرتے ہیں۔[1]

ایک اور معمہ نشوونما پر کنٹرول سے متعلق ہے کہ آخر دایاں اور بایاں بازو جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر ہوتے ہیں کس طرح ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یعنی خلئے یہ کس طرح جان لیتے ہیں کہ اب انہیں اپنی تعداد میں مزید اضافہ کر کے بازوؤں کی لمبائی میں بے قاعدگی پیدا نہیں کرنی چاہئے۔

# مماثل جڑواں بچے

والدین کے لئے جڑواں بچوں کی پیدائش کا واقعہ گویا ان کی خوشی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ عموماً ایسے بچوں کے درمیان کئی عادات مشترک پائی گئی اور ان کی طبیعتیں بھی قریباً یکساں دیکھنے میں آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ہم شکل مماثل جڑواں بچے مستقل طور پر معاشرے کی دلچسپی کا مرکز رہتے ہیں اوائل عمری سے والدین کا طرز عمل ماحول اور لوگوں کا یکساں رویہ ایسے جڑواں بچوں میں مشترکہ عادات واطوار پیدا کرتا ہے۔

لیکن ان بچوں کی مشترک عادات و خصائل کو محض ماحول کی بنیاد پر بیان کرنا درست نہیں۔ اس بات کے بڑے ٹھوس شواہد ملے ہیں کہ مماثل جڑواں بچے جنہیں پیدائش کے بعد سے الگ الگ ماحول میں ایک دوسرے سے دور رکھ کر اس طرح پرورش کی گئی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی پھر بھی ان بچوں کے طرز عمل میں فطرتاً مماثلت پائی گئی۔

مماثل جڑواں بچوں کی پیدائش ایک مخصوص طریقے سے ہوتی ہے۔ مرد کے جرثومے اور عورت کے بیضہ کے ملاپ کے بعد ملاپ شدہ بیضہ خلاف معمول دو حصوں میں تقسیم ہو کر دو وجودوں کی بنیاد ڈالتا ہے۔

اگرچہ بعض کا دعویٰ یہ ہے کہ مماثل جڑواں بچوں کی مثال ایسے ہیں کہ گویا ایک ہی شخصیت بیک وقت دو جسموں میں موجود ہے تاہم ان افراد کے مابین کچھ تفاوت بھی ہوتا ہے مثال کے طور پر مماثل جڑواں افراد کے ہاتھوں کی لکیروں میں فرق ہوا کرتا ہے لیکن یہاں موضوع فطرت کے اس معمے کے متعلق ہے کہ بعض مماثل افراد کے ہاتھوں کی لکیریں ایک دوسرے کا مکمل اور عین عکس ہوتی ہیں اور وہ ایک جان دو قالب کی مثال ہوتے ہیں۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ دو مماثل جڑواں بہنوں فریڈا چیپلن اور گریٹا چیپلن کا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب وہ ۳۸ برس کی تھیں تو ایک ہمسائے Ken Iveson کو تنگ کرنے کے الزام میں عدالت میں حاضر کیا گیا۔ وہ شخص ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور گزشتہ ۱۵ برس سے ان بہنوں کی عادت تھی کہ وہ اس شخص کا فیکٹری سے باہر انتظار کرتیں اور جونہی وہ باہر آتا اسے گالیاں دیتیں اور اپنے تھیلوں سے مرمت کرتیں۔ انہیں بذات خود اس نامعقول حرکت پر حیرت تھی کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ عدالت میں سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو مجسٹریٹ کو دونوں بہنوں کے درمیان حیرت ناک مماثلت کا علم ہوا۔ اس کے ہر سوال کا جواب دونوں مل کر ایک ساتھ ایک انداز اور ایک جیسے الفاظ میں دے رہی تھیں۔ کوئی بناوٹی حرکات نہیں تھیں۔ عدالت کو بتایا گیا کہ ان دونوں کی زندگی مماثلت کے ایسے حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ لڑکپن میں جب دوسرے بچے ان بہنوں کو بالکل ایک جیسے ملبوسات میں ایک ہی انداز میں چلتے پھرتے دیکھا کرتے تو "جادوگرنیاں" قرار دے کر پتھر مارا کرتے تھے۔ علاقے میں اس بات کا اتنا چرچا تھا کہ اکثر بڑی عمر کے افراد بھی انہیں سامنے سے آتا دیکھ کر راستہ تبدیل کر لیتے تھے۔

ماہرین نفسیات نے ان کے تجزیئے کی خاطر دونوں بہنوں کو خاکی رنگ کے دو ایک جیسے کوٹ دیئے جن میں بٹنوں کا فرق تھا یعنی ایک کوٹ کے بٹنوں کا رنگ سبز جب کہ دوسرے کے بٹن خاکی رنگ کے تھے۔ دونوں نے کوٹوں کے بٹنوں کو کاٹ کر الگ کر کے ایک دوسرے میں برابر تقسیم کر دیا۔ تاکہ دونوں کے پاس ملے جلے بٹنوں کے ایک جیسے سیٹ بن جائیں۔ وہ اپنی مماثلت قائم رکھنے کو اس حد تک مجبور تھیں کہ جب دونوں کو علیحدہ علیحدہ قسم کے دستانوں کا جوڑا دیا گیا تب بھی ایک ایک دستانے کو تبدیل کر کے پہن لیا حالانکہ دونوں کے دونوں ہاتھوں پر الگ الگ دستانے کچھ اچھا تاثر نہیں دے رہے تھے۔ اب انہیں دو مختلف صابنوں کی ٹکیاں دی گئیں۔ انہوں نے اپنے صابنوں کو آدھا آدھا کاٹ کر ٹکڑوں کو تبدیل کر لیا مگر اس مرتبہ مماثلت اختیار کرنے میں بیچاریوں کو بڑی مشکل پیش آئی تھی اور وہ روئی بھی تھیں۔ اس سے قبل کبھی ایسا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا۔ وہ تو کھانا بھی ایک سا کھاتی تھیں۔

ماہرین نفسیات کی حیرت کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ دونوں بہنوں نے انہیں ایک آواز ہو کر بتایا کہ "ہم ایک دوسرے کے اس قدر قریب ہیں کہ گویا ایک ہی شخصیت ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا کیا سوچ رہا ہے کیونکہ ہمارا دماغ ایک ہی ہے۔"

ان کے بارے میں یہ بھی پتہ چلا کہ صفائی اور غسل کے معاملے میں انتہائی جنونی ہیں صرف ایک ہفتے کے دوران ۱۴ عدد صابن اور شیمپو کی ۳ بڑی بوتلیں وہ استعمال کر لیتی تھیں ان کا بیشتر وقت ایک دوسرے کے بال دھلانے اور بنانے سنوارنے میں لگ جاتا تھا۔[2]

عدالت نے انہیں مقامی ادارے کے سپرد کر دیا۔ جہاں عموماً دماغی مریضوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ حالانکہ دونوں بہنیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔

کولمبس (جارجیا) کے علاقے میں ۱۹۷۰ء میں پیدا ہونے والی دو جڑواں بچیوں کا قصہ بھی دلچسپ ہے ماں باپ انہیں گریسی کینیڈی اور ورجینا کینیڈی کہتے تھے۔ یہ ابھی ۱۷ ماہ کی ہی تھیں کہ والدین نے محسوس کیا کہ بچیاں کوئی اور ہی زبان بولتی ہیں۔ جوں جوں یہ بڑی ہوتی گئیں ان کے مابین گفتگو میں صرف دو الفاظ ممی اور ڈیڈی کی شناخت ہوئی باقی تمام الفاظ ان دو کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھتا تھا۔ انہوں نے نہ صرف خود ساختہ زبان ایجاد کر لی تھی بلکہ اپنے نام بھی تبدیل کر رکھے تھے گریس اپنے آپ کو پوٹو Poto کہتی اور ورجینیا نے اپنا نام Cabenga رکھ چھوڑا تھا۔ کوئی انہیں پرانے ناموں سے پکارتا تو وہ توجہ نہیں کرتی تھیں اور انہوں نے انگریزی بولنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ آپس میں اپنی خفیہ زبان میں ہی گفتگو کیا کرتی تھیں۔

۷ برس کی عمر میں بچیوں کو کیلیفورنیا میں سانڈیاگو کے بچوں کے ہسپتال لے جایا گیا۔ یہاں ماہرین نے ان کی باہمی گفتگو ٹیپ کر لی۔ جب انہوں نے تجزیہ شروع کیا تو ان کا خیال تھا کہ بچیوں نے مقامی انگریزی زبان اور اپنی جرمن دادی اور جرمن/انگلش زبانیں بولنے والی ماں کے زیر تربیت یہ خفیہ زبان گھڑ لی

ہے۔ مگر بچیو ں کی گفتگو میں نامعلوم قواعد وانشاء، اسم، فعل اور صفت کے استعمال نے انہیں چکرا دیا۔ ماہرین نے جڑواں بچیو ں کے درمیان اسے خفیہ رابطے Idioglossia کا نام دیا۔[3]

کامل ایک برس کی تربیت سے بچیو ں نے اچانک ہی انگریزی زبان بولنا شروع کر دی اور خفیہ زبان کا استعمال ترک کر دیا۔ اب جو ماہرین نے ان کی پرانی گفتگو کی بابت دریافت کیا کہ ان جملوں کا کیا مفہوم ہے تو یہ بچیاں منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھی رہیں کہ ہم کیا جانیں یہ کیا زبان ہے۔ اس روز سے انہوں نے انگریزی بولنا شروع کر رکھی ہے۔ اور اپنی ذاتی خفیہ زبان کا راز نہ کھولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔

۱۹۳۹ء میں اوہائیو میں ایک خاتون کے ہاں دو ناجائز جڑواں بچوں کی ولادت ہوئی۔ دونوں بچوں کو دو علیحدہ علیحدہ گھرانوں نے گود لے لیا۔ ایک بچے کو لوئس گھرانہ رلما کے علاقے میں لے گیا جب کہ دوسرے بچے کو ۸۰ میل دور "ڈے ٹن" کے علاقے کی سپرنگر فیملی کے حوالے کر دیا گیا۔ ہر دو گھرانوں سے یہی کہا گیا کہ اس بچے کا جڑواں بھائی مر چکا ہے۔

چھ برس بعد بیگم لوئس نے گود لینے کی طویل قانونی مدت کی تکمیل پر عدالت سے رجوع کیا اور عدالت کو بتایا کہ انہوں نے بچے کا نام جیمز رکھا ہوا ہے مگر عدالت نے اسے حیرت میں ڈال دیا۔ ان کا حکم تھا کہ بچے کا نام جیمز رکھنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ بیگم لوئس کو اب یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ ان کے متبنہ بچے کا جڑواں بھائی درحقیقت زندہ ہے اور اسے گود لینے والوں نے بھی اس کا نام جیمز ہی رکھا ہے۔

۴۰ برس بعد جیمیز لوئس اپنے گمشدہ بھائی جیمز سپرنگر کو تلاش کرتا ہوا اس سے آن ملا دونوں نے ایک دوسرے کو بیتے ایام کی داستان سنائی تو یہ حیرت انگیز امور سامنے آئے۔ دونوں کو گود لینے والے گھرانے کی بیٹیوں کے نام لیری تھے۔ دونوں تعلیمی دور میں ایک جیسے مضامین میں کمزور رہے تھے۔ دونوں کی دلچسپی ایک ہی مضمون سے رہی تھی۔ دونوں نے کتا پالا تھا اور دونوں نے اپنے اپنے پالتو کتے کو ٹرائے کا نام دیا تھا۔ دونوں نے لنڈا نامی عورتوں سے شادی کی تھی اور پھر طلاق دے دی تھی اور پھر دونوں نے دوسری شادی کی تھی اور ان کی دوسری بیویوں کا نام بھی ایک ہی تھا۔ یعنی "بیٹی" دونوں کے اپنے اپنے پہلے بیٹوں کا نام "جیمز ایلان" ہی رکھا تھا۔ دونوں کی عادت رہی تھی کہ وہ ہر سال اپنی اپنی فیملی کو چھٹیوں میں فلوریڈا کے ایک ہی ساحل پر واقع ہوٹلوں میں لے جا کر ٹھہرا کرتے تھے۔ دونوں نے پٹرول پمپوں اور ریستورانوں پر ملازمت کی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے علاقوں میں سماجی خدمت سرانجام دی یعنی دونوں پارٹ ٹائم ڈپٹی شیرف کی ڈیوٹی دیتے رہے تھے۔ دونوں کا مشغلہ "لکڑی کا کام" تھا۔ اور ان تمام واقعات کے دوران انہیں ایک دوسرے کی موجودگی کے بارے میں قطعاً علم نہیں تھا۔

جسمانی طور پر بھی دونوں ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے تھے یعنی دونوں کا قد ۶ فٹ اور وزن ۱۸۰ پونڈ تھا۔ صحت سے متعلق دونوں ایک ہی قسم کے مسائل کا شکار رہے تھے۔ دونوں ایک ہی عمر میں ذہنی تناؤ اور دردِ شقیقہ کے مریض رہے تھے اور ایک ہی عمر میں ان امراض سے صحت یاب ہوئے اسی طرح دونوں کو ایک ہی قسم کی دل کی بیماری لاحق ہوئی اور عمر کے مخصوص حصے میں ایک ساتھ دیگر تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

یونیورسٹی آف منی سوٹا (امریکہ) کے ماہر نفسیات Thomas Bouchard کے زیر سرپرستی ایک تحقیقی پروگرام کا آغاز کیا گیا۔ اس کے تحت ۳۰ ایسے جڑواں افراد پر تحقیق کی گئی جو الگ الگ مقامات پر جداگانہ ماحول میں پرورش پاتے رہے۔ اس سلسلے میں چند دلچسپ واقعات سامنے آئے مثلاً دو جڑواں بہنوں مسز جین ہملٹن (سکاٹ لینڈ) اور مسز آئرن ریڈ (لیسسٹر) نے ایک طویل عرصہ کے بعد ملاقات کی اور ان کے بارے میں پتہ چلا کہ دونوں کو سر چکرانے اور خوف کی بیماریاں لاحق رہی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے ۴۴۰ میل دور رہتی تھیں مگر ان کی عادات میں کافی اشتراک تھا مثلاً دونوں کو پانی سے خوف رہتا تھا اور جب بھی کنبوں کے ہمراہ اپنے اپنے علاقوں میں سمندر کی سیر کو آتیں تو ساحل پر پانی کی جانب پشت کر کے بیٹھا کرتیں۔ دونوں نے جوانی میں سکاؤٹ تحریک میں کام کیا اور دونوں سنگھار کا سامان بنانے والی ایک ہی کمپنی کے لئے کام کرتی رہیں۔

دو اور جڑواں بہنیں مسز ہیر (لسیسٹر) اور مسز ڈوروتھی (بلیک برن) ۱۹۴۳ء میں پیدائش کے فوراً بعد الگ کر دی گئیں اور ان کی پرورش الگ الگ ماحول میں ہوئی۔ مگر دونوں کی شادی ایک ہی سال میں ہوئی۔ ایک نے اپنے بیٹے کا نام "رچرڈ اینڈریو" رکھا تو دوسری نے بیٹے کو "اینڈریو رچرڈ" کا نام دیا۔ دونوں نے اپنی اپنی جگہ پیانو بجانے کی تربیت ایک ہی حد تک حاصل کی اور موسیقی کا امتحان ایک جتنی تعلیم سے پاس کیا۔ دونوں کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی اور دونوں ڈائری لکھنے میں خاص ترتیب رکھتی تھیں اور ایک سال میں ایک ڈائری استعمال کرتی تھیں۔

دو جڑواں بھائیوں کا واقعہ اور بھی دلچسپ اور عجیب ہے۔ آسکر سٹوہی اور جیک یوفی کے والدین میں جھگڑا ہو گیا تو آسکر کو اس کی ماں اپنے ہمراہ جرمنی لے آئی اور جیک، یوفی اپنے والد کے ہمراہ ٹرینی ڈاڈ میں رہ گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۳۳ء کا ہے۔

جرمنی میں آسکر نازی نظام تعلیم سے متاثر ہو کر سرگرم نازی پیروکار بن گیا۔ وہ صرف جرمن زبان جانتا تھا اور پکا یہودی دشمن اور سچا نازی بن چکا تھا۔

اب ادھر ٹرینی ڈاڈ کی سنئے۔ وہاں جیک یوفی اپنے کٹر یہودی باپ کی زیر تربیت یہودیت کی تعلیم پا کر ایک سرگرم یہودی کے طور پر جانا پہچانا جا رہا تھا۔ وہ صرف انگریزی بولتا تھا۔ سمندر پار دونوں بھائی شیر خواری کے زمانے سے بچھڑے۔ متضاد ماحول میں پرورش پاتے رہے مگر ان کی عادات ایک سی تھیں۔ وہ رسالے کو آخر صفحہ سے شروع کر کے پیچھے کو پڑھا کرتے۔ دونوں کو کلائیوں پر ربڑ بینڈ بے دھیانی میں اس حد تک لپیٹتے چلے جانے کی عادت تھی کہ کلائی زخمی کر بیٹھتے دونوں کو عجیب سے مذاق کی عادت تھی۔ یہ اپنے اپنے علاقوں میں لوگوں کی بھیڑ میں ہسٹریا کے مریضوں کی مانند زمین پر گرنے اور لوگوں کو خوفزدہ کرنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے تھے۔

۴۶ برس بعد ایک زمانے کے بچھڑے ہوئے جڑواں بھائی پہلی بار منی سوٹا کے ائیرپورٹ پر ملے تو یہ عجیب نظارہ تھا۔ دونوں نے بالکل ایک جیسے لباس زیب تن کر رکھے تھے اور آنکھوں پر چوکور شیشے کی عینکیں لگا رکھی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر تھے۔ مگر واقعہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے سے شدید نفرت رکھنے والے نازیت اور یہودیت کے متضاد فلسفہ کے حامل دو بھائی آنکھوں میں آنسو بھرے ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ (4)

# نابغہ بچے

عقل و دانش کے حوالے سے ایک اور معمہ نابغہ یا جینئس بچے ہیں۔ یعنی وہ بچے جو تعجب خیز ذہانت کے مالک ہیں۔ افلاطون نے ایسے بچوں کو "سنہرے بچے" قرار دیتے ہوئے ان کے نابغہ ہونے کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ایسے بچے کے والدین بھی عقل مند ہوں؟ یا پھر یہ پیدائش کی خصوصی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں؟

۱۹۸۰ء میں ایلسکونڈیڈو کیلے فورنیا میں ایک کروڑ پتی رابرٹ گراہم نے "نوبل سپرم بنک" قائم کیا جہاں نوبل انعام یافتہ لوگوں کے جنسی جرثومے محفوظ کیے گئے تھے۔ ایک تجربے میں ایک ماہر کمپیوٹر کے جرثوموں کا ایک خاتون کے جرثوموں سے ملاپ کرایا گیا تو جو بچہ پیدا ہوا وہ ایک نابغہ بچہ تھا۔ اگست ۱۹۸۲ء میں پیدا ہونے والے اس بچے ڈارون کا ذہن اپنے ہم عمر دو سال کے بچے سے دوگنا زیادہ کام کرتا تھا۔ تو کیا نابغہ بچے کے والدین کا نابغہ ہونا ضروری ہے؟ نہیں ــــ! البرٹ آئن سٹائن کی مثال سامنے ہے۔ جس کا باپ عام سا آدمی تھا۔ اور ماں بھی ایسی ہی تھی۔ دیگر لوگوں میں محمد علی جناح، علامہ اقبال، لیونا رڈو ڈاونچی اور موزارٹ ہیں۔ آخر الذکر گو ۳۵ سال کی عمر میں وفات پا گیا تھا لیکن موسیقی کی دنیا میں امر ہو گیا۔ وہ پانچ برس کی عمر میں دھنیں ترتیب دینے لگ گیا تھا۔ (5)

تو گویا اس سلسلے میں والدین کی تخصیص ضروری نہیں۔ جیسا کہ مشہور لطیفہ ہے کہ جارج برنارڈ شا جیسے ذہین شخص سے ایک حسین و جمیل اداکارہ نے کہا تھا کہ برنارڈ شا اور اس کے ملاپ سے ایک ایسا نابغہ بچہ پیدا ہو گا جو حسین اور دانش مند ہو۔ لیکن برنارڈ شا نے افسوس سے کہا کہ اگر اس بچے نے صورت باپ سے اور دماغ ماں سے وراثت میں پایا تو کیا ہو گا؟

ان نابغہ بچوں سے ناقابل یقین باتیں وابستہ ہوتیں ہیں۔ جیسے گوئٹھ کے بارے میں کہتے ہیں کہ ۳ برس کی عمر میں یونانی زبان پڑھنے لگا تھا۔ شاعر تھامس بینگٹن میکالے نے ایک سال کی عمر میں والدین سے کہا تھا کہ "کیا اس چمنی کا دھواں جہنم سے آ رہا ہے" اس وقت وہ کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اسی طرح ۹ مئی ۱۹۴۸ء کو پیدا ہونے والے بچے آکیلا نے ۲ برس کی عمر سے ٹی وی نشریات سے مختلف مقامات کے ٹیلی فون نمبر یاد کرنا شروع کر دیئے تھے اور تین برس کی عمر تک اچھا شاطر بن گیا تھا۔

نابغہ بچے بسا اوقات اپنے اور دوسروں کے لئے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی ذہنی سطح اوروں سے آگے کام کرتی ہے جیسا کہ اس واقعہ

سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یوکرین (روس) کے رہنے والے بچے گرشن نے محض چار ماہ کی عمر میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ آٹھ ماہ کی عمر میں چلنا اور بمشکل ایک برس کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا۔ سات برس کی عمر میں اسے نسبتاً اگلی کلاس میں داخلہ نہیں دیا گیا اور بے چارہ اپنے ہم عمروں میں خبطی مشہور ہوا اور نکو بنا رہا۔ ہم جماعتوں کی مار پیٹ سے تنگ آ کر اس کی ماں نے نوکری چھوڑ کر اسے گھر ہی میں پڑھانا شروع کیا تو مقامی حکومتی کارندوں نے اسے پاگل خانے بھجوا دیا کہ یہ

نابغہ بچہ : ولیم سیڈیز

عورت بچے کی تربیت اور پرورش کے بہانے اسے اسکول نہیں بھیجتی اور خود بھی ملازمت چھوڑ رکھی ہے۔

یوں نابغہ بچے کی زندگی کا دردناک پہلو سامنے آتا ہے۔ وہ بے چارہ اپنی نصابی کتب سے اونچی سوچ رکھنے کے سبب ہم جماعتوں میں "بڑا آیا علامہ" کے طنز کے ساتھ ساتھ پڑھائی سے بے زار، تا چلا جاتا ہے۔ لیکن روسی بچے کا پھر بھی کچھ نہ کچھ انتظام ہو گیا کہ قید کے چند ہی ہفتوں بعد عزیز و اقرباء اس کی ماں کو آزاد کرا لائے اور آخر کار ۱۹۸۷ء میں ماسکو سٹیٹ یونیورسٹی میں شعبہ طبیعات میں اس کے بچے کو اپنی عمر سے ۱۰ برس بڑے طالبان علم کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔

افلاطون کا خیال تھا کہ اگر نابغہ بچے کی ابتدا ہی سے شناخت ہو جائے اور ان بچوں کو فلسفہ اور مابعد الطبیعات کا علم حاصل کرنے میں حوصلہ افزائی کی جائے تو ایسے بچے صرف ایک نسل کے بعد دنیا کو تبدیل کر کے رکھ دیں گے۔ مگر سوال وہی ہے کہ نابغہ بچے، نابغہ کیوں اور کس طرح ہوتے ہیں؟ کیا تعلیمی دباؤ اور غیر معمولی توجہ سے بچے نابغہ بن جاتے ہیں؟ شائد اس کا جواب نہیں میں ہی ہے۔ لیکن ۱۸۹۸ء میں پیدا ہونے والے نابغہ شخص ولیم جیمز سڈس کے باپ کا بھی یہی خیال تھا چنانچہ ولیم سیڈس کی پیدائش پر اس نے اپنے نظریئے کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ بچہ ابھی نو ماہ کا تھا کہ اسے حروف تہجی کے بلاک کھیلنے کے لئے دیئے گئے۔ وہ صرف چار برس کی عمر میں انگلش اور فرنچ زبانیں ٹائپ کرنے لگا تھا۔ باپ نے بچے کے ذہن پر بڑا بوجھ ڈال دیا تھا مگر اسے یقین ہو رہا تھا کہ اس کا خیال درست ہے کہ بچوں کو جتنا مرضی پڑھایا جائے وہ اتنی زیادہ تعلیم حاصل کرتے جائیں گے۔

ولیم کو اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ پہلی جماعت میں وہ کسور اعشاریہ کے بارے میں اپنے استاد سے زیادہ جانتا تھا۔ صرف ۶ ماہ میں اس نے اسکول کی تعلیم کے ۷ برس کا کام مکمل کر لیا۔ وہ ۸ سال کا تھا اور اسے ۶ زبانیں آتی تھیں۔ اگلے سال اسے ہاورڈ میں داخلے کی اجازت نہ ملی کیونکہ ان کے خیال میں اس کی عمر بہت کم تھی۔

۱۱ برس کی عمر میں جب وہ ہاورڈ میں داخل ہوا تو وہ ادارے کی تاریخ کا سب سے کم سن طالب علم تھا۔ سال اول میں اس نے فورتھ ڈائی منشن کے

موضوع پر لیکچر دیا۔ ۱۰۰ سامعین جن میں اساتذہ اور طلبہ سب شامل تھے اسے دیکھ کر حیران تھے اور سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سوں کے تو پلے ہی نہ پڑا تھا کہ یہ لڑکا کیا کہہ رہا ہے۔ اگلے روز کے اخبارات میں اس کے لیکچر کی دھوم مچی ہوئی تھی۔

لیکن اگلا برس کچھ خراب ہو گیا ولیم کا ذہن بہت تھک گیا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ٹھیک ہوا تو پھر سے کالج جانے لگا۔ مگر والدین سے بڑا تنگ آ گیا۔ وہ لوگ اسے ابھی تک چھوٹے عام لڑکوں کی طرح کے لباس پہننے کو دیتے تھے۔ ۱۶ برس کی عمر میں وہ کالج سے فارغ ہو گیا۔ مگر اس کے دل میں باپ سے شدید نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ ابنارمل تھا۔ گندے کپڑوں میں رہتا۔ اور شاذ ہی نہاتا۔ کہتا تھا کہ مکمل زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اور مکمل زندگی کا مفہوم اس کے نزدیک تنہائی تھا۔ چنانچہ اس نے ساری زندگی شادی نہ کی اور کلرکی کرتا رہا۔ ایک اخباری نمائندے نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اس کے بارے میں اخبار میں خبر دی تو اس نے اخبار پر دعویٰ کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ شمار کرنے والی مشین چلاتا رہوں مگر یہ مجھے تنہا نہیں رہنے دیتے۔ وہ ۱۹۴۴ء میں ۴۶ برس کی عمر میں فوت ہو گیا۔

برطانوی نابغہ بچی روتھ لارنس نے محض ۱۳ برس کی عمر میں آکسفورڈ سے ریاضی کے شعبے میں اول درجے کی ڈگری حاصل کی۔ یہ بچی سکاٹ لینڈ کے نابغہ کولن میک لارن کا قائم کردہ ریکارڈ (۱۷۱۷ء) توڑنے کی کوشش کر رہی ہے جو ۱۹ برس کی عمر میں ایبرڈین کے ماریشل کالج میں پروفیسر کی خدمات انجام دینے لگ گیا تھا۔ اس کی اور جینیر سڈس کی کہانی میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں کی تربیت میں والدین کا بہت ہاتھ ہے۔ جب اس کے باپ کو بچی کی غیر معمولی ذہانت کا علم ہوا تو اس نے اپنا کمپیوٹر کا کام چھوڑ کر بچی کی تعلیم و تربیت خود سنبھال لی۔ چنانچہ ماہرین نفسیات کے خیال میں بچی کی حیران کن شخصیت میں اس کے ذہین والد کی سخت محنت کا ہاتھ ہے۔

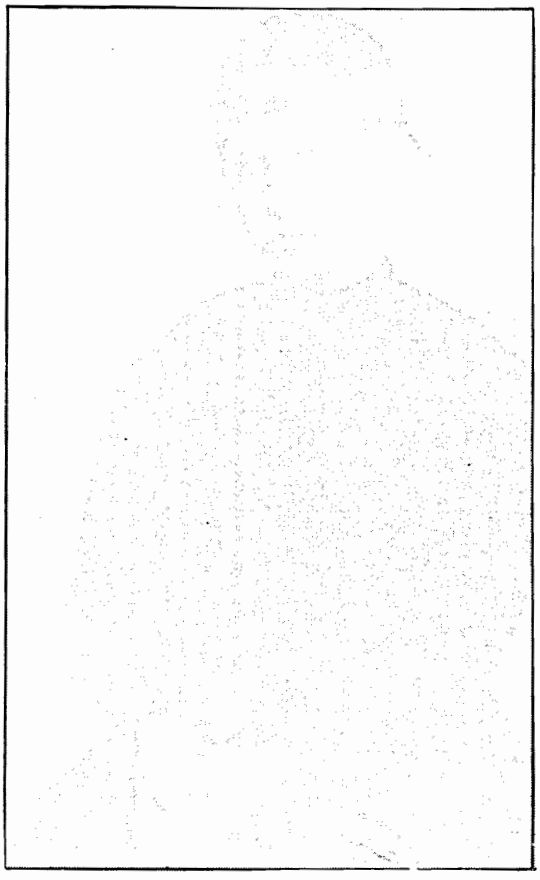

نابغہ بچہ : جان نی

مگر نابغہ بچوں کے اعلیٰ ذہن کے پیچھے صرف والدین کی تربیت کا مفروضہ ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب وے برج (سرے) کے رہنے والے انتھونی میکون کا احوال سامنے آتا ہے۔ وہ دو سال کی عمر میں شیکسپیئر کے اقوال کا حوالے دینے لگ گیا تھا۔ اور اسی عمر سے لاطینی بھی بول لیتا۔ اس کے باپ کا کہنا ہے کہ وہ بذات خود کوئی غیر معمولی ذہانت کا مالک نہیں ہے اور نہ ہی کبھی انتھونی کی تربیت میں کسی نے کوئی خاص کردار ادا کیا ہے۔ بلکہ اسے بار بار انتھونی کی عجیب و غریب باتوں کی تصدیق کے لئے ایک عدد انسائیکلوپیڈیا بھی خرید کر لانا پڑا کہ بچہ ایسے ہی اڑا تو نہیں رہا۔ ادھر انتھونی ہے کہ باپ کی گفتگو میں غلطیاں بھی نکالتا ہے۔

۱۹۸۴ء میں صحافیوں نے انتھونی سے اس کی زبان و ادب سے غیر معمولی واقفیت کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ایک عجیب بات کہی کہ اس کی تمام معلومات کا ذریعہ ایک نادیدہ دوست ایڈم ہے جو سیاہ بالوں، بھوری آنکھوں اور ڈاڑھی والا پراسرار شخص ہے۔

اینڈراگون ڈی میلو کا واقعہ بھی ایسا ہی ہے۔ اس لڑکے نے گیارہ برس کی عمر میں سانتا کروز میں یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے ریاضی میں ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ ۱۹۷۷ء میں پیدا ہوا۔ ابھی سات ہفتے کا تھا کہ ایک روز اس کے والدین نے سنا کہ وہ انہیں "ہیلو" کہہ رہا ہے۔ ڈھائی سال کی عمر میں وہ جیومیٹری کے مسئلوں کو سمجھنے لگا تھا۔ اسی عمر میں اس نے شطرنج کھیلنا شروع کر دی تھی۔ تین برس کی عمر میں اس نے اپنے غسل کے ٹب کا حجم خود ہی نکال لیا۔ ۴ برس کی عمر میں وہ یونانی زبان، فلسفہ اور طبیعات سیکھنے لگ گیا تھا۔ ۶ سال کی عمر میں اس نے ارضیات اور جیوفزکس پڑھنے شروع کر دیئے اور آٹھویں سال میں کمپیوٹر کے پیچیدہ پروگرام تشکیل دینے لگ گیا۔ اس کا باپ آگسٹائین گنار بجاتا ہے۔ اس نے اقرار کیا کہ اپنے بیٹے کی غیر معمولی ذہانت کا سبب کم از کم اس کی ذات نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ خود ذہین آدمی ہے نہ ہی اس نے ڈی میلو کی کوئی خاص تربیت کی ہے، بلکہ بعض اوقات نابغہ بچے کا باپ ہونا اسے خوف زدہ کر دیتا ہے۔

اگر کسی شخص کے بچے یا بچی میں بچپن سے ہی کسی مضمون کے بارے میں غیر معمولی قابلیت دیکھنے میں آئے تو کیا یہ رویہ درست ہو گا کہ والدین اور اساتذہ اسے اس مضمون میں خوب محنت کرنے پر مجبور کریں؟ مالورن کالج کے ریاضی کے پروفیسر جان نی کے بیانات سے کچھ خدشات سامنے آئے ہیں۔

جان نی بذات خود ایک نابغہ بچہ تھا۔ اس کی والدہ ایک نرس اور والد اکاؤنٹس کلرک تھے۔ جان کو آسٹریلیا میں ۳ سال کی عمر میں نرسری سکول سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا تھا کہ تم بہت چالاک و ہوشیار ہو۔ نی نے صرف ۲ برس کی عمر میں پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اور تیرہ برس کی عمر میں آٹھ 'ولیول کامیابی سے طے کر لئے۔ سترہ برس کی عمر میں اس نے کیمبرج کے سینٹ جان کالج سے اوپن سکالرشپ حاصل کیا اور یہیں سے ریاضی میں اول درجے کی ڈگری لی۔

جان نی کہتا ہے کہ بچہ کا نابغہ ہونا اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہیں۔ اسے یاد ہے کہ اس کا ایک ہم مکتب طالب علم بھی بڑا نابغہ ہوا کرتا تھا مگر ایک روز وہ ادارے سے غائب ہو گیا۔ معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ اس لڑکے کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے کیونکہ لوگوں نے اس بے چارے سے ضرورت سے زائد توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ بس اس وقت سے جان نی کو نابغہ کہلانے سے چڑ ہو گئی۔ وہ کہتا ہے کہ اگر بچپن میں کسی بچے کے والدین یہ دیکھ لیں کہ ان کا بچہ ریاضی میں دوسروں سے بہتر ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے ننھا آئن سٹائن سمجھ کر غیر معمولی کارناموں کی امید لگا لی جائے۔

جان نی کے کہنے کے مطابق جس طرح پودوں کو "ہاٹ ہاؤس" میں رکھ کر زبردستی اگایا جاتا ہے۔ اس طرح سے بچوں کو جنہیں قدرت نے کوئی صلاحیت ودیعت کر دی ہوتی ہے پر معاشرہ اس انداز سے اثر انداز ہوتا ہے کہ ایسے معصوم بچے "ہاٹ ہاؤس" کے قیدی بن جاتے ہیں۔ وہ لوگوں کی امیدوں پر پورا اترنے کے لئے جان توڑ محنت کرتے ہیں اور ابنارمل ہو جاتے ہیں تاکہ کوئی ان کا نابغہ ہونے کا اعزاز چھین نہ لے۔ چنانچہ ایسے بچے جنہیں خداداد صلاحیتوں کا حامل یا نابغہ قسم کے القابات ملتے ہیں انہیں محتاط رہنا چاہئے کہ کہیں لوگوں کی غیر حقیقت پسندانہ امیدیں انہیں تباہ نہ کر دیں۔

ماہر نفسیات جون فری مین جو "یورپین کاؤنسل فار ہائی ایبلٹی" کی صدر بھی ہے۔ اپنی تصنیف "گفٹڈ چلڈرن ــــ گروئنگ اپ" میں اپنے مشاہدات بیان کرتی ہے کہ ناکامی کا خوف ایسے بچوں کے لئے ذاتی طور پر ایک بہت بڑا عذاب ہوتا ہے۔ اور ایسے بچے عموماً والدین اور اسکول کے دباؤ میں آ کر ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بچے ناکامی کے خوف سے امتحان دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔

۱۹۹۲ء میں برطانیہ سے سب سے کم عمر گریجوئٹ کا اعزاز حاصل کرنے والے بچے گنیش ستام پالم نے ۱۳ برس کی عمر میں ریاضی فرسٹ کلاس میں آنرز میں کامیابی کے بعد یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔ اس کے والدین کا رویہ اس سلسلے میں قابل غور ہے۔

گنیش اپنے سری لنکن والدین کے ہمراہ ساوتھ لندن میں رہتا ہے۔ اس لڑکے کی زندگی خاصی نارمل ہے۔ کیونکہ یہ اپنی عمر کے مطابق کھیل کھیلتا ہے۔ والدین کو جب ۵ برس کی عمر کے بیٹے کی ریاضی میں ذہانت کا علم ہوا تو انہوں نے کبھی بچے پر دباؤ نہیں ڈالا کہ وہ ریاضی کا بھوت سوار کر لے اس کے بجائے انہوں نے گنیش کو ریاضی مشغلے کے طور پر اپنانے پر اصرار کیا ہے۔ وگرنہ اس کا بچپن تباہ ہو جاتا۔ انہوں نے نیشنل ایسوسی ایشن فار گفٹڈ چلڈرن کی رکنیت بھی اختیار کر لی ہے۔ جس کی ۲۰۰۰ فیملیاں ممبر ہیں۔

ایسوسی ایشن کے صدر مائیکل سٹورٹ کا کہنا ہے کہ اس گھرانے نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ اپنے خداداد صلاحیتوں کے حامل بچے کی حوصلہ افزائی اس انداز میں کر سکتے ہیں کہ ناکامی کے اس خوف سے جو کامیابی کے حصول کی مشکلات سے مقابلہ کرنے سے پہلے پیدا ہو سکتا ہے کے بغیر بھرپور توانائی بروئے کار لا سکے۔

نابغہ بچے نابغہ کیوں ہوتے ہیں؟

بچے کی کردار سازی میں اس کے موروثی اثرات، ماحول، تعلیم و تربیت اور جسمانی نظام عمل مل جل کر کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر ایک سچا نابغہ بچہ ان تمام عوامل کے خلاف ایک نئی چیز بن کر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تنوع کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ فی الحال قدرت کا ایک راز ہے۔

# روح

غاروں کے زمانے میں انسان نیند کے عالم میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا بھاگتا دوڑتا اور مردہ عزیز و اقرباء سے ملتا جلتا دیکھتا تھا۔ مگر آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو پہلی جگہ پھر ویسے ہی دراز پاتا۔ یہ معمہ اس کے لئے بڑا حیرت انگیز تھا۔ اس نے اس کی یہ توجیہہ کی کہ ضرور اس کے اندر کوئی اور چیز ہے جو سونے کی حالت میں اس کے بدن میں سے نکل کر گھومتی پھرتی ہے اور بیدار ہونے پر لوٹ آتی ہے۔ یہ چیز روح کہلائی۔

روح کا یہ تصور مرور زمانہ کے ہاتھوں تہذیبوں میں پھیلتا چلا گیا اور سوائے بدھ مت کے ہر مذہب کی اساس میں لازمی عنصر کے طور پر شامل رہا۔ موت کے بارے میں انسانی مشاہدہ یہ تھا کہ آدمی کا سانس رک جاتا ہے پس یہ اعتقاد ہو گیا کہ روح کا مسکن انسانی سانس ہے۔ چونکہ سانس میں ہوا کے جھونکے آتے ہیں۔ لہٰذا جس تہذیب میں بھی روح کا نیا یا پرانا تصور موجود ہے وہاں روح کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ کا مفہوم "ہوا کا جھونکا" ہی ہوتا ہے۔ مثلاً عبرانی زبان کا رواح، عربی کا روح، ہندی کا آتما، یونانی زبان کا سائیکی اور لاطینی زبان کا اینما۔ سب کے معنی ہوا کا جھونکا ہی ہیں۔[6]

ایٹم کا تصور دینے والے یونانی مفکر دمقراط کا کہنا تھا کہ نیند کی حالت میں جسم سے کچھ ایٹم باہر نکل جاتے ہیں اور ان کے واپس پلٹ آنے پر شخص بیدار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ نہ لوٹیں تو آدمی پر موت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ایٹم "روح" کے قائم مقام ہیں۔ جیسے قدیم صحیفے اپنشد میں درج ہے کہ جب کوئی شخص سو رہا ہو تو اسے جھنجوڑ کر نہیں جگاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی آتما (روح) جو ادھر ادھر گھومتی پھر رہی ہے واپس جسم میں نہ آ سکے۔ اور وہ شخص کسی لاعلاج بیماری کا شکار ہو جائے۔ ایسے ہی مشکوٰۃ کی حدیث میں ہے کہ "نیند آدھی موت ہے۔"

مذہب کی رو سے روح کی اساس غیر مادی ہے۔ یعنی جسم (مادی) اور روح (غیر مادی) میں ثنویت ہے۔ مادی جسم میں حرکت، فکر و شعور فیصلہ اور عقل کی حامل روح ہی ہے۔ انجیل میں روح کو قوت حیات کہا گیا۔ پہلے پہل سائنس دانوں کا خیال تھا کہ روح ایک پراسرار قوت ہے اور اس کے ہونے کی سب سے بڑی شہادت کیمیائی مرکبات کی وہ قسم ہے جسے نامیاتی مرکبات یا Organic Compounds کہا جاتا ہے۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ یہ نامیاتی مرکبات صرف زندہ اجسام پودوں اور حیوانوں میں تیار ہوتے ہیں مگر بیرونی طور پر ان کی تیاری ممکن نہیں مثلاً یوریا ایک مادہ ہے جو جانوروں کے پیشاب میں پایا جاتا ہے۔ اس کی تیاری تجربہ گاہ میں ناممکن سمجھی جاتی تھی۔ کہا گیا کہ اس قسم کے کیمیائی مادوں کی تیاری کے لئے ایک خاص قسم کی قوت کی ضرورت ہوتی ہے جو زندہ اجسام میں پائی جاتی ہے۔ اسے قوت حیات، وائٹل فورس یا قوت حیوانیہ کہا گیا۔ یعنی طے پایا کہ روحی قوت ہی نامیاتی مرکبات بنا سکتی ہے۔ مگر کولب اور ووہلر نے جب تجربہ گاہ میں نامیاتی مرکبات تیار کر دکھائے تو قوت حیوانیہ کا نظریہ باطل قرار پایا اور زندگی کی میکانکی تعبیر کرنے والوں کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اس سے پہلے

مفکرین کا ایک بڑا گروہ کہتا چلا آ رہا تھا کہ زندگی مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ اسکا الگ خارجی وجود بھی ہے۔ یہ زندگی ایک قوت ہے جسے انہوں نے مختلف ناموں سے پکارا مثلاً برگساں نے اسے جوشش حیات Elan Vital یا قوت حیات کہا اوسبورن نے Aristogenesis کا نام دیا۔ برگ نے Nomogenesis اور روسا نے Hologenesis بتایا سمٹس نے Holism اور ڈریش نے Entelechy سے تعبیر کیا۔ سی ایم ولیم اسے Genetic Energy کہتا تھا۔ ایڈورڈ کوپ Bathnic Force اور بی مور Biotic Energy کا نام دیتا تھا۔ ولیم میکڈوگل نے اسی توانائی کو روح یا Soul کہہ کر پکارا تھا۔(7)

بحث اور تجربات کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ ایک مرے ہوئے شخص کو حساس ترازو میں رکھا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ موت واقع ہونے پر بدن کا وزن معمولی سا کم ہو گیا ہے۔ وزن میں اسی معمولی تبدیلی کو روح کی روانگی سے تعبیر کیا گیا اور کہا گیا کہ روح کا وزن کر لیا گیا ہے۔ مگر معترضین نے ثابت کر دکھایا کہ وزن میں یہ تبدیلی مرنے والے کے پھیپھڑوں سے نکلنے والی آخری ہوا کے نتیجے میں سامنے آئی۔

اگلے مرحلے میں انسانی جسم کا کیمیائی تجزیہ کیا گیا کہ اس کی ترکیب کیا ہے۔ اس تجزیئے کے مطابق ایک عام آدمی میں دس گیلن پانی ہوتا ہے۔ چربی اتنی ہوتی ہے جس سے صابن کی سات عدد ٹکیاں بن سکیں۔ کلر بن اتنا ہوتا ہے کہ اس سے نو ہزار پنسلیں بنائی جا سکیں۔ اتنی فاسفورس ہے جس سے ماچس کی دو ہزار تیلیاں بنائی جا سکیں۔ لوہے کی اتنی مقدار ہے جس سے ۴ گرام ایک کیل بنائی جا سکے۔ چونے کی اتنی مقدار جو مرغی کے ڈربے میں سفیدی کے لئے کافی ہو۔ اس کے علاوہ سلفر اور میگنیشیم کی کچھ مقدار اور بس۔ مگر یہ سب تو غیر زندہ مادے ہیں پھر ان کے ملاپ سے ہم ایک جیتا جاگتا وجود کیوں بنا نہیں پاتے۔ ہم گہرائی میں جاتے ہوئے زندگی کی بنیادی اکائی "خلیہ" تک اتر آئے مگر اس کے تجزیئے نے کیا بتایا؟ یہی کہ وہ محض چند ایٹموں اور مالیکیولوں کا مجموعہ ہے۔ یوں ہم نے جان لیا کہ "زندہ اجسام اور غیر ذی حیات مادہ میں ایک خلا (GAP) ہے۔ سوال یہ تھا کہ اس خلا کو کس طرح پر کیا جائے۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ خلیات کا مطالعہ اس خلا کو پورا کر دے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ اس سے خلا کی وسعت اور بڑھ گئی اور زندگی کی بلند سطح تو ایک طرف اس کی پست ترین شکل اور غیر ذی حیات مادہ میں جو بعد تھا وہ اور کشادہ ہو گیا۔ (ای بی ولسن۔ دی سیل ڈیولپمنٹ اینڈ ہیری ان ٹنس۔ )(8)

مروجہ عقائد کی رو سے خالق کائنات نے روز آفرینش، بہت بڑی تعداد میں روحوں کو ایک بار ہی پیدا کر لیا جنہیں زمین پر بھیجا جانا تھا۔ چنانچہ شکم مادر میں بچے کی ابتدائی حالت میں ایک روح جنین میں داخل ہو جاتی ہے اور موت کے وقت بدن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یوں کروڑوں سال سے بھی پہلے کسی نامعلوم زمانے میں پیدا شدہ روحیں اس بات کی منتظر چلی آ رہی ہیں کہ کس وقت انہیں زمین پر اپنے بدن کے قفس میں داخل ہونا ہے یہ روح باشعور، توانا اور ناطق ہے اور ادراک بالحواس کو متحرک رکھتی ہے۔

روح کے اس مروجہ نظریئے سے اختلاف رکھنے والوں کا اعتراض یہ ہے کہ زمان و مکان ان روحوں پر کس طرح اثر انداز نہیں ہو رہا۔ دنیا میں آنے سے پہلے یہ لاکھوں برس کی عمر عالم بالا میں بسر کر چکی ہوتی ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ بچے کے بدن میں آ کر ان کا سارا تجربہ، گفتگو کی صلاحیت اور دیگر قویٰ صفر ہو جاتے ہیں۔ ہزاروں کروڑوں برس کے دوران ان کے ذہنوں کی سطح پر کیا اثر پڑا۔ بول چال اور قادر الکلامی کی صلاحیت نومولود میں آ کر گنگ کیوں ہو جاتی ہے۔(9) اور پھر جیسے جیسے بچہ بڑا ہوتا جاتا ہے اس کا شعوری ارتقاء بھی جاری رہتا ہے۔ تو اس کے ساتھ روح بھی ارتقاء پانے لگتی ہے ایسے کہ جیسے روح کا ذہن بھی فہم و فراست میں ترقی کر رہا ہو۔ اسی طرح بدن کے ضعف کے ساتھ ساتھ روح بھی ضعف اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ کیوں؟ اگر روح کی عمر نہیں بڑھ رہی تو پھر وہ دنیاوی عمر کے ہر حصے میں مستقل ذہانت کا ثبوت کیوں نہیں دیتی؟ بدن میں آنے والی تبدیلیوں میں برابر کی شریک کیوں ہوتی ہے؟

اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ درحقیقت روح ناطق ہے۔ بات چیت سننے سمجھنے اور اس پر ردعمل کا اظہار کرنے کی صلاحیت اسی میں پیدائش سے پہلے اور بعد بھی موجود ہوتی ہے۔ مگر ان تینوں امور پر کام کرنے کے لئے اسے انسانی بدن کے جن ذرائع (خصوصاً دماغ) کی بطور واسطہ ضرورت پڑتی ہے وہ بچپن میں کمزور ہوتے ہیں۔ مثال یوں ہوئی کہ ریڈیو اسٹیشن (روح) کی ٹرانسمشن تو جاری رہتی ہے مگر ریڈیو (بچے کا بدن) اگر خراب (کمزور) ہو اور ریڈیائی لہروں کو پکڑ کر براڈ کاسٹ نہ کر رہا ہو تو اس میں ریڈیو سٹیشن (روح) کا کیا قصور۔ ہاں مگر جب ریڈیو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کی قوت بڑھا دی جاتی ہے (بچے کے تن و دماغ کی نشوونما ہو جاتی ہے) تو وہ بخوبی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ روح کو اپنی خوبیوں کے اظہار پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اعضائے جسمانی کی مضبوطی کی ضرورت ہوتی ہے۔

مگر یہ بات بھی درست معلوم نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر مغل شہنشاہ اکبر اعظم کا ارادہ ہوا کہ معلوم کرے کہ نسل انسانی کی اصل زبان کیا ہے؟ کیونکہ یہ رنگ برنگی بولیاں تو مختلف نسلوں اور قبیلوں کے گروہ اپنے بچوں کو سکھا دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک انسانی بچے کی آبادی سے دور جنگل میں پرورش کی گئی جس کا واحد رابطہ ایک گونگا شخص تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ بچہ کس قسم کی زبان استعمال کرتا ہے اور وہی نسل انسانی کی اصل فطری زبان ہوگی۔ مگر جب وہ کافی عرصہ بعد واپس بلایا گیا۔ تو لڑکے کو انسانی آبادی کے بارے میں کچھ خبر نہ تھی اور نہ ہی اسے کوئی زبان آتی تھی۔ بلکہ جانوروں کی سی آواز نکالتا تھا۔ ثابت ہوا کہ روح حواس کی محتاج ہے۔ اور اس مرحلے پر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے تب بھی ٹھیک ہوگا۔ کیونکہ اگر روح کا حقیقی وجود ہوتا تو وہ اس قسم کے پیدائشی جنگلی لوگوں کے بجائے اپنی کوئی زبان استعمال کرتی۔

یوں مخالفین نظریہ روح کے نزدیک جسم کے افعال کو کنٹرول کرنے والی قوت در حقیقت دماغ اور شعور ہے اور روح نامی کی کوئی خارجی شے اور فی نفسہٖ بدن سے الگ شے کا وجود نہیں ہے۔ چنانچہ روح (در حقیقت ذہنی توانائی) کا بدن سے وہی تعلق ہے جو بھاپ کی قوت کا انجن سے ہے۔ اور زندگی ایک میکانکی نظام کے تحت رواں دواں ہے۔

لیکن زندہ اجسام میں توانائی کا یہ منبع کس طرح سے شروع ہوا۔ اس نے شعور کے ساتھ کس طرح ساتھ دیا؟ اس توانائی کی نوعیت کیا ہے؟ یہ سب ایک معمہ ہے۔ اوسپنسکی کے الفاظ میں "ہماری سائنس زندگی اور اس کی ابتداء کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتی۔ یہ معمہ معمہ ہی رہ جاتا ہے۔ ایک زندہ جسم، زندہ خلیہ اور نخزمایہ (پروٹوپلازم) میں کچھ ایسی چیز ہے جو ناقابل فہم ہے۔ یہی ناقابل فہم چیز ہے جو ذی حیات مادہ کو غیر ذی حیات مادے سے ممتاز کرتی ہے۔ ہم اسے صرف اس کے افعال سے پہچان سکتے ہیں۔

اس کا سب سے اہم عمل یا فنکشن عمل تولید ہے یہ چیز مردہ جسم، مردہ خلئے اور مردہ مادے میں نہیں پائی جاتی۔ ایک ذی حیات جسم اپنے آپ کو لامحدود طور پر (تولید کے ذریعے) پھیلاتا چلا جاتا ہے اور اس کے لئے غیر ذی حیات مادے کو اپنے اندر جذب کرتا رہتا ہے۔ یہی زندگی کا وہ عمل ہے جس کی ماہیت سمجھائی نہیں جا سکتی لیکن یہ طے ہے کہ مادیت کے حامیوں کا یہ خیال کہ زندگی میکینیکل قوتوں کے عمل کے نتیجے میں سامنے آئی۔ بالکل غلط ہے"۔[10]

- (Tertium Organum)

# ذہانت

ہم انسان ہوموسپین کہلاتے ہیں (یہ لفظ لاطینی الفاظ سے مل کر بنا ہے جن کا مفہوم ہے عقل مند آدمی) ہماری تاریخ سے لاکھوں سال پہلے زمین پر کم عقل حیوان پھرا کرتے تھے۔ جن میں سے ایک نے دو پیروں پر چلنا شروع کر دیا۔ جس لمحے اس دو پایہ مخلوق کو ذہانت "ملی" وہ ہوموسپین ہو گیا۔ ذہانت کے تحفے نے اسے کرہ ارض کی بادشاہت کا تاج پہنا دیا۔ اس میں گفتگو کرنے، باہمی تعاون کرنے، اجتماعیت اور ایجادات کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہو گئیں۔

ہم نے جانوروں سے انسانوں تک کا سفر کیسے طے کر لیا۔ یہ فطرت کا ایک بہت بڑا راز ہے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ انسانوں میں ذہانت کب، کہاں، کیسے اور کیونکر پیدا ہوئی؟

لطف کی بات تو یہ ہے کہ ذہانت کی کوئی جامع اور غیر متنازع تعریف بھی نہیں بس چند خصوصیات کے حوالے سے ہم نے ذہین اور غیر ذہین کا معیار قائم کر رکھا ہے۔

ذہانت کی ایک تعریف رالف ہولووے کی تجویز کردہ ہے جس کے مطابق معلومات فراہم کرنے کا عمل ذہانت کا عام پہلو ہے۔ انسانی دماغ کی بیرونی پرت دیگر حیوانات کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہے۔ اور چونکہ اس دماغی تہہ سے معلومات کی فراہمی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس تہہ کا تعلق ذہانت کے مذکورہ پہلو سے ہے۔ اس ساخت کی وجہ سے ہی ہم دوسرے مخلوقات سے ممتاز ہیں۔ رالف کے مطابق دماغ کے اندرونی ریشوں اور اجزاء کی ترتیب سے بھی ہمارے ذہین ہونے پر اثر پڑتا ہے۔ اور انسانوں میں اس مخصوص ترتیب کی وجہ سے ہی حیوانوں کے مقابلے میں گفتگو اور آلات سے جستجو کے خواص پیدا ہوئے ہیں۔[11]

کیلی فورنیا یونیورسٹی کے گیری لائنچ کا بیان ہے کہ انسان اور حیوان کے مابین ذہانت میں فرق کا ایک سبب بصارت ہے۔ مثلاً وہیل مچھلی کے دماغ میں

کسی بھی شے کی بصری ترتیب ہم سے بالکل مختلف ہوگی۔ انیسویں صدی میں ڈارون نے انسانی ذہن کے ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ باہمی کشمکش کا نتیجہ ہو سکتی ہے بعدازاں محققین نے بھی تائید کی کہ انسانی ذہنیت پر سماجی اور معاشرتی زندگی کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ یوں سماج کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ذہانت نے بھی ترقی کی ہے۔ جان ہاپکنز سکول آف میڈیسن کے سربراہ سولومن سنائڈر کا خیال ہے کہ ارتقائی لحاظ سے دماغ نے ان بہت سے خلیوں کی مدد سے کام کرنا شروع کیا جنھوں نے ایک دوسرے کو پہچاننا سیکھ لیا تھا۔

ہم کب ذہین ہوئے؟ اس سوال کا جواب بڑا دشوار ہے۔ ایک امریکی ماہر اعصابیات ہیری جیریسن نے اس ضمن میں دو نکتے بیان کیے ہیں کہ انسانی ذہانت کا تعلق دماغ کی جسامت اور اس کے اندر اجزاء کی ترتیب سے ہے۔ اب رکازیات کی دنیا میں زمانہ قدیم سے دماغ کی جسامت میں تبدیلی کا اندازہ تو لگایا جا سکتا ہے مگر اندرون دماغ کیا کیا تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی چلی آ رہی ہیں یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

ذہانت کے ارتقائی عمل کو سمجھنے کے لئے جس وقت کمپیوٹر کی مصنوعی ذہانت سے انسان جیسے ذہنی کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ تو اس سے پیچیدگی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس بات کا ثبوت مل رہا ہے کہ انسانی دماغ کو بہت چھوٹے چھوٹے سے معمولی قسم کے کام کرنے کے لئے بھی معلومات کا وسیع ذخیرہ درکار ہوتا ہے۔ اس بناء پر کیلی فورنیا یونیورسٹی کے گیری لائنچ نے کہا کہ غالباً انسانی ذہانت کا دار و مدار ذہنی افعال پر نہیں بلکہ ذہن میں معلومات محفوظ کرنے کی بے پناہ صلاحیت پر ہے۔ انسانی دماغ کی بیرونی تہہ میں معلومات کا ذخیرہ کرنے کی وسیع گنجائش موجود ہے۔

سائنس دانوں کے باہمی نظریاتی اختلافات کے باوجود ایک بات پر سب کا اتفاق ہے کہ جب تک انسانی دماغ کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جاتا تب تک ذہانت کو سمجھنا بھی ممکن نہیں۔ اسی بناء پر گیری لائنچ نے کہا ہے کہ ہم اس چیز کے اندر ہونے والے افعال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں جس کے متعلق بذات خود ہم بہت کم جانتے ہیں۔ محقق چارلس لومسڈن (ٹورانٹو یونیورسٹی) اس ضمن میں پرامید ہے اس کا کہنا ہے "بیسویں صدی کا اختتام ذہن کا سنہری دور ہو گا۔ ابھی تو ہم صرف انسانی ذہن کی ماہیت سمجھنے کی ابتداء کر رہے ہیں۔"[12]

# ذہن انسان

خیالات کا منبع ذہن ہے۔ ذہن کیا ہے؟ یہ ایک صدیوں پرانا معمہ ہے۔ جس پر ارباب حل و عقد نے تحقیق کا ایک عظیم ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ مگر ذہن کا مسئلہ پیچیدہ ہی رہا ہے۔

میکانکی تصورات کے حامی یہ کہتے ہیں کہ درحقیقت مادہ ہی سب کچھ ہے چنانچہ یہ شعور اور ذہن وغیرہ مادہ کی پیداوار ہیں۔ مادیت کے فلسفہ کی رو سے ماورا مادہ کچھ بھی نہیں اس لئے مادیت کے علمبردار شین نے کہا تھا کہ شعور انسانی دماغ کے بعض حصوں کی قوت کا نام ہے پس ذہن کی حقیقت یہ ہے کہ وہ محض توانائی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ بالفاظ دیگر نفس انسانی یا شعور انسانی کا اپنا کوئی خارجی مستقل اور آزاد وجود ہے ہی نہیں اور یہ محض انسانی دماغ کے طبعی افعال کا نام ہے۔

تو نتیجہ یہ نکلا کہ مادہ کو ذہن پر فوقیت حاصل ہے؟ کیا واقعی؟

یہ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ ہم جذبات اور کیفیات کو اپنی ذات تک ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ ان تخیلاتی وارداتوں میں کوئی دوسرا صحیح معنوں میں شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ خیالات ہیں۔ جو خوشی، غمی، بیم و رجاء، بلند عزائم اور پست حوصلگی، محبت، نفرت کے جذبات کو مہمیز کرتے ہیں۔ خیالات کی دنیا کتنی وسیع ہے مگر دوسرا تو کیا ہم خود بھی نہ تو اس دنیا کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ چھو سکتے ہیں، گویا یہ دنیا ظاہری حواس خمسہ کی گرفت سے باہر ہے۔ اور یہ تو طے ہے کہ جو احاطہ حواس سے باہر ہے وہ مادہ نہیں ہے پس خیالات اور ذہنی وارداتوں کی دنیا، مادی دنیا نہیں ہے۔

یہ بھی ہمارا مشاہدہ ہے کہ ہمارے خیالات بیرونی محیجات سے بہرطور متاثر ہوتے ہیں مثلاً کوئی غم انگیز منظر طبیعت پر افسردگی طاری کر دیتا ہے۔ دوسری طرف خود ہمارا ذہن بھی خیالات سے متاثر ہوتا ہے۔ مثلاً غصے کے عالم میں بدن کا تھر تھرانا، فشار خون کا بڑھ جانا اور حادثہ کا سن کر جسم کا ٹھنڈا پڑ جانا اور بعض اوقات ہمارا اس قدر گم سم ہو جانا کہ کھلی آنکھوں کے سامنے سے کوئی گزر جائے تب بھی احساس نہ ہونا اور کسی کے زور سے بلانے یا ہلانے

سے چونک کر حقیقی دنیا میں لوٹ آنا۔

یوں ثابت ہوا کہ جسم اور ذہن دونوں الگ الگ ہیں۔ ان کی نیو ایک نہیں ہے اچھا اگر ایک نہیں ہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ "نفس اور دماغ کا باہمی علق کیا ہے؟ اس کے متعلق صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ عقدہ لاینحل ہے بلکہ یہاں تک کہ ہنوز وہ بنیاد بھی معلوم نہیں ہو سکی جہاں سے اس سوال کے حل کی بتداء کی جا سکے۔ "(13)

(Brain And Its Mechanism By Charles sherring)

# انسانی ذہن کس طرح کام کرتا ہے؟
## افعال - جذبات - احساسات

انسانی دماغ، اعصاب اور ان کے افعال پر تحقیق کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ اس تحقیق کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا مگر اس سلسلہ میں موثر کام اس صدی کی پانچویں دہائی میں ہی ممکن ہوا۔ عصبی نظام کی ساخت اور افعال سمجھنے کے لئے نئی اصطلاحات اور دریافتیں عمل میں آئیں۔ الکٹرانی خوردبینی مشاہدے سے معلوم ہوا کہ نظام اعصاب کی تشکیل کرنے والے خلئے جنہیں نیوران کہتے ہیں عام خلیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کا کام پیغامات کو دماغ یا حرام مغز تک لانا اور لے جانا ہے۔ ہر خلیہ اگلے خلئے کو پیغامات کی ترسیل کرتا ہے۔ ان پیغامات کی نوعیت کیمیائی ہے ایسے بہت سے کیمیائی مرکبات تو دریافت کر لئے گئے ہیں جو عصبی خلیات سے خارج ہوتے ہیں مگر سائنس دان ان کیمیائی مرکبات کی شکل میں بھیجے جانے والے پیغامات کو سمجھ نہیں سکے۔ چنانچہ ذہن کی کارکردگی کو سمجھنا خاصا دشوار ہے۔

امریکہ کے ساک انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ دماغی حیاتیات کے سربراہ ڈبلیو میکس کووان کا کہنا ہے کہ "یہ سوال واقعی اہم ہے کہ کیا انسانی دماغ خود اپنے بارے میں سوچنے کی اہلیت رکھتا ہے یا نہیں۔" ان کا کہنا ہے کہ دماغ کے مختلف حصوں میں موجود خلیوں کی تفاعلی خصوصیات کے بارے میں ہم کافی کچھ جانتے ہیں مگر اس کے باوجود ہمیں ان اعلیٰ درجے کے افعال کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ جو ہمیں انسان بناتے ہیں یعنی سوچنا۔ تخیل اور محسوس کرنا وغیرہ۔ انفرادی خلیات کے اجتماعی اور پیچیدہ افعال سے وہ دماغی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں جنہیں سہولت کی خاطر ہم سوچ اور ذہن کہہ لیتے ہیں۔ "(14)

کووان کا نقطہ نظر امید دلاتا ہے کہ دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا تو دماغ کی ساخت اور اعصابی خلیوں سے خارج کردہ مادوں کی دریافت اور کارکردگی کا مطالعہ ایک روز انسان کی ذہانت کا عملی پہلو واضح کر دیں گی۔ مگر دوسری جانب جان ہاپکن سکول آف میڈیسن کے سربراہ سولومن سنائیڈر کی رائے مختلف ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جو سوال آپ پوچھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم یہ کب معلوم کر لیں گے کہ دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ اور کون سی چیز طرز عمل کا تعین کرتی ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ پوری حقیقت یقیناً کبھی بھی معلوم نہیں ہو گی۔ بالکل اس طرح جیسے ہم کسی پتھر یا ایٹم کی مکمل ساخت معلوم نہ کر سکیں گے۔"

سنائی ڈر کے خیال میں اعصاب سے متعلق دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا تو ممکن ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ دماغ افعال پر کس طرح کنٹرول رکھتا ہے۔ کیونکہ سائنس دانوں کے مطابق ایک خاص قسم کا کیمیائی مادہ ہے جو اعصاب کے درمیان پیغام رسانی کے ذریعے احساسات اور جذبات پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ ایسی دوائیں تیار کر لی گئی ہیں جو کیمیائی طور پر حساسیت کو متاثر کر سکتی ہے۔ پس ہمیں سب کچھ تو کبھی بھی معلوم نہیں ہو گا۔ مگر پھر بھی خاص خاص دماغی افعال کے بارے میں ہم بہت کچھ جان لیں گے۔ اتنا کچھ کہ وہ (طبی اعتبار سے) ہمارے لئے کافی ہو گا۔ "(15)

# یادداشت

انسانی دماغ معموں اور بجھارتوں کا ایک پراسرار علاقہ ہے۔ اس کے ان گنت اسرار میں سے ایک یادداشت اور اس سے متعلق معمے ہیں۔ انسانی دماغ میں نگاہ سے متعلق خلیوں کے قریب سر کے پچھلے حصے میں یادداشت سے متعلق خلئے واقع ہوتے ہیں۔ سائنس کہتی ہے کہ ذہن انسانی معلومات کو کیمیائی اور چارج شدہ سگنل کی شکل میں محفوظ رکھتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ہم دماغ کی مختلف صلاحیتوں بشمول یادداشت کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس کے لئے کچھ مخصوص ورزشیں بیان کی جاتی ہیں اور بعض ادویات مثلاً طب مشرق میں خالص شہد کے ساتھ باداموں کا استعمال یا بادام اور سیاہ مرچ کو اکٹھا پیس کر نہار منہ کھانا یادداشت اور ذہانت میں اضافے کا موجب قرار دیا جاتا ہے۔

ادھر فطری طور پر بے پناہ یادداشت کے حامل لوگوں کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ عام حافظ قرآن اس کی مثال ہیں۔ برما کے ایک مذہبی رہنما "بھاندانتاوتی سارا" کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے بدھ مذہب کی مبینہ الہامی کتاب کے سولہ ہزار صفحات ازبر تھے۔ ایک اور شخص ڈومینک اوبرئین نے ۳۱۲ کارڈوں کو جنکی نمائش اس کے سامنے مختلف طریقوں سے کی گئی تھی بالکل اسی طریقے پر ترتیب دے کر دکھایا جیسا اسے دکھایا گیا تھا رومی بادشاہ ہیڈرین کو اپنی فوج کے تمام سپاہیوں کے نام معلوم تھے۔ سترھویں صدی کے فرانسیسی عالم مینانگ نے فرنچ زبان کی ۲ جلدی لغات محض یادداشت کے بل پر لکھی تھی۔

بعض افراد کی یادداشت کو فوٹو گرافک میموری کہا گیا ہے۔ یہ لوگ کسی بھی واقعے کی انتہائی جزئیات بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مڈل سیکس (برطانیہ) کی ایک خاتون نے قدرت کے عطا کردہ اس تحفے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یہ خاتون بینک ملازم تھی۔ ایک رات کسی نے اس کے فلیٹ میں نقب لگائی اور اس کی عصمت دری کر کے چلتا بنا مگر مجرم نے گھپ اندھیرے میں صرف چند سیکنڈ کے لئے ٹارچ جلا کر پرس میں پیسے دیکھنے کی غلطی کی تھی۔ اور اتنی مختصر مدت میں ہی اس خاتون نے اس کے سارے خدوخال دیکھ لئے تھے اور بعد ازاں اتنی تفاصیل فراہم کیں کہ آرٹسٹ نے مجرم کا بہترین خاکہ تیار کر لیا۔ اور یوں یہ شخص فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ اور ۱۹۸۶ء میں اسے اولڈ بیلے میں سات سال کی قید ہوئی۔[16]

لطیفہ مشہور ہے کہ ایک شخص طبیب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "مجھے بھولنے کی بڑی سخت بیماری ہے، کچھ دیر پہلے کی بات بھول جاتا ہوں"۔ طبیب نے پوچھا "آپ کو یہ بیماری کب سے ہے؟" مریض نے کہا "کون سی بیماری؟ کیسی بیماری؟"

لطیفہ کی حد تک تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن کوئی جاکر نسیان کے مریضوں سے ان کا کرب دریافت کرے۔ مثلاً بی بی سی کے پروڈیوسر کلائیو ویرنگ کے دماغ کو ۱۹۸۴ء میں وائرس لگ گیا۔ اسے کچھ یاد نہیں رہتا۔ حتیٰ کہ چند لمحے پیشتر کی بات بھول جاتا ہے۔ اس عذاب کی شدت سے وہ بعض اوقات پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔ اس کی صحت یابی کا کوئی امکان نہیں۔ وہ کھانا کھا کر اٹھتا ہے کہ پھر میز پر نگاہ پڑ جاتی ہے تو یہ بھول کر کہ ابھی ابھی تو پیٹ بھر کر فارغ ہوا ہے، دوبارہ میز پر بیٹھ جاتا ہے کہ آج تو کھانا کھایا ہی نہیں۔ بسیار خوری نے اس کے نظام ہضم کو بہت خراب کر دیا۔ اس کی عبرتناک زندگی بعض اوقات دوسروں کے لئے تفنن کا باعث بن جاتی ہے۔ وہ بیماری سے پہلے بی بی سی کے شعبہ موسیقی کے اہم عہدے پر فائز تھا۔ یادداشت کی خرابی کے بعد ایک روز اسے کنگز کالج میں آرگن کے سامنے بٹھا دیا گیا کہ وہ بجائے لیکن وہ آرگن کو ایسے دیکھنے لگا کہ جیسے اس قسم کی چیز کو وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ وہ اس ساز کو اسی مقام پر بارہا بجا چکا تھا مگر اب اسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ پھر جب اسے آرگن کے سٹول پر بٹھایا گیا تو گویا ساز بجانے سے متعلق اس کی یادداشت لوٹ آئی اور اس نے بڑی خوبصورتی سے آرگن بجا کر اپنی بیوی اور آس پاس کھڑے لوگوں کو محظوظ کیا۔ لیکن جونہی وہ ساز بجا کر فارغ ہوا اور گھوم کر دیکھا تو بیوی کھڑی دکھائی دی تب اس نے بڑی جذباتی انداز میں بیوی کو تھام لیا جیسے وہ بڑے عرصے سے بچھڑی ہوئی تھی حالانکہ وہ کتنی دیر سے اس سے باتیں کرتی رہی تھی۔ اب جو کلائیو نے مڑ کر دوبارہ آرگن کو دیکھا تو ایک بار پھر حیرت اس کی آنکھوں میں در آئی کہ یہ کیا چیز ہے اور اس کا کیا کام ہے۔ اسے کالج کی پرانی فلم دکھائی گئی جس میں اسے ساز بجاتے دکھایا گیا تھا تو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی خود ہے۔ فلم ختم ہوئی تو فوراً اسے یہ بھول گیا کہ اس فلم میں اسے ساز بجاتے دکھایا گیا ہے۔ غنیمت ہے کہ وہ اپنی بیوی کو پہچانتا ہے۔ کیونکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جب لوگ بھلی بری ہر بات بھول جاتے ہیں۔ جیسے ہنگری کی خاتون ماریا ٹانڈی کے ساتھ ہوا۔ ۱۹۳۸ء میں برطانیہ میں اس کی ماں کی وفات کی اطلاع اس پر بجلی بن کر گری اور ماریہ کو سب کچھ بھول

گیا۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں۔ حتیٰ کہ اسے بات چیت کرنا بھی بھول گیا ہے۔[17] آج ایک عرصہ ہو چکا ہے مگر وہ بے چاری بالکل خالی الذہن ہو کر کلے بری (ایسکس) کے ہسپتال والوں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی ہے۔

یادداشت سے متعلق خلئے کھوپڑی کی مضبوط ہڈی کے نیچے محفوظ ہوتے ہیں تاہم سخت قسم کی ضرب انہیں متاثر کر سکتی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ جب کسی حادثے کے بعد کوئی شخص اپنا سارا ماضی بھول جائے، اپنا نام، والدین، دوست، اہل خانہ، عزیز و اقارب سب کچھ۔ یہ بڑی دردناک کیفیت ہوتی ہے۔ بعض اوقات کوئی عام یا چونکا دینے والی بات سے متعلقہ شخص کی یادداشت واپس لوٹنے لگتی ہے۔ چوٹ کے علاوہ سخت خوف اور ڈپریشن کے مریض بھی یادداشت کھو سکتے ہیں اور بعض اوقات ماضی کے محض اکا دکا واقعات ان کے ذہنوں میں باقی رہ جاتے ہیں لیکن سائنس دان اس سلسلے میں بہتری کے لئے پرامید ہیں اور یادداشت کی بہتری کے لئے ہارمونوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر رچرڈ مارٹن نوبل انعام یافتہ برطانوی سائنس دان ہے۔ ۷۴ برس کی عمر میں وہ الزہائمر کے مرض میں مبتلا ہوا اور اس کی یادداشت آہستہ آہستہ کمزور ہونے لگی۔ ۱۹۸۴ء میں اسے اپنا کام چھوڑنا پڑا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ جو کچھ پڑھتا ہے فوراً بھول جاتا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ وہ اس کے اعلیٰ ذہن کو نہیں بچا سکتے۔

۱۹۸۸ء میں مارٹن نے رضاکارانہ طور پر اپنے اوپر ایک دوا ٹی ایچ اے استعمال کرائی جس کے نتائج اچھے رہے اور یادداشت بہتر ہو گئی۔ اب مارٹن نسیان کا اتنا مریض نہ تھا کہ گھر سے کسی کام کے لئے نکلتا اور باہر آکر بھول جاتا کہ وہ کیوں آیا ہے۔ جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا کہ وہ کسی کانفرنس میں شریک ہونے کی غرض سے روانہ ہوا اور کسی غیر متعلقہ جگہ کے لئے جہاز یا ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سائنس دان نئے نئے تجربات کر رہے ہیں اور یادداشت کو بگڑنے سے روکنے اور اس میں اضافہ کے لئے بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ نئی ادویات متعارف کی جا رہی ہیں۔ کینیڈا میں عورت میں دردزہ برداشت کرنے کے لئے قدرتی طور پر پیدا ہونے والی رطوبت ان ذہنی مریضوں کے لئے مفید دیکھی گئی ہے جو کسی دردناک حادثے کے سبب نسیان کا شکار ہو چکے تھے۔ ہارمون ڈی جی اے وی پی بھی یادداشت کی حفاظت میں موثر پایا گیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یادداشت کو بہتر بنانے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی جائے گی۔

# معمہ شناخت

ایک حادثے میں میرا جسم بالکل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور صرف دماغ بچ جاتا ہے ادھر ایک شخص کا سارا جسم تو صحیح سلامت رہتا ہے مگر اس کا دماغ تباہ ہو جاتا ہے۔ فرض کر لیں کہ سرجری کے کسی طریقے سے میرا دماغ اس دوسری شخصیت کے کاسہ سر میں فٹ کر دیا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم دونوں میں سے شخصیت کس کی باقی رہی۔ میری (ایک نئے بدن کے ساتھ) اس شخص کی (ایک نئے دماغ کے ساتھ) یا ہم دونوں سے علیحدہ ایک نئی شخصیت عالم وجود میں آئی؟

یہ ایک بڑا عجیب مسئلہ ہو گا۔ دونوں میں سے وراثت کا حامل کون ہو گا؟ اگر کوئی معاشی نقصان ہوا تو کون اسے برداشت کرے گا۔ اگر کسی ایک پر کوئی الزام تھا تو کون عدالت کے سامنے جوابدہ ہو گا۔ پیچیدگی تو اس وقت بڑھے گی جب وہ شخصیت ایک عورت کی ہوئی جب اس کا بدن گھر لوٹے گا تو ان کا طرز فکر، یادداشت، معلومات اور رویہ سب میں انقلابی تبدیلیاں آجائیں گی۔ میرے بچے عورت کی شکل میں اپنے باپ کے دماغ کو قبول کر لیں گے؟ یا اس عورت کا شوہر اپنی بیوی کے بدن کے حصول کے لئے جدوجہد کرے گا اور اس کے بچے اپنی "زندہ والدہ" سے لپٹنے کو بے چین ہوں گے؟

گلاسگو یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والی مصنفہ ای جے بروسکی نے اس سے بھی پیچیدہ تر امکان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ انسانی دماغ دو نصف کروں پر مشتمل ہوتا ہے جو کم و بیش آزاد اور خود مختار ہوتے ہیں اور بدن کی متضاد اطراف کو کنٹرول کرتے ہیں۔ بایں ہمہ ایسی مثالیں موجود ہیں جب بعض لوگوں کا آدھا دماغ ناکارہ ہو گیا اور جراحت کے ذریعے نکال دیا مگر وہ باقی نصف دماغ کے ساتھ نارمل زندگی بسر کرتے ہیں۔ اب اگر جراحت کے ذریعے ایک

دماغ کے دونوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ دو جسموں کی خالی کھوپڑیوں میں منتقل کر دیا جائے اور وہ زندہ کر لئے جائیں تو دونوں کی یادداشت ایک ہی ہو گی کیا ایسی صورت میں یہ کہا جائے گا کہ ایک ہی شخصیت دو بدنوں میں موجود ہے؟ ایک سوال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی کھوپڑی سے آدھا دماغ نکال کر کسی اور شخص کا آدھا دماغ لگا دیا جائے تو اس صورت میں کیا نتائج سامنے آئیں گے؟ دو مختلف شخصیتوں کے نصف نصف دماغ آپس میں کیا طرز عمل اختیار کریں گے۔ کون سا حصہ غالب اور کونسا مغلوب ہو گا؟ کیا اس سے ایک نئی متوازن شخصیت بنے گی؟ دو مختلف دماغوں کے بدن کی شناخت کس دماغ کے حوالے سے ہو گی؟ کیا یہ ایک بدن میں دو شخصیتیں ہوں گی؟ (18)

شناخت کا ذریعہ بدن ہے یا دماغ؟ اس مسئلے کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچئے کہ زید کی کھوپڑی میں اگر عمر اور بکر کے دماغوں کے آدھے آدھے کرے پیوست کر دیئے جائیں اور زید کا اپنا دماغ ہٹا دیا جائے تو شناخت کس کی ہو گی زید کی؟ بکر کی؟ یا عمر کی؟ زید کے بدن میں اب دو مختلف یادداشتوں کے حامل خود مختار دماغ کیا گل کھلائیں گے؟

ایک بات طے شدہ ہے کہ شخصیت کا کوئی وجود ضرور ہے۔ اس وجود کا ادراک "انا" سے ہے۔ یعنی ہماری "میں" اور "ہم" ہی شخصیت کا ثبوت ہیں۔ ہماری "میں" کبھی نہیں مرتی۔ ان حالات میں بھی جب کوئی شخص کسی حادثے کے نتیجے میں یادداشت کھو دیتا ہے۔ تب بھی اس کی "میں" برقرار رہتی ہے۔

"میں" کیا ہے؟

---

گو ہر فرد اپنی جگہ Unique ہے مگر شخصیت کی بہت سی جہتیں ہو سکتی ہیں لیکن دماغ اور نفسیات کے ماہرین کے سامنے ایسے Cases بھی موجود ہیں کہ جب کسی طبعی یا نفسیاتی خلل کی بدولت ایک ہی فرد میں ایک سے زیادہ شخصیات اور نت نئی جہتیں نمودار ہوئیں۔ ان واقعات میں سے سب سے زیادہ تعجب خیز واقعہ ایک لڑکی مولی فانچر کا ہے۔

۱۰ مئی ۱۸۶۴ء کو بروک لین کے علاقے میں ایک سولہ سالہ لڑکی Mollie Fancher گھوڑے کی پشت سے سر کے بل گر پڑی، اس کی پسلیاں ٹوٹ گئیں اور دماغ بھی متاثر ہوا۔ ڈاکٹروں کی کوششوں سے وہ صحت یاب ہو گئی مگر اگلے برس جون کی ۸ تاریخ کو اس بدقسمت کا دوبارہ ایک اور حادثہ ہو گیا۔ اس مرتبہ اسے گاڑی سے ٹکر لگی تھی۔ حادثہ خاصہ سخت تھا۔ مولی کا بدن تھرتھرا رہا تھا۔ کسی کو بھی اس کے بچنے کی امید نہیں تھی لیکن ڈاکٹروں کی کوشش کامیاب رہی اور جسم و جان کا تعلق قائم رہا۔

۳ فروری ۱۸۶۶ء کی شام ایک ڈاکٹر رابرٹ سپائر نے مولی کو دیکھتے ہوئے قریب کھڑی مولی کی خالہ سوسن کو بتایا کہ لڑکی کی حالت بہتر ہو رہی ہے۔ پھر ڈاکٹر سپائر نے اپنی گھڑی دیکھی اور کہا، اوہو میں جب بھی یہ سوچ کر آتا ہوں کہ آج گھر جلد لوٹ جاؤں گا مگر کبھی بھی وقت پر نہیں پہنچا۔ آج مجھے ایک بجے گھر پہنچنا تھا تاکہ چکن پاٹ پائی کھا سکوں مگر حسب معمول لیٹ ہو گیا ہوں۔ آپ تو جانتی ہیں کہ یہ ڈش ٹھنڈا ہونے پر بدذائقہ ہو جاتی ہے۔

ابھی ڈاکٹر نے یہ بات کہی ہی تھی کہ مولی کا بدن ایک دم لرز گیا اور وہ بیہوش ہو گئی۔

ایک ماہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو یادداشت کھو بیٹھی تھی۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس کا تعارف اس کے عزیز و اقارب اور خالہ سوسن کرا سبی سے کرایا گیا۔ اس کا سارا دھڑ ہر وقت دکھتا رہتا تھا۔ صرف بازوؤں میں باقی بدن کی نسبت سہل حرکت ممکن تھی۔

اس نئی زندگی کا آغاز اس نے بڑے حوصلے سے کیا۔ اس زمانے میں اس نے چھ ہزار کے قریب خطوط تحریر کئے۔ کئی نئے دوست بنائے اور نہایت حسین کشیدہ کاری کے بہت سے نمونے تیار کر لئے اس نئی زندگی کو ۹ برس ہونے کو آئے ۱۸۷۵ء میں فروری کا مہینہ تھا کہ مولی ایک بار پھر بے خود ہو گئی۔

جس وقت اس نے آنکھیں کھولیں تو قریب ہی اس کے پہلے معالج ڈاکٹر رابرٹ سپائر کا بھائی ڈاکٹر فلیٹ سپائر کھڑا تھا۔ مولی نے اس سے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ کے بھائی چکن پاٹ پائی کھانے کے لئے گھر وقت پر پہنچ گئے تھے؟" پھر اس کی نگاہ خالہ سوسن پر پڑی اور وہ حیرت سے پوچھنے لگی "کیا بات ہے خالہ

آپ کے سرخ گالوں کو کیا ہوا؟ آپ تو کتنی بوڑھی اور بدلی بدلی دکھائی دے رہی ہیں"۔

۹ برس بعد مولی اچانک اپنی اصل شخصیت میں واپس آ گئی تھی مگر اسے ۹ برس کی درمیانی زندگی کی کوئی بات یاد باقی نہیں تھی۔ ۹ سال پرانی باتیں وہ یوں کر رہی تھی کہ گویا وہ گزشتہ روز کی باتیں ہوں۔ جب اسے ۹ برس کے دوران اس کے اپنے ہاتھوں تحریر کردہ خطوط اور کشیدہ کاری کے نمونے دکھائے گئے تو وہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگی اور کہا کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی فوت شدہ عورت کا کام ہے۔

اس کے بعد سے مولی نت نئے تماشے دکھانے لگی۔ اس کی آنکھیں مدہم ہوتے ہوتے بالکل بے نور ہو گئیں مگر اس کا کہنا تھا کہ اسے اب بھی دکھائی دیتا ہے اور وہ ماتھے سے چیزوں کو دیکھ سکتی ہے، وہ ایک انترجامی بن چکی تھی۔

ایک روز فلکیات دان ہنری پارخرسٹ Henry Parkhurst مولی سے ملنے چلا آیا کہ دیکھے کہ آیا یہ لڑکی کسی قسم کی جعل سازی کر رہی ہے یا پھر حقیقتاً غیر معمولی طاقتوں کی مالک ہے۔

اس نے بارہا ایک تجربہ کیا، وہ خط لکھ کر لفافے میں بند کر دیتا مگر مولی اسے بتا دیا کرتی کہ بند لفافے میں موجود تہہ کئے ہوئے کاغذ پر کیا لکھا ہے اور کس انداز سے لکھا ہے۔ ہنری کا خیال تھا کہ شاید یہ لڑکی اس کا ذہن پڑھ لیتی ہے چنانچہ اس نے عدالت کی پرانی فائل کا ایک صفحہ بغیر دیکھے نکال لیا کہ کسی کو بھی بشمول اس کے کاغذ کے مندرجات کا علم نہ ہو سکے مگر ہنری یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا کہ مولی نے اس مرتبہ بھی لفافے میں رکھے صفحے کو بغیر دیکھے بآسانی پڑھ ڈالا۔

اسے باجم (باہراز جسم، شاہدات) کی صلاحیت بھی حاصل ہو گئی تھی ۱۸۷۷ء کی ایک رات اس کی چیخیں سن کر سوسن بیدار ہو گئی۔ مولی کہہ رہی تھی وہاں خون ہی خون ہے۔ وہ مر رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس نے وہاں جا کر دیکھا ہے کہ ٹرین کا حادثہ ہوا ہے اور اس کا چھوٹا بھائی ہلاک ہو گیا ہے۔ بعدازاں اس بات کی تصدیق ہو گئی۔ مولی کا بیان تھا کہ وہ اکثر و بیشتر مقامی علاقے اور ملک میں گھوم پھر کر لوگوں کو دیکھتی ہے حالانکہ اس کا بدن بستر پر دراز ہوتا ہے۔

۱۸۷۸ء میں ایک رات مولی ایک بوڑھے ڈاکٹر جارج سارجنٹ سے محو گفتگو تھی کہ اس نے آنکھیں موند لیں اور گویا گہری نیند میں چلی گئی ذرا سی دیر گزری تھی کہ اس نے دھیرے سے کراہ کر آنکھیں کھول لیں اب وہ سارجنٹ کو عجیب سی اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ سارجنٹ نے سنا مولی کے منہ سے ایک نئی آواز آ رہی تھی۔ "تم کون ہو سکتے ہو؟" سارجنٹ نے اسے حیرت سے دیکھا مولی کی ایسی آواز وہ پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔ مولی کی شخصیت تبدیل ہو چکی تھی۔

نئی مولی فانچر نے سارجنٹ سے درخواست کی کہ اسے آئڈل کہا جائے کیونکہ اس کا اصل نام آئڈل ہے۔ آئڈل نے کمرے میں ادھر ادھر جو مولی کی تیار کردہ کشیدہ کاری دیکھی تو اسے اتنا خوبصورت کام کرنے والی لڑکی سے بے حد حسد محسوس ہوا۔

کچھ مدت بعد آئڈل واپس مولی کی جون میں آ گئی۔ اب کے اسے بڑی حیرت ہوئی کہ کون اس کی غیر موجودگی میں اس کی کشیدہ کاری خراب کر رہا ہے۔ حالانکہ آئڈل کی شکل میں وہ خود ہی "مولی" کو ستانے کی خاطر بنائی ادھیڑ دیا کرتی تھی مگر دونوں شخصیتیں ایک دوسرے سے بے خبر تھیں۔

اگلے برس اور بھی تماشے ہوئے۔ ایک رات مولی کے اندر ایک چھ سالہ بچی روز بڈ کی شخصیت نمودار ہوئی۔ معاً مولی کی آواز تبدیل ہو کر بچے جیسی ہو گئی اور بچپنا پیدا ہو گیا۔ روز بڈ کے بعد ایک اور رات مولی میں ایک خوشگوار تبدیلی آئی۔ اس رات وہ ایک نئی شخصیت پرل بنی جو بڑے عمدہ اخلاق و اطوار کی مالک تھی۔

ایک رات روبی نامی عورت کا روپ دھارا۔ یہ عورت بڑی تیز طرار اور لطیفہ گو تھی۔

لطف کی بات یہ تھی کہ اصل مولی، آئڈل، روز بڈ، پرل یا روبی میں سے کسی کو بھی ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ ڈاکٹر سارجنٹ نے ایک نرالی بات سوچی۔ اس نے تمام شخصیات کے درمیان خطوط کے ذریعے رابطے کا سلسلہ شروع کیا۔ جس رات بھی مولی کی شخصیت تبدیل ہوتی۔ وہ اسے مولی کا تحریر کردہ خط پڑھنے کو دیتا اس طرح کرتے کرتے پانچوں کی پانچوں شخصیتوں کے درمیان خطوط سے دوستانہ قائم کر دیا گیا۔ ہر ایک دوسرے کو ان مخصوص طرز تحریر میں لکھا کرتی۔ مولی عام طور پر اپنے دوستوں میں سے آئڈل سے خط میں یہی درخواست کیا کرتی تھی کہ وہ اس کی کشیدہ کاری کو نہ ادھیڑا کرے۔ روز بڈ سارجنٹ سے عموماً ہجے پوچھا کرتی۔

اس حیرت انگیز شخصیت کا انتقال ۱۱ر فروری ۱۹۱۶ء کو ہوا۔ کوئی نہ جان سکا کہ یہ کون مرا ہے۔ آئیڈل، روز بڈ، پرل، روبی یا پھر مولی بذات خود۔ اس کی قبر کے کتبے پر لکھا گیا ہے۔

"مولی فانچر ــــ زندگی کے اسرار سے آگاہ تھی"۔[19]

# دماغ
# جنہوں نے طبّی ماہرین کو ہلا دیا

انسانی دماغ قدرت کا ایک حیرت ناک عجوبہ ہے۔ ہمارے تمام تر افعال کو کنٹرول کرنے میں اس کی اہمیت بنیادی نوعیت کی ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کے پیش نظر قدرت نے کھوپڑی کی سخت ہڈی کے درمیان اس کی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہے۔ کیونکہ معمولی ضرب جو دماغ تک براہ راست پہنچے، بڑے شدید نوعیت کے نتائج دے سکتی ہے۔ کئی واقعات موجود ہیں کہ محض ذرہ سے جھٹکے سے آدمی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

ایک جانب تو دماغ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اس پر معمولی سا صدمہ شدید نوعیت کے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ دوسری جانب بعض حیرت ناک واقعات نے بالکل مخالف نتائج دیئے ہیں۔

۱۸۷۹ء میں ایک جواں سال خاتون جو ایک مل میں ملازمہ تھی داہنی آنکھ کے اوپر مشینری کا پرزہ اس قدر زور سے لگا کہ یہاں سے کھوپڑی کی ہڈی کی کرچیاں دماغ میں چار انچ اندر تک داخل ہو گئیں۔ پرزہ نکالنے کے لئے جراحی کے عمل کے دوران دماغ کا یہ حصہ بالکل خراب ہو گیا۔ ڈاکٹروں کے اندازے کے برعکس جب یہ خاتون صحت یاب ہوئی تو اس دماغی چوٹ کا ذرہ بھر اثر باقی نہ رہا۔ حتیٰ کہ سر درد کی شکایت بھی نہ ہوئی۔ اور یہ خاتون ۴۲ برس تک نارمل زندگی بسر کرتی رہی۔

Phineas Gage کا واقعہ اس سے بھی انوکھا ہے۔ یہ ۲۵ سالہ نوجوان ریل کی پٹڑی بچھانے کے کام پر مامور تھا۔ ۱۳ر ستمبر ۱۸۴۷ء کے دن وہ ایک سوراخ میں دھماکہ خیز مادہ فولادی سلاخ سے ٹھونس رہا تھا کہ سلاخ کی رگڑ سے چنگاری اٹھی اور دھماکے کے ساتھ سلاخ گولی کی رفتار سے گیج کی گال میں لگی اور اندر ہی اندر سے ہو کر اس کی آنکھ کو باہر دھکیلتی ہوئی بالائی کھوپڑی کو چھید کر ۱۸ انچ کے قریب باہر نکل آئی۔ دھماکے کی شدت سے وہ زمین پر گر گیا تھا۔ مگر بے ہوش نہیں ہوا۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ بس ایک بیل گاڑی موجود تھی۔ اسے گاڑی پر بٹھایا گیا۔ راستہ بڑا خراب تھا۔ چنانچہ جھٹکے لگتے رہے اس کی حالت کچھ خراب ہونے لگی۔ خدا خدا کر کے وہ لوگ ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا۔ کہ یہ شخص زندہ بچے گا۔ ڈاکٹر نے سلاخ کو باہر نکالا تو خون، مغز کے ٹوٹے ہوئے کچھ اجزاء اور کھوپڑی کی ہڈی کی ننھی کرچیاں بھی باہر نکل آئیں۔ نوجوان کی اجازت سے اس کے تابوت کی تیاری کے سلسلے میں اس کے جسم کا ناپ لیا گیا۔ مگر یہ گیج بھی عجیب ہی شخص نکلا کہ بالکل بھلا چنگا ہو گیا۔ صرف اس کی بائیں آنکھ بے نور ہو گئی۔ مختلف ڈاکٹروں اور سرجنوں نے بارہا میڈیکل سائنس کے اس عجوبہ شخص سے ملاقات کی اور اس کا مشاہدہ کیا۔[20]

۱۸۸۸ء کے میڈیکل پریس آف نیویارک میں بھی ایک ایسا ہی واقعہ بیان ہوا ہے۔ ایک شخص لکڑی کے پل کے قریب کھڑے، بحری جہاز کی مرمت کا کام کر رہا تھا۔ اس کی کھوپڑی جہاز کے بالائی حصے اور لکڑی کے درمیان پھنس گئی۔ دباؤ پڑا تو لکڑی کے تیز سرے سے اس کی کھوپڑی اور دماغ کا کچھ حصہ کٹ گئے۔ ڈاکٹروں نے دیکھا کہ اس شخص کا خاصا دماغ اور خون اس حادثے میں ضائع ہو گیا ہے۔ مگر انہوں نے اس کی پٹی کر دی اس شخص کے بچنے کا بھی کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ مگر جس وقت وہ ہوش میں آیا تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس کا چال ڈھال اور گفتگو ویسے ہی تھے۔ تاہم اس حادثے کے ۲۶ برس بعد اسے جزوی طور پر فالج کا سامنا کرنا پڑا۔

۱۹۳۵ء میں نیویارک کے سینٹ ونسٹن ہسپتال میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ بظاہر کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ عام بچوں کی طرح روتا، کھاتا اور ہلتا جلتا تھا۔ مگر پھر وہ اچانک مر گیا تو ڈاکٹروں کو معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

ڈاکٹر جان ڈبلیو بروئل اور ڈاکٹر جارج ڈبلیو ایلبی نے ۱۹۵۷ء میں امیر کن سائی کو لوجیکل ایسوسی ایشن کو اطلاع دی کہ انہوں نے بوجوہ ایک ۳۹ سالہ مرد کے دماغ کا دائیاں حصہ جراحت کے عمل سے مکمل طور پر ہٹا دیا۔ یہ شخص نہ صرف یہ کہ زندہ رہا بلکہ اس کی ذہنی صلاحیتوں پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا۔

۱۹۴۰ء میں سوکر (بولیویا) کی انتھروپولوجیکل سوسائٹی کے اجلاس میں برازیلی ڈاکٹروں نکولاس اورنز اور آگسٹائن اٹوریکا کا بیان بڑا عجیب اور بظاہر ناقابل یقین تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۴ برس کے ایک لڑکے کو سر میں شدید درد کی شکایت رہتی تھی۔ اندازہ تھا کہ اسے دماغ میں پیپ بھرنے کی تکلیف ہے جب اس کے کھوپڑی کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ مریض کا دماغ بلب سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی بات تھی جیسے کسی شخص کی گردن اڑا دی گئی ہو۔

مگر وہ لڑکا اپنی موت تک اپنے تمام تر حواس کو استعمال کرنے پر قادر تھا۔ جرمن ماہر دماغ ہوف لینڈ نے ایک مفلوج آدمی کا آپریشن کیا بے ہوشی سے پہلے وہ شخص ٹھیک ٹھاک طریقے سے بات چیت کر رہا تھا مگر جب کھوپڑی کاٹ کر الگ کی گئی تو کاسہ سر میں دماغ تھا ہی نہیں۔ صرف گیارہ اونس پانی موجود تھا۔[21]

# سائی کومیٹری

کشف یا باطنی قوت سے گزرے ہوئے واقعات کو پھر سے اس طرح معلوم کرنا، گویا صاحب کشف اس واقعے کا آنکھوں دیکھا حال بتا رہا ہے۔ سائی کومیٹری کہلاتی ہے۔

شعبہ سراغرسانی اور پولیس کے ریکارڈ میں بین الاقوامی طور پر ایسے لوگوں کے بارے میں حیران کن تفاصیل موجود ہیں۔ جنہوں نے امن و امان کے ذمہ دار اداروں کی مدد محض اپنی باطنی قوت کے بل بوتے پر کی۔ امریکہ میں ایک خاتون ڈورتھی ایلی سن ایک ایسی ہی خاتون ہے جسے اس کی کارکردگی کے اعتراف میں لاتعداد تمغات اور سندیں دی گئی ہیں۔ نہ صرف وہ خود بلکہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس طرح سے یہ کارنامے سرانجام دیتی ہے۔ لیکن پولیس والے اس کی صلاحیتوں اور خدمات سے واقفیت کی بدولت اس کا بڑا احترام کرتے ہیں۔

بین الاقوامی طور پر سائی کومیٹری کے حوالے سے نیدرلینڈ کے دو افراد کروائسٹ اور ہرکوس کو بے پناہ شہرت ملی۔ ان کی صلاحیتوں کے حوالے سے انہیں انسانی راڈار اور جادوگر کے خطاب دیئے گئے۔

Gerard Croist جرارڈ کروائسٹ ۱۹۰۹ء میں نیدرلینڈ کے غریب یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تربیت محتاج خانوں میں ہوئی اور والدین کی جانب سے اسے کبھی کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی۔ مگر بچپن سے اسے سائی کومیٹری کی صلاحیت حاصل ہو گئی تھی۔

ایک روز اسکول کا ایک استاد ایک دن کی غیر حاضری کے بعد آیا تو کروائسٹ نے اسے بتایا کہ گزشتہ روز وہ بڑی دور ایک جگہ پر ایک لڑکی سے ملنے گیا تھا جس نے سرخ گلاب لگا رکھا تھا۔ اور استاد اس لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔ استاد سخت حیرت زدہ ہو گیا۔ فی الحقیقت وہ اپنی منگیتر سے ہی ملنے گیا تھا۔ جس نے سرخ گلاب لباس میں ٹانک رکھا تھا۔ لیکن کروائسٹ کو کیسے پتہ چلا؟

۳ر دسمبر ۱۹۴۵ء میں کروائسٹ ہالینڈ کے ادارہ ماورائے نفسیات کے پروفیسر ٹین ہاف Tenhaeff سے ملا۔ پروفیسر نے مہینوں سخت محنت کے بعد یہ نتائج دیئے کہ اس حیرت انگیز انسان میں نہایت غیر معمولی خصوصیات ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس ۳۶ سالہ شخص کی خوبی یہ ہے کہ اول کسی شے کو پکڑ کر بتا سکتا ہے کہ اس کا مالک کون ہے اور اس کی آواز کیسی ہے؟ دوم یہ کہ شے کے مالک کے اپنے حالات کس قسم کے ہیں۔ سوم یہ کہ شے کے مالک کے تعلقات اور رسائی کس کس سے ہے اور چہارم یہ کہ شے کے مالک کی رہائش گاہ کہاں ہے۔ اور پاس پڑوس میں کون رہ رہا ہے۔

اس کی اس غیر معمولی صلاحیت کے کامیاب مظاہرے دیکھتے ہوئے تاریخ میں پہلی مرتبہ پراسرار قوتوں کے مالک کسی شخص کو پولیس میں ملازمت اسی خوبی کی بنیاد پر دی گئی۔ اس نے کئی گتھیاں سلجھا کر پولیس کو حیرت زدہ کر دیا۔ مثلاً ۱۹۴۹ء میں ایک جرم کے ملزمان کو اکٹھا کیا گیا۔ مگر پولیس کو اصل مجرم نہیں ملا

تب کروائسٹ کو بلا لیا گیا۔ اور اسے ایک پیکٹ دیا گیا۔ اس نے بغیر کھولے بتا دیا کہ اس پیکٹ میں تمباکو کا ڈبہ ہے پھر اس ڈبے کو ہاتھ میں پکڑ کر اس نے ذہن کے گھوڑے دوڑانے شروع کیے اور بتانے لگا کہ ملزمان میں سے دو درمیانی عمر کے افراد آپس میں بھائی ہیں پھر ان کے مکان کی تفصیل بیان کی۔ پھر بتایا کہ دونوں نے ایک ذہنی معذور لڑکی کو پکڑ کر بھینسوں کے باڑے میں لے جا کر اس سے زیادتی کی پھر اسے بھینس پر ڈالنے والے کمبل میں لپیٹ کر مارنے کی ترکیبیں سوچنے لگے مگر پھر چھوڑ دیا۔ کروائسٹ نے ان لڑکوں کے اور جرم بھی گنوائے اور یہ بھی بتا دیا کہ ان میں سے ایک جرم کے اقرار کے بعد خود کشی کر لے گا۔ پولیس نے پوچھ گچھ کی تو ملزمان میں سے دو لڑکے بھائی ثابت ہوئے اور انہوں نے جرم کا اقرار کر لیا۔ اور بعد ازاں ایک بھائی نے صرف دو ہفتے بعد خود کشی کر لی۔

کروائسٹ کی شہرت بیرونی ممالک میں پھیل گئی۔ جون ۱۹۵۸ء میں امریکی پولیس نے امریکی تاریخ کے سب سے متنازعہ جرائم میں سے ایک میری لن شیفرڈ قتل کے سلسلے میں کروائسٹ کو مقتولہ کے سرخ جوتوں کا جوڑا بھیجا کروائسٹ نے جوتوں کو ہاتھ میں پکڑ کر بتایا کہ اس کی مالکہ ایک حسین عورت تھی جو قتل کر دی گئی ہے۔ قاتل جھاڑ جیسے بالوں والا ایک مرد ہے۔ ادھر کلیولینڈ میں اس عورت کے قتل کے اہم ترین ملزم اس کے خاوند شیفرڈ پر بہت زیادہ شک کیا جا رہا تھا۔ مگر اس نے بتایا کہ قاتل کوئی جھاڑ نما بالوں والا شخص تھا۔ جس نے اس کی بیوی کے قتل کے وقت اسے ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔ (مسٹر شیفرڈ کو ۱۹۶۶ء میں امریکی عدالت نے بری کیا تھا)

فروری ۱۹۶۱ء میں کروائسٹ سے ۴ سالہ بچی گوگل کی گمشدگی کے سلسلے میں نیویارک پولیس نے مدد مانگی۔ کئی مرتبہ ٹیلی فون پر رابطے پر بتایا کہ گوگل کو کس علاقے میں کہاں کہاں ڈھونڈا جائے اور وہ جگہ بتائی جہاں بچی دفن تھی کیونکہ وہ کھوئی نہیں تھی بلکہ قتل کر دی گئی تھی۔ کروائسٹ کبھی امریکہ نہیں آیا تھا مگر اس کے بتائے گئے پتے کے مطابق بچی کی نعش بر آمد کر لی گئی۔

کروائسٹ کے بے شمار کارناموں کے باوجود بسا اوقات قانون اتنا بے بس ہو جاتا ہے کہ کسی ایسے شخص کے خلاف کہ جس کے بارے میں کروائسٹ نے بالتفصیل جرائم کی فہرست گنوا دی ہو ٹھوس ثبوت کی عدم موجودگی کے سبب الزام درست ثابت نہیں ہو سکتا۔

کروائسٹ بذات خود کوئی خاص تعلیم یافتہ نہیں تاہم تحقیق اور دریافت کے میدان میں اس کے کارنامے کسی سے کم نہیں۔ اس نے بہت سے گمشدہ مخطوطات کا پتہ لگایا۔ کئی تاریخی نوادرات تلاش کر کے دیئے۔ اور ڈائنو سار حیوانوں کے متحجرات کا کھوج لگایا۔ مورخین نے بارہا کروائسٹ کی مدد سے ماضی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کروائسٹ کی پراسرار قوت ہمہ وقت کام نہیں کرتی تھی بلکہ بعض دفعہ خوابیدہ رہتی تھی۔ اور کئی کئی روز تک کام نہیں کیا کرتی تھی۔ وہ لوگوں کی خدمت یا پولیس کی مدد کا کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ یہ قوت خدائی تحفہ ہے اور معاوضہ وصول کرنے کی صورت میں اس ناقدری کا نتیجہ اس صلاحیت کے خاتمے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

کروائسٹ کے پانچ بچوں میں سے ایک بیٹے جیرارڈ کروائسٹ جونیئر کو بھی باپ کی خوبیاں حاصل ہوئیں۔ یہ لڑکا کبھی امریکہ نہیں گیا تھا۔ مگر جب اس سے مدد کی درخواست کی گئی کہ شارلٹن کی دو لڑکیوں کی تلاش میں مدد دے تو اس نے اپنے باپ سے وراثت میں ملی ہوئی صلاحیت کی بدولت وہیں امریکہ کے اس علاقے کا نقشہ بنا دیا اور پولیس کو علاقے کے بارے میں حیران کن تفصیلات بتاتے ہوئے وہ جگہ بتائی جہاں دونوں لڑکیاں موجود تھیں۔ بعد ازاں وہاں سے دو لڑکیاں دو چھوٹی قبروں سے بر آمد کر لی گئیں۔ انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔[22]

پیڑوان ڈرہرک اپنے کارناموں کی بدولت بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔ اسے دنیا ہرکوس کے نام سے جانتی ہے۔ اس کی صلاحیتوں کے پیچھے ایک حادثہ کارفرما ہے۔

نبیدر لینڈ میں ہرکوس چمنیاں صاف کرنے کا کام کرتا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ ایک روز بارش ہو رہی تھی اور ہرکوس سیڑھی پر چڑھ کر ایک عمارت کی چمنی صاف کرنے لگا کہ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آن گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کی کھوپڑی میں فریکچر ہو گیا تھا۔ ہسپتال میں اسے ہوش آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ وہ لوگوں کے ذہن پڑھ سکتا تھا۔ ایک نرس نے اس کی نبض دیکھنے کے لئے کلائی تھامی، تو اس نے اس نرس سے کہا کہ احتیاط کرے ورنہ اس کے دوست کا سوٹ کیس گم جائے گا۔ تب نرس کو یاد آیا کہ وہ ہسپتال آتے ہوئے اپنے دوست کا سوٹ کیس ریل گاڑی میں بھول آئی

ہے۔

ہرکوس چیزوں کو پکڑ کر ان سے متعلقہ واقعات اور شخصیات کے بارے میں جان لیتا تھا۔ اس کی یہ صلاحیت اس کے لئے خطرہ بن گئی۔ ہسپتال سے فارغ ہو کر ایک مریض گھر جانے والا تھا۔ اس نے ہرکوس سے الوداعی طور پر ہاتھ ملایا اور ہرکوس نے جان لیا کہ یہ شخص جونہی ہسپتال سے نکلے گا تو باہر ایک گلی میں قتل کر دیا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔

ہرکوس کی اس پیش گوئی کے بارے میں چہ مہ گوئیاں شروع ہو گئیں مقتول نازی مزاحمتی تحریک کا رکن تھا جو زیر زمین کام کر رہی تھی۔ ان لوگوں کو جب اس بات کا پتہ چلا تو انہیں شک گزرا کہ ہرکوس نازیوں کا ایجنٹ نہ ہو۔ چنانچہ ایک رکن کو بھیجا گیا تاکہ ہرکوس کو قتل کر دیا جائے مگر ہرکوس نے بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔[23]

ہرکوس ہسپتال سے فارغ ہوا تو اپنے پرانے کام کا اہل نہیں رہا تھا۔ اس کے لئے بڑی توجہ کی ضرورت ہوتی تھی جو ہرکوس کے بس کی بات نہیں رہی تھی لیکن اس نے اپنی نئی ذہنی قوت کی مدد سے تماشے کر کے گزارا کیا۔ ایک روز چند ڈچ محب وطن اپنی خفیہ تحریک کے ایک نئے رکن کی تصویر لے کر ہرکوس سے ملنے آئے۔ انہیں شک تھا کہ یہ شخص نازیوں کا جاسوس ہے۔ ہرکوس نے آنکھیں بند کر کے تصویر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ یہ شخص جرمن افسر کی وردی پہنے نظر آ رہا ہے ڈچ محتاط ہو گئے اور کافی عرصہ نگرانی کے بعد اسے جرمنی کو جنگی معلومات فراہم کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔

ہرکوس کی صلاحیتوں سے پولیس نے بھی استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ ایک شخص کو اس کے مکان کی دہلیز پر کوئی قتل کر گیا تھا۔ ہرکوس کو بلایا گیا اس نے مقتول کا کوٹ پکڑ کر بتانا شروع کر دیا کہ قاتل ایک بڈھا ہے جو عینک لگاتا ہے۔ اس کی مونچھیں بھی ہیں اور اس کی ٹانگیں مصنوعی ہیں۔ اس نے آلہ قتل مقتول کی چھت میں چھپا رکھا ہے۔ پولیس نے وہ بندوق تو اسی وقت بر آمد کر لی۔ لیکن بعد ازاں جب قاتل پکڑا گیا تو اس کا حلیہ عین وہی تھا جو ہرکوس نے بیان کیا تھا۔ ہرکوس کی شہرت بیرون ملک بھی پھیل گئی۔

۱۹۵۰ء میں برطانیہ میں ویسٹ منسٹر ایبے سے ایک بیش قیمت ہیرا چوری ہو گیا۔ سکاٹ لینڈ یارڈ کی سرتوڑ کوشش سے بھی چور کا سراغ نہ ملا۔ ناچار ہرکوس کو آزمانے کا فیصلہ کیا گیا اور اسے لندن بلا لیا گیا۔

ہرکوس کو ایک گاڑی اور ایک ہتھیار دیا گیا جو مجرم بھاگتے وقت چھوڑ گیا تھا۔ ہرکوس کو لندن کا ایک نقشہ بھی دیا گیا جس پر اس نے کچھ دیر آہستہ آہستہ لکیر کھینچنی شروع کر دی۔ یہ اس کے بقول وہ راستہ تھا جسے چوروں نے استعمال کیا۔ اگرچہ ہرکوس پہلی مرتبہ لندن آیا تھا مگر حیران کن حد تک حکام کو نقشے کے راستے کے آس پاس کی عمارتوں کی بالکل درست نشاندہی کر کے بتاتا رہا۔ اس نے بتایا کہ چور ایک نہیں بلکہ تین ہیں اور ان کے ہمراہ ایک عورت بھی ہے۔

سکاٹ لینڈ یارڈ تین ماہ بعد جب چوروں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی تو ہرکوس کی ہر بات درست ثابت ہوئی۔

# ذہنی تصویر کشی

یونیورسٹی آف کولوریڈو میڈیکل سکول کا ڈاکٹر جول آئزن ہیڈ ماہر نفسیات تھا۔ اسے کسی نے اطلاع دی کہ شکاگو کے ایک ٹرک ڈرائیور ٹیڈ سیریئوس نامی شخص کا دعویٰ ہے کہ وہ پولارائیڈ کیمرے میں اپنی ذہنی قوت سے وہ تصاویر نمودار کر سکتا ہے جو اس کے ذہن میں بن رہی ہو۔ ڈاکٹر آئزن ہڈ نے اس شخص سے ملنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ڈاکٹر ایک مضمون میں دعویٰ کر چکا تھا کہ خوارق العادت مظاہر کو بار بار دہرانا امکان سے باہر ہے اور اگر ٹیڈ فی الحقیقت ذہنی تصویر کشی کر رہا تھا تو ڈاکٹر کو اپنے دعوے میں ترمیم کرنا پڑتی۔

مقررہ وقت پر ٹیڈ نے اپنے مظاہرے کی ابتداء کر دی اس نے ہاتھ میں کاغذ کی چھوٹی سی نلکی پکڑ رکھی تھی۔ جسے وہ "گزمو" کہتا تھا۔ اسے نے گزمو کا رخ کیمرے کے عدسے کی طرف کر دیا۔ کئی تصاویر کھینچی گئیں مگر ضائع ہو گئیں۔ آخر کار دو بھدی سے تصاویر مل ہی گئیں ایک پر پانی کا دارہ اور دوسری پر

ہوٹل سا کھنچا ہوا تھا۔ یہ ثبوت آئزن برگ کو پریشان کرنے کو کافی تھا۔ وہ فوراً کئی سائنس دانوں سے ملا مگر کسی نے بھی ٹیڈ کے معاملے میں گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ حتیٰ کہ کوئی ٹیڈ کا مظاہرہ دیکھنے پر راضی نہ ہوا۔ ڈاکٹر نے خود ہی کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا اندازہ حسب سابق یہی تھا کہ ساری چالبازی اس کاغذی گز مو میں ہے۔ مگر ٹیڈ کا کہنا تھا کہ کاغذ کی اس نکی سے وہ صرف اپنی سوچ کے ارتکاز کا کام لیتا ہے۔ جب گز مو کو دیکھا بھالا گیا تو واقعی اس میں کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے ٹیڈ سے اور تصاویر بھی کھنچوائیں اور اس کی غیر معمولی صلاحیت کا معترف ہو گیا۔ بعد کے تجربات میں دیگر سائنس بھی شریک ہونے لگے اور ایک ماہر چشم بھی آ گیا۔ ان کے تجربات ڈاکٹر آئزن ہڈ نے اپنی تصنیف "ورلڈ آف ٹیڈ سیریوس" میں پیش کئے ایک جگہ اس کا بیان ہے "سیریوس پر مختلف النوع تجربات کے بعد ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سیریوس تو بغیر کیمرے کے بھی تصورات یا خیالی افراد یا مناظر کی تصویر کشی پر قادر ہے۔ بارہا اس نے محض غیر ایکسپوز شدہ فلم پر ارتکاز کر کے ذہنی تصویر کشی کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کی تصویریں اتنی گہری نہیں تھیں جیسا کہ کیمرے سے لی جاتی تھیں"

ادھر دو رپورٹروں چارلز رینالڈ اور ڈیورڈ آئزن ناڈر اتھ نے ٹیڈ کو گز مو استعمال کرتے دیکھا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ٹیڈ جھوٹا شخص ہے۔ انہوں نے خود ہی ایک آلہ تیار کیا۔ اس چھوٹے سے آلے کو گز مو میں فٹ کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ایک سرے پر عدسہ اور دوسرے سرے پر غیر استعمال شدہ فلم رکھی گئی تھی۔ اس آلے کو کیمرے کے سامنے رکھ کر جب انہوں نے تصاویر اتار دیں۔ تو وہ ٹیڈ کی "ذہنی تصاویر" سے کوئی خاص مختلف نہ تھیں۔ کیا ٹیڈ بھی جعلسازی کا ایسا طریقہ استعمال کر رہا تھا؟ دونوں نے اپنی ایجاد اور اس کا پس منظر ۱۹۶۷ء میں "پاپولر فوٹو گرافی" میں شائع کیا تو ٹیڈ کے مخالفین نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر ڈاکٹر آئزن ہڈ اور دوسرے کئی افراد کا بیان یہی تھا کہ تجربات کے دوران ٹیڈ کے گز مو کو بارہا چیک کیا گیا ہے اور اس میں کوئی غیر معمولی چیز نہیں دیکھی گئی۔ مگر مخالفین یہی کہتے رہے کہ ٹیڈ ہاتھ کی صفائی سے اصل گز مو تبدیل کر دیتا ہے۔

ایک مصنف جان گوڈون ۱۹۶۹ء میں ٹیڈ سے ملا۔ وہ اپنے ساتھ پولارائیڈ کی فلم بھی لے گیا تھا۔ ادھر کسی رسالے کا فوٹو گرافر کیمرہ لے آیا۔ جان گوڈون نے فلم ڈلوا کر کیمرہ ٹیڈ کو پکڑا دیا۔ اور ٹیڈ نے کیمرے کے عدسے کو یوں گھورنا شروع کر دیا جیسے وہ اپنے ذہن میں موجود شکل کو عدسے پر منعکس کر رہا ہے۔ جب اس نے "ابھی" کہہ کر تصوری کھنچوائی۔ تو کئی مرتبہ صرف اس کا اپنا چہرہ تصویر میں آیا۔ مگر کم از کم دو مرتبہ ایسی تصویریں آئیں جن میں عمارتیں اور دفاتر ہلکے مٹے مٹے سے نظر آ رہے تھے۔ جان گوڈون فیصلہ نہیں کر سکا کہ ٹیڈ کس طرح سے جعل سازی کر رہا ہے۔[24]

ٹیڈ کی باقاعدہ شہرت کی ابتداء ۱۳ر اگست ۱۹۶۳ء میں کینیڈا کے ٹورانٹو ٹیلی وژن سے ہوئی۔ موقع پر کئی کیمرہ ٹیکنیشن، پروڈیوسر اور بہت سے دوسرے معتبر افراد موجود تھے۔ ٹیڈ سیریوس نے پولارائڈ کیمرے کے لینز کو نظروں سے ایک فٹ کے فاصلے پر رکھ کر ارتکاز شروع کر دیا اور کچھ دیر بعد آگے بڑھ کر بٹن دبا دیا ——— بجائے اس کے کہ تصویر ہر ٹیڈ کی صورت ہوتی۔ وہاں ایک قدیم قلعے کے نقوش واضح تھے۔

ٹیڈ کا بیان ہے کہ وہ ٹرک ڈرائیوری سے پہلے ہوٹل میں ویٹر تھا انہی دنوں ایک دوست معمول کے طور پر خزانے پر ارتکاز کر رہا تھا کہ اس کے دوست نے ٹیڈ کے سر کی تصویر اتاری تو وہاں بجائے سر کے، خزانے کی تصویر آئی تھی۔ بعد ازاں گو انہیں خزانہ تو نہ ملا مگر روزی کا ایک دلچسپ ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ ٹیڈ نے سکاگو کی سڑکوں اور عمارتوں کی ذہنی تصویر کشی سے لوگوں کو محفوظ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کام میں خاصی توانائی صرف ہوتی اور وقت بھی خاصا لگتا چنانچہ ۱۹۵۹ء تک ٹیڈ کا وزن ۲۵۰ پاؤنڈ سے گھٹ کر صرف ۱۳۵ پاؤنڈ رہ گیا تاہم مسلسل پریکٹس سے وقت کا دورانیہ خاصا ہو گیا تھا اور وہ محض ۲ منٹ کے ارتکاز کے بعد تصاویر اتارنے پر قادر ہو گیا تھا۔[25]

# تیسری آنکھ (بن آنکھوں کی بصارت)

اس شخص کا نام خدا بخش تھا۔ مگر وہ کے بی ڈیوک (K.B Duke) کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی پیدائش ۱۹۰۶ء میں کشمیر میں ہوئی۔ اس نے مداری کا پیشہ اپنایا اور ایک مشہور کرتب باز بن گیا۔ پیشے کے ابتدائی ایام میں جب وہ ایک سرکس میں ملازم تھا تو اس کی ملاقات ایک گرو سے ہوئی۔ جس نے اسے

ارتکاز اور توجہ کے قواعد سے آگاہ کیا۔ ۱۱ برس کی طویل جدوجہد کے بعد خدابخش نے ذہنی ارتکاز میں خوب مہارت حاصل کر لی۔ اب اس نے اپنے مشہور کرتبوں کا سلسلہ شروع کیا۔ جن میں سے آگ پر چلنے میں اسے زیادہ شہرت ملی (دیکھئے آتش قدمی) لیکن ایک اور کرتب بھی اس کی شناخت بن گیا۔ یہ تھا نظر کے استعمال کے بغیر معمول کے کام سرانجام دینا۔

برطانیہ کے مشہور روحی محقق ہیری پرائس Harry Price نے خصوصی طور پر خدابخش کے ٹسٹ لئے مگر وہ کوئی بھی دلیل پیش کرنے سے قاصر رہا کہ خدابخش کس طور بند آنکھوں کے باوجود "دیکھ" سکتا ہے۔ ہیری کے ان تجربات کو دیگر سائنس دانوں نے بھی بغور دیکھا اور وہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ خدابخش کے پاس کوئی غیر معمولی قوت بصارت موجود ہے۔ ان تجربات کے دوران خدابخش کی آنکھوں پر خمیر آٹے کے دو پیڑے رکھ کر ان پر دھاتی پرت اور روئی رکھ کر آنکھیں باندھ دی جاتی۔

اس انتظام کے بعد جب خدابخش کے آگے کوئی کتاب کھول کر رکھ دی جاتی تو وہ آرام سے پڑھنے لگتا۔ رکاوٹوں کے راستے پر بغیر کسی چیز سے ٹکرائے مزے سے گزر جاتا اور سائیکل بھی چلا لیتا۔

ان تجربات کے بعد خدابخش کو عالمی شہرت ملنے لگی اور اس کے کرتب بھی عجیب ہوتے چلے گئے۔ مثلاً ستمبر ۱۹۳۷ء کو اس نے لورپول (Liver Pool) برطانیہ میں ۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع تنگ راستے پر چل کر لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ جب کہ اس حالت میں اس کی آنکھیں بندھی ہوئی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ مانچسٹر کے ایک ہسپتال میں ڈاکٹروں نے خدابخش کی آنکھوں کو اچھی طرح بند کر کے تماشائیوں کو یقین دلایا کہ یہ شخص کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر لوگوں کے سامنے خدابخش بغیر کسی مدد کے ہسپتال سے نکل آیا۔ سائیکل پر سوار ہوا اور مزے سے ٹریفک کے اژدھام میں سائیکل چلانے لگا۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ جہاں ضرورت ہوتی وہاں ہاتھ کے اشارے بھی دیتا۔

ڈاکٹروں اور سائنس دانوں نے بارہا خدابخش کے ٹسٹ لئے لیکن وہ کوئی بھی توجیہہ پیش کرنے سے قاصر رہے۔ خدابخش نے خود یہ کہا کہ "مجھے تو اتنا پتہ ہے کہ یہ سب ذہن کے اندر کوئی صلاحیت ہے۔ میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھتا ہوں۔ اپنی شدت ارتکاز کی بدولت۔ جو کوئی بھی شخص خود سے حاصل کر سکتا ہے"۔ (26)

۱۰ر جنوری ۱۹۹۳ء کو پاکستان ٹیلی وژن سنٹر کراچی سے صبح کی نشریات میں کراچی کے ایک نوجوان احمد غفار کا مظاہرہ دکھایا گیا۔ اس نوجوان کی آنکھوں پر آٹے کے پیڑے اور پٹیاں باندھ کر ایک سیاہ لفافہ سر پر گردن تک چڑھا دیا گیا۔

یہ نوجوان کراچی ٹیلی وژن سنٹر سے مصروف سڑکوں پر موٹر سائیکل پر سوار توازن کے کرتب دکھاتا، تیز رفتاری سے گزر گیا۔ اس نے انٹرویو میں بتایا کہ ۶ برس تک ارتکاز اور توجہ سے اس نے یہ صلاحیت حاصل کی۔ احمد غفار کا بیان تھا کہ وہ سواری کے دوران یہ جان لیتا ہے کہ اس کے قریب بس جا رہی ہے، ٹرک ہے یا آئل ٹینکر لیکن اسے موٹر سائیکل کی رفتار کا اندازہ نہیں ہوتا۔

تبھی وہ ایک مرتبہ پوری رفتار سے جا رہا تھا کہ سڑک پر موجود سپیڈ بریکر سے اچھل کر ایک گڑھے میں جا گرا۔

# تنویم

تنویم کاری کا فن بڑا قدیم ہے۔ یہ جو قدیم اساطیری داستانوں اور قصے کہانیوں میں ایسے جادوگروں کا ذکر ملتا ہے جو ایک اشارے یا جھاڑ پھونک سے کسی شخص کے رویہ کو تبدیل کر لیا کرتے تھے۔ وہ یقیناً تنویم کاری کرتے تھے۔ لیکن ٹھوس بنیادوں پر اس فن کی شناخت مغرب میں اٹھارویں صدی عیسوی میں ہی ممکن ہو سکی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں Franz Mesmer آسٹریا کا ایک طبیب تھا جو نجوم میں خاصا شغف رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بعید فاصلوں پر واقع ستاروں کی کشش ثقل اگرچہ کرہ ارض تک پہنچتے پہنچتے نہایت کمزور ہو جاتی ہے تاہم یہ کمزور مقناطیسی قوت انسانوں کے رویئے پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ اس

نظریئے کی بنیاد پر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر مریض کے سر پر مقناطیسی امواج کی شدت میں اضافہ کیا جائے تو اس سے اور بھی زیادہ واضح نتائج مل سکیں گے۔

ویانا میں اس نے اپنے مطب میں ہسٹریا اور دوسرے دماغی امراض کے سلسلے میں مقناطیس کا استعمال شروع کر دیا۔

کچھ ہی عرصہ بعد اسے پتہ چلا کہ مقناطیسی سلاخوں کا استعمال بھی ضروری نہیں بلکہ خود انسانی انگلیاں ان کا متبادل ہو سکتی ہیں۔ اسے سمجھ نہ آئی کہ یہ کونسی پراسرار مخفی قوت ہے جو انگلیوں سے نکل کر مریض کے جسم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ چونکہ اصل مقناطیس اور محض انگلیوں کے استعمال کے نتائج ایک ہی تھے لہٰذا مسمر نے موخر الذکر قوت کو "حیوانی مقناطیسیت" کا نام دیا۔ ادھر مریضوں کی ایک بڑی تعداد نے جو روزانہ مسمر کے اختراع کردہ عجیب و غریب طریقہ علاج سے فیض یاب ہونے آتی تھی ڈاکٹر کے نام کی مناسبت سے اس طریقہ کار کو مسمرازم سے معنون کر دیا۔

لیکن ویانا کی پولیس نے اس سارے تماشے کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں مسمر مروج طریقوں سے انحراف کرتے ہوئے روحیت کا استعمال کر رہا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر کو اس طریقہ علاج کو جاری رکھنے سے روک دیا گیا۔ چنانچہ ۱۷۷۰ء میں مسمر فرانس چلا آیا۔ یہاں ۱۷۸۴ء تک پیرس میں اس کے نئے طریقہ علاج کو بے پناہ شہرت ملی۔ بادشاہ کو خبر ملی تو وہ خاصا پریشان ہوا اور اس نے فرانس کی طب اور سائنس کی اکادمی کو حکم دیا کہ وہ اس طریقہ علاج کی چھان بین کرے جسے بہت سے لوگوں نے کاروبار بنا لیا تھا اور مریض بھی اس طریقہ علاج کو بہتر سمجھنے لگ گئے تھے۔

اس زمانے میں Lyons کی میڈیکل سوسائٹی کے ایک سابق صدر پروفیسر چیسٹنر ڈی پوسیگر Prof: Chestener Puysegur نے ایک نئی دریافت کا اعلان کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مریض کو ٹرانس میں لے کر معمولی ترغیبات کے ذریعے اس کی قوت ارادی پر گرفت حاصل کر لیتا ہے اور مریض کے افعال اس کی مرضی کے تابع ہو جاتے ہیں۔

بس یہیں سے مسمر کی شامت آ گئی۔ بادشاہ کو خوب نمک مرچ لگا کر بتایا گیا کہ مسمرازم کے ذریعے فرانسیسیوں کے ذہنوں کو خراب کیا جا رہا ہے۔ ۱۷۸۹ء میں مسمر سوئزرلینڈ چلا آیا یہاں ۳۶ برس بعد بڑے برے حالوں میں اس کا انتقال ہوا۔

اس کے بعد تقریباً نصف صدی تک کسی نے مسمرازم کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور یہ محض عامل معمول کا تماشہ بنا رہا ۱۸۴۲ء میں البتہ ایک بڑا واقعہ ہوا۔ سکاٹ لینڈ کے نفسیات دان جیمز بریڈ نے مریضوں کو ٹرانس میں لینے کا ایک اور طریقہ ایجاد کیا۔ وہ مریضوں کے سامنے کوئی روشن چیز رکھ کر انہیں اس چیز پر گہری توجہ کرنے کا حکم دیتا تھا جس سے ان پر خواب خرامی یا نیند میں چلنے کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس طریقے کو بریڈ نے ۱۸۴۳ء میں ہپناٹزم کا نام دیا۔ (ہپناٹزم یونانی لفظ ہپناس بمعنی نیند سے مشتق ہے)۔

بریڈ کے تنویمی طریقے کو بہت اہمیت حاصل ہو گئی۔ کئی لوگوں نے تنویمی نیند کے دوران جراحت کے بڑے بڑے مراحل ہنسی خوشی برداشت کر لئے کیونکہ تنویمی نیند کے دوران انہیں درد کا احساس سرے سے ہوتا ہی نہیں تھا۔

ہپناٹزم کے منفی انداز میں استعمال نے اس طریقہ کار کو بے حد رسوا کیا۔ مثلاً ایک سرجن روڈالف ہیڈنہین اپنے سامعین پر تنویمی عمل کر کے انہیں کتے بلیاں بنا دیتا اور یہ لوگ فرش پر لوٹتے پھرتے اور خیالی برتنوں سے دودھ چاٹتے نظر آتے۔ انگلستان کے موسیقی گھروں کا حال اس سے بدتر تھا وہاں شوقیہ لوگ سٹیج پر آتے اور ماہر تنویم کی ترغیب پر کپڑے اتار پھینکتے اور تصوراتی سازوں پر دھنیں بجانے لگتے اور ہال میں بیٹھے لوگوں کا ہنس ہنس کر گلا بیٹھ جاتا۔

لیکن سب سے مزے کا قصہ بی بی سی والوں کا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں ان لوگوں نے سٹیج کے مضحکہ خیز عامل معمول کے کھیلوں کو سنجیدگی سے ٹی وی پر پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ شمالی لندن کے ایک محل میں ریہرسال شروع ہوئی عامل نے ترغیب دینا شروع کی۔ کچھ دیر بعد جب پروڈیوسر نے کیمرہ مینوں کو کوئی حکم دیا تو ان کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ سب کے سب تنویم کے زیر اثر بے حس کھڑے ہیں پروڈیوسر نے اپنا سر پیٹ لیا اور عامل کی سماجت کی اور عملے کو تنویم سے آزاد کرایا۔ تب سے اس نشریاتی ادارے نے تہیہ کر لیا کہ کبھی بھی ٹی وی پر عامل حضرات کو معمول کو ترغیب دیتے ہوئے نہیں دکھائیں گے مبادا بی بی سی کے ناظرین اپنے ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھے بیٹھے تنویم کی زیر اثر آ جائیں۔[27]

۱۹۵۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ہپناسس ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے ہپناٹزم کے عام اسٹیج مظاہرے ممنوع قرار دیئے گئے۔ لیکن ۱۹۸۸ء میں یہ پابندی اٹھا لی گئی۔ تاہم بی بی سی کے خدشات بہرحال درست ثابت ہوتے رہے۔ اس کی تکلیف دہ صورت اٹلی میں پیش آئی جب ایک آٹھ سالہ بچے کو ہسپتال

اس حالت میں لایا گیا کہ اس نے ہاتھوں کو ایک دوسرے سے اس قدر سختی سے بھینچ رکھا تھا کہ انگلیاں سوج کر سیاہ ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ بچہ ماہر تنویم کے سیلا Casella کا پروگرام ٹی وی پر خاصے انہماک سے دیکھ رہا تھا اور اس دوران کے سیلا کی ترغیبات سے شدید طور پر متاثر ہو گیا۔ اس بچے کو طاقتور قسم کے مسکن ادویات کے ٹیکے دیئے گئے مگر نہ بچہ نے ہاتھوں کو الگ کیا اور نہ ہی اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ ادھر پولیس نے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کے سیلا کو روم کے ایک ہسپتال سے ڈھونڈ نکالا۔ کے سیلا نے وہیں سے بچے کو ٹیلی فون پر زور دار آواز میں کہا "ایک، دو، تین۔ اب تمہارے ہاتھ آزاد ہیں۔" اور عین اسی وقت بچے نے انگلیوں کو آرام سے کھول لیا۔

ان حالات میں فن تنویم کے بارے میں دو قسم کے مختلف الرائے افراد سامنے آتے ہیں ایک وہ جو اس علم کو خوفناک ترین سفلی علم قرار دیتے ہیں دوسرے وہ جو اس طریقے سے شفایاب ہونے والے مریضوں کو دیکھ کر اس کی افادیت میں رطب اللسان ہیں۔ ایسی ہی دو متضاد آراء کے حامی افراد کا رویہ جرائم اور ہپناٹزم کے بارے میں ہے۔

سراغرسانی کی دنیا میں ہپناٹزم کے استعمال کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ بوسٹون (امریکہ) میں پولیس کے محکمہ میں تنویم کا ایک خصوصی یونٹ قائم ہے۔ یہ لوگ جرم کے وقوعہ پر موجود افراد سے رابطہ کرتے ہیں۔ بسا اوقات جرم کی شدید نوعیت کی صورت میں عینی شاہد جزئیات بھول جاتا ہے یا اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے ایسے میں تنویمی عمل کے ذریعے ان کے دماغی توازن کو معمول پر لایا جاتا ہے اور نہایت قیمتی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

طب و سراغرسانی کے میدانوں سے ہٹ کر ہپناٹزم کا ایک اور طریقہ خاصا مقبول ہوا ہے۔ یہ خود ترغیبی کے ذریعے اپنے آپ کو ہپناٹائز کرنے کا عمل ہے۔ فالتو جھجک، خوف، خطرہ، کم حوصلگی ہر جگہ اس طریقے کو آزما کر خاطر خواہ نتائج اخذ کئے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً محمد علی باکسنگ کے مقابلوں سے پہلے اور اداکار سلویسٹر سٹیلون مشہور زمانہ ریمبو فلمیں بنانے سے پہلے خود تنویمی کے ذریعے ہی حواس مجتمع کرتے رہے۔ موٹر کاریں چلانا سکھانے والے ایک استاد نے بتایا کہ وہ اپنے شاگردوں کو امتحان سے پہلے ترغیب دے کر ان کی گھبراہٹ دور کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۰ میں سے ۸ شاگرد پہلے موقع پر ہی امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۲۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو پال ہارڈرپ نامی نوجوان نے کوپن ہیگن میں ایک بنک میں گھس کر دو آدمی قتل کر دیئے جب اسے گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس نے ایک عجیب بات کہی۔ اس نے بتایا کہ اسے بجورن نیلسن نامی ہپناٹزم کے ایک ماہر نے مسلسل ۳ ماہ تک ہر روز یہ سبق پڑھایا کہ وہ بنک لوٹے گا اور اگر کیشیئر رقم نہ دے تو اسے گولی مار دے گا۔ ڈنمارک حکومت نے پال ہارڈرپ کو ایک نفسیات دان ری ٹر کے حوالے کر دیا۔ ڈاکٹر ری ٹر نے بیان دیا کہ پال ہارڈرپ نے یہ قتل اپنی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ نفسیات دانوں نے نیلسن بجورن نامی شخص کو مجرم قرار دیا اور اس نے بھی اس کی ذمہ داری قبول کی کیونکہ اس کے بقول وہ ہپناٹزم کی قوت کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ اسے عمر قید کی سزا دینے پر عوامی حلقے دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک کے نزدیک وہ بے گناہ تھا اور دوسرا اسے مجرم قرار دے رہا تھا۔

نیلسن بجورن نے تو کسی اور شخص کے ذریعے یہ خطرناک غلطی کی تھی۔ مگر روس میں وولف میسنگ Wolf Messing نامی شخص نے سرکاری سطح پر خود ایک تجربہ کر کے دکھایا جس سے ایک بینک کیشیئر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ قصہ یوں ہے کہ ۱۹۴۰ء میں اسٹالن نے حکم دیا کہ وولف میسنگ نامی شخص کے بارے میں رپورٹ دی جائے کہ اس کی قوتوں کے قصوں میں کتنی صداقت ہے۔ میسنگ دو سرکاری اہلکاروں کو بطور گواہ ساتھ لے کر بنک میں گھس گیا۔ اس نے کیشیئر کو کاغذ پکڑا کر کہا کہ مجھے ایک لاکھ روبل ادا کرو۔ سرکاری اہلکاروں کے سامنے کیشیئر نے نوٹوں کی گڈی نکال کر میسنگ کو دی اور وہ انہیں بریف کیس میں رکھ کر اہلکاروں کے ہمراہ بینک سے باہر آ گیا۔ پھر یہ لوگ دوبارہ بنک میں داخل ہوئے میسنگ نے ساری رقم واپس کی اور کیشیئر کو وہی کاغذ پھر دیا۔ یہ کیا تھا صرف ایک سادہ کاغذ کا ٹکڑا جس پر کیشیئر نے تنویم کے زیر اثر اتنی بڑی رقم ادا کر دی۔ اس لمحے جب کیشیئر کو احساس ہوا کہ وہ کیا کر بیٹھا تھا تو اسے دل کا شدید دورہ پڑا جس نے اس کی جان لے لی۔

# آتش قدمی
## "آگ سے کھیلنے والے"

آگ سے کھیلنے والوں میں سب سے زیادہ پراسرار شخصیت ایک عورت جو جرار ڈیلی کی ہے۔ جو ۱۷۸۰ء میں اٹلی میں پیدا ہوئی۔ اس کے کرتب تمام آگ کے بازی گروں سے منفرد تھے۔ جن کی بناء پر اسے ۱۸۱۸ء میں برطانیہ کے دورے کے دوران "نہ جلنے والی عورت" کا خطاب دیا گیا۔ اسے بے پناہ شہرت ملی کیونکہ اس کے کرتبوں میں نظر کا دھوکا نہیں بلکہ قوت برداشت کا مظاہرہ تھا۔

اس کے کرتب، دہشت ناک ہوا کرتے تھے وہ نائٹرک ایسڈ کو منہ میں بھر کر چند لمحے کے لئے تماشائیوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی اور پھر اسے لوہے پر تھوک دیتی۔ سب کی نظروں کے سامنے مرتکز ترشہ لوہے پر گرتا اور لوہے سے نارنگی رنگ کے ابخرات اڑنے لگتے اور ثابت ہو جاتا کہ تیزاب سچ مچ منہ میں تھا۔ بعض اوقات وہ کسی برتن میں سب کے سامنے تیل ڈال کر آگ پر ابالتی اور انڈے کی تھوڑی سی سفیدی ڈال دیتی جو فوراً پک جاتی جس سے پتہ چل جاتا کہ تیل سخت گرم ہے پھر وہ فوراً تیل کو منہ میں انڈیل دیتی اور چند لمحے توقف کر کے وہ تیل کو انگاروں پر چھڑکتی اور وہ بھڑک اٹھتے تاکہ لوگوں کو یقین ہو جائے کہ منہ میں گرم تیل ہی تھا۔

اس کا ایک کرتب زبان پر لاکھ یا موم کو پگھلا کر رکھنا تھا جس پر اس کا معاون مہر لگا کر نشان ثبت کر دیتا تھا لیکن یہ تو معمولی بات تھی اس نے بسا اوقات اس سے بھی زیادہ مشکل کام کیے۔ مثلاً. وہ سیسے کو پگھلا کر چلو میں بھر کر..... منہ میں ڈال لیتی۔ اسے کچھ دیر چباتی! اور پھر منہ سے دھات کے سکوں کی شکل کے گول پتلے ٹکڑے نکالتی۔ اس نے پگھلی دھات پر چل پھر کر بھی دکھایا۔ ایک اور کرتب میں وہ آہنی کھڑپے کو آگ میں تپا کر سرخ کر لیتی اور اسے ننگے بازوؤں اور پیروں پر مار کر دکھاتی۔ بالوں سے چھوتی اور تختے پر رکھ کر اتنی ٹھوکریں لگاتی کہ لوہا دہرا ہو جاتی اور اس وقت تو مجمعے کے چھکے چھوٹ جاتے جب وہ زبان سے تپتے ہوئے لوہے کو چاٹتی اور اس کی زبان پر تھوک سے شوں شوں کی آواز آتی۔ لیکن اس سارے تماشے میں اسے ذرہ بھر تکلیف نہ ہوتی اور نہ ہی جسم پر جلنے کا نشان پڑتا۔

ماہرین نے اس کا اچھی طرح معائنہ کیا مگر کبھی یہ راز نہ کھلا کہ حدت سے اس کا بدن، زبان اور بال متاثر کیوں نہ ہوتے۔ وہ کہتی تھی کہ میں ایک خفیہ قسم کی محلول لگا کر کرتب دکھاتی ہوں مگر یہ بات جھوٹ ثابت ہوئی کیونکہ شدید گرمی سے محلول کو جلنا یا پگھلنا اور دھواں بننا چاہئے تھا مگر ایسا کبھی نہ دیکھا گیا بلکہ تجربات کے دوران اس کی جلد اور زبان صاف پائی گئی ماہرین کا خیال تھا کہ اسے درحقیقت کوئی خلاف معمول جسمانی عارضہ لاحق ہے جس کے بارے میں سائنس ناواقف ہے۔ جو نے ماہرین سے کہا تھا کہ اسے بچھڑے کی ران دیں اور وہ جا کر اوون میں بیٹھ جائے گی اور اس وقت باہر نکلے گی کہ جب ران کا گوشت روسٹ ہو چکا ہو گا غالباً اس عجیب کرتب کا کوئی گواہ نہیں لیکن امکان ہے کہ جو نے ایسا بھی کر دیکھا چونکہ اس نے کہا تھا کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔[28]

کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک کرتب باز خدا بخش نے بھی "آتش قدمی" کے حوالے سے بہت زیادہ شہرت پائی یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے انگلستان کے ایک مشہور روحی محقق ہیری پرائس Harry Price نے اخبار دی ٹائمز کی ۲۳ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کی اشاعت میں ایک اشتہار دیا کہ پیشہ ور اور ایسے افراد جنہیں فطری طور پر حرارت سے مزاحمت کی صلاحیت ودیعت ہوئی ہے۔ رابطہ کریں تاکہ برطانیہ میں آتش قدمی کا پہلا باقاعدہ مظاہرہ کیا جائے۔ کافی عرصہ گزر گیا۔ مگر کسی نے بھی رابطہ قائم نہیں کیا ہیری پرائس کا ارادہ اس منصوبہ کو ترک کرنے کا ہوا مگر عین اس وقت ایک ۲۹ سالہ شخص خدا بخش منظر عام پر آیا اور پرائس کو یقین دلایا کہ وہ ایسا مظاہرہ کرنے پر تیار ہے اور اگر وہ چاہیں تو اس پر کوئی بھی تجربہ کر سکتے ہیں۔

۹ر ستمبر ۱۹۳۵ء کو سرے Surrey کے مقام پر ایک مظاہرے کا اہتمام کیا گیا۔ ایک فٹ گہرے ۲۵ فٹ لمبے اور ۳ فٹ چوڑے گڑھے کو ۳۰۰ گیلن، ۱۰ گیلن پیرافین اور لکڑی کے ڈبوں سے بھر کر ٹائمز رسالے کے ۲۵ عدد پرانے شماروں سے آگ لگا دی گئی۔ خدا بخش نے کچھ توقف کیا اور کہا کہ آگ کو خوب بھڑکنے دیا جائے۔ پونے دو گھنٹے بعد جب خندق تپ کر سرخ ہو چکی تھی اور باہر سے پھینکا جانے والا کوئلہ بھی بھڑک اٹھا تھا۔ تب خدا بخش لمبے لمبے ڈگ

بھرتا ہوا الاؤ میں داخل ہو گیا اور آرام سے چلتا ہوا دوسری جانب نکل گیا اس نے یہ تماشا ۳ مرتبہ دھرایا۔ سائنس دانوں نے اس کے پیر دیکھے وہاں جھلسنے کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اور اس کا پاجامہ تک جلنے سے بچا ہوا تھا۔

موقع پر موجود ایک سائنس دان کو جوش آ گیا اور وہ بھی انگاروں کو ننگے پاؤں سے روندنے کے لئے الاؤ میں داخل ہونے کی حماقت کر بیٹھا اور اسی لمحے چیخیں مارتا ہوا باہر نکل آیا انگاروں نے اس کے تلوؤں میں آبلے ڈال دیئے تھے۔

خدا بخش نے اس واقعے سے بڑی شہرت پائی۔ ۱۹۳۸ء میں اس نے ایک اور مظاہرہ کیا اور راک فیلر پلازہ میں موجود ۱۴۰۰ ڈگری پر گرم بھٹی میں جا گھسا اس بار اس کے پیروں پر چند چھوٹے چھوٹے سے آبلے پڑ گئے۔

اس نے دنیا بھر میں گھوم پھر کر اپنے کرتبوں کا مظاہرہ کیا جب اس سے پوچھا کہ وہ یہ سب کس طرح سے کرتا ہے تو اس کا جواب تھا۔ حوصلہ اور یقین۔ بس یہی سب کچھ ہے۔ "[29]

---

عیسائی مبلغ Monsignon Despartuers نے جس زمانے میں میسور کا دورہ کیا تو مہاراجہ نے اس کے لئے ایک عجیب تماشے کا اہتمام کیا۔ ڈسپارچر نے دیکھا کہ ایک ۱۳ فٹ لمبا اور چھ فٹ چوڑا گڑھا کھودا جا رہا ہے۔ اس ایک فٹ گہرے گڑھے میں آگ جلا کر اس قدر دہکائی گئی کہ تماش بینوں کو گڑھے سے ۲۵ فٹ دور بیٹھنے میں ہی عافیت نظر آئی تب ایک مسلمان شخص جو شمالی ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا آیا اور گڑھے کے عین کنارے پر آن کھڑا ہوا اور مہاراجہ کے محل کے ایک ملازم کو آگ میں جانے کا حکم دیا جب اس نے انکار کیا تو مسلمان شخص نے اسے زبردستی گڑھے میں دھکیل دیا لیکن لوگ یہ دیکھ کر حیران ہو گئے کہ وہ آدمی جس کے حواس رخصت تھے آگ میں داخل ہونے پر پرسکون ہو گیا کیونکہ حدت اسے کچھ نہ کہہ رہی تھی۔ دیکھا دیکھی دس اور ملازمین بھی انگاروں پر سے آرام سے گزر گئے ان کے بعد مہاراجہ کے بینڈ کا عملہ ساز بجاتا ہوا گزر گیا مگر کسی کو آبلہ تک نہ پڑا۔ دو انگریز بھی ان عجیب انگاروں پر سے گزرے ان کے علاوہ ۲۰۰ مزید تماشائیوں نے بھی اس تماشے میں حصہ لیا جب مہاراجہ نے تماشہ ختم کرنے کا اشارہ دیا تو وہ مسلم کرتب باز دھڑام سے زمین پر آن گرا اور پانی پانی چلانے لگا اسے فوراً خوب پانی پلایا گیا تو اسے کچھ دیر بعد چین آیا مہاراجہ نے ڈسپارچر کو بتایا کہ یہ کوئی مذہبی تقریب نہیں تھی۔ بشپ کے قریب ہی کھڑے ایک برہمن نے اس تمام واقعے کی یہ توجیہہ پیش کی کہ مسلم کرتب باز گڑھے کے کنارے کھڑا اس حرارت کو جذب کر رہا تھا جو دوسری صورت میں اوپر سے گزرنے والوں کے جسموں کو جلا سکتی تھی۔[30]

---

نتھان کاکر Nathan Coker ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوا۔ وہ ایک غلام تھا۔ اس کا مالک پرنل Purnell میری لینڈ کا ایک وکیل تھا جو بڑا سخت مزاج اور سنگدل واقع ہوا تھا۔ بے چارہ نتھان اکثر بھوکا رہتا۔ ایک دوپہر جب باورچی، باورچی خانہ سے باہر تھا۔ نتھان چوری چھپے اندر چلا آیا اور دیکھا کہ ایک برتن میں کچھ پک رہا ہے۔ اس نے ندیدے پن سے کھانا نکالا اور گرم گرم حالت میں منہ میں ڈال لیا۔ سخت بھوکا تھا اور اسے خیال ہوا کہ منہ جل جائے گا۔ مگر کچھ بھی تو نہ ہوا۔ تب اسے پتہ چلا کہ گرم چیزوں سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور وہ جو چاہے کھا پی سکتا ہے چاہے وہ کتنی ہی گرم ہو۔ الٹا سرد چیزوں سے اسے پریشانی ہوا کرتی تھی۔

آزاد ہونے پر نتھان لوہار بن گیا۔ وہاں وہ اکثر لوہے کی گرم سرخ سلاخ کو بھٹی سے باہر ہاتھوں کی مدد سے نکال لیا کرتا۔ مگر ہاتھوں کو کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ جب نتھان کی اس خصوصیت کا علم اور لوگوں کو ہوا تو ایک روز علاقے کے لوگوں نے اس کا کرتب دیکھنے کا انتظام کر دیا۔ اس موقع پر دو طبیب اور دو اخبارات کے ایڈیٹر بھی موجود تھے۔

لوگوں کے سامنے نتھان نے ایک فولادی کھرپے کو اتنا گرم کیا کہ وہ سفید ہو گیا اور پھر اسے پیروں کے ننگے تلوؤں پر رکھ کر دکھایا۔ اس کے بعد کھرپا دوبارہ گرم کیا گیا اور نتھان نے لوگوں کو کھرپا اس طرح چاٹ کر دکھایا۔ پھر پگھلا ہوا سیسہ اس کی ہتھیلیوں پر ڈالا گیا۔ جسے نتھان نے اپنے منہ میں ڈال لیا۔ تھوڑی دیر دانتوں اور مسوڑھوں پر گھمایا اور سخت ہونے پر باہر نکال کر دکھایا۔ ہر کرتب کے بعد طبیب نتھان کا جائزہ لیتے لیکن انہیں اس کے جسم کا کوئی حصہ حرارت سے متاثر نظر نہیں آیا۔ اس تماشے کی روئیداد نیویارک ہیرالڈ میں ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔[31]

# پراسرار آتش زدگی
# یہ انسان کیوں جل گئے

۱۷۰ پاؤنڈ وزنی خاتون کا کیا بن گیا۔ ایک راکھ کا ڈھیر۔ کھوپڑی ٹخنہ اور پیر جو ساٹن کی جوتے میں موجود تھا۔ جگر ریڑھ کے ایک ٹکڑے سے چپکا پڑا تھا باقی سارے کا سارا بدن جل کر خاکستر ہو چکا تھا۔ کس قدر خوفناک منظر تھا!

پیٹرس برگ فلوریڈا میں یہ واقعہ ۱۹۵۱ء میں جولائی کی پہلی تاریخ کی صبح ۶۷ سالہ بیوہ Marry Hardy Reeser کے ساتھ پیش آیا مکان کی مالکہ صبح آٹھ بجے عمر رسیدہ بیوہ کو ایک ٹیلی گرام دینے آئی مگر دروازے کا دستہ سخت گرم تھا دو آدمیوں نے اس کی مدد کی اور دروازہ کھولا تو اندر یہ بھیانک منظر دیکھنے کو ملا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ۴ فٹ قطرے کے دائرے کے اندر ہر چیز بشمول بوڑھی عورت جل کر خاکستر ہو چکی تھی اور سیاہ دائرے سے باہر ہر چیز مکمل طور پر محفوظ تھی۔ مالک مکان کو یاد آیا کہ گزشتہ رات ۹ بجے اس نے میری کو آرام کرسی پر بیٹھے سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔ کیا سگریٹ سے اتنی تیز حرارت پیدا ہوئی کہ آرام کرسی اور بوڑھی میری دونوں جل گئے؟ اور حرارت کا اثر بھی ۴ فٹ قطرے کے ایک دائرے میں محدود رہا؟

سگریٹ میں اتنی حرارت ہو ہی نہیں سکتی۔ بھٹیوں میں بھی جہاں لاشوں کو جلا کر راکھ بنائی جاتی ہے ۲۵۰۰ ڈگری فارن ہیٹ کا درجہ حرارت گھنٹوں تک مسلسل درکار ہوتا ہے۔

آتش زدگی کے جرائم کا ماہر سراغرسان ایڈورڈ ویوس بڑا حیرت زدہ تھا۔ وہ بس یہی کہہ سکا کہ عورت آگ سے ہلاک ہوئی۔ آگ کیوں لگی یہ علم نہیں۔

پنسلوانیا یونیورسٹی کے ماہر امراض ڈاکٹر کازمین نے عورت کی بندر کی طرح سکڑی کھوپڑی دیکھ کر کہا کہ میں نے کبھی اس طرح کی انسانی کھوپڑی نہیں دیکھی۔ آگ کیوں لگی؟

کیا پٹرول استعمال ہوا تھا؟ ماہرین کا جواب تھا کہ کوئی کیمیائی مادہ استعمال نہیں ہوا تھا۔ پھر کیا بجلی کا شارٹ سرکٹ ہوا؟ لیکن حرارت کے اثر سے تو فیوز خود

میری ہارڈر کا گھر پراسرار آتشزدگی

جان اروِنگ بنٹلے پراسرار آتشزدگی نے اس کی نصف ٹانگ چھوڑ کر باقی پورا بدن خاکستر کر دیا

ہی اڑا گیا تھا۔ پولیس چیف کا کہنا تھا کہ منطقی طور پر ایسا ہونا خارج از امکان ہے مگر ایسا ہو چکا ہے۔ پولیس نے سگریٹ کو آگ کا سبب قرار دیتے ہوئے فائل بند کر دی۔

انسانی تاریخ میں لوگوں کے بظاہر بلا سبب جل جانے کا یہ واحد واقعہ نہیں تھا اس سے پہلے اور بعد میں ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں۔

۱۸۸۸ء کے برٹش میڈیکل جرنل میں سکاٹ لینڈ کے ایک فوجی کی تصویر شائع کی گئی جس میں اس کا بدن بری طرح جھلسا دکھایا گیا تھا پراسرار آگ کے اثر سے اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

برٹش میڈیکل جرنل میں ہی ۱۸۹۱ء میں ایک خاتون کی ٹانگ کے جل کر خستہ ہو جانے کا واقعہ درج تھا۔ تاہم اس کی جراب بالکل محفوظ تھی۔ ایسے ہی ۱۹۱۹ء میں ایک مصنف جے ٹمپل تھرسٹن کا سینہ سے نچلا سارا حصہ جل گیا تھا لیکن کپڑے بالکل صحیح سلامت رہے۔

ایک ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے۔ جولائی کی ۲۹ تاریخ تھی۔ ایک خاتون میری کارپنٹر اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ نورفوک برطانیہ کے ساحل پر چھٹی کا دن منا رہی تھی انہیں کیا خبر تھی کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ میری کارپنٹر کشتی کے عرشے پر غسل آفتاب لے رہی تھی کہ اچانک اس کے بدن سے آگ کے شعلے نکلنے لگے اور چند لمحوں میں وہاں راکھ کا ایک ڈھیر رہ گیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ عرشے کی باقی ہر چیز آگ کے اثر سے محفوظ رہی۔(32)

ایک اور مشہور واقعہ ۱۹۶۶ء کا ہے جب ایک میٹر ریڈر ایک ۹۰ سالہ ریٹائرڈ ڈاکٹر جان اروِنگ بنٹلے کے مکان میں داخل ہوا تو اسے ایک عجیب سی بو اور آسمانی رنگ کے دھوئیں کا احساس ہوا۔ ڈھونڈنے پر اسے ایک دہشت ناک منظر دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ غسل خانے میں فرش پر ایک سوراخ بنا ہوا ہے جو سیاہ کناروں کی وجہ سے جلنے کے نتیجے میں بننے کا پتہ دے رہا ہے۔ اس سوراخ کے ساتھ بوڑھوں کے زیر استعمال آسانی سے چلنے کے لئے استعمال ہونے والا والا

فولادی جنگلا پڑا ہے۔ لیکن تھرا دینے والی چیز ڈاکٹر ینٹلے کی دائیں ٹانگ کا کچھ حصہ اور اس میں موجود جوتا تھا جو سوراخ کے ساتھ پڑے تھے جب کہ باقی جسم خاکستر ہو کر سوراخ کے اندر آ پڑا تھا اور گھٹنے کا جوڑ صاف پہچانا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ حرارت کا ایک بیم جیسے روشنی کا ہوتا ہے ایک جگہ پر مرکوز رہا اور آس پاس کی چیزیں حرارت کے اثر سے محفوظ رہیں۔

یہ انسان کیوں جل گئے؟

جرم و سزا اور سراغرسانی کی طب "فارینزک میڈیسن" کے ایک محقق ڈاکٹر الفرڈ سوائن ٹیلر نے ۱۸۷۳ء میں لکھا تھا کہ معلومہ حقائق کی رو سے اس قسم کی آتش زدگی کی کوئی تشریح ممکن نہیں۔

پراسرار آتش زدگی کے محققین کی ایک رائے یہ ہے کہ جلنے کے واقعات ان لوگوں کے ساتھ پیش آئے جو شراب کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔

ڈنمارک کے ۱۷ ویں صدی کے طبی محقق تھامس پرتھورلن نے ایک عورت کا واقعہ بیان کیا جو تین سال سے برانڈی پر گزارہ کر رہی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک روز جب وہ بھوسے کے ڈھیر پر لیٹی ہوئی تھی تو اس کا بدن جل کر خاک ہو گیا صرف انگلیوں کے سرے اور کھوپڑی بچ گئے۔

اس قسم کے کئی واقعات کے پیچھے شراب کے استعمال کی زیادتی کا عنصر خاصا غالب دکھائی دیتا ہے چنانچہ شراب کے نقصانات کی فہرست میں انسانی آتش زدگی کو بھی داخل کر دیا گیا۔ کہا گیا کہ یہ آگ آدمی کے اندر سے لگتی ہے اور پانی سے نہیں بجھتی۔

مائیکل ہیری سن نامی محقق نے ریاست ٹینسی کے یونیورسٹی آف ناش ولی کے ایک پروفیسر جیمز ہملٹن کا واقعہ بیان کیا ہے۔ ہملٹن ۱۸۳۵ء میں ایک روز اپنے گھر کے باہر کھڑا تھا کہ بائیں ٹانگ میں یوں محسوس ہوا جیسے بھڑ نے کاٹ لیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہاں سخت گرمی بھی محسوس ہوئی۔ ہملٹن نے جھک کر دیکھا کہ اس کے پاجامے سے ایک شعلہ نکل رہا ہے۔ اس نے ہاتھ مار کر شعلہ بجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ بجھا۔ یہ بات اس کے حواس رخصت کرنے کو کافی تھی مگر اس کے دماغ نے کام کیا کہ آگ کو اگر ہوا کی فراہمی روک دی جائے تو وہ بجھ جاتی ہے چنانچہ اس نے فوراً ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر شعلے کو ڈھانپ دیا تو وہ بجھ گیا اور اس کی جان بچ گئی۔(33)

شراب والا سبب کوئی لازمی عنصر نہیں۔ ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں جن میں ہلاک ہونے والے افراد شراب کے رسیا نہیں تھے۔

پھر آخر ان لوگوں پر کیا آفت ٹوٹی اور ایسا کیوں ہوا؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان تمام افراد کے دل میں مر جانے کی شدید تمنا تھی۔ یہ لوگ بوجوہ خودکشی نہ کر پائے تو مرنے کی خواہش نے ان کے بدنوں کو جلا کر بھسم کر ڈالا۔ کیا سوچ مادی جسم پر اس بھیانک طریقے پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔

# غیر حنوط شدہ محفوظ لاشیں

امریکی بحریہ کے ایک ہیرو کا نام جان پال جونز تھا۔ ۱۷۹۲ء میں وہ پیرس میں گردے کے عارضے کے سبب ہلاک ہوا تو فرانس میں غیر مقامی پروٹسٹنٹ افراد کے قبرستان میں اماتاً دفن کر دیا گیا۔ پہلے تو ارادہ یہی تھا کہ لاش امریکہ منتقل کر دی جائے لیکن فرانس کا انقلاب شروع ہونے سے معاملہ تعطل کا شکار ہو گیا۔

۱۸۹۹ء میں فرانس میں امریکی سفیر جنرل پورٹر نے کوشش شروع کر دی کہ اپنے قومی ہیرو کا جسد تلاش کیا جائے۔ مگر اتنا عرصہ گزرنے کے سبب یہ خاصہ دشوار کام ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک صدی سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اور قبرستان کب کا ختم کر کے وہاں باغ بنا دیا گیا تھا۔ جہاں مردہ کتوں اور گھوڑوں کو بھی دفن کیا جاتا رہا تھا۔

تلاش جاری رہی اور کئی سال گزر گئے۔ خدا خدا کر کے گورستان کا سراغ ملا۔ اب سفیر کے حکم پر جونز کے تابوت کی تلاش شروع ہوئی۔ ۳۱ر مارچ ۱۹۰۵ء کو یہ سنا گیا کہ ایک تابوت ملا ہے اور قوی امکان ہے کہ یہ جونز کا ہی تابوت ہے۔ اپریل کی ۷ تاریخ کو تابوت کھول دیا گیا۔ بعد میں امریکی سفیر پورٹر نے

کہا "ہم بے پناہ حیران ہوئے۔ جسد حیران کن حد تک محفوظ تھا۔ گوشت پوست بہت معمولی سا سکڑا تھا۔ جس کی رنگت خاکی مائل بھوری تھی۔"

لاش کے سر پر ٹوپی موجود تھی۔ جس پر قومی ہیرو جونز کے نام کے ابتدائی حروف تہجی درج تھے۔ لاش کی چیر پھاڑ سے موت کا سبب معلوم ہو گیا۔ ایک فیصد شک کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ لاش امریکی قومی ہیرو جان پال جونز کی نہیں ہے۔

۲۴ر جولائی ۱۹۰۵ء کو جونز کا غیر معمولی طور پر محفوظ جسد اپنی پہلی تدفین کے ۱۱۳ سال اور ۴ روز بعد اینا پولس کی بحریہ کی تربیت گاہ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دوبارہ دفن کر دیا گیا۔

مشہور زمانہ فاتح نپولین بونا پارٹ کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ شکست کے بعد وہ سینٹ ہیلی نا کے جزیرے میں قید کر دیا گیا۔ شائد کینسر کے سبب اس نے اسی جزیرے میں دم توڑا تھا اور یہیں دفن کر دیا گیا۔ ادھر فرانس میں اس کا بھتیجا لوئس نپولین شہنشاہ لوئس فلپ سے مسلسل اصرار کرتا رہا کہ اس کے عظیم چچا کی لاش دیار غیر سے منگوا کر اپنے وطن ہی میں مقبرہ بنا کر دفن کیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ کے حکم سے ۱۸۴۰ء میں ایک بحری جہاز ہیلنا کے لئے روانہ کیا گیا۔

جزیرے پر نپولین کا تابوت کھولا گیا تو فرانسیسی ڈاکٹر گلارڈ قریب موجود تھا۔ مگر اسے صرف ۲ منٹ کی مدت دی گئی کہ وہ لاش کا جائزہ لے۔ یہ بہت کم وقت تھا۔ لیکن دیکھنے والوں نے بھی نہایت عجیب بات نوٹ کی۔ ۲۰ برس پرانی لاش بالکل محفوظ اور تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے خدوخال میں کوئی نمایاں تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے پرانے شناساؤں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ ڈاکٹر گلارڈ کا بیان تھا کہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ تدفین ہوئی ہو۔ اس کی داڑھی اور ناخن موت کے بعد اگ آئے تھے اور جلد ابھی تک نرم و نازک اور لچک دار تھی۔ کفن کے ساتھ چاندی کے دو برتنوں میں عظیم سپہ سالار کی آنتیں اور دل علیحدہ محفوظ کر کے رکھ دیئے گئے تھے۔ گلارڈ کا اندازہ تھا کہ علاقے کی آب و ہوا نے لاش کو اتنا عرصہ محفوظ رکھا ہے۔

ابراھام لنکن کا واقعہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ چوروں اور سمگلروں کا ارادہ تھا کہ لنکن کا تابوت قیمتی نوادرات کی حیثیت سے چرا لیا جائے۔ چوری کی یہ کوشش ۱۸۷۶ء میں ناکام ہو گئی۔ لنکن کے بیٹے رابرٹ لنکن کو خدشہ تھا کہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس کے اصرار پر فیصلہ کیا گیا کہ لنکن کا تابوت اس کے مقبرے میں ۱۰ فٹ گہرائی میں دفن کر کے اسے کنکریٹ سے بھر کر بند کر دیا جائے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۰۱ء کو ایک مجمع کے سامنے تابوت نکالا گیا۔ رابرٹ لنکن موجود تو نہ تھا لیکن اس نے کہلا بھیجا تھا کہ لنکن کا تابوت کھول کر نہ دیکھا جائے۔ لیکن موقع پر موجود معتبر افراد نے اس کے برخلاف تابوت کھول کر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ عام لوگوں میں عرصہ سے افواہ گرم تھی کہ لنکن کی لاش اس کے تابوت سے غائب کر دی گئی ہے۔

مقبرے میں ۲۳ افراد موجود تھے۔ مزدوروں نے جونہی تابوت کا ڈھکن اٹھایا ایک چھبتی ہوئی بو چاروں طرف پھیل گئی۔ سب لوگ تیزی سے آگے بڑھے اور تابوت میں دیکھنے لگے۔ لنکن کا مردہ بہت عمدہ حالت میں موجود تھا۔ داڑھی اور سر کے بال حتیٰ کے مساتک محفوظ تھا۔ ہاتھوں پر موجود دستانے کب کے گل سڑ کر ختم ہو چکے تھے اور جلد کا رنگ غیر معمولی طور پر خاکستری مائل نظر آ رہا تھا۔

لاش کی حفاظت کی اور مثال نامور انگریز شاعر لارڈ بائرن کی ہے۔ ۱۸۲۴ء میں اس کی لاش یونان سے لندن لائی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں جون کی ۱۴ تاریخ کو اس کی تدفین کے ۱۱۴ برس بعد اس کا مقبرہ کھولا گیا۔ عیسائی مذہبی راہنما ریورینڈ کینن باربر نے اس کا حکم خصوصی طور پر دیا تھا۔ درحقیقت ۱۸۲۴ء میں بائرن کو ویسٹ منسٹر میں ایک شاندار سنگ مرمر کے مقبرے میں دفن کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا مگر اس وقت مہتمم نے وہاں تدفین نہ ہونے دی کیونکہ بائرن کسی اچھی شہرت کا مالک نہیں تھا۔ تب سے بائرن کی اصل لاش کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوتی آ رہی تھیں۔ ریورینڈ باربر کا ارادہ تھا کہ اس طرح نہ صرف بائرن کی لاش کا مسئلہ حل ہو جائے گا بلکہ اس کے مدفن کے بارے میں معلومات کا ایک ریکارڈ بھی اکٹھا ہو جائے گا۔

سب سے پہلے تابوت سے سیسے کا بنا ہوا ایک ڈھکن اٹھایا گیا تو نیچے ایک اور ڈھکنا دکھائی دیا۔ اسے بھی ہٹا دیا گیا تو تیسرا اور آخری لکڑی کا تختہ نظر آیا۔ جیسے ہی ڈھکنا اٹھایا گیا تو اپنے عہد کا مشہور شاعر لارڈ بائرن اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ ابدی نیند سوتا پایا گیا۔ صرف اس کے ہاتھوں اور ٹخنوں سے نیچے پیر سے استخوانی نظام واضح تھا۔ وگرنہ باقی بدن کے بال تک ٹھیک ٹھاک تھے۔ اس کے سر کے پچھلے حصے اور سینے میں شگاف تھا جہاں سے دماغ اور دل نکال لئے گئے تھے اور قریب ہی رکھے گئے برتن میں محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ لاش کے اعضائے تناسل غیر معمولی حد تک نشوونما پا چکے تھے۔[34]

# زمانے میں سفر

۱۹۱۱ء میں ایک کتاب شائع ہوئی An Adventure مصنفہ آکسفورڈ کی دو خواتین شارٹ لٹ موبرلے CHARLITTE MOBERLY اور ایلینور جارڈین ELEANOR JOURDAIN تھیں ان کا بیان تھا کہ ۱۹۰۱ء میں وہ دونوں ورسائی کے محل کے باغ کی سیر کر رہی تھیں کہ یکایک انہوں نے دیکھا کہ وہ ۱۷۸۹ء کے دور میں آگئی ہیں (یہ وہ زمانہ تھا جب انقلاب فرانس کا جوالا مکھی پھٹنے کو تھا) ۔ انہوں نے دیکھا کہ لوگوں نے اسی دور کے لباس پہن رکھے ہیں اور آپس میں حالیہ سیاست (۱۷۸۹ء) پر گفت و شنید کرتے پھر رہے ہیں۔[35] انہوں نے سبزی مائل لباس پہنے دو آدمی دیکھے جن کے سروں پر تین کونوں والا ہیٹ تھا۔ ایک چیچک زدہ سیاہ چہرے والا شخص بھی نظر آیا۔ جارڈین کا کہنا تھا کہ ماحول بڑا خوابناک اور بوجھل تھا۔ تنہائی کا احساس تھا اور بے چینی ہو رہی تھی۔ اگرچہ دونوں کو یکساں حالت کا سامنا تھا مگر وہ بڑی خاموش رہیں اور اس واقعے کی بابت گفتگو بھی نہ کر سکیں۔ ایک ہفتے بعد جا کر کہیں اس حیرت انگیز تجربے پر ایک دوسرے سے بات کی حتیٰ کے جھوٹا کہلائے جانے کے خوف سے بھی بہت عرصے بعد چھٹکارا حاصل کیا اور بڑی جرأت سے یہ کتاب شائع کرائی۔

ان خواتین کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ ماضی میں پہنچ گئی تھیں۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ اس قسم کا دعویٰ بہت کم لوگوں نے کیا ہے۔ قصے کہانی کی حد تک زمانوں میں سفر کرنے کے لئے ٹائمنگ مشین کا افسانہ بھی خوب گھڑا گیا مگر تاریخ میں معدودے چند افراد کا تذکرہ موجود ہے جنہوں نے اپنا زمانہ چھوڑ کر ماضی میں پلٹنے اور واپس لوٹنے کا دعویٰ کیا اور ماضی کی تفاصیل بیان کیں۔

۱۹۷۳ء میں جین JANE O.NEILL نامی لڑکی کو ایک حادثہ میں شدید نوعیت کا صدمہ ہوا جس کے بعد سے اسے غیر معمولی تجربات سے گزرنے کا موقع ملا۔ مثلاً ایک موقع پر انگلینڈ میں فوتھرنگے چرچ کی سیر کے دوران اسے ایک تصویر میں بڑی دلچسپی محسوس ہوئی۔ بعد میں اس نے اس تصویر کا تذکرہ ایک دوست سے کیا تو اس نے کسی ایسی تصویر کی موجودگی سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جین کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس مقام پر اتنی اہم تصویر کو اس کے دوست نے کیوں نہ دیکھا۔ پتہ کراتے کراتے اسے یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ وہ تصویر تو چرچ کے اندر ۱۵۰۰ء کے زمانے میں لگی ہوئی تھی مگر جین کو کیسے پتہ چل گیا۔ کیا وہ چرچ کی سیر کرتے کرتے سینکڑوں برس پہلے کے ماضی میں جا کر واپس آئی تھی؟[36]

ماضی میں سفر کے واقعات کی بعض شارحین اس طرح تشریح کرتے ہیں کہ درحقیقت فرد زمانے کی حد پار نہیں کرتا بلکہ یہ سارا سلسلہ اس کے پچھلے جنم کی یادگار کے طور پر آواگانی خوابوں اور تصورات کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ ایک اور توجیہہ روشن ضمیری ہے یعنی ذہنی طور پر ان لوگوں کا رابطہ ماضی سے قائم ہو جاتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں بذات خود داخل ہو کر مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ وقت کائنات میں فلم کی ریل کی مانند محفوظ ہو رہا ہے۔ اس ریل میں بعض اوقات جھول آجاتا ہے اور جو اس میں داخل ہو جائے وہ ماضی یا مستقبل میں جا سکتا ہے۔ مگر ایک نظریہ زیادہ توجہ حاصل کر رہا ہے۔ وہ یہ کہ ماضی میں سفر دراصل آسیبی چکر ہے یعنی کسی آسیب زدہ مقام پر زمانہ ماضی کے حالات کو ہو بہو دوبارہ پیدا کیا جاتا ہے اور جو اس حلقہ آسیب میں داخل ہو جائے وہ اپنے آپ کو پچھلے دور میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ ہوتا اسی زمانے میں ہے۔ ورسیلز کے مقام پر دونوں خواتین میں کسی آسیب کی کرشمہ کاری دیکھ رہی تھیں۔ تو کیا ورسیلز کا محل آسیب زدہ ہے؟ شاید کیونکہ ان خواتین کے بعد اور لوگوں نے بھی ورسیلیز کے محل میں غیر معمولی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ مثلاً ۱۹۳۸ء میں ایک خاتون نے بتایا کہ ایک خوشگوار دوپہر کو محل کے باغ میں بیٹھے اس نے قدیم لباس میں ملبوس ایک جوڑے کو لکڑیوں سے بھری گاڑی کو دھکیل کر لے جاتے دیکھا۔ یہ جوڑا بالکل خاموشی سے گزر گیا حتیٰ کہ گاڑی کے چلنے کی آواز بھی نہ آئی۔ اسی طرح سے کئی واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

ماضی میں سفر کے ساتھ ساتھ بعض افراد کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ انہیں مستقبل کو جاگتی آنکھوں بقائم ہوش و حواس دیکھنے کا حیرتناک تجربہ ہو چکا ہے۔ ایک معتبر گواہی ایئر مارشل وکٹر گوڈراڈ کی ہے۔ جسے سر کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔

گوڈراڈ ۱۹۳۰ء میں ایک مرتبہ سکاٹ لینڈ میں شدید طوفان میں ہوائی جہاز اڑا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ جہاز کو قریب واقع ڈریم ایئر فیلڈ پر اتار لے جو

شارلٹ موبرے اور ایلینور جارڈن زمانے میں سفر

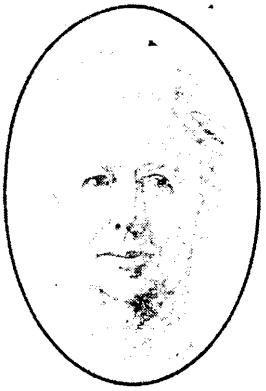

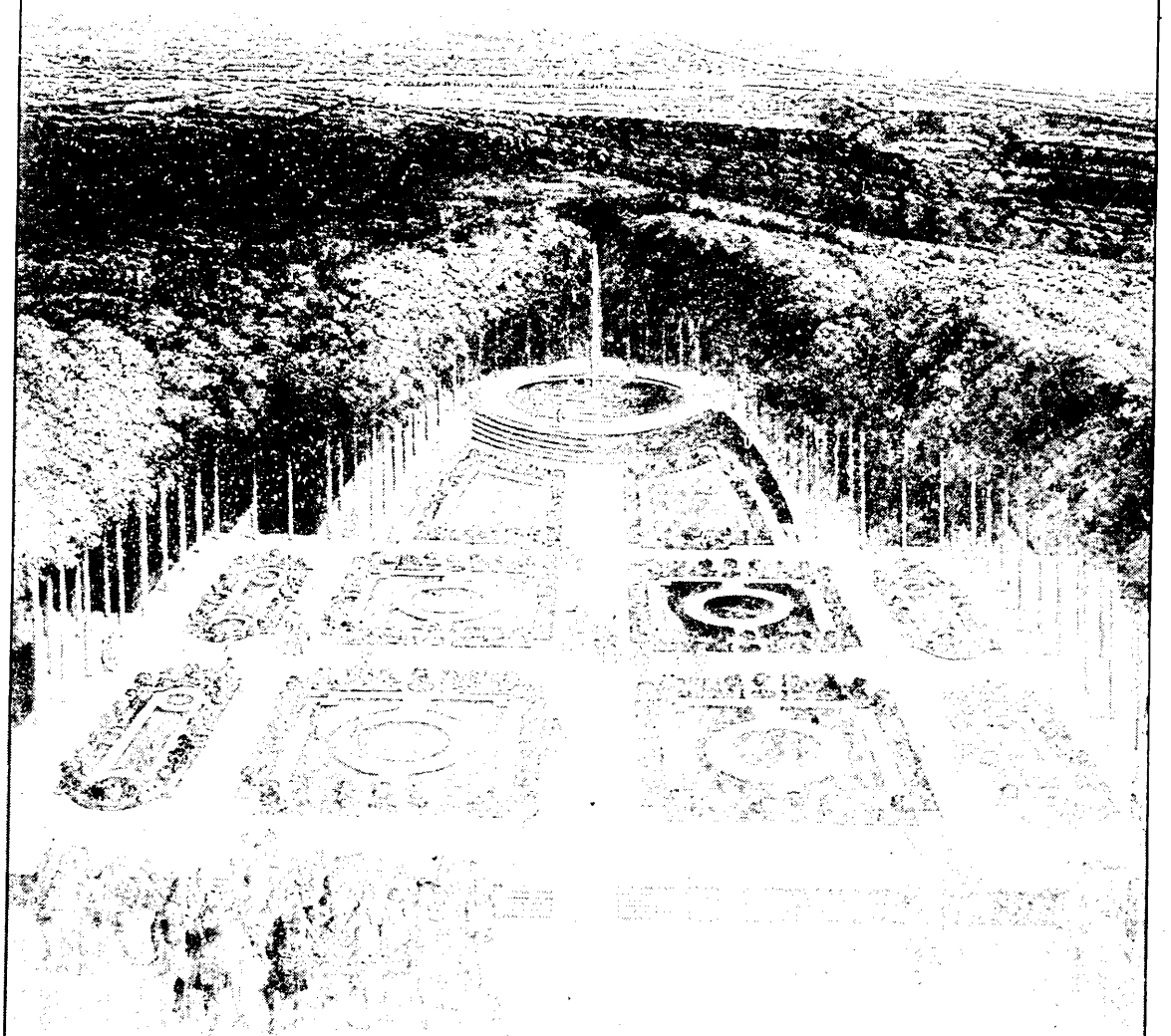

ایک عرصہ سے سنسان تھا اور کوئی اسے استعمال نہیں کر رہا تھا۔ وہ فیلڈ سے چوتھائی میل کے فاصلے پر تھا کہ ایک عجیب بات ہوئی۔ گوڈارڈ کو یوں لگا کہ جیسے وہ بیک وقت حال اور مستقبل میں موجود ہے۔ اچانک سارا علاقہ اثیری روشنی میں اس طرح نہا گیا کہ گویا موسم گرما کی دوپہر کا وقت ہو۔ نیچے خاصی چہل پہل تھی۔ جہازوں کے نو مرمت کروہ ہینگروں میں مشینیں دو پنکھوں والے جہازوں کی مرمت کر رہی تھیں۔ گوگوراڈ کا طیارہ زمین سے محض ۵۰ فٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ مگر کسی نے بھی اس کی طرف دھیان تک نہ دیا اور وہ ویسے کا ویسا دوبارہ طوفان میں داخل ہو گیا جیسے کسی نے اسے دیکھا تک نہ ہو۔ گوڈراڈ کے پاس اس وقت نقشہ موجود تھا مگر اس میں کہیں بھی اس ہوائی اڈے کا ذکر تک نہ تھا۔ گوڈراڈ اس واقعہ کی توجیہہ نہ کر پایا۔ چار برس بعد اسے جا کر معلوم ہوا کہ ڈریم کے مقام پر ایک نیا ہوابازی کا تربیتی ادارہ قائم کیا گیا ہے گویا وکٹر گوڈراڈ نے اپنی پرواز کے دوران مستقبل میں ۴ برس بعد کا منظر دیکھ لیا تھا۔ گوڈراڈ کا کہنا ہے کہ اس واقعے کے بعد سے اسے انسان کے آزاد ارادے کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرنا پڑی اور وہ جبر کے عقیدے کا قائل ہو گیا۔[37]

# انتقال روح

بچے کا نام تھا جسبیر، عمر چار برس سے کم ہی تھی جب جاٹ گھرانے کا یہ بچہ چیچک کا شکار ہو گیا بچارے کا جبڑا لٹک گیا اور سانس رک گئی بچے کے سرد بدن کو آنسو بھری نگاہوں سے دیکھتا ہوا اس کا غمزدہ باپ شری گردھاری لال اپنے گاؤں سے لوگوں کی مدد لینے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر اچھا ہوا کہ اسے آخری رسومات کے انتظامات میں بڑی دیر ہو گئی کیونکہ جب وہ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر لوٹا تو معجزاتی طور پر مردہ بچے میں زندگی کی رمق کے آثار نظر آنے لگے تھے اور سانس بحال ہو رہا تھا۔

چند ہفتوں بعد بچہ بالکل تندرست ہو گیا صرف چہرے پر چیچک کے کچھ نشانات باقی رہ گئے لیکن اس کی شخصیت میں ایک عظیم تغیر رونما ہوا۔ اس نے کھلونوں اور پرانے دوستوں کے ساتھ کھیلنا ترک کر دیا اور گھر والوں کا پکا ہوا کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا اس کا کہنا تھا کہ وہ جاٹ نہیں بلکہ اونچی ذات کا برہمن ہے اور تو اور اس کی گفتگو میں برہمن گھرانوں کے مخصوص الفاظ بھی آنے لگے۔ پڑوس کی ایک برہمن خاتون اسے کھانا پکا کر دیتی رہی وگرنہ بھوکا مر جاتا۔ جاٹوں کا خیال تھا کہ بخار سے بچے کے دماغ پر اثر پڑا ہے۔

یہ واقعہ شمالی ہندوستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں رسول پور میں ۱۹۵۴ء میں پیش آیا۔ لوگ بڑے پریشان تھے۔ جسبیر کو کوئی پراسرار قسم کا پاگل پن لاحق تھا کیونکہ ۴ سال کا بچہ اتنی روانی سے عجیب تفصیلات بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ جسبیر جاٹ نہیں بلکہ کسی گاؤں وہدی کا رہنے والا سوبھارام ہے اور اس کا باپ گردھاری لال نہیں شنکر ہے اور یہ کہ اس کی ایک بیوی اور بچہ بھی ہے۔

۳ برس گزر گئے۔ رسول پور کی ایک عورت شریمتی شیامو کافی عرصہ پہلے ۶۰ میل دور ایک گاؤں وہدی میں جا بسی تھی اور کبھی کبھار عزیز و اقرباء سے ملنے رسول پور کا چکر لگا لیتی تھی۔ اس بار وہ تقریباً سات برس بعد گاؤں آئی تھی اور اس سے پہلے کے چکر میں جسبیر محض دودھ پیتا بچہ تھا۔ یعنی کوئی امکان نہیں تھا کہ اس بار کے چکر میں وہ شیامو کو پہچان لیتا۔ لیکن ہوا یہ کہ جس بیر جاٹ کی نظر جونہی شیامو پر پڑی تو خوش ہو کر کہنے لگا کہ یہ ہماری اچھی ملنے والی ہیں حالانکہ وہ خاتون اونچی ذات کی تھی اور جسبیر کے گھرانے اس کا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ اسے لوگوں نے جسبیر کے واقعے کے بارے میں بتایا تو وہ بڑی حیرت زدہ ہوئی کیونکہ ادھر وہدی میں تیاگی فیملی کے ہاں اس کا آنا جانا تھا اور جسبیر کے بیان کردہ حقائق اسی گھرانے پر پورے اترتے تھے۔ تیاگی فیملی کے سربراہ شری شنکر لال تیاگی کا جواں مرگ بیٹا سوبھارام ۱۹۵۴ء میں حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ جسبیر کا بیان تھا کہ وہ سوبھارام ہے۔ اس نے اپنی پہلی زندگی کے خاتمے کے بارے میں بالکل درست باتیں بتائیں کہ وہ لوگ ایک شادی کی تقریب سے واپس آ رہے تھے۔ ۲۲ سالہ سوبھارام کو ایک دشمن نے مٹھائی میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا۔ راستے میں ہی اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ رتھ سے گر کر سخت زخمی ہو گیا اور سر پر لگنے والی چوٹ اسی شام اس کی جان لے بیٹھی۔ یہاں تک کے واقعے کی تصدیق سوبھا رام کے والد شری شنکر لال نے بھی کی پھر جسبیر/سوبھارام نے بتایا کہ اسے ایک سادھو ملا اور کہنے لگا کہ وہ کسی اور بدن میں جا گھسے۔ پھر شاید سوبھارام کو جسبیر نظر آیا جس نے چیچک کے ہاتھوں ابھی دم توڑا تھا اور وہ اس کے بدن میں داخل ہو گیا۔ وہدی سے شنکر لال اپنے گھرانے کے دوسرے آدمیوں کے ہمراہ رسول

پور آیا تو جسبیر کو بڑی خوشی ہوئی اور سوبھارام سے ہر شخص کا رشتہ سب کو بتایا۔ وہ اپنے بیٹے سے مل کر بڑا خوش ہوا۔ مگر اس کی پچھلی جنم کی بیوی کو جسبیر کے والد گر دھاری لال نے آنے سے روک دیا تھا۔ اب اس امر میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ جسبیر کے جسم میں سوبھارام کی روح داخل ہو چکی ہے مگر جاٹوں اور تیاگیوں نے لڑکے کو علیحدہ علیحدہ موقعوں پر اپنے ہاں ٹھہرانا شروع کر دیا۔ وہدی جا کر جسبیر/سوبھارام بڑا خوش خوش رہتا۔ دو تین بار وہ رسول پور سے فرار ہو کر تیاگیوں کے پاس گیا بھی مگر اس حرکت سے دونوں گھرانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔

یونیورسٹی آف ورجینیا سے ڈاکٹر آئیان سٹیفن سن اپنی کتاب کے سلسلے میں ۱۹۶۴ء میں خصوصی طور پر اس لڑکے سے ملنے آیا اس کا بیان تھا کہ لڑکا اپنے ظاہری ماں باپ اور دوسرے جاٹوں سے الگ تھلگ اداس رہتا ہے کیونکہ وہ اسے اس کے حقیقی والدین کے پاس وہدی لے جانے کے لئے تیار نہیں۔(38)

# طائر روح کی پرواز

کیا یہ بات ممکن ہے کہ بیک وقت ایک جسم دو مختلف مقامات پر موجود ہو؟ یعنی ایک فرد کو جس لمحے ایک مقام پر دیکھا جا رہا ہوں وہ عین اس لمحے مکانی اعتبار سے کسی اور مقام پر بھی موجود نظر آ رہا ہو۔

صوفیوں کی حکایات میں ایسے واقعات موجود ہیں۔ جنہیں جھوٹ، افسانہ یا حماقت کہہ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مگر بعض شواہد یہ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ شاید یہ ممکن ہے کہ فرد اپنے تخیل کی قوت کو بروئے کار لا کر اپنے جسم میں سے ایک اور وجود کو بر آمد کرے اور اسے اپنی مرضی کے تحت کسی اور مقام کو چلا جائے جب کہ اس کا پہلا وجود پہلے ماحول میں ٹھیک ٹھاک موجود رہے یہ طریقہ کار "جسم اثیری" کا ظہور کہلاتا ہے جب کہ دوسرے وجود کے ذریعے جو مشاہدات حاصل کئے جاتے ہیں انہیں باجم (باہراز جسم مشاہدات) کہا جاتا ہے۔ مبینہ باجم کی دو اقسام ہیں:۔

ایک تو کسی فرد کی بیک وقت ایک سے زائد مقامات پر موجودگی کا بیان اور دوسرے مر کر زندہ ہونے والوں کے بیانات۔ اول اول اطلاع ملی کہ آپریشن کرانے والے مریض کوئی کہانی سناتے ہیں کہ کس طرح ان کے بدن سے ایک اور بدن (پرانی شخصیت کے ساتھ) رونما ہوا اور اس نے کیا کچھ دیکھا کہا گیا کہ یہ بے ہوش کرنے والی ادویات کے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں کہ جب انہیں جراحت سے پہلے استعمال کیا گیا تھا مگر یہ ایک الگ معمہ تھا کہ بعض اوقات کسی فرد کی طبی طور پر موت کی تصدیق کر دی گئی لیکن بعد ازاں اسے زندگی مل گئی تو اس نے عجیب و غریب کہانیاں سنائیں۔

قدیم ہندی روایات اور علوم بتاتے ہیں کہ دھیان اور ارتکاز کی قوت سے روح کو جسم سے باہر نکالنا اور گھوم پھر کر واپس لے آنا ممکن ہے۔ اسے طائر روح کی پرواز کہا گیا ہے۔

ایک کیتھولک مذہبی راہنما سینٹ انتھونی (۱۱۹۵ء - ۱۲۳۱ء) کے بارے میں ایسے ہی قصے مشہور ہیں۔ وہ خاصا مقبول مقرر اور مبلغ تھا اور اٹلی اور فرانس میں جگہ جگہ اس کے خطبات سننے کے لئے دعوت دی جاتی تھی۔ چرچوں کے محتاط ریکارڈ بتاتے ہیں کہ اس نے لوگوں کو بیک وقت دو مختلف مقامات پر یادگار خطبے دیئے یہ ۱۲۲۶ء کا واقعہ ہے۔ وہ فرانس میں لموگر کے مقام پر خطبہ دے رہا تھا۔ علاقے کے لوگ ہمہ تن گوش اسے سن رہے تھے۔ کہ اچانک وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اس نے لباس سے منسلک ٹوپی سر پر اوڑھ لی اور خاموشی سے جھک گیا۔ مجمع خاموش تھا۔ کئی منٹ بیت گئے۔ یک بیک وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنا خطبہ پھر سے جاری کر دیا۔

ادھر تو لوگ یہ سمجھے کہ انتھونی مراقبہ میں چلا گیا تھا مگر ادھر دور کافی فاصلے پر ایک چرچ میں موجود ایک اور مجمعے نے دیکھا کہ منبر پر انتھونی نمودار ہوا اس نے کچھ کلمات کہے اور اسی پراسرار طریقے سے غائب ہو گیا جیسے وہ ظاہر ہوا تھا۔(39)

اسلامی تصوف کے عظیم ستون شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی ایسے ہی پراسرار واقعات منسوب ہیں۔ واقعات کی رو سے شیخ جیلانیؒ کو بیک وقت کم و بیش ۵۰ افراد نے الگ الگ اپنے ہاں دعوت پر بلایا وقت طعام ہر شخص نے شیخ کو اپنے ہاں کھانا کھاتے دیکھا۔ تصوف کی اصطلاح میں یہ کثرۃ الوجود کا مظاہرہ تھا کہ شیخ کی شخصیت ایک وقت میں ۵۰ مقامات پر دیکھی گئی۔

ان واقعات میں توخیر تقدس کا پہلو موجود ہے مگر ۱۸۳۶ء میں برطانیہ سے امریکہ جانے والے شخص ایس آر ول ماٹ S.R.Wilmot کے ساتھ تو ایک لطیفہ ہی ہو گیا۔ وہ بحری جہاز میں ایک مسافر ولیم ٹائٹ کے ہمراہ مستقل طور پر اپنے گھرانے کے پاس امریکہ جا رہا تھا۔ دوران سفر ایک رات کیبن میں اس کی بیوی شب خوابی کے لبادے میں ملبوس داخل ہوئی مگر غیر شخص کو دیکھ کر جھجک گئی مگر پھر آگے بڑھی اور اپنے شوہر کو بوسہ دے کر واپس چلی گئی۔ نفسیاتی اعتبار سے ہم اس واقعے کو ایک عرصہ سے بچھڑے ہوئے ولماٹ کی خواہشات کا فریب نگاہ کی صورت میں نمودار ہونا کہہ سکتے ہیں۔ مگر اگلی صبح ولیم ولماٹ سے بڑا ناراض تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ولماٹ بڑا عیاش آدمی ہے کیونکہ ولیم نے اپنی آنکھوں سے ایک عورت کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ جس نے ولیم کی موجودگی کو بڑی بے حیائی سے نظر انداز کر دیا تھا۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ ولماٹ جب نیویارک پہنچا تو اس کی بیوی نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہیں میری آمد یاد ہے۔ وہ ولماٹ کو اس کے کیبن کی بابت ٹھیک ٹھاک تفصیلات کے ساتھ بتا رہی تھی۔ مگر وہ تو نیویارک میں تھی شاید اسے بھی باہراز جسم مشاہدہ ہوا تھا۔ اس رومان پرور قصے سے آگے ہم ایک تکلیف دہ مگر اہم واقعے کی طرف آتے ہیں۔

۱۹۳۷ء میں لارڈ (ڈاکٹر) آکلینڈ گیڈیز Lord Geddes نے رائل میڈیکل سوسائٹی آف ایڈنبرگ کے سامنے اپنا طبی مقالہ پیش کیا اور شعبہ طب کی نامور شخصیات کے سامنے اقرار کیا کہ اسے بذات خود اس حیرت انگیز کیفیت سے گزرنے کا تجربہ ہوا ہے۔ مقالے میں اس نے بیان کیا کہ ایک رات وہ بستر پر پڑا تھا اور اسے زہر خورانی کا حادثہ درپیش ہوا تھا۔ اس کی حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ اس نے مدد کے لئے گھنٹی بجانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ اس نے بتایا "مجھے احساس تھا کہ میری حالت بہت خراب ہے مگر میرا شعور پوری طرح بیدار تھا۔ پھر اچانک یوں لگا کہ میرے شعور سے کوئی اور شعور جدا ہو رہا ہے اور یہ شعور بھی "میں" ہی تھا"۔

"رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ میں نہ صرف اپنا بدن اور بستر دیکھ سکتا ہوں بلکہ ساتھ ہی ساتھ کمرہ بلکہ مکان اور باغ تک میری نگاہوں میں ہیں۔ پھر مجھے علم ہوا کہ میں تو گھر کی چیزوں کے علاوہ لندن میں بھی دیکھ پا رہا ہوں۔ درحقیقت جس جانب میری توجہ ہوئی (میں ادھر تک دیکھنے پر قادر تھا)۔ میں مکان کی (چوتھی بعد) وقت میں آزاد تھا"۔

پھر اس نے اپنی ملازمہ کو کمرے میں داخل ہو کر چونکتے دیکھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے دیکھا کہ کس طرح ملازمہ نے جلدی جلدی ٹیلی فون گھمایا اور ڈاکٹر کو اطلاع دی او ڈاکٹر اپنے مریضوں کو چھوڑ کر گیڈیز کے گھر بھاگتا آیا۔ پھر اس نے ڈاکٹر کو سنا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ گیڈیز گزرنے والا ہے۔ مگر خود گیڈیز اپنے بدن سے باہر تھا اور ڈاکٹر کو جواب نہ دے سکتا تھا۔

پھر اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر نے اس کے بدن میں سرنج داخل کر دی۔ اور اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور اسے واپس اپنے بدن میں مجبوراً داخل ہونا پڑا مگر اسے اس بات پر شدید خفگی تھی کیونکہ جسم سے باہر کی نئی کیفیات سے وہ ابھی تک پوری طرح لطف اندوز نہیں ہوا تھا۔ بدن میں واپسی پر اسے دور نظری اور لطافت کا احساس جاتا رہا بلکہ تکلیف بھی ہوئی۔[40]

شدید تشدد کا شکار ہونے والے بعض افراد نے بھی باہراز جسم مشاہدات (باجم) کی تصدیق کی ہے۔ ایڈ موریل ED Morrel نامی شخص ۱۹۱۰ء میں ایری زونا کے اصلاح خانے میں قید تھا۔ وہاں اس پر شدید تشدد کیا جاتا۔ بعض اوقات شکنجہ نما جیکٹ پہنا کر اسے گیلا کر دیا جاتا اور جب جیکٹ سکڑنے لگتی تو تکلیف سے وہ بے ہوش ہو جاتا تب اسے یوں لگتا کہ اس کی روح بدن سے باہر نکل آئی ہے اور وہ جہاں چاہے اس روح کے ذریعے گھوم پھر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ عقوبت خانے میں ادھر ادھر گھوم پھر کر فرار کی راہ تلاش کیا کرتا تھا۔ یہ روحی آزادی محض اس عقوبت خانے تک محدود نہ تھی بلکہ موریل کا بیان ہے کہ وہ پورے امریکہ میں گھوم پھر سکتا تھا اور ایک ایسے ہی روحی سفر کے دوران اس نے اس عورت کو بھی دیکھا تھا جس سے رہائی پانے کے بعد اس نے ملاقات اور شادی کی۔

باہراز جسم مشاہدات کے باقاعدہ اندراز جز اور ان پر تحقیق کے سلسلے میں ہیرالڈ پٹ ہوف اور رسل ٹارگ Henald Puthoff and Russell targ نے خاصے تجربات کیئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ باجم کی کچھ حقیقت ضرور ہے مگر یہ ہوتا کس طرح ہے اس کی خبر نہیں۔ ان کے علاوہ ہیرالڈ امریکی ماہر نفسیات ڈاکٹر الزبتھ خب لرراس Dr. Elisabeth Khubler Ross نے خاصا کام کیا۔ اس نے ۲۰ برس تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا مختلف افراد کے مشاہدات کا ایک قیمتی ریکارڈ جمع کیا۔ ان لوگوں کے بیانات اور ڈاکٹر گیڈیز کے بیان کردہ مشاہدات میں بڑی مشابہت دیکھی گئی ہے۔ مادی جسم سے نکل کر

ایک مرتبہ طائر روح کی پرواز کا تجربہ حاصل کرنے والے ان افراد میں سے بیشتر کے دلوں سے موت کا خوف نکل چکا تھا۔

یونیورسٹی آف کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے محقق ڈاکٹر چارلس ٹارٹ نے باجم کے سلسلے میں تجربات کئے۔ اس نے باجم کے دعوے دار افراد کو جمع کیا اور انہیں ایک تاریک کمرے میں سلایا گیا جہاں ان لوگوں کے دماغ سے ایسے آلات منسلک کیے گئے جو ان کی دماغی لہروں کو ریکارڈ کرتے رہے۔ اس کے علاوہ کمرے کے ایک شیلف کے اوپر خفیہ طور پر ایک کاغذ بھی رکھا گیا جس پر خاص نمبر تھا۔ اگر کوئی شخص بے ایمانی سے نمبر پڑھنے کی کوشش کرتا تو خبرداری کے الارم بج جاتے اور وہ اسی وقت پکڑا جاتا اس نمبر کا علم صرف ڈاکٹر ٹارٹ کو تھا۔

ڈاکٹر کے رضاکاروں میں سے ایک نوجوان عورت کا دعویٰ تھا کہ وہ بچپن سے باجم کا تجربہ کرتی آرہی ہے۔ پہلی رات گزری تو اس نے کہا کہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس کے دماغ کی لہروں کے چارٹ سے بھی معمول کا اتار چڑھاؤ ہی معلوم ہوا۔ اگلی رات البتہ معمولی نہیں تھی۔ صبح عورت نے بتایا کہ اسے باجم کا تجربہ ہوا اور اس کے جسم ثانی نے گھڑی میں سوا تین کا وقت دیکھا۔ (اگرچہ کلاک لڑکی کے سونے کی جگہ سے نظر نہیں آرہا تھا) ۔ دماغی لہروں کا چارٹ دیکھا گیا تو عین ۱۵: ۳ بجے کے مقام پر لڑکی کے دماغ کی لہروں میں غیر معمولی تبدیلی نظر آئی۔ گویا کوئی بات ہوئی تھی۔

تیسری رات بھی رضاکار خاتون کو باجم کا تجربہ ہوا اور اس مرتبہ بھی جو وقت اس نے بیان کیا وہ دماغی لہروں کے چارٹ سے عین مطابقت رکھتا تھا۔ اور چوتھی صبح تو کمال ہی ہو گیا۔ لڑکی نے بتایا کہ وہ اپنے جسم لطیف کے ذریعے فضا میں تیرتی ہوئی گئی اور شیلف کے اوپر ایک کاغذ پڑا دیکھا جس پر ۲۵۱۳۲ درج تھا۔ عین اس لمحے اس نے کلاک کا رخ کیا تو وہاں ۶ بجے صبح کا وقت نظر آیا۔

دو باتیں خوب رہیں ایک تو یہ کہ لڑکی کا بدن اپنی جگہ پڑا رہا تھا اور کمپیوٹر کی رو سے ۵: ۵۷ بجے صبح کو لڑکی کی دماغی لہروں میں تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے وقفے کے دوران لڑکی نے جو نمبر دیکھا تھا وہ وہی خفیہ نمبر تھا جس کی خبر صرف ڈاکٹر ٹارٹ کو تھی![41]

جب سے ڈاکٹر خبلر راس کی تحقیقی رپورٹ شائع ہوئی ہے، ہزاروں افراد نے باجم کے تجربات کی تصدیق کی ہے۔ ان دعاوی کو وہم، مغالطہ یا فریب نگاہ قرار دیتے جانے سے قطع نظر بیشتر افراد کے مبینہ مشاہدات میں اس قدر شباہت کیوں ہے؟

متعلقہ موضوعات

حیات بعد از موت

# روحوں سے رابطہ

اکتوبر ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے لندن کی نیشنل لیبارٹری برائے نفسیاتی تحقیق کے دفتر میں لیبارٹری کا سربراہ ہیری پرائس صحافی آئیان ڈی کوسٹر کے ہمراہ روحوں سے رابطے کی ایک دعوے دار کی کارکردگی دیکھ رہے تھے۔ اس نوجوان عورت کا نام تھا ایلین گیرٹ EILEEN GARRETT پروگرام یہ تھا کہ گیرٹ کچھ ہی عرصہ قبل وفات پانے والے شہرت یافتہ سریت پسند جاسوسی مصنف سر آرتھر کانن ڈائل کی روح کو بلالے اور اس سے جو گفتگو ہو اس کا کل احوال ایک رسالے میں شائع کرا دیا جائے۔ چنانچہ روحی نشست کا آغاز ہوا اور اس کے بعد وہ کچھ پیش آیا جو کسی کے گمان میں بھی نہ تھا۔ گیرٹ پر ایک اور ہی روح آگئی تھی۔ دو روز پیشتر ۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو برطانوی فضائیہ کا ایک مسافر بردار طیارہ R 101 فرانس میں گر کر تباہ ہو گیا تھا۔ ۵۴ میں سے ۴۰ افراد ہلاک ہو گئے تھے جن میں جہاز کا پائلٹ فلائٹ لیفٹننٹ ارون بھی شامل تھا۔

جس لمحے گیرٹ میں روح کا حلول ہوا تو سامعین حیران رہ گئے ان کے توقع کے برعکس آرتھر کانن ڈائل کی جگہ وہاں تباہ شدہ طیارے کے پائلٹ ارون کی روح آکر ان سے مخاطب تھی۔ اپنے تعارف کے بعد اس نے بتایا کہ جہاز کی بربادی کے متعدد اسباب تھے۔ جہاز کے انجنوں کی استعداد اتنی نہیں تھی کہ وہ اتنا بھاری اور بڑی جسامت کا جہاز اڑا سکتے۔ خود انجن بھاری بھرکم تھے۔ جہاز کو بلند کرنے والے نئے ایلی ویٹرز کا خیال احمقانہ تھا۔ ایلی ویٹر پھنس کر رہ گئے۔ تیل کی نالی میں رکاوٹ آگئی۔ اتنی نیچی پرواز..... بلند ہونا خارج از امکان، کار آمد لفٹ بہت چھوٹی بڑے لفٹ کا اعداد و شمار کا نظام فیل، اضافی لفٹ استعمال نہیں کی جا سکتی تھی۔ لمبی پرواز پر اس قدر وزن، خراب رفتار، جہاز بے طرح ڈولتا جا رہا تھا۔ فیبرک پر بے پناہ تناؤ، انجن غلط، بہت بھاری جہاز کو بلند نہ کر سکتے تھے۔ مقررہ

بلندی تک ہر گز نہیں پہنچا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ آزمائشی پروازوں کے دوران بھی نہیں۔ جہاز کی باڈی میں بھی نقائص بے تحاشہ وزن، اتنا کہ جو انجنوں کی قوت سے باہر تھا۔

ہیری پرائس کے معاون صحافی آئیان ڈی کوسٹر نے اگلے روز روحی نشست کی کل کارروائی شائع کر دی۔ آرون اوون جہاز بنانے والوں میں سے ایک شخص چارلٹن نے جب یہ قصہ پڑھا تو ہیری پرائس سے رابطہ قائم کیا۔ یہ لوگ سخت حیرت زدہ تھے۔ کیونکہ روحی واسطے نے جو معلومات بہم پہنچائیں تھی ان میں شامل ۴۰ نکات انتہائی اہم اور خفیہ تھے جو جہاز کی تباہی کا اصل سبب ظاہر کر رہے تھے۔ چارلٹن اس امر سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے خود بھی روحیت پر تحقیق شروع کر دی۔

۵ر اکتوبر کو پیش آنے والے المناک حادثے کے ضمنی اثرات بڑے موثر ثابت ہوئے۔ کیونکہ اس حادثے کے نتیجے میں برطانیہ میں ہوا سے ہلکے جہازوں کی تیاری روک دی گئی۔ حادثے میں فضائیہ کے دو اعلیٰ افسران کی ہلاکت نے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔

شہری ہوابازی کی وزارت کے میجر اولیور ولائیرز کو جب گیرٹ کے روحی رابطے کی روئیداد معلوم ہوئی تو وہ بھی ان روحی محافل میں شریک ہونے لگا۔ اس نے بذات خود حادثے میں ہلاک ہونے والے بعض افراد کی ارواح کے بیانات سنے اور سوال و جواب کیے۔ کیا صحافی آئیان ڈی کوسٹر کی بیان کردہ کہانی اور اولیور اور چارلٹن کے مشاہدات غلط تھے؟ کیا گیرٹ دھوکہ بازی کر رہی تھی؟ ہر گز نہیں! حادثے کے ۶ ماہ بعد جب سرکاری تحقیقی رپورٹ منظر عام پر آئی تو حادثے کے بارے میں گیرٹ کے منہ سے نکلے ہوئے مبینہ ارواح کے الفاظ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئے۔ حادثے کی چھان بین کرنے والی کمیٹی نے ایک ایک بات کے درست ہونے کا اقرار کیا۔ یہ واقعہ روح اور حیات بعد الموت کے منکرین کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔

گیرٹ ۱۹۷۰ء میں ۷۷ برس کی عمر میں وفات پا گئی۔ مگر کوئی بھی تسلی بخش طور پر آج تک اس امر کی تشریح نہیں کر سکا کہ وہ عورت جسے فضائی طبیعات کی الف بے سے بھی واقفیت نہیں تھی اس نے کس طرح سے جہاز کی تکنیکی خرابیوں کا اتنا مفصل اور درست اندازہ جائے حادثہ سے اتنی دور گھر بیٹھے وقوعہ کے صرف دو روز بعد لگا لیا۔[42]

---

ڈاکٹر رچرڈ ہاج سن روحی تحقیقی ادارے کا ایک نامور محقق تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں ایک روحی معمولہ، مسز پائپر کے تجزیئے پر بہت کام کیا۔ ڈاکٹر رچرڈ کا ایک نوجوان دوست جارج پی. لیو نیویارک کا ایک قانون دان تھا جس نے قانون کا شعبہ چھوڑ کر تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ نوجوان اکثر ڈاکٹر رچرڈ سے حیات بعد الموت پر گفتگو کرتا تھا اور ہمیشہ اس نظریئے کی تردید کر دیا کرتا تھا۔ مگر ایک مرتبہ اس نے ڈاکٹر سے کہا کہ اگر وہ پہلے مر گیا اور حیات بعد از موت کی حقیقت ہوئی تب وہ رابطے کی کوشش کرے گا۔

یہ نوجوان ۱۸۹۲ء میں ۳۲ برس کی عمر میں گھوڑے سے گر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ڈاکٹر نے جواں مرگ کو پیل ہام کا نام دے رکھا تھا۔

ایک ماہ بعد ڈاکٹر ہاج سن مسز پائپر کے ہمراہ روحی نشست میں موجود تھا۔ اس نے مسز پائی. پر سے درخواست کی کہ پیل ہام کا ایک لنگوٹیا دوست (جس کا فرضی نام اس نے "جان ہارٹ" بتایا) پیل ہام سے رابطے کا متمنی ہے۔ مسز پائی. پر پر جذب کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ پہلے پہل الٹا سیدھا بولتی رہی مگر پھر ایک دم کہنے لگی کہ کوئی شخص جارج بات کرنا چاہ رہا ہے (پیل. ہام کا اصل نام جارج پی. لیو تھا) ڈاکٹر کے سامنے جارج نامی روح نے اپنا مکمل نام بتا دیا اور پھر اپنے بے تکلف دوستوں بشمول جان ہارٹ کے نام لئے پھر کسی مسٹر اور مسز ہاورڈ کا ذکر کیا اور ان کی بیٹی کیتھرین کے لئے پیغام دیا۔

ڈاکٹر ہاج سن جب ہاورڈ گھرانے سے ملا اور قصے سے آگاہ کیا تو ان کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ مسٹر ہاورڈ خود آکر پائی. پر سے ملا اور اس کے ذریعے پیل. ہام سے سوال و جواب کیے۔ مگر اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ بعض امور ایسے تھے کہ جن کے بارے میں صرف اس کے اور پیل. ہام کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا۔ ہاورڈ کو پائی. پر کی صلاحیتوں پر شبہ تھا۔ چنانچہ اس مرتبہ بعض سوالات کا جواب تحریری شکل میں حاصل ہوا تو ہاورڈ کے پسینے چھوٹ گئے اس کاغذ پر ہاورڈ کی زندگی کے بعض ایسے پوشیدہ گوشے بے نقاب کر دیئے گئے تھے جن کے بارے میں جواں مرگ پیل. ہام کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ پیل. ہام کی روح نے مسز پائی. پر سے رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ بعد ازاں آئندہ ۶ برس کے دوران پیل. ہام کی روح مسز پائی. پر سے ملتی رہی اور ۱۵۰ کے قریب نشستوں میں ۳۰ پرانے دوستوں سے بات چیت کی۔ ان تمام لوگوں کا تعارف فرضی ناموں سے کرایا جاتا رہا تھا۔ مسز پائی. پر بیشتر افراد سے

واقف نہیں تھی مگر ہر مرتبہ پیل. ہام کی روح نے مسز پائی. پر کے منہ سے ان لوگوں کے اصل نام ہی کہلوائے۔

امریکی ماہر نفسیات اور فلسفی ولیم جیمز کو یقین تھا کہ وہ پائی. پر کی روحی نشستوں کی منطقی توجیہہ کرے گا۔ اس نے جب اس موضوع پر تحقیق شروع کی تو اسے اقرار کرتے ہی بنی کہ مسز پائی. پر کا دعویٰ. حقیقت پر مبنی ہے یا کم از کم وہ غیر معمولی قوتوں کی مالک ہے۔ ولیم جیمز نے خفیہ طور پر بارہا تحقیق کرائی کہ کہیں مسز پائی. پر ملاقاتیوں کے بارے میں پہلے سے معلومات تو نہیں کر لیتی۔ مگر اس شک کی تردید اس وقت ہو گئی جب وہ پہلے سے طے کیے بغیر ادھر ادھر سے غیر معروف لوگوں کو ملاقات کے لئے لاتا رہا اور ان کا تعارف فرضی ناموں سے کراتا رہا مگر مسز پائی. پر نے روحوں سے معلومات کے بعد ان کے اصل نام اور کوائف بتانے میں کبھی خطا نہ کی۔

پروفیسر جیمز کی معرفت ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہربرٹ نکولاس کو بھی پائی. پر سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ نکولاس کو بھی سب توقع مس پائی. پر کی صلاحیتوں پر شبہ تھا۔ مگر ایک ہی نشست میں وہ حوصلہ ہار بیٹھا۔ بعدازاں جیمز کو اس نے خط میں لکھا کہ یہ عورت میرے لئے عظیم ترین معمہ ہے۔ میں نے بس ایک ذرا سا سوال کیا مگر وہ کامل تین چوتھائی گھنٹے تک بولتی ہی چلی گئی۔ نام، مقامات، اور واقعات فر فر بیان کر کے رکھ دیئے۔

۱۹۰۵ء میں محقق ہاج سن کی وفات کے بعد کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ منطق اور اخلاقیات کے پروفیسر جیمز ہاروی ہائسلوپ نے مسز پائی. پر کا تجزیہ کیا۔ بارہ نشستوں کے بعد اس نے کہا کہ وہ اپنے فوت شدہ والدین اور چچاؤں سے مل کر حیران رہ گیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ پائی. پر کوئی ایسا نفسیاتی مریضہ ہے جس کی شخصیت بار بار بدل جاتی ہے۔ نہیں بلکہ وہ ایک حقیقی روحی معمولہ ہے۔

روحی معمول ایک ٹیلی فون کی مانند انسانی دنیا اور عالم ارواح کے درمیانی رابطے کا ذریعہ ہیں بعض اوقات وجد کے عالم میں ان کی آواز روح کی جسمانی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب کہ بعض اوقات وہ اپنی ہی آواز میں روح سے سنے ہوئے الفاظ دہراتے ہیں یا ہاتھ کو ڈھیلا ڈھالا چھوڑ کر انگلیوں میں قلم تھام لیتے ہیں اور روح ان کے ہاتھ کو کاغذ پر چلا کر تحریر منتقل کراتی ہے۔ روحی معمول ہونے کے دعوے داروں میں سے اکثریت دھوکہ بازوں کی ہو سکتی ہے۔ اور ان سے بار بار سرزد ہونے والی غلطیوں مثلاً نام، تاریخ، مقامات اور واقعات کے بیانات میں غلطی کے ذریعے انہیں پکڑا جا سکتا ہے۔ مگر مسز پائی. پر اور ایلن گیرٹ جیسی خواتین کے معاملے میں یہ کہنا درست نہیں۔ خاصے سنجیدہ اور معتبر سائنس دانوں اور ماہرین نے ان کا مشاہدہ کیا مگر کبھی بھی انہیں دھوکہ باز قرار نہیں دے سکے۔ ان کی زیادہ سے زیادہ تشریح یہی ہوتی ہے کہ روحی معمول درحقیقت ٹیلی پیتھی کے ذریعے سامنے بیٹھے شخص کے ذہن میں موجود معلومات اخذ کر کے اپنی زبان سے یہ کہہ کر ادا کرتے ہیں کہ یہ باتیں روحوں سے معلوم ہو رہی ہیں۔ مگر تمام واقعات کی تشریح محض ٹیلی پیتھی کے اس نظریئے کے بنیاد پر کرنا ممکن نہیں۔ آخر کار روح کے خارجی وجود کے بارے میں کم از کم شبہ ضرور پڑ جاتا ہے۔

سینٹ لوئس کے علاقے میں رسوری کا امیگریشن کمشنر رہائش پذیر تھا۔ ان دنوں اس کی ۳۰ سالہ بیوی جو ایک سگھڑ گھریلو خاتون تھی۔ اپنے باپ کی موت پر کافی افسردہ رہنے لگی تھی۔ ویسے وہ مسرور زندگی گزار رہی تھی وہ ذہین عورت تھی۔ مگر ادب سے کوئی خاص شغف نہیں تھا۔ یہ خاتون اپنی قریبی سہیلی کے ہمراہ روحوں سے رابطے کے لئے اوجا بورڈ استعمال کرتی تھی۔

۲۲ر جون ۱۹۱۳ء کو ان خواتین نے اوجا بورڈ کے ذریعے ایک روح سے رابطہ قائم کیا۔ مذکورہ خاتون پرل کران کے ساتھ اس کی سہیلی ایملی ٹیچنگ اوجا بورڈ پر مصروف عمل تھی۔ روح نے اپنے نام کے ہجے یوں تحریر کئے۔ پی اے ٹی سی، پی اے ٹی سی بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام پے ٹشنس ورتھ ہے۔ بس تب سے اس روح سے شروع ہونے والے روابط ۲۵ برس تک جاری رہے۔ اوجا بورڈ کے ساتھ ساتھ اب ورتھ روح خاتون کران میں حلول کرنے لگ گئی تھی۔ دو دنیاؤں کے باسیوں کے درمیان یہ طویل رفاقت ۱۹۳۷ء میں خاتون کران کی موت کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ ورتھ نامی روح سے رابطے کے دوران مختلف واقعات بالترتیب پیش آتے رہے۔ پہلے کران اور ایچنگ دونوں اوجا بورڈ استعمال کرتی تھیں پھر کران اور روح میں تعلق زیادہ پختگی کی طرف مائل ہوا۔ چنانچہ اب کران محض ذہن میں روح کے پیدا کردہ حروف کے الفاظ بنا کر بولنے لگی۔ پھر بے خودی کے عالم میں کران باقاعدہ تحریر کے ذریعے روح کا پیغام دینے لگی۔

یہ روح بڑی شاعرانہ طبیعت کی مالک تھی۔ اس نے اپنے آپ کو دانائی کا مطرب کہا تھا۔ خاتون کران کے ذریعے اس نے شاعری کی مختلف اصناف، حکیمانہ اقوال اور حکایات قلمبند کرائیں۔ یہ ادب پارے جیسے ہی منظر عام پر آئے انہیں فوری قبولیت عامہ حاصل آئی۔ چنانچہ نیویارک کے نیشنل آرٹس کلب میں

خاتون کران اور ان ادب پاروں کی خالق ان کی مبینہ دوست روح کو سالانہ تقریب میں مدعو کر لیا گیا۔ مگر کران کے بقول روح نے آنے سے معذوری ظاہر کر دی۔

بریٹ ویٹ انتھالوجی آف میگزین ورس کے ۱۹۱۸ء کے ایڈیشن میں جہاں بڑے بڑے شعراء کا منتخب کلام شائع ہوا وہیں روح ورتھ اور خاتون کران کی شاعری کو بھی جگہ دی گئی۔ مشہور شاعر ایڈگر لی ماسٹرز کا بیان تھا "میں یہ رائے دینے سے اجتناب کرتا ہوں کہ آیا یہ سب کچھ مسز کران کا ہے یا اس روح پے شنس ورتھ کا تاہم یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ وہ (کران) ہمیں غیر معمولی ادب دے رہی ہے۔

واقعی یہ انوکھی بات تھی۔ کیونکہ ورتھ روح نے (یا جو کوئی بھی مسز کران کے بقول ان کے ذریعے تحریر کر رہا تھا) سات عدد ناول، کئی افسانے اور ایک عدد ڈرامہ بھی تخلیق کر دکھایا تھا۔ آخر یہ مطرب دانائی کون تھی؟ کیا یہ خاتون کران کے اوہام کی پیداوار تھی؟ یا واقعی ایک روح۔

پے شنس ورتھ اگر کران کا ذہنی طور پر تراشیدہ پیکر تھا تو پھر اتنا اعلیٰ ادب کیونکر تخلیق ہوا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کران خاتون کو خاصی بہتر تعلیم و تربیت ملی مگر ادب سے تو اسے معمولی سا بھی شغف نہ تھا۔ ایسے میں بعض کا کہنا ہے کہ کران تو محض واسطہ تھا۔ جسے عالم برزخ کی باسی ورتھ نے دنیا کے سامنے اپنی روحی ذات کی شناخت کرانے کے لئے استعمال کیا تھا۔ خود ورتھ نے کران کو اپنے بارے میں کیا بتایا؟ کران کے بیان کے مطابق ورتھ بتاتی تھی کہ ۱۶۴۹ء میں وہ ڈارسٹ (انگلینڈ) میں رہائش پذیر تھی۔ بعد ازاں امریکہ کی نو آبادیوں کو چلی آئی۔ وہ کسی ایسے دور کا تذکرہ بھی کر رہی تھی جب اس کا وجود غیر واضح تھا اور وہ قدیم جہاز رانوں کی مانند ابدی طور پر بے مقصد گھوما پھرا کرتی تھی۔[43]

متعلقہ موضوعات دیکھئے

روح

روحوں کا رابطہ

علم ارواح

# روحوں کا رابطہ

یہ ان افراد کا ذکر ہے جن سے ادب اور آرٹ کی دنیا کے عظیم افراد کی روحوں نے رابطہ قائم کیا اور ان معمولوں نے دنیا کو حیران کر دیا۔

دنیائے موسیقی میں تہلکہ مچا دینے والی اس خاتون کا نام روز میری تھا۔ یہ بڑی عجیب عورت تھی۔ اسے ادراک ماورائے حواس کی طاقت رکھنے کا بھی دعویٰ تھا۔ اس کا بیان تھا کہ یہ صلاحیت اس کے باپ دادا میں بھی رہی تھی۔ وہ اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات سے بھی آگاہ ہو جاتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مرے ہوئے لوگوں کی روحیں اسے ملنے آتی ہیں۔ ایک روز اس نے اپنے باپ کو بلا ہی دیا جب اس نے کہا کہ اس کا ایک پرانا دوست بلیک، روز میری سے ملا ہے اور اس نے التجا کی ہے کہ میری کا والد اس کے ناروا سلوک کو معاف کر دے۔ میری کا باپ حیرت زدہ تھا کہ بلیک تو میری کی پیدائش سے بھی کئی برس پہلے وفات پا گیا تھا اور خود میری کا باپ تو اس دوست کو بالکل ہی بھول چکا تھا۔ اسکول میں میری کی صلاحیتوں کے کئی استاد گواہ تھے۔ وہ واقعات یا حقائق کو پہلے سے کس طرح جان لیتی ہے؟ یہی سوال اکثر ان کے ذہن میں کلبلاتا تھا۔

اصل واقعات کا آغاز مارچ ۱۹۶۴ء سے ہوتا ہے۔ ان دنوں روز میری عسرت کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ اس درمیانی عمر کی عورت کے لئے دو بچوں کو پالنا پوسنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

بعد ازاں اس نے اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ قریباً سات برس کی عمر میں اسے ایک سفید بالوں والا شخص (روح) دکھائی دیا۔ جس نے اسے کہا کہ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تو میں پھر آؤں گا اور تمہیں موسیقی سکھاؤں گا۔ روز میری کو اس شخص کا نام معلوم نہ تھا۔ مگر حلیہ خوب یاد تھا۔ وہ روح وعدے کی پکی نکلی۔ کیونکہ ۱۹۶۴ء میں ایک روز دوبارہ آ گئی۔ روز میری ایک سہ پہر بیٹھی تھی کہ اسی بوڑھے آدمی کی روح نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ یہ مشہور موسیقار فرانز لسنرٹ کی روح ہے۔ اس نے حسب وعدہ روز میری کو موسیقی کی تربیت دینا شروع کی۔ میری کے پاس ایک پرانا پیانو رکھا تھا اور میری کو یہ بجانا بھی تقریباً بھول چکا تھا۔ روح کی راہنمائی میں میری پیانو کے بٹنوں کو دباتی رہی اور موسیقی کی آواز آتی رہی۔ ایسی سریلی آواز اس نے کاہے کو سنی تھی۔ اس طرح ایک سلسلہ چل

نکلا۔ روح سہ پہر کے وقت آکر ساز بجانے کی تربیت دیتی رہی۔ فرانز کی روح نے اسے موسیقی کو کاغذ پر درج کرنے کا طریقہ بھی سکھایا اور کہا کہ یہ سب کچھ اس لئے کیا جارہا ہے کہ عالم ارواح سے خاطر خواہ تعلق پیدا ہو جائے۔ ایک روز روح نے کہا کہ میری یہ اچھا ہی ہوا کہ تم نے ساز بجانے کی باقاعدہ تربیت نہیں حاصل کی کیونکہ اس طرح لوگ شک کرتے کہ یہ دھنیں تمہاری اپنی تخلیق کردہ ہیں۔ پھر اگر تمہیں پہلے سے ہی موسیقی سے واقفیت ہوتی تو تمہارے اپنے تخیل اور نظریات ہمارے سچے سروں کی تیاری میں بڑی رکاوٹ ہوتے۔ فرانز کی روح نے موسیقی کی بنیادی تربیت دے کر روز میری سے کہا کہ اب وہ ان کے کام آنے کے لئے مکمل طور پر تیار ہو گئی ہے۔ فرانز نے خاتون کو رفتہ رفتہ دنیائے موسیقی کی عظیم آنجہانی ہستیوں کے ایک پورے حلقہ سے متعارف کرا دیا۔ ان موسیقی کاروں میں چوپن، شوبرٹ، شومان بیتھوون، باخ براہمز، موزارٹ، گریگ، برلائیوز، سٹراونس کی، رشمانینوف اور دوسرے کئی معتبر افراد کا نام آتا ہے۔ شاید ان لوگوں کو مرکے بھی چین نہ آیا تھا۔ انہیں موسیقی سے عشق تھا۔ اور میری سے ملاقات اس عشق کا امتحان تھا۔ ان لوگوں کی روحوں نے میری سے درخواست کی کہ وہ ان دھنوں کو ضبط تحریر میں لائے جو اپنے انتقال کے بعد سے یہ لوگ عالم ارواح میں ترتیب دیتے رہے ہیں۔

ساؤتھ لندن میں ہالم کے مقام پر واقع میری کے مکان میں ان روحوں کی آمدورفت جاری رہی۔ میری نے ان لوگوں کی خواہشات کے آگے سر جھکا دیا۔ دھنوں کے اندراج کا آغاز ہوا۔ اور ایک وقت آیا کہ میری کی الماریاں اور میزوں کی درازیں کاغذوں سے اٹ گئیں۔

ڈونلڈ ٹووے ایک نامور ماہر موسیقار اور کمپوزر تھا۔ جو ۱۹۴۱ء میں فوت ہوا۔ ۳۰ برس بعد ۱۹۷۱ء میں اس کی روح اس موقع پر میری سے ملنے آئی۔ جب عظیم موسیقاروں کے بعد از مرگ ترتیب دیئے گئے سازینوں، راگوں اور دھنوں کا منتخب حصہ ایک البم میں پیش کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس نے روز میری کو البم پر مختلف تانوں کی املا کرائی اور یہ مجموعہ شائع کرا دیا گیا۔

بڑی لے دے ہوئی۔ یہ کیا مذاق تھا کہ موسیقاروں کی روحیں عالم ارواح میں بیٹھی دھنیں ترتیب دیتی ہیں اور آکر روز میری کو بتلا جاتی ہیں۔ مگر موسیقی کے تمام شائقین اور ماہرین کو اقرار تھا کہ بلاشبہ میری کی پیش کردہ دھنیں متعلقہ موسیقاروں کے اسٹائل سے زبردست مشابہت رکھتی ہیں۔

برطانوی کمپوزر رچرڈ راڈنی بینٹ نے کہا "بہت سے لوگ فی البدیہہ (موسیقی ترتیب دے لیتے ہیں) مگر موسیقی (کے انداز) میں اس طرح نقل کرنے کے لئے تو سالہا سال کی ٹریننگ درکار ہے۔" مگر تربیت کا کیا سوال؟ روز میری نے تو عمر بھر میں بمشکل دو برس تک موسیقی سیکھی اور اوپیرا میں بھی ایک یا دو دفعہ شرکت کی وہ بھی اپنی خواہش کے خلاف پھر اتنے موسیقاروں کے جدا جدا انداز کی بھرپور نقل، یہ ٹریننگ یا تربیت کا بس نہیں۔

روز میری براؤن نے ان موسیقاروں سے ملاقات، ان کی شکل و صورت چال ڈھال اور رویئے پر اس طرح سے تبصرہ کیا ہے جیسے وہ زندہ حالت میں اس کے ساتھ رہتے رہے ہوں۔ گویہ لوگ مختلف قومیتوں اور زبانوں کے تھے مگر روز میری سے سب انگلش میں ہی بات کیا کرتے تھے عالم ارواح میں ان پر جوانی طاری تھی اور حقیقی زندگی کے کئی امراض و عوارض بھی ندارد تھے۔

شوبرٹ میری سے پہلی ملاقات کے دوران شناخت کی خاطر عینک پہنے آیا۔ مگر بعد ازاں عینک کے بغیر ہی آتا رہا۔ روحوں کو نظر کی کمزوری کی شکایت نہیں ہوتی! ان کی قوت سماعت بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ کیونکہ بیتھوون کا ثقل سماعت کا عارضہ بھی جاتا رہا تھا اور وہ میری سے آرام سے گفتگو کر لیتا تھا۔ ان لوگوں کا میری کو اپنی تخلیقات سے متعارف کرانے کا انداز بھی جدا جدا تھا۔ میری کے بقول، شوبرٹ گیت خود گا کر سنایا کرتا تھا۔ حالانکہ اس کی آواز اتنی اچھی نہیں تھی۔ باخ اور بے تھون کو میری کا پیانو بجانا بالکل نہیں بھاتا تھا۔ یہ دونوں اسے اپنی دھنیں املا کرا کر لکھواتے تھے۔ جب کہ چوپن ساتھ ساتھ پیانو بجاتے ہوئے تانوں کی املا کرانا پسند کرتا تھا۔

ان کی طبیعتیں بھی فرق فرق تھیں۔ شوبرٹ خوش طبع تھا۔ لی. سز کو اگر ذرہ سا بھی توہین کا احساس ہوتا تو وہ کئی کئی روز تک روٹھا رہتا اور ملنے نہ آتا۔ چوپن کو ٹیلی ویژن کا چسکا لگ گیا تھا۔ وہ اپنے ہیولے میں جدید لباس پہنے نظر آتا تھا۔ لی. سز کو میری کے ہمراہ بازار سے خریداری کے دوران ساتھ ساتھ چلنے میں لطف آتا تھا۔ روز میری نے اقرار کیا کہ اسے بذات خود خشک مزاج بیتھوون سے کچھ الفت ہو گئی تھی۔

۱۹۶۶ء میں روز میری روحیت پسندوں کے گروپ میں شامل ہوئی تو اس کی روحی طاقتوں کے قصے روحی حلقوں میں زبان زد عام ہوئے۔ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۶۸ء میں بی بی سی نے اپنے پروگرام "ومنیز آور" میں روز میری سے متعلق خصوصی فیچر نشر کیا۔ موسیقاروں اور ماہرین نفسیات نے گو تفصیلی تجزیئے کے بعد یہ تسلیم کر لیا ہے کہ روز میری کسی قسم کی جعل سازی نہیں کر رہی لیکن تنقید کرنے والے بھی موجود ہیں۔ مثلاً نیویارک میگزین کے الان رچ کا کہنا

# روحوں کا رابطہ

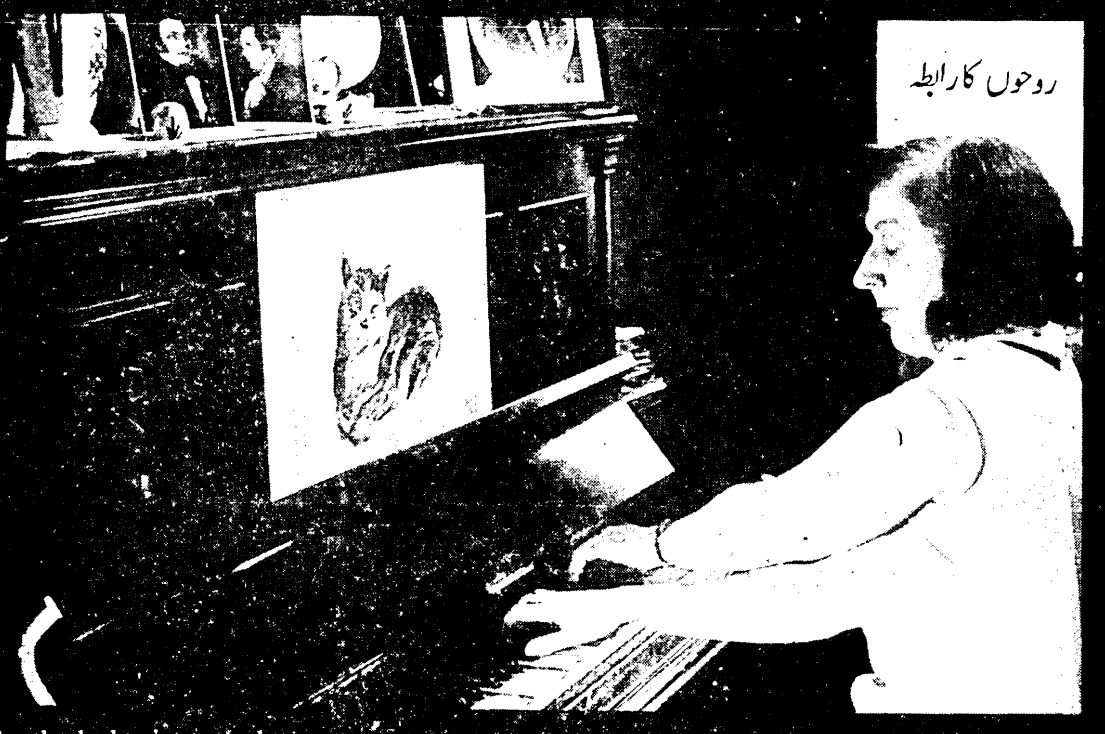

Are the dead trying to reach us from their coffins? These drawings (top left) show the positions before and after some heavy coffins were moved in an allegedly haunted vault in Christ Church, Barbados in 1820. Knocking sounds were also heard recently at the funeral of spiritualist medium Mrs Jane Helen Hughes (left). Several mourners claimed to have heard the strange noises, including the newspaper photographer who took this picture

Above: Londoner Mrs Rosemary Brown, who claims to be in contact with the spirits of several dead composers including Liszt and Chopin. She says they guide her hands to write down and play new compositions (right). Even experts agree these are in the style of the masters

روز میری براؤن عباد تیں، روحیں اسے تربیت دیتی تھیں

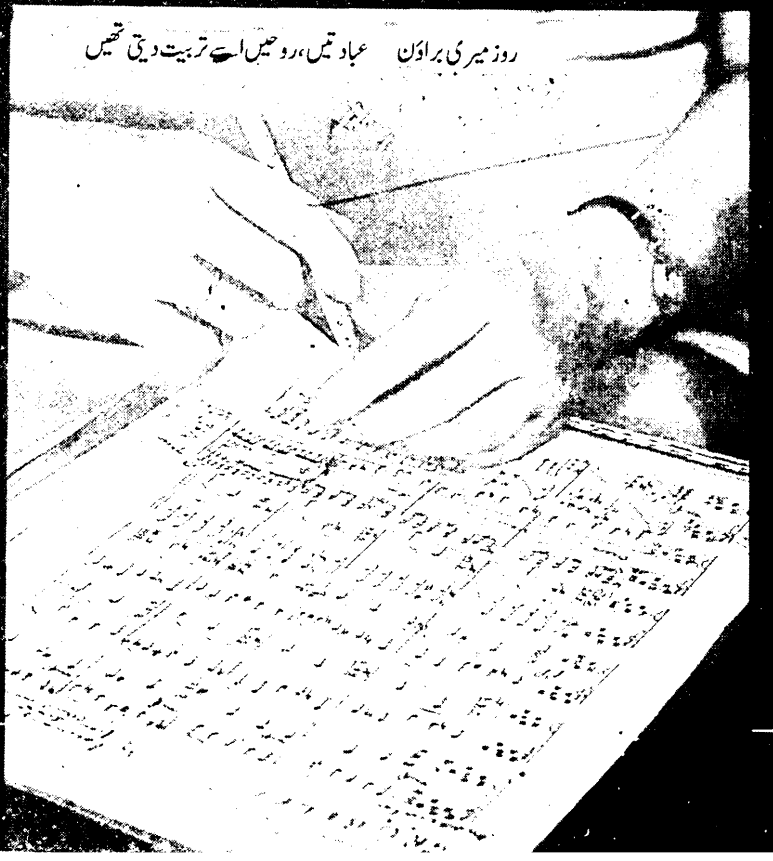

ہے کہ روز میری نے مشہور موسیقاروں کی مشہور دھنوں میں بھونڈی سی تبدیلی کر کے یہ چکر چلایا ہے۔(44)

---

دانتے کی شہرہ آفاق نظم، طربیہ خداوندی کی تکمیل کا واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ دانتے مر گیا تو اس کے یار دوست پیروکاروں اور گھر والوں کو معلوم ہوا کہ طربیہ خداوندی کے آخری حصے "بہشت" کے اختتامی اشعار باقی مسودے کے ساتھ موجود نہیں ہیں۔ ہر کوئی تلاش میں لگ گیا کہ آخری اشعار والے کاغذات ڈھونڈے جائیں۔ مگر ساری کوششیں بے سود ثابت ہوئیں اور سب نے یہی خیال کیا کہ شاید دانتے کو اپنی اس عظیم تخلیق کو مکمل کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چند اصحاب نے دانتے کے دو بیٹوں کو مشورہ دیا کہ وہی اپنے باپ کی تخلیق کی تکمیل کریں۔

ایک رات دانتے کے بیٹے جیکو پو نے باپ کو خواب میں دیکھا کہ اس نے جیکو پو کو سرزنش کی کہ وہ کیوں پہلے سے یہ سوچ بیٹھے ہیں کہ دانتے نے کام مکمل نہیں کیا۔ پھر وہ اسے ہاتھ سے پکڑ کر اس مکان میں لے گیا جہاں وہ لوگ کبھی رہا کرتے تھے۔ ایک کمرے کی دیوار کو چھو کر دانتے کہا کہ جس چیز کو اتنے عرصے سے تلاش کیا جا رہا ہے وہ یہاں ہے۔

جیکو پو خواب سے بیدار ہو گیا۔ آدھی رات کا عمل تھا۔ مگر جیکو پو کو چین کہاں۔ وہ فوراً اپنے باپ کے دوست گیارڈینو Giardino سے ملنے چلا گیا۔ بڈھے گیارڈینو نے جو جیکو پو کا خواب سنا تو اتنا پرجوش ہوا کہ اس وقت لباس تبدیل کر کے جیکو پو کے ہمراہ اس عمارت کے مالک سے ملا جہاں دانتے نے وفات پائی تھی۔ اس بچارے کو صبح کاذب کے وقت ہی اٹھا دیا یہ لوگ جیکو پو کے خواب میں دیکھے گئے کمرہ میں چلے گئے۔ دانتے کی بتائی ہوئی دیوار پر ایک چٹائی ٹنگی تھی۔ اسے ہٹایا گیا تو کھڑکی نظر آئی۔ جس میں کچھ کاغذ رکھے تھے جو نمی سے خراب ہو رہے تھے۔ کاغذوں کو جھاڑا گیا۔ دانتے کی طربیہ خداوندی کے گمشدہ ۱۳ بندان کے سامنے تھے۔

---

مشہور امریکی ناول نگار چارلس ڈکنز کی آخری تخلیق ایک پراسرار کہانی تھی۔ ڈکنز نے ایک رسالے میں مکمل کہانی کو ۱۲ اقساط میں شائع کرانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس مرتبہ خلاف معمول اس نے اپنے ناشر سے ایک عجیب بات پر اصرار کیا۔ اس نے معاہدے میں خصوصی طور پر یہ بات درج کرنے پر زور دیا کہ اگر اس کے ناول کی تکمیل سے پہلے ہی ڈکنز کی موت واقع ہو جائے تو معاوضے کی رقم اس کے وارثوں کو دے دی جائے گی۔

یہ پراسرار کہانی "ایڈون ڈروڈ کا معمہ" قسط وار شائع ہونا شروع ہوئی۔ ڈکنز کے چاہنے والوں نے اس کہانی کو بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر وہی ہوا جس کا ڈکنز کو ڈر تھا۔

۱۸۷۰ء کو ڈکنز مر گیا۔ ناول کی ابھی نصف اقساط ہی تحریر اور شائع ہوئی تھیں۔ ڈکنز کی موت نے اس کے چاہنے والوں کو نہ صرف افسردہ کر دیا۔ بلکہ اس کی تجسس سے بھرپور آخری تحریر کی نامکمل اشاعت سے بڑی بدمزگی ہوئی کیونکہ بیشتر قارئین کو پراسرار کہانی کا انجام جاننے کے لئے بڑی بے چینی تھی۔

برٹیل بورڈ کے علاقے میں ایک آوارہ نوجوان تھامس سبمیز نے ایک مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ مکان کی مالکہ ضعیف الاعتقاد قسم کی عورت تھی۔ وہ کافی عرصہ تک اپنے کرائے دار جیمز کو روحیت کی باتیں بتاتی رہی۔

ڈکنز کی موت کو ایک برس ہو چکا تھا۔ اکتوبر ۱۸۷۲ء کی تین تاریخ کو جیمز نے مالکہ مکان کو بتایا کہ اس سے مشہور مصنف چارلز ڈکنز کی روح نے رابطہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ڈکنز کی آخری تخلیق کو مکمل کرے۔

وہ عورت بڑی حیران ہوئی اسے جیمز کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس نے اپنے کرائے دار کو کئی سہولتیں بشمول کرایہ کی معافی فراہم کیں۔ تاکہ وہ کامل توجہ سے کام کر سکے۔ اس کی زبانی دوسرے لوگوں تک بھی نوجوان کے دعوے کی اطلاع پہنچی اور کئی لوگ اسے دیکھنے آتے رہے۔ تھامس جیمز وجدی سی حالت میں کافی دیر تک بیٹھا رہتا تھا۔ پھر ایک دم حواس میں آ جاتا اور لکھنے بیٹھ جاتا۔ بعض اوقات وہ تیزی سے صفحات پر صفحات لکھتا چلا جاتا۔ جب کہ بعض دفعہ وہ صرف چند سطریں لکھ کر چھوڑ دیتا تھا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ مطلع ابر آلود ہوتا یا موسم خراب ہوتا تو تھامس ویسے کا ویسے بیٹھا رہ جاتا۔ ایک لفظ بھی نہ لکھ پاتا۔

وہ کیا لکھ رہا تھا؟ اس کا کہنا تھا کہ ڈکنز کی روح باقاعدہ اسے اپنے آخری ناول کی آخری اقساط شائع کرانے کے سلسلے میں مہمیز دے رہی ہے۔

نوجوان کے دعوے اخبار میں شائع ہوئے اور اس کی بڑی تضحیک ہوئی مگر ایک ماہ سے بھی کم مدت میں اکتوبر کی ۳۱ تاریخ کو وہ ڈکنز کے نامکمل ناول کی بقیہ اقساط منظر عام پر لے آیا۔

ماہرین ادب کے ہاتھ جب تھامس جیمز کی یہ تحریر آئی۔ تو اکثر افراد چونکے بغیر نہ رہ سکے۔ آوارہ مزاج تھامس نے کیسی عجیب تحریر پیش کی کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ڈکنز کا انداز تحریر یا خود ڈکنز کی تحریر نہیں ہے۔ ماہرین نے اسے عین ڈکنز کا اسلوب ہی قرار دیا۔ اخبارات نے تھامس کو ڈکنز کا اصل جانشین قرار دیا۔ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایسا گمنام اور آوارہ قسم کا آدمی یوں ایک دم سے مشہور ہو جائے گا۔

مشہور مصنف سر آرتھر کانن ڈائل نے بذات خود تھامس جیمز سے ملاقات کی اور اس کا احوال "فورٹ نائٹ ریویو" کی دسمبر ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ شخص پانچ جماعتیں پاس ہے اور اس واجبی سی تعلیم کے باوجود چھاپہ خانہ کے اس ملازم نے ڈکنز کے طرز تحریر اور الفاظ کا اس قدر بغور مطالعہ کیا کہ "ایڈون ڈروڈ کا معمہ" کو تمام و کمال تحریر کرنے کی صلاحیت حاصل کی جو بلاشبہ ایک حیرت ناک امر ہے کیونکہ اس تحریر سے پہلے اس شخص کی کوئی ادبی حیثیت نہیں اور نہ ہی اس میں اب بھی اتنی خوبی ہے کہ کوئی ادبی تخلیق پیش کر سکے۔

تھامس جیمز اپنے اس واحد ادبی کارنامے کو دنیا کے حوالہ کر گیا جو اس کے بیان کے مطابق ڈکنز کی روح کا کارنامہ تھا۔ وہ خود اچانک ایک روز کسی کو کچھ بتائے بغیر چلا گیا کوئی نہیں جانتا کہ اس پر کیا گزری۔[45]

متعلقہ موضوعات — روحوں سے رابطہ

روح — علم ارواح

# حوالہ جات


۱۔ سائنس میگزین شمارہ 41 صفحہ 26
۲۔ The world's reatest myst G. Brown P : 62
۳۔ People's Almanac II P : 705
۴۔ The world's Greatest Mysteries P : 65
۵۔ ایضاً P : 114
۶۔ کائنات اور انسان صفحہ ۱۱
۷۔ انسان نے کیا سوچا صفحہ ۶۹
۸۔ ایضاً صفحہ ۶۹
۹۔ نظریہ روح کا تجزیہ از برکت علی سرمد صفحہ ۵
۱۰۔ انسان نے کیا سوچا صفحہ ۶۸
۱۱۔ سائنس میگزین ۴۱ صفحہ ۲۳
۱۲۔ ایضاً صفحہ ۲۴
۱۳۔ انسان نے کیا سوچا صفحہ ۱۰۵
۱۴۔ سائنس میگزین شمارہ ۴۱ صفحہ ۲۵
۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۵
۱۶۔ World's Greatest Mysteries P : 126
۱۷۔ ایضاً P : 127
۱۸۔ Guiness Encyclopedia P : 491
۱۹۔ People'sAlmanac II P : 1255
۲۰۔ World of Incredible but True P : 71
۲۱۔ ایضاً صفحہ ۹۹
۲۲۔ People'sAlmanac II P : 1235
۲۳۔ The Book of Great Mysteries P : 228
۲۴۔ People'sAlmanac II P : 1235
۲۵۔ World Famous Supernatural Mysteries P : 128
۲۶۔ People'sAlmanac II P : 1258
۲۷۔ World's Greatest Mysteries P : 122
۲۸۔ People'sAlmanac II P : 1255
۲۹۔ ایضاً P : 1258
۳۰۔ World of incredible But True P : 203
۳۱۔ ایضاً p : 133
۳۲۔ ایضاً P : 250
۳۳۔ The book of Great Myst P : 99
۳۴۔ People'sAlmanac II P : 1215
۳۵۔ Unsolved Mysteries of The Universe P : 51
۳۶۔ Great Myst , J . Great P : 30
۳۷۔ The Book of Great Myst , G Wilson P : 492
۳۸۔ People'sAlmanac II P : 1219
۳۹۔ World's Greatest Myst P : 131
۴۰۔ ایضاً P : 132
۴۱۔ P : 136
۴۲۔ The Book of Great Myst P : 411
۴۳۔ People'sAlmanac II P : 1257
۴۴۔ ایضاً P : 1261
۴۵۔ Stranger than Science

باب پنجم

# پراسرار مخلوق

# جنات

جنات اور اس قبیل کی دوسری مخلوقات کے مطالعے کے لئے مخصوص کیا جانے والا شعبہ علم مابعد الحیاتیات یا ایکزوبائیالوجی Exobiology کہلاتا تھا۔ اس علم کے بانیوں میں سے ایک نوبل انعام یافتہ ماہر حیات جوشوالیڈر برگ ہے۔ اس کے علاوہ عالم شہرت یافتہ ہیئت دان کارل ساگان، ماہر کیمیا ہیرالڈ سی ارے اور اسٹیفن ایچ ڈول بھی نمایاں ہیں۔

مابعد الحیاتیات کے سامنے اہم ترین مسئلہ خلائے بسیط میں کسی غیر زمینی سیارے پر زندگی کا سراغ لگانا ہے۔

زندگی بذات خود کیا ہے؟ یہ کہنا بہت دشوار ہے۔ بس چند خصوصیات کی موجودگی کسی جسم کو زندہ اشیاء کے گروہ میں شامل کر دیتی ہے۔ کرہ ارض کے تمام معلومہ جانداروں میں بعض خواص واضح طور پر مشترک ہیں مثال کے طور پر تمام تر جاندار اشیاء کی بنیادی ساخت میں پروٹین اور نیوکلیائی ترشے کے مالیکیول لازمی طور پر ملتے ہیں۔

علم مابعد الحیاتیات اس نظریئے پر کام کر رہی ہے کہ امکاناً زندگی کے مروجہ لگے بندھے اصولوں سے جدا کوئی ایسا نظام موجود ہو سکتا ہے جہاں عام ڈگر سے ہٹ کر زندگی کی نقش گری ایک اور منفرد انداز میں جاری و ساری ہو۔ پیدائش، نمو اور ارتقاء کے انداز جداگانہ ہوں اور جسم و جان کے باہمی رشتے نرالے ہوں۔

درحقیقت حیاتیات کے ماہرین اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ اس سیارے میں زندگی کے جتنی بھی شکلیں معلوم ہوئی ہیں وہ تمام ایک مخصوص طریقے پیدائش پروٹین ان واٹر فارمولا کے تحت ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ گویا زندہ اجسام کی ساخت میں دو اہم ترین اجزاء پروٹین اور پانی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ پانی کے بجائے پروٹین اور امونیا کے مابین ایسا رشتہ قائم ہو جائے جو پروٹین امونیا فارمولے کے تحت زندگی کی پیدائش عمل میں لائے کیونکہ پانی کی طرح امونیا بھی زندگی کو نشوونما دینے میں ایسے ہی معاون ثابت ہو سکتی ہے اور وہ سیارے جہاں پانی نہیں ہے یا اس قدر سردی ہے کہ پروٹین ان واٹر قائم پذیر ہو سکتا۔ وہاں امونیا، میتھین اور اس سلسلے کے دوسرے مرکبات جداگانہ طریقے سے زندگی کی داغ بیل ڈال دیں۔

پہلے یہ اعتراض بڑا قوی معلوم ہوتا تھا کہ چونکہ زمین کے علاوہ باقی سیاروں پر آکسیجن مناسب مقدار موجود نہیں فلہٰذا زمین کے علاوہ زندگی کہیں اور موجود ہی نہیں۔ مگر جب بکٹیریا کی ایسی اقسام دریافت ہوئیں کہ آکسیجن کی ضرورت تو رہی ایک طرف آکسیجن کی موجودگی ہی ان کے قتل کے مترادف تھی تو یہ مفروضہ غلط ثابت ہو گیا کہ آکسیجن کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔

پروٹین ان امونیا کے فارمولے سے آگے بھی اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ شدید تر سردی میں مختلف عناصر اور مرکبات کے درمیان تعاملات حیات کے انوکھے شاہکار تخلیق کریں۔ اس کے برعکس شدید گرم ماحول میں بھی مٹی کے اہم عنصر سلیکان اور (ہائیڈروجن کے قائمقام) فلورین کے ذریعے بھی کسی مخلوق کی بود و ماند دائرہ امکان میں آتی ہے۔

انسانی تاریخ کے صدیوں پر محیط ریکارڈ میں جہاں نظر آنے والی مخلوق کے تذکرے موجود ہیں وہاں ان دیکھی اور نادیدہ ہستیوں کا ذکر بڑے شد و مد سے کیا جاتا رہا ہے ہم انہیں توہمات کہہ کر بیک نظر ان سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں اور ان مشاہدات و تجربات کو دماغی خلل پر بھی محمول کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس بیشتر صحیح الدماغ افراد کے ساتھ بقائم ہوش و حواس پیش آنے والے مظاہر کو حواس کا فریب قرار دینے کے بجائے سائنسی بنیادوں پر ان امور کی توجیہہ کی کوشش بھی کر سکتے ہیں۔

جنات کو پہچاننے کا ذریعہ اس مخلوق کی کارروائیاں ہیں۔ جنہیں ہم دو طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک تو ناقابل تشریح خلاف معمول مظاہر ہیں۔ دوسرے ایسے انسان یا حیوان ہیں جن پر یہ مخلوق حاوی ہو کر اذیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ کسی خبیث الفطرت جن سے متاثر ہونے والے انسان کو آسیب زدہ یا جن گرفتہ کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگ اتنی عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان کا دماغ ظاہری طور پر معطل ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی دورہ ختم ہوتا ہے تو مریض کو بالکل یاد نہیں ہوتا کہ اس نے کیا "کارنامہ" سرانجام دیا ہے۔ علم نفسیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ "توہم پرست" جس معاملے کو نادیدہ مخلوق کی کارگزاری سمجھتے ہیں اس کی حقیقت دماغی خلل سے بڑھ کر کچھ نہیں یعنی یہ آسیب زدہ دراصل شیزوفرینیا (تقسیم شخصیت) اور اختناق الرحم جیسے امراض کا شکار ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔

لیکن بعض اوقات ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ نفسیات دان بھی مریض کو محض نفسیاتی مسئلہ قرار دیتے ہوئے ہچکچانے لگتے ہیں۔ ایک ایسا واقعہ فلپائن میں پیش آیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یہاں بے سہارا بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مئی ۱۹۵۱ء میں منیلا میں پولیس نے ایک ایسی ہی لاوارث، بچی کلاریتا کو ایک گلی سے گرفتار کیا جہاں وہ خوفناک انداز میں چیخ چلا رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کی مرمت کر رہا ہو۔ مجمع کا خیال تھا کہ لڑکی پاگل ہے پولیس اسے لے گئی اور جیل میں بند کر دیا۔ بچی نے سسکتے ہوئے درخواست کی کہ اس کے بدن پر دانتوں سے کاٹنے کے نشانات دیکھے جائیں۔ اس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ مگر جس وقت بچی نے پھر سے چیخنا چلانا شروع کر دیا تو سپاہی اسے باہر لے آیا وہ کہہ رہی تھی کہ ہوا میں ایک تیرتی ہوئی بلا اسے بار بار کاٹتی ہے۔ اس کے سر پر ایک بڑی سی کالی ٹوپی ہے۔ شکل انسانوں جیسی ہے۔ مگر آنکھیں باہر کو ابلی سی ہوئی ہیں۔

پولیس چیف منیلا کے میئر کو بلا لایا اور لوگوں نے خود دیکھا کہ لڑکی کے بازوؤں اور کندھوں پر دانتوں سے کاٹے جانے کے نیلگوں نشانات موجود ہیں۔ جن کے اردگرد تھوک بھی موجود ہیں۔ بچی نے رات جیسے تیسے کر کے گزاری اور اگلی صبح اسے عدالت لے جایا جا رہا تھا تو ایک بار پھر اس نے دل ہلا دینے والی آواز سے چلانا شروع کر دیا۔ موقع پر موجود اخباری رپورٹروں اور ڈاکٹر نے دیکھا کہ لڑکی کے بدن پر دانتوں کے نشانات ظاہر ہو رہے ہیں۔ دو پولیس والوں نے لڑکی کو جکڑ رکھا تھا۔ ۵ منٹ بعد لڑکی تکلیف اور خوف کی شدت سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی۔ لیڈی ڈاکٹر مارنیا لارا نے کہا کہ لڑکی کو ہسٹریا نہیں ہے۔ اس نے اپنے آپ کو نہیں کاٹا ہے کیونکہ اس کے کاندھے بھی زخمی ہیں اور وہاں تک اس کا منہ پہنچنا محال ہے۔

لارا نے میئر اور بڑے پادری کو بلا بھیجا۔ یہ لوگ ابھی وہاں پہنچے ہی تھے کہ لڑکی کو ہوش آ گیا اور وہ تڑپنے لگی اور بتایا کہ وہ نادیدہ بلا ایک بار پھر حملے کے لئے پر تول رہی ہے اور اس بار اس کا ایک بڑی آنکھوں والا ساتھی بھی ہمراہ ہے۔ میئر نے دیکھا کہ بچی کی گدی پر کسی نے زور سے کاٹا ہے اور وہاں دانتوں کے نشانات نمودار ہو گئے ہیں۔ میئر نے لڑکی کو پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے ہسپتال لے جا رہے تھے۔ میئر کی نظروں کے سامنے بچے کے ہاتھ پر دانتوں کے نشانات ثبت ہونے لگے۔ یہ لوگ سخت متوحش ہو گئے۔

بچی کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں وہ رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئی۔ مگر میڈیکل سائنس کے لئے ایک ناقابل تشریح معمہ چھوڑ گئی۔

ایک اور واقعے کا تذکرہ فلسفی جوڈ نے "افکار حاضرہ" میں کیا ہے۔ یہ رومانیہ کے ایک کسان کی بیٹی ایلیونور کا قصہ ہے۔ اس کے بدن پر بھی کلارا کی طرح سے دانتوں کے نشان اور نیل پڑ جایا کرتے تھے۔ اس لڑکی کو تجرباتی ماحول میں پابندی کے ساتھ زیر نگرانی رکھا گیا اور دیکھنے میں آیا کہ کوئی نادیدہ ہستی اس لڑکی پر بار بار حملہ آور ہوتی ہے۔ اس لڑکی نے بتایا کہ یہ نادیدہ مخلوق دراصل خبیث جنات ہیں۔ اس کے جسم پر مخصوص زخم لوگوں کے دیکھتے دیکھتے نمودار ہو جاتے اور لڑکی کا چیخ چیخ کر برا حال ہو جاتا۔

رئیس امروہوی "جنات" حصہ دوم میں رقم طراز ہیں "خیال یہ ہے کہ فضا میں یقیناً ایک کم شعور توانائی کارفرما ہے۔ یہ ایک دھندلی اور

ادھوری سی شخصیت ہوتی ہے۔ اس نیم تاریک آوارہ گرد شخصیت کی اکثر حرکات خود کار ہوتی ہیں۔ غیر ارادی جیسے مشینی حرکات، یہ بے شعور توانائی انسانی شعور اور ارادے سے لرزہ براندام رہتی ہے۔ یہ خلاء میں تیرنے والی قوت کروڑوں اکائیوں میں تقسیم ہے اور ہر اکائی محدود ادھورے اور ناقص وجود کی مالک ہے۔ ان اکائیوں کو عنصری مخلوق یا قوائے عنصری Elementals کہتے ہیں۔ عنصر یا عنصر زاد ایسی مخلوق ہے جس کی جسمانی ترکیب اور دماغی ساخت انسان سے مختلف کم درجے کی ہے۔ عنصری جسم نظر بھی آ سکتے ہیں نہیں بھی آ سکتے۔ صرف چند لمحے کے لئے اپنی پسندیدہ شکل میں ظاہر ہوتے اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ان میں ہر شکل ہیئت Form کو اختیار کرنے کی غیر معمولی صلاحیت و استعداد پائی جاتی ہے۔ یہ سب سے زیادہ انسان کی طاقتور دماغی لہروں سے خوفزدہ رہتے ہیں آدمی کے اعصابی نظام اور دل و دماغ سے جس طول موج (ویولینتھ) کی لہریں نکلتی ہیں وہ ان کے حق میں زہریلی گیس کا حکم رکھتی ہیں۔ انسانی دماغ کی لہریں جتنی طاقتور ہوں گی یہ اس سے اتنا ہی خوفزدہ ہوں گے۔ ہم صرف اپنی قوت ارادی اور خود اعتمادی سے انہیں اپنا محکوم بنا سکتے ہیں۔ جس طرح اور عنصری قوتوں (بھاپ، بجلی، ایٹمی توانائی اور مقناطیسیت) کو ہم اپنے اشاروں پر چلاتے اور ان سے مفید یا مضر کام لے سکتے ہیں اسی طرح اس عنصر زاد مخلوق سے کام لیا جا سکتا ہے۔

## بھوت (Ghosts)

"میں خدا پر یقین نہیں رکھتا۔ مگر مجھے بھوتوں کا یقین ہے۔" آئرلینڈ میں گولولے کے مقام پر رہنے والے شخص جان سٹین نے ۱۹۷۴ء میں یہ بیان اس وقت دیا جب اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک بھوت نے اس کی رہائش گاہ کو آسیب زدہ کر رکھا تھا۔

بھوت پریت کسی انسان کے مادی بدن سے جدا ایسے قابل شناخت غیر مادی روحی اجزاء ہوتے ہیں جو دیئے گئے بیانات کے مطابق کبھی کبھی ظاہر ہوتے ہیں اور زندہ اجسام کے سامنے عیاں ہوتے ہیں۔ بھوت کی یہ تعریف ہمیں آکسفورڈ ڈکشنری میں نظر آتی ہے۔ لفظ "گھوسٹ" جو انگریزی زبان میں بھوت کے لئے مستعمل ہے سیکسن زبان کے لفظ Gaste یا Gest سے مشتق ہے۔

پیٹر ہننگ اپنی کتاب "گھوسٹس" میں ماہرین کے بارے میں رقمطراز ہے کہ وہ بھوتوں کے بارے میں پانچ بنیادی باتیں بتاتے ہیں۔ اول یہ کہ ہم اپنی گزشتہ زندگیاں بسر کر چکے ہیں جب کہ بھوت دوسرا جنم لیتے ہیں اور اپنے دور کے لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے وجود کے پیچھے اکثر شدید ذہنی کرب کارفرما ہوتا ہے اور ان کا شاہد معمولی سی روحانیت کا حامل بھی ہو سکتا ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ کسی مردہ شخص کی روح اور کسی "شے" کے باہمی اختلاط کے ذریعے گو ابتدائی قسم کی تاہم جزوقتی واقفیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ عالمی پیمانے پر ان کے بارے میں ادراک پایا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک خوف اور ڈر کا احساس ان کے وجود پر پختگی فراہم کرتا ہے۔ اور پانچویں یہ کہ ہم حقیقت میں بھوت دیکھتے ہیں جو مردہ روحوں کی مجسم صورتیں ہوتی ہیں جو ان مناظر کی جانب واپس لوٹنے کی کوشش کرتی ہیں جن میں انہوں نے پچھلے جنم میں وقت گزارا تھا۔

بھوتوں میں متنوع مختلف بنیادوں پر کیا جا سکتا ہے ہر قوم میں ان کی گروہ بندی مختلف طریقوں پر ہوئی۔ پتھر کے دور کے انسان اپنے مردے دفن کرتے ہوئے بہت سی تقاریب کا انعقاد کرتے مبادا مردے کی روح ناراض ہو کر بھوت بن کر ان کے پیچھے پڑ جائے۔ قدیم ترین تحریروں میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ مثلاً اہل بابل کی مٹی کی تختیاں اس کا ثبوت دیتی ہیں۔ سمیریوں کے عقائد سے بھی ان کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اوقات بھوتوں کی درجہ بندی کے تین مدارج تسلیم کئے گئے تھے۔ یعنی (۱) مرنے والے کی شریف روح۔ (۲) اس روح کا ایک کریہہ المنظر بھیانک بد روح میں ارتقاء اور (۳) آخری صورت نیم انسانی اور نیم روحانی صورت کا ایک مخلول جو کسی روح اور انسان کے ازدواجی تعلقات کے نتیجے میں ظاہر ہوں۔ اسیری اقوام اولین قوموں میں شمار ہوتی ہیں جن کے ہاں بھوتوں کی تقسیم اور درجہ بندی مختلف ناموں کے تحت کی گئی ہے۔ غالباً چار ہزار برس پرانی گل گامش Gilgamish کی کہانی جو اہل بابل کا اصنامیاتی اثاثہ تھا۔ ارواح کے بارے میں اولین محفوظ تحریر شدہ کہانی ہے۔ اہل مصر کے ہاں ارواح زندگی کے زیادہ تر گوشوں میں ملوث نظر آتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک، آدمی ان چیزوں سے مرکب ہے۔ ایک طبیعی جسم، ایک روح، ایک قلب، ایک اور روح جسے وہ "خو" کہتے ایک قوت اور ایک نام۔ ان کا خیال تھا کہ یہ بھتنوں کی کارروائیاں خو سے سرزد ہوتی ہیں جو کسی شخص کے مرنے کے بعد آزاد ہوتی ہیں اور کسی جانور پر قابض ہو کر لوگوں میں

بیماریاں پھیلاتی ہیں۔ سب سے زیادہ شورش پسند ارواح خودکشی کرنے والوں، قتل کئے جانے والے مجرموں، پانی میں ڈوبنے والوں اور دفن نہ کئے جانے والوں کی ہوتی ہیں۔

عربوں کے ہاں عفریت مقتولوں کی روح ہوتی جو جائے قتل سے اٹھا کرتی اور اس کے چھٹکارے کا طریقہ اس مقام پر زمین میں کیل گاڑنا تھا اور تعویذات کا استعمال بھی ہوتا تھا۔

رومی اور یونانی اصنامیات میں بھوتوں پر مفصل بحث ملتی ہے۔ سورا کے رومی کونسل پلائی نی نے ورج کیا ہے۔ کہ ایتھنی نی ڈورس نامی فلسفی نے ایک مکان کرائے پر لیا۔ جہاں زنجیریں گھسیٹتا ہوا ایک بھوت رہتا تھا۔ ایک رات وہ بھوت فلسفی کو نظر آیا اور اسے پیچھے لگا کر باغ میں لایا اور ایک طرف اشارہ کر کے غائب ہو گیا۔ فلسفی نے اگلے روز وہاں کھدائی کر کے زنجیروں میں جکڑا ہوا انسانی ڈھانچہ پایا جسے عوام الناس کے سامنے نظر آتش کر دیا گیا۔ پھر وہ بھوت کبھی نظر نہ آیا۔ رومی روایات میں بشمول سیزر کے بھوتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جنہوں نے پیش گوئیاں کیں جو بعد میں پوری ہوئیں۔

الغرض شمالی یورپ سکنڈے نیویا، انڈیا، چین اور جاپان ہر جگہ کی روایات میں بھوتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ اور تو اور ریڈ انڈین قبائل، ہیں جن کا متذکرہ علاقوں سے تعلق نہ تھا کے ہاں روایات کا بہت بڑا ذخیرہ بھوتوں اور ارواح سے متعلق تھا۔

بائبل اور عیسائی روایات میں بھی زمناء کے تذکرے ملتے ہیں جنہوں نے لوگوں کو بدارواح سے نجات دلائی لیکن اب کہا جاتا ہے کہ یہ سب یا تو گھڑے ہوئے قصے ہیں یا محض نظر کے دھوکے ہیں۔ مثلاً ولی انتھونی جو عیسائیت میں بھوتوں کو بھگانے والا ایک بہت بڑا کردار تھا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے مسلسل روزے رکھنے کے سبب دماغی کمزوری سے ایسے مناظر دکھائی دیئے تھے یا بہت ممکن ہے اس نے کوئی ایسی روٹی کھائی جس پر Claviceps Purpurea نامی فنجائی اگی تھی اور یوں وہ L.S.D (لائی ذرجک ایسڈ) کی وجہ سے ایسے دماغی مرض میں گرفتار ہو سکتا ہے کہ بھوت پریت دکھائی دینے لگیں۔

کلوسکی کے طریقہ کار کے تحت روحوں نے پگھلے موم میں اپنے چہروں کے یہ نقوش چھوڑے

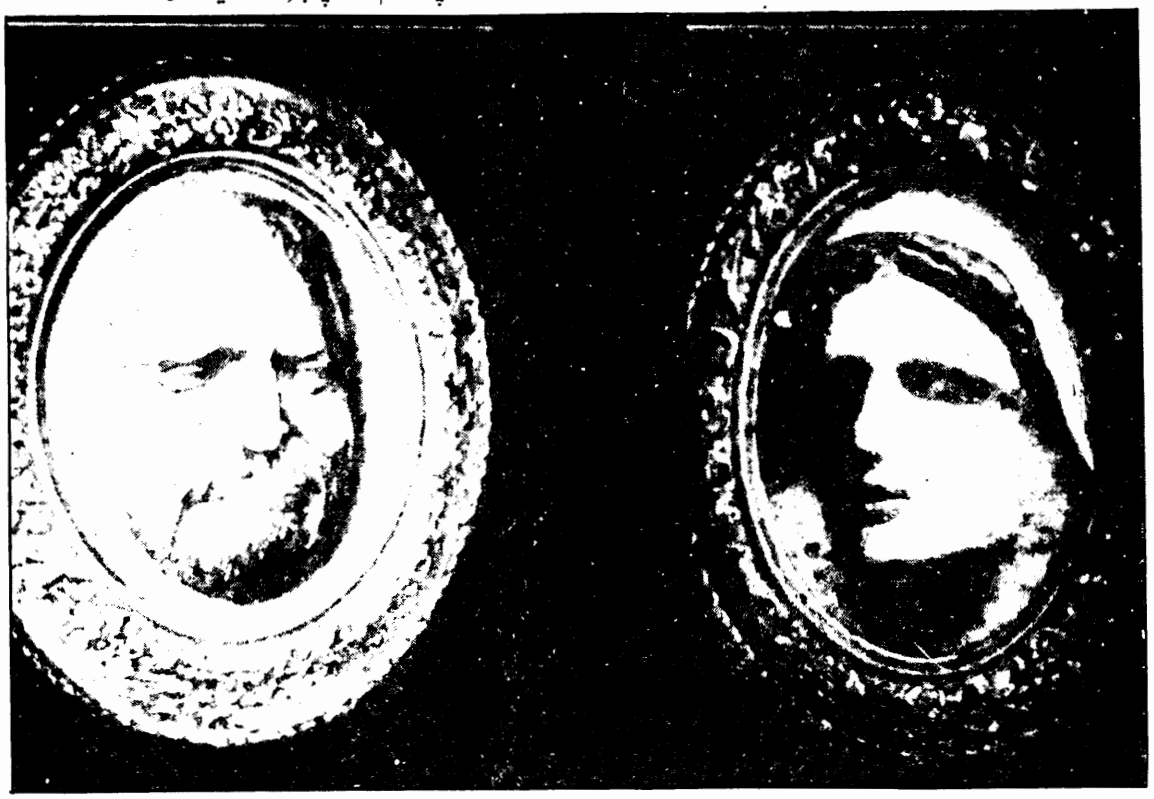

تیرھویں صدی عیسوی کی صلیبی جنگوں کے واقعات ۱۲۹۵ء کی پیرس انگش ہسٹری میں درج ہیں ان میں کئی بھوتوں کی تواریخ مع واقعات درج ہیں اس کے مطابق ۱۲۵۰ء میں نیل کے کنارے ایک انگریز سپاہی ولیم لانگز ورڈ لڑتا ہوا مارا گیا تو عین اس وقت برطانیہ میں اس کی ماں کو ایک بھوت کے ذریعے بیٹے کی موت کی اطلاع ملی۔

بعد کے ادوار بھوتوں کے جعلی مظاہروں سے عبارت ہیں۔ ۱۷۹۴ء میں بلجیم کے رہنے والے گیسپرڈ رابرٹ سن نے فرانس کے علاقے میں کئی مظاہرے کئے۔ وہ عدسوں کا ماہر تھا۔ پیرس آمد کے بعد اس نے حکومت کو پیش کش کی تھی کہ ایسے عدسے بنائے جائیں جس سے برطانوی بحریہ جو فرانسیسی بندرگاہوں کے راستے روکے بیٹھی تھی کو جلا دیا جائے۔ لیکن اس پیش کش کے مسترد ہونے کے بعد اس نے عدسوں کی مدد سے عکس پیدا کر کے بھوتوں کی شبیہیں پیش کرنے کا کاروبار شروع کیا جو بڑا کامیاب رہا۔ ۱۸۶۳ء میں پروفیسر جان ہنری پیپر نے لندن میں ایسے مناظر پیش کرنے میں بہت زیادہ شہرت پائی۔ اس کی بہت نقالی ہوئی۔

اس کے بعد کیمرے کے ذریعے بھوتوں کی تصاویر کھینچنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اگرچہ بہت حد تک یہ تصاویر جعلی ہوتی تھیں اور کیمرے کے ڈبل ایکسپوژر کے ذریعے حاصل کی گئی ہوتی تھیں۔ تاہم چند تصاویر اور موقعے پر موجود لوگوں کی شہادتوں کی بنیاد پر تصاویر کو اصل قرار دیا گیا۔ کیونکہ ماہرین نے جعل سازی کے امکان کو مسترد کر دیا تھا۔

چند روحی مظاہر کے دوران روح کی موجودگی کا ثبوت آواز اور ہیولوں کی آمد سے ملتا ہے۔ میڈیم یا معمول کے بدن کے کسی سوراخ سے ایک سفید سادخانی مادہ نمودار ہوتا ہے جسے ایکٹو پلازم یا ٹیلی پلازم کہتے ہیں۔ یہ مادہ رفتہ رفتہ تجسیم اختیار کرتا ہے اور روح اپنے آپ کو ظاہر کر دیتی ہے۔

پنسلوانیا کی ایک خاتون ای تھل پوسٹ پرش Ethel Post Parrish نے ایک مرتبہ ۸۰ افراد کی موجودگی میں ایکٹو پلازم کے ذریعے ایک ریڈ انڈین لڑکی کی تجسیم کی جسے وہ اپنی روحی راہبر قرار دیتی تھی اور اس روح کا نام سلور بیل بتاتی تھی۔ انفراریڈ کیمرے سے اس ۳۰ منٹ پر محیط واقعے کی تصویر کشی کی گئی۔ کوئی بھی اس واقعے میں جعل سازی تلاش نہ کر سکا۔[1]

فرے نک کلوسکی Franek Kluski پولستانی تاجر شاعر اور روحی معمول تھا اس نے تاریخ میں روحوں کو حاضر کرنے اور ان کی موجودگی ثابت کرنے میں سب سے موثر تجربات پیش کئے۔ وہ ایک نیم روشن کمرے میں روحیں بلاتا تھا اور انہیں پگھلے ہوئے موم میں اپنے ہاتھ ڈبو کر نکلنے کا حکم دیتا۔ اس کے بعد قریب رکھے ٹھنڈے پانی کے برتنوں میں موم لگا ہاتھ ڈالنے کا حکم دیا جاتا اور روح کے ہاتھ کی ساخت سخت ہو جانے والے موم کے خول کی شکل میں پانی پر تیرنے لگتی۔ موقع پر موجود لوگوں کو کوئی روح وغیرہ نظر تو نہ آئی لیکن ٹھنڈے پانی میں ہاتھ کی حرکت سے پیدا ہونے والے چھپاکوں کی آواز وہ بخوبی سن لیتے۔ اس روحی مجلس کے اختتام پر موقع پر موجود افراد کے ہاتھوں اور پانی میں موجود ہاتھ کے مومی خول کا موازنہ کیا جاتا کسی کے ہاتھ سے یہ خول مشابہت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے بعد خول میں پلاسٹر آف پیرس انڈیل کر سخت کر لیا جاتا اور موم ہٹا دیا جاتا۔ تاکہ ہاتھوں کی ساخت کا قریبی مشاہدہ آسان ہو جائے۔ کلوسکی نے اپنے اس ایجاد کردہ طریقے پر روحوں کے چہروں کے ماسک بھی حاصل کئے۔

کلوسکی کے کام میں کبھی جعل سازی ثابت نہ کی جا سکی بلکہ سب کو اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ اگر کوئی شخص ہاتھوں کے خول بناتا ہے تو اس موم کے نازک خول سے ہاتھ باہر کس طرح نکال لیتا ہے۔ کیونکہ کلائی کے مقام پر خول کا سوراخ چھوٹا ہوتا ہے اور اس چھوٹی جگہ سے بڑی جسامت کا ہاتھ اس طرح نکال لینا کہ خول ٹوٹنے نہ پائے۔ بلاشبہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔

کلوسکی روحی تجسیم کے مناظر پیش کرنے کا بادشاہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مومی خولوں کے علاوہ اس نے دیگر مظاہرے سے بھی شہرت پائی۔ بلکہ بعض روحی ماہرین کے نزدیک اس کے دیگر کارنامے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء کے دوران کلوسکی نے وارسا کے مقام پر کئی معتبر افراد کے سامنے اپنے روحی مظاہر پیش کئے۔ ان افراد میں یونیورسٹی آف مشی گن کے پروفیسر این ڈبلیو پاولوسکی بھی شامل تھے۔ کوئی شخص بھی ان مظاہر کی تشریح نہ کر سکا۔ یہاں کلوسکی نے حیوانی روحوں کی تجسیم کی۔

پاولوسکی نے ایک روحی مجلس کا احوال بیان کیا ہے۔ کہ معمول کو بٹھا کر اس پر مگنیشیم فلیش اور کیمرہ فوکس کر دیا گیا۔ تب پہلا حیوان نمودار ہوا۔ یہ ایک عقاب تھا جو اڑتے ہوئے دیواروں اور چھت سے پر ٹکراتا ہوا آ کر معمول کے کندھوں پر بیٹھ گیا اور اسی وقت تصویر اتار لی گئی۔ پروفیسر کا کہنا ہے کہ سمجھ میں

بھوت کا مظاہرہ اس واقعہ کو 80 عینی شاہدوں نے دیکھا روح کی تجسیم کا یہ مظاہرہ امریکہ میں کیا گیا

نہیں آتا وہ کہاں سے آیا تھا اور اچانک کس طرح غائب ہو گیا۔ پھر ایک عدد (اود بلاؤ سے مشابہ حیوان) ویسل سانمودار ہوا جو اپنی ننھی سی ٹھنڈی تھوتھنی سے حاضرین کے ہاتھ اور چہرے سونگھتا پھرا پھر ایک بڑا سا کتا آیا جس کے منہ سے بڑے بڑے دانت جھلک رہے تھے اور اس کی آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ مگر سب سے بڑھ کر خوفناک چیز قبل از تاریخ عہد کا انسان "پیتھی کین تھروپس" تھا۔ جسے کئی مواقع پر بلایا گیا۔ اس گوریلا نما مخلوق کا بڑا سا سر تھا اور پورے بدن پر بھرے بھرے بال تھے۔ یہ بڑا طاقتور معلوم ہوتا تھا۔ گو اس سے خوف آتا تھا مگر اس کی ذہنی سطح خاصی پست تھی۔ (2)

گو کلوسکی کے بعد اور لوگوں نے حیوانی روحوں کی تجسیم کے مظاہرے کئے جیسے لندن میں لارڈ ولزلے کے سامنے ایک ماہر نے سیل جانور پیش کیا مگر کوئی بھی کلوسکی جیسی شہرت حاصل نہ کر سکا۔

پورے یورپ میں چرچوں میں یسوع مسیح"، مقدس مریم" اور دیگر پادریوں کی روحوں کے دکھائی دینے کی خبریں آتی رہتیں ہیں لیکن سب سے بڑھ کر قابل اعتبار خبریں حکومتی اداروں میں بھوتوں اور روحوں کی خبریں ہیں۔ ایسی مثالوں میں سرفہرست امریکہ (وہائٹ ہاؤس) اور برطانیہ (دس ڈاؤننگ اسٹریٹ) ہیں۔ ثانی الذکر میں ۱۹۶۰ء میں پائیں باغ میں مزدوروں نے ایک ایسی مخلوق دیکھی جس کا بدن انجرات سے مرکب دکھائی دیتا ہے۔ لیکن حسب سابق سرکاری طور پر اسے تسلیم نہ کیا گیا۔

وہائٹ ہاؤس میں نظر آنے والا بھوت پہچان لیا گیا ہے۔ یہ صدر ابراہام لنکن کا ہے اور اکثر لوگوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ جیسے صدر روز ویلٹ کی بیوی نے تحریر کیا ہے کہ ایک روز ایک ملازمہ گھبرائی ہوئی آئی اور بتایا کہ وہ بستر کے کنارے پر بیٹھا اپنے بوٹ کے تسمے کھول رہا ہے۔ پوچھا گیا کون تو اس نے جواب دیا۔ "مسٹر لنکن" برطانوی وزیر ونسٹن چرچل نے لنکن کا بھوت دیکھا تو کمرہ ہی تبدیل کر لیا۔ ہیری ٹرومین نے ۱۹۴۵ء میں تحریر کیا کہ نیدر لینڈ کی ملکہ وہلہلمینا اور اس کی ملازماؤں نے حلفیہ کہا کہ انہوں نے کئی مرتبہ لنکن کے بھوت کو دیکھا۔ یہ بھوت عموماً اس وقت زیادہ دکھائی دینے لگتا ہے جب مملکت کسی بحران سے گزر رہی ہو۔

کیا بھوت حیات بعد از موت اور روح کے وجود کا حقیقی ثبوت فراہم کرتے ہیں؟ باطنی مظاہر پر تحقیقات کرنے والے مشہور ادارے S.P.R نے ۱۸۸۹ء میں مختلف لوگوں کے بیانات میں یہ مشترکہ نقطہ تلاش کیا کہ جن افراد کا بھوت دکھائی دیتا ہے ان میں سے بیشتر کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت وہ شدید قسم کی ذہنی اذیت یا روحی عذاب سے گزر رہے تھے۔ چنانچہ یہ تصور پیدا ہوا کہ موت یا مصیبت کے اذیت ناک لمحات کے دوران ان افراد نے ماحول اور مدرکات کے بارے میں اتنی شدت سے سوچا کہ جانکنی کے عالم میں ان کے خیالات ٹیلی پیتھی طریقے سے مقامی طور پر آزاد ہو گئے۔ اور یہ آزاد شدہ آوارہ یہ خیالات نہ معلوم وجوہات کی بناء پر وقتاً فوقتاً لوگوں کی نگاہوں کے سامنے انہی واقعات کو دوبارہ پیش کر دیتے ہیں۔ جو مرنے والے کے دماغ میں شدت سے گردش کر رہے تھے۔

ٹیلی پیتھی یا انتقال خیال بذات خود ایک معمہ ہے مگر غیر مرئی خیالات کے زیر اثر فضا میں پیدا ہو جانے والی صورتوں کا نظر آنا اپنی جگہ ایک مکمل معمہ ہے۔ کیا یہ تشریح قابل قبول ہے؟

(متعلقہ موضوعات دیکھئے۔ روح۔ علم ارواح۔ ارواح خبیثہ)

# بد ارواح/ارواح خبیثہ (Poltergiests)

Poltergiests جرمن زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "کھڑکھڑانے والی روح"

از منہ قدیم سے یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر مانی جاتی رہی ہے کہ ارواح دو قسم کی ہوتی ہیں۔ نیک و بد۔ موت کے وقت مادی جسم سے علیحدگی کے بعد ثانی الذکر ارواح عالم مثالی سے بھٹک کر دنیا میں آ جاتی ہیں یا انہیں راندہ گیا ہوتا ہے۔ انسانی دنیا میں آنے کے بعد یہ ارواح خباثت پر اتر آتی ہیں۔ بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر وہ انسانوں کو ستاتی ہیں۔ ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ وہ بغیر دکھائی دیئے بہت شور شرابے کرتی ہیں۔ آسیبی مکانات میں قدم کی چاپ دیواروں پر دھپ دھپ، دروازوں کے چرچرانے کی آوازیں رونے، چیخنے، ماتم کرنے بھیانک قہقہے اور دل ہلا دینے والی آوازیں پیدا کرنے کی وجہ سے انہیں

پولٹر گیسٹ کہا گیا ہے۔ اپنی موجودگی کا اظہار کرنے کے لئے وہ مادی اجسام کو ہلانے جلانے، فرنیچر کو گھسیٹنے اور لوگوں پر چھوٹی موٹی اشیاء پھینک کر سنگ باری کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتیں لیکن ان حرکتوں سے کسی شخص کو جسمانی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ایسے مظہر کو آسیب یا بدروح گرفتگی کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ یہ صورت حال زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بدروح گرفتہ کو اذیت دینے کے لئے ارواح خبیثہ کا ایک نادر طریقہ کار اپنے شکار کو دانتوں سے بھنبھوڑنا ہے۔

۱۹۲۲ء میں امریکہ کی نیشنل لیبارٹری برائے نفسیاتی تحقیق نے رومانیہ سے تعلق رکھنے والی ایک ۱۳ سالہ لڑکی Eleonora Zugon کا مسئلہ دیکھا۔ اس کی پشت اور گردن پر کسی نظر نہ آنے والی حملہ آور مخلوق کے دانتوں کے نشانات بنے ہوئے تھے۔ ماہرین کی نظروں کے سامنے بھی اس کے جسم پر بعض جگہوں پر دانت کاٹنے کے نشانات ابھرے۔[3]

۱۹۵۳ء میں فلپائن کے ایک پولیس سٹیشن میں کلاریٹا نامی ۱۸ سالہ لکڑی ایک دم سے چیخنے چلانے لگی۔ سمجھا گیا کہ شاید اسے کوئی بیماری یا ہسٹریا ہے مگر جب وہ کچھ پرسکون ہوئی تو اس نے کسی ان دیکھے حملہ آور کے دانتوں کے تازہ نشانات دکھائے جو اس کی ٹانگوں اور بازوؤں پر ظاہر ہوئے تھے۔[4]

ایسے اور اس قسم کے دوسرے بیشتر واقعات میں کوئی نہ کوئی لڑکا یا لڑکی ضرور ملوث ہوتے ہیں۔ کیوں؟ ماننے اور نہ ماننے والے مختلف توجیہہ کرتے ہیں بعض ماہرین نفسیات جو ارواح خبیثہ کے خارجی وجود کو تسلیم نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ ان سارے تماشوں کی وجہ نوجوان لڑکے لڑکیوں میں عنفوان شباب کی جسمانی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں ہے۔

ادھر ارواح خبیثہ کے خارجی وجود پر یقین رکھنے والوں کی توجیہہ یہ ہے کہ یہ ارواح عام حالات میں غیر موثر رہتی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنی کارکردگی کے لئے توانائی درکار ہوتی ہے۔ اور یہ توانائی، ارواح خبیثہ ان لڑکے لڑکیوں سے حاصل کرتی ہیں جو آغاز شباب کی پیچیدگیوں سے ابنارمل ہو چکے ہوں۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ خبیث روح درحقیقت ہر انسان کے اندر موجود ایک ضرر رساں توانائی ہے۔ جو خوابیدہ حالت میں کسی طبعی ذریعہ سے اپنی شناخت کی منتظر رہتی ہے۔ چنانچہ یہ مخفی قوت فرد کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ جب کہ بھوت مقام سے مخصوص ہوا کرتے ہیں۔ متاثر شخص جگہ چھوڑ کر دور چلا جائے تو بھوت پیچھا نہیں کرتے۔

۱۹۲۰ء میں ماہر نفسیات ہیری برائس اس نتیجے پر پہنچا کہ ارواح خبیثہ کے اثرات عموماً نوجوان لڑکیوں پر ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے لئے آسیبی سرگرمیوں کا تناسب بالترتیب ۵ اور ۹۵ فیصد ہے۔ خواتین میں جسمانی غدودوں کی رطوبتوں کے پیدا ہونے سے دماغ میں پنہاں منفی قوت کو اپنے اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔ مگر عنفوان شباب کی جسمانی اور ذہنی تبدیلیوں کو ہی محض "ارواح خبیثہ" کا اصل سبب قرار دینا زیادتی ہوگی کیونکہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ جب پورے معاملے میں کوئی بھی ایسا لڑکا یا لڑکی موجود نہیں ہوتے جو آغاز شباب کے دور سے گزر رہے ہوں۔ اس کی مثال آئرلینڈ کے کلاکی آرٹ سنٹر کے واقعات ہیں۔

۷۰ء کی دہائیوں میں پیش آنے والے ان مظاہر کے دوران سب سے نمایاں شخصیت ایک سلجھی ہوئی عورت مارگریٹ اوبرائن تھی۔ وہ ارواح خبیثہ کی کارروائیوں کا مرکز نہیں تھیں کیونکہ کئی واقعات اس کی غیر موجودگی میں پیش آئے۔ بیشتر لوگوں نے ایک بہت بڑی سیاہ بلی کا خاکہ دیکھنے کی اطلاع دی۔ آئرش پریس نے ان حیران کن واقعات کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کیا۔ ڈبلن سے کچھ لوگ یہاں آئے اور روح سے رابطے کے لئے اوجابورڈ استعمال کیا مگر روحی محافل کوئی خاص نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ الٹا دو روز بعد خوارق العادت مظاہر بڑھ گئے۔ گاہے گاہے رات کو دروازوں پر دستک ہونے لگ گئی۔ سوئچ خود بخود آف ہو جاتے۔ آرٹ سنٹر میں رہائش پذیر فن کاروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ گھنٹیوں کی آوازوں سے وہ بڑے بے آرام رہنے لگے۔ حالانکہ وہاں آس پاس کہیں بھی کوئی گھنٹی نہیں تھی۔ اب بند کمروں میں پڑے فرنیچر کی شامت آ گئی۔ اکثر فرنیچر کو الٹایا گیا ہوتا لکڑی کی ایک کرسی کا جوڑ جوڑ الگ کر دیا گیا اور ایک اور کرسی کو تو بالکل چور چور کر دیا۔ پھر چند ہفتے سکون سے گزرے مگر اس کے بعد پھر سے گڑبڑ شروع ہو گئی۔ اس بار برتنوں کی باری تھی۔ انہیں پٹخ کر بھی بدروح کا جی نہ بھرا تو آرٹ سنٹر کے فن پاروں کو تار تار کر کے رکھ دیا اور دیواروں کو گوند سے لیپ دیا۔

۱۹۷۰ء کے اواخر میں ڈبلن کا ایک پادری بدروح کو بھگانے آیا مگر اس کے جانے کے بعد بدروح نے ایک نیا تماشا شروع کیا۔ مسز اوبرائن کے ہاں ریفریجریٹر نہیں تھا۔ اور ان کا گوالا دودھ کی بوتلیں باہر ندی کے اتھلے پانی میں رکھ جایا کرتا تھا کہ وہ ٹھنڈی رہ کر محفوظ رہیں۔ ایک روز اوبرائن نے دیکھا کہ سب

نلوں کی ایلومینیم کی بنی ٹوپیاں غائب ہیں۔ مگر دودھ کو کسی نہ نہیں چھیڑا۔ یہ تماشا کئی روز تک ہوتا رہا۔ تو پہلے پہل اوبرائن نے یہ خیال کیا کہ یہ حرکت پرندوں کی ہے کہ وہ دودھ کے لئے بوتل کے ڈھکن اتار دیتے ہیں۔ چنانچہ پانی کے اندر چار وزنی پتھروں کا چھوٹا سا چوکا بنا کر اس پر وزنی سل دھر دی گئی مگر تب بھی ڈھکنے ٹوٹ ہوتے رہے۔ ادھر گھر میں یہ بدروح مختلف اقسام کی چھوٹی بڑی ٹوپیاں پھینکنے لگی۔ اوبرائن سونے سے پہلے سارے گھر کو کنڈیاں تالے لگا کر سوتی مگر ہر روز گھر میں نہ معلوم طریقے سے قسم قسم کی ٹوپیاں پڑی ملتیں۔

کلاکی آرٹ سنٹر میں بدروح کی یہ کارستانیاں ۱۹۷۰ء کے اختتام کے ساتھ ہی خود ہی ختم ہو گئیں۔ (5)

# آدم نما.....انسانوں کے پراسرار بھائی بند

وہ انسانوں کی مانند دو پیروں پر چلتے پھرتے ہیں۔ اس اعتبار سے وہ انسان کے علاوہ کرہ ارض کی دوسری دو پایہ مماثلہ مخلوق ہیں۔ چہرے مہرے سے وہ نسان اور بندروں کے بین بین معلوم ہوتے ہیں مگر ان میں سے بیشتر بندروں سے زیادہ ذہین ہیں وہ اوزاروں اور ہتھیاروں کا استعمال بھی کرتے ہیں سائنس کو ن کے وجود کے بارے میں شک ہے ان کی روایات مختلف انداز میں پورے کرہ ارض سے ملتی آ رہی ہیں۔ روایات اور عینی شاہدوں کے بیانات کی تعداد کی روشنی میں یوں لگتا ہے جیسے ان کی کئی انواع کرہ ارض کے گھنے اور تاریک علاقوں میں چھپی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ کیا یہ تمام بیانات لغو ہیں؟

وسط ایشیاء کے علاقوں (منگولیا، چین اور روس) کے لوگ ایک نیم انسان نما مخلوق کا ذکر کرتے ہیں جسے انہوں نے الماس Almas کا نام دے رکھا ہے۔ ان کے خیال میں یہ پست درجے کے انسان ہیں۔ یہ مخلوق خونخوار نہیں ہے۔ بلکہ عام انسانوں سے دوستانہ رویہ رکھتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ الماس درحقیقت قبل از تاریخ عہد کے انسان نینڈر تھال کی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ نینڈر تھال سیدھے کھڑے ہو کر دو ٹانگوں پر چل سکتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کی نسل خشکی پر جگہ جگہ پھیلی ہوئی تھی۔ مگر پھر اچانک کہیں سے انسانوں کی ایک اور قسم "کرومیگنوں" نمودار ہو گئی۔ یہ لوگ زیادہ ذہین تھے۔ ان کے دماغ کی جسامت نینڈر تھال نسل سے زیادہ بڑی تھی۔ دونوں نسلوں میں چپقلش ہو گئی کرومیگنوں نے انسانوں کی دوسری قسم کو ہلاک کرنا شروع کر دیا تاریخ کی رو سے نینڈر تھال صفحہ ہستی سے مٹا دیئے گئے اور اس قسم کا ایک انسان بھی باقی نہ رہا۔ لیکن دنیا کے مختلف خطوں سے دو ٹانگوں پر چلنے والے جانور نما انسانوں/انسان نما جانوروں کے دیکھے جانے کی اطلاعات آتی رہتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ یا تو گوریلے یا اس قسم کے دوسرے حیوانات ہیں جن کی شناخت سائنسی طور پر اب تک نہیں ہو سکی یا پھر ان نینڈر تھال انسانوں کی باقیات سے ہیں جو کرومیگنوں کے ہاتھوں قتل عام سے اتفاقاً بچ گئے تھے۔

۱۹۵۸ء سے پہلے اشتراکی روس میں کسی انسان نما مخلوق کے وجود سے انکار کیا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی ممالک اس قسم کی مخلوق کی تلاش کی آڑ میں درحقیقت ایشیاء میں جاسوس ٹیمیں بھیجتی ہیں۔ مگر جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک روسی سائنس دان جے کرونن نے بیان دیا کہ اسے بذات خود پامیر کے علاقے میں ایک برفانی انسان دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جس کے بازو لمبے تھے جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا اور وہ ذرہ جھک کر چلتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے بعد سے علاقے سے آنے والی اطلاعات کو محض نظر انداز کرنے کی ریت ختم ہو گئی۔ سائبریا کے علاقے میں ایسی مخلوق کو چوچونا کہا جاتا ہے کچھ اطلاعات کے مطابق اس نسل کی دو اقسام دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک ننگ دھڑنگ بالوں والے وحشی، دوسرے ہرنوں وغیرہ کی کھال پہننے والے چوچونا۔

کومی ری پبلک کے علاقے میں ایک شخص نکولائی ایودیو نے ۱۹۸۶ء میں لوگوں سے یاگ مورٹ نامی انسان نما مخلوق کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ کئی لوگوں نے اس بالوں والی مخلوق کو دیکھ رکھا تھا۔ ان کے خیال میں اس مخلوق کو ہلاک کرنا بربادی کو آواز دینے کے مترادف ہے۔

بحیرہ اسود کے قرب وجوار کے لوگوں نے کپ تر نامی دوپایہ مخلوق دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہ مخلوق کھانے پینے کی چیزوں کا "مال کے بدلے مال" کے ذریعے راہ چلتے لوگوں سے تجارت بھی کرتی ہے۔ ۱۹۴۱ء میں بھورے بالوں والے اس قسم کے ایک انسان نما کو فوج نے جاسوسی کے الزام میں دھر لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی آدمی ہے جس نے کھال اوڑھ رکھی ہے۔ موچنے سے اس کے بال اکھاڑے گئے تو معلوم ہوا کہ یہ فی الحقیقت کوئی اور ہی مخلوق

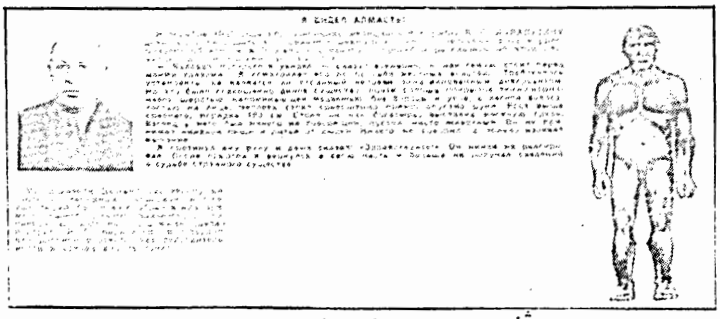

روسی شخص کا راپیتاں اور اس کی بیان کردہ انسان نما مخلوق

ہے۔ عینی شاہدوں کے خیال میں اس مخلوق کو گولی مار دی گئی تھی۔

روس میں چین اور افغانستان کی سرحد کے قریب پامیر کے علاقے کی انسان نما مخلوق روسی دستے کی گولیوں کا شکار ہو گئی۔ ۱۹۲۵ء میں بحر جنرل ٹوپل سکی کے آدمی ایک پہاڑی غار میں پھنس گئے جس کے منہ پر برف آگری تھی۔ یہ لوگ باہر نکلے تو بتایا کہ اندر بالوں والی کوئی مخلوق تھی۔ جس نے چھڑیوں سے سپاہیوں کی مرمت کرنے کی کوشش کی تو ان لوگوں نے گولی چلا دی۔ ایک عدد بالوں والا آدمی نما مارا گیا باقی بھاگ گئے۔ اس کی لاش باہر لا کر معائنہ کیا گیا۔ اس کے دانت بڑے اور نچلا جبڑا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اسے پتھروں میں دبا دیا گیا۔ اس کی صورت انسانوں سے ملتی تھی۔

آلتائی اور گوبی کے علاقوں کے علاوہ وسطی چین سے بھی انسان نما مخلوق کے شواہد ملے ہیں۔ چین میں ۵ لاکھ سال پرانے رکازات میں سے ایک دو پایہ مخلوق جائی کین. ٹوپتھی کس کے آثار ملے تھے۔ خیال ہے کہ یہ نسل نابود نہیں ہوئی۔ بلکہ جنگلوں میں اب تک انکی باقیات مل جاتی ہیں۔

آسٹریلیا میں عہد قدیم کی انسان نما مخلوق ہوموار یکٹس کے رکاز ملے ہیں۔ وہاں کے لوگ یوئی نامی گوریلا انسان کا تذکرہ کرتے ہیں جو اب بھی جنگلوں میں پھرتا ہے۔ شاید یہ انسان کے آباؤ واجداد کی گمشدہ کڑی ہو۔

۱۹۱۷ء میں سوئس ماہر ارضیات Francois De Loys اپنی ٹیم کے افراد کے ہمراہ لاطینی امریکہ کا سفر کر رہا تھا۔ وین زوویلا، کولمبیا کی سرحد پر انہیں انسانی/بندر نما جانوروں کے ایک جوڑے کا سامنا کرنا پڑا یہ پرائمیٹ (انسان اور بندر) کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں جانور انسانوں کو دیکھ کر بڑے جارحانہ انداز میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ان کی جسامت انسانوں جتنی ہی تھی۔ پہلے پہل تو یہ خوفناک آوازیں نکال کر ان لوگوں کو بھگانے کی کوشش کرتے رہے پھر انہوں نے وہی حرکت کی جو گوریلے اور دوسرے بڑے پرائمیٹ قسم کے حیوان کیا کرتے ہیں یعنی اپنے ہاتھوں پر خود ہی پاخانہ کر دیا تاکہ اسے آدمیوں پر اچھال دیں۔ لویز کے آدمی اتنی بڑی مخلوق سے خوفزدہ تھے۔ انہوں نے اپنی دانست میں نر جانور پر گولی چلا دی اور دوسرا جانور بھاگ گیا۔

مرے ہوئے جانور کو دیکھا گیا یہ درحقیقت مادہ تھی اور اس جوڑے کا نر (جسے وہ مادہ سمجھے ہوئے تھے) بھاگ گیا تھا۔ اس لاش کی تصویر اتار لی گئی۔ اس کا قد ۵ فٹ اور پونے دو انچ تھا۔ کیا اس انسانی جسامت کی مخلوق کرہ ارض کے اس حصے میں موجود ہے؟ سائنس دان آج تک اس حیوان کی شناخت نہیں کر سکے۔ نئی دنیا کے معلومہ بندروں میں کوئی بھی اتنا بڑا نہیں ہے۔ یہ کیا چیز تھی؟ اس کی پیشانی اور دانتوں کی ساخت خطہ امریکہ کے بندروں جیسی نہیں تھی بلکہ بحیثیت مجموعی یہ انسان سے زیادہ قریب تھا۔ گویہ مادہ حیوان تھی مگر اس کی چھاتیاں غیر نمایاں اور گوریلوں سے مشابہ تھیں۔ کیا یہ انسان اور بندر کے درمیان کوئی کڑی تھی۔[6]

ایک ماہر فطرت کا بیان تھا کہ یہ جانور قبل از تاریخ عہد کے ابتدائی انسانوں پتھی کین تھروپس ارکیٹس سے مشابہ تھا۔ پتھی کین تھروپس انسان کی نسل زمانوں پہلے نابود متصور ہوتی ہے۔ کیا یہ اس نسل کی باقیات سے تھا؟ جو نہ معلوم زمانوں سے اپنے ہوموسیپیئن قسم کے انسانوں کی دست برد سے محفوظ جنوبی امریکہ کے ان گھنے جنگلات میں شاید موجود چلی آ رہی ہے۔ جہاں ہوموسیپیئن نسل کے انسانوں کے گزر بہت کم ہوتا ہے۔

ارجن ٹینا میں انسان نما مخلوق کو "اکومار" یا "اکو" Ucumar / Ucu کہا جاتا ہے۔ ان کے دیکھے جانے کی اطلاعات زیادہ تر ریاست مالٹا سے آئی ہیں۔ ان کے بدن پر بھی گھنے بال پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں جنوبی علاقوں میں اینڈیز کا دورہ کرنے والی ساؤتھ پیٹاگونن آئس کیپ مہم کے افراد نے برف میں کسی دو پایہ مخلوق کی نقوش پا دیکھے۔ ۶ انچ لمبے اور ۴ سے ۵ انچ تک چوڑے ان قدموں کے نشانوں کی شناخت نہیں کی جا سکی۔

## آدم نما

ڈی لوئز کی ٹیم نے کولمبیا کے قریب اس مخلوق کو ہلاک کیا اس مخلوق کی شناخت نہیں ہو سکی

افریقہ کے خطے میں بھی انسان نما مخلوق کی روایات تواتر سے چلی آتی ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان روایات کا اشارہ دراصل گوریلوں کی طرف ہے۔ لیکن مقامی لوگوں کے بیانات کے مطابق اس مخلوق کا حلیہ اور خصائل گوریلوں سے نہیں ملتے۔ پیرس کی قومی مرکزی سائنسی تحقیق گاہ کی ایک رکن ا ہارٹ نے ۱۹۷۸ء میں نیروبی میں صحافیوں کو بتایا کہ ۱۰ برس کے دوران اس نے افریقہ کی انسان نما مخلوق کے بارے میں ملنے والی اطلاعات جمع کی ہیں ان کے مطابق وہ اس انسان نما مخلوق کو " × " کا نام دے کر اس کی ۵ اقسام بیان کرتی ہے۔ ان میں سے ۵ × کے بارے میں اس نے بتایا کہ یہ آدم نما مخلوق تیر کمان بھی استعمال کرتی ہے۔ صحافیوں کو ایک ایسی ہی کمان دکھائی گئی جو کسی ۵ × سے چھینی گئی تھی۔ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ اس قسم کا ہتھیار انہیں پہلے کبھی دیکھنے اتفاق نہیں ہوا۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ مخلوق افریقی سواحلی اور ماسائی زبانیں نہیں جانتے۔

ایک مقامی باشندے کا بیان تھا کہ اسے کوئی انسان نما مخلوق ( × ) اغواء کر کے لے گئی تھی۔ اس کی آنکھیں، ناک، منہ اور چہرہ بالکل انسانوں جیسا تھا چہرے پر بال نہیں تھے۔ مگر پیشانی بیبون بندر کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ فرانسیسی محقق کا خیال تھا کہ یہ مخلوق جدید اور قدیم انسان کی درمیانی کڑی ہے۔ (7)

آئیوری کوسٹ کے علاقے میں ایک بونا مخلوق سمائٹ کے چرچے ہیں شاید یہ افریقہ کے پگ. می بونا انسانوں کے بھائی بند ہیں لیکن ان کے بدن بھی بالوا سے ڈھکے بتائے گئے ہیں۔

تنزانیہ میں ۴ فٹ لمبے بونے انسان نما مخلوق Agogwe کے تذکرے ہیں۔

وسطی امریکہ کے جنگلوں میں پستہ قد انسان نما مخلوق دیکھنے کی اطلاعات ملی ہیں ان کا قد ساڑھے تین سے ساڑھے چار فٹ تک ہوتا ہے۔ چہرہ زردی مائل اور چپٹا سا ہوتا ہے۔ بدن پر کتوں کی طرح گھنے موٹے بھورے رنگ کے بال ہوتے ہیں۔ گوئٹے مالا اور بیلز میں انہیں Dioendis یا Duende کا نام د گیا ہے ایکوا ڈور والے انہیں Shiru کہتے ہیں سوری نام۔ فرنچ گیانا اور گیانا کے لوگ انہیں Didi کے نام سے پکارتے ہیں۔

نیویارک بوٹانیکل گارڈن کے مجلہ نیوزلیٹر کے ۱۹۸۷ء کے شمارے میں ایک امریکی کا خط شائع ہوا جو گزشتہ سال ۱۹۸۶ء میں گیانا کے ایک جنگل میں فنجا پودے اکٹھا کر رہا تھا کہ اسے خشک پتوں پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو اسے سر سے پیر تک بالوں سے بھرا ہوا ایک انسان نما شخص نظ آیا۔ جس کا قد پانچ فٹ تھا۔ یہ مخلوق امریکی کو دیکھ کر مڑی اور بالکل انسانوں جیسی آواز میں ہاؤ ہاؤ کرتی بھاگ گئی۔

برازیل میں ایمزوناس، ماؤ گروسو اور گویاز کے صوبوں میں اور بولیویا کے سرحدی علاقوں گواپور اور ایکر میں اکثر پالتو جانور اور دوسرے جنگلی چوپائے اس عالم میں ملتے ہیں کہ ان زبانیں گدی سے کھینچ کر باہر کھینچ لی گئی ہوتی ہیں۔ مقامی لوگ اسے ایک انسان نما Mapinguary کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء میں دس افراد پر مشتمل ایک مہم کا ایک برازیلی رکن جنگل میں کھو گیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ ایک بڑے درخت پر چڑھ گیا۔ جنگل سے خوفناک جنگھاڑوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اس شخص نے بندوق تیار کر لی نیچے کچھ فاصلہ پر کسی انسان نما مخلوق کا ہیولہ سا نظر آیا۔ جس کا بدن بالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس شخص نے اس بلا پر گولی چلا دی تو وہ دل ہلا دینے والی آواز میں چیختا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ صبح کو یہ درخت سے اتر کر اس جگہ گیا جہاں اس نے فا کیا تھا۔ وہاں کچھ خون پڑا تھا۔ اور ہوا میں بڑی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

برطانوی فوج سے سبکدوش ہونے والا کرنل ہنری فاسیٹ برازیل کے علاقے میں تلاش و جستجو کا کام کر رہا تھا۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں برازیل میں بولیویا کی سرحد کے قریب اسے کچھ وحشیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی جلد پر گھنے بال تھے مگر یہ انسانوں سے مشابہ تھے۔ انہوں نے کاندھوں پر تیر و کمان لٹ رکھے تھے۔ فاسیٹ اور اس کے ساتھیوں کو دیکھ کر ایک نے یوپو کر کے چلانا شروع کر دیا تو ذرا سی دیر میں سارا جنگل ان کی آوازوں سے بھر گیا یہ اچھل اچھل کر آگے آتے گئے اور فاسیٹ کی ٹیم پر تیر برسانے شروع کر دیئے ان لوگوں نے زمین اور درختوں پر فائر کئے کہ یہ مخلوق ڈر جائے مگر وہ باز نہ آئے تو فاسیٹ اور اس کی ٹیم کو مجبوراً واپس ہونا پڑا اور قریبی گاؤں میں جا کر دم لیا۔ دیہاتی لوگوں نے بتایا کہ وہ اس وحشی مخلوق کو ماری کوکسس Maricoxis کہتے ہیں۔ (8)

# بگ فٹ (BIG-FOOT)

خطہ امریکہ کے شمالی علاقوں میں عرصہ دراز سے لوگوں کے درمیان ایک روایت چلی آ رہی ہے کہ ان علاقوں میں دو پیروں پر چلنے والی ایک مخلوق کا بسیرا ہے جو انسانوں سے خوف کھاتی ہے۔ اس کا سارا بدن موٹے اور بھرے بھرے سفید، سیاہ، بھورے یا نارنجی بالوں والی جلد سے ڈھکا ہوا ہے اور اس کا قد عام انسانوں سے زیادہ بڑا (۷ سے ۹ فٹ) ہوتا ہے۔ اس کا وزن ۲۵۰ کلو گرام کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ شکل میں انسانوں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا سر نوکیلا ہے اور اس کے لمبے لمبے بازو ہوتے ہیں گردن چھوٹی ہے اور کاندھے مضبوط بتائے گئے ہیں۔ اس کی چال گوریلے کی بجائے انسانوں جیسی ہے۔ اس کے نقوش پا غیر معمولی حد تک بڑے (۴۰ سم لمبے اور ۱۵ سم تک چوڑے) دیکھے گئے ہیں اس لئے اس کا نام بگ فٹ یا دراز پا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ کی تقریباً تمام ریاستوں میں دراز پا دیکھنے کی لاتعداد اطلاعات اخبارات کی سرخیاں بنتی رہی ہیں۔ زیادہ تر اطلاعات جنوبی ریاستوں سے آئی ہیں کینیڈا میں انہیں Sasquatch سس قواچ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ نام کینیڈا کے مقامی انڈین لوگوں نے دیا تھا۔ امریکی انڈین اسے "اوماہ" کہا کرتے تھے۔ بعض جگہ کے لوگ اسے ریت کا آدمی کہہ کر اب تک تعظیم دیتے ہیں بعض جگہ اسے سکنک آدمی کہا جاتا ہے کیونکہ سکنک نامی حیوان کی طرح اس کے بدن سے بھی انتہائی ناگوار بدبو اٹھتی رہتی ہے۔

سائنس دان امریکہ میں انسان کے علاوہ کسی بھی بھاری بھر کم سیدھے چلنے والے پرائمیٹ (انسانوں اور بندروں کے خاندان) قسم کے حیوان کے وجود سے انکار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ لوگ سفر کے دوران نرم زمین پر قدموں کے بڑے بڑے نشانات دیکھتے ہیں۔ موقع ملے تو پلاسٹر آف پیرس کا کیچڑ ان نقوش میں ڈال کر ایک ٹھوس نقش حاصل کر لیتے ہیں کچھ افراد نے جنگلوں میں ان جانوروں کی تصاویر بھی کھینچی ہیں۔ بیشتر سائنس دان ان سب کو جعل سازی قرار دیتے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی مردہ دراز پا، اس کی کھال، دانت یا ہڈی تک نہیں لاکر دی۔ بس کچھ لوگ بال لے کر آئے ہیں مگر کیا کیا جائے کہ پہلے سے کوئی مصدقہ بالوں کا نمونہ موجود نہیں جس سے موازنہ کر کے ان کی اصلیت پر حکم لگایا جا سکے۔

اس جانور کی تصاویر تو بہت لوگوں نے اتاریں جنہیں رد کر دیا گیا مگر ایک فلم خاصی تہلکہ خیز ثابت ہوئی جسے پیٹرسن نامی شخص نے اتارا تھا۔

۱۹۶۷ء کا ذکر ہے۔ اکتوبر کی ۲۰ر تاریخ تھی۔ شمالی کیلی فورنیا میں بلف کریک کے مقام پر ایک نوجوان راجر پیٹرسن اپنے ایک دوست باب جملن کے ہمراہ گھڑ سواری کر رہا تھا۔ خزاں کا موسم تھا اور جگہ جگہ رنگ برنگے پتے بکھرے پڑے تھے اچانک پیٹرسن کا گھوڑا خوفزدہ ہو کر اچھل گیا اور پیٹرسن کو پٹخ دیا۔ پیٹرسن کی نگاہ اٹھی کچھ فاصلے پر کوئی دو پایہ مخلوق کھڑی تھی۔ اس کا پورا بدن بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ پیٹرسن کی عقل نے کام کیا اور اس نے اپنا کیمرہ آن کر کے اس مخلوق کی طرف کر دیا اس مخلوق نے ان لوگوں کو دیکھا اور مڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی جنگل میں چلی گئی۔ دراز پا کے بارے میں ایک انتہائی اہم ثبوت مل گیا تھا؟

پیٹرسن کی فلم لاتعداد بار دیکھی گئی۔ ماہرین حیوانیات کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کہ یہ ایک حقیقی حیوان ہے یا کسی آدمی نے کھال پہن رکھی ہے۔ فلم میں نظر آنے والے دراز پا کے سینے کے غیر معمولی واضح ابھاروں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی عورت ہے۔ مگر اس کے چال ڈھال کے بارے میں ماہرین کی رائے ہے کہ یہ کوئی آدمی ہے جس نے سینے کے مصنوعی ابھاروں سے عورت کا تاثر دینے کی کوشش کی ہے مادہ گوریلوں کی چھاتیاں اتنی ابھری نہیں ہوتیں۔ یہ گویا بن مانس کے مقابلے میں انسان سے زیادہ قریب حیوان تھا۔ مزید یہ کہ اس جانور/انسان کے سرین گوریلے کے بجائے انسانوں سے مشابہ ہیں۔ اور باہر کو ابھرے ہوئے ہیں۔ اس کے پیروں کی جسامت اور چال بھی غیر معمولی ہیں۔ اور دو پایہ مخلوق کے بارے میں اس عام تصور کے خلاف ہیں کہ ان کی پیروں کی جسامت اور قدموں کے درمیان فاصلے میں ایک خاصی نسبت ہوتی ہے۔ ہاتھ ہلانے کا انداز بھی غیر معمولی ہے۔ یہ کسی طرح انسانوں کا انداز نہیں ہو سکتا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اس انداز میں بازو ہلا کر چلنا چاہے تو پہلے اس کے بازو توڑ کر کچھ فاصلہ رکھ کر انہیں کس کر باندھنا پڑے گا۔ جانور کے جسم کا بالائی حصہ زیریں نصف حصے سے زیادہ چوڑا اور بھاری بھر کم ہے بعض ماہرین کے خیال میں ایسے جانور کو دو کے بجائے چاروں ہاتھوں پیروں پر چلنا چاہئے تھا۔ مگر فلم میں وہ دو پیروں پر چلتا چلا گیا ہے۔

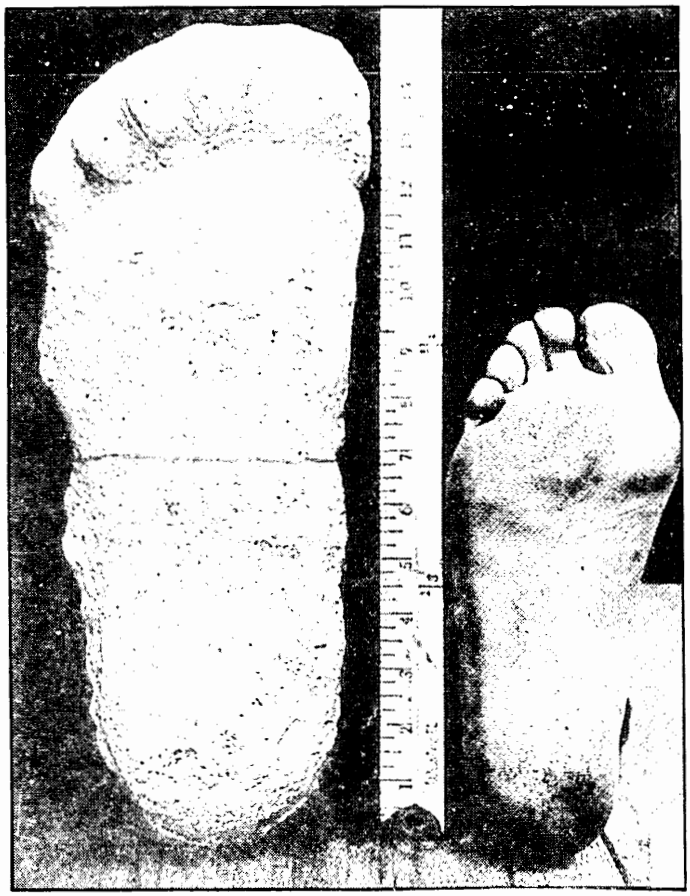

ایک بالغ انسانی مرد کے پیر کا ایک بگ فٹ کے نقش قدم کے کاسٹ سے موازنہ

کیا یہ فلم ایک دھوکہ ہے؟ پیٹرسن سے پوچھ گچھ کرنے والوں کو یقین ہے کہ یہ جوان جھوٹ نہیں بولتا اس نے جیسا دیکھا اسے فلم پر اتار لیا۔ مگر بعض افراد کو شک ہے کہ یہ سارا تماشا اس کے دوست باب جمیلن کا تیار کردہ تھا جو پیٹرسن کو جنگل میں بہانے سے اس طرف لے آیا جہاں اس نے پہلے سے کسی راز دار کو بالوں والا لباس پہنا کے کھڑا کر رکھا تھا۔ باب گملن اس بات کی تردید بڑی سختی سے کرتا ہے۔ پیٹرسن کو مرے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ گملن نے فلم کے ذریعے کوئی مادی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ وہ اس واقعے کی تفصیل یوں بیان کرتا ہے کہ ان دنوں علاقے میں نقوش پا دیکھنے کی اطلاعات عام تھیں اور وہ دونوں ایک کیمرے اور بندوق کے ساتھ نکلے تھے کہ دراز پا کو ڈھونڈ کر اس کی تصویر اتاری جائے۔ وقوعہ پر پہنچتے پہنچتے وہ لوگ علاقے کے مناظر کی فلم بنا رہے تھے۔ جب انہیں موقع ملا کہ گملن نے دراز پا کو بندوق کی زد میں رکھتے ہوئے پیٹرسن کو فلم بنانے کا موقع دیا مگر ان کی بدقسمتی تھی کہ فلم کافی دیر سے استعمال ہونے کی وجہ سے بہت کم رہ گئی تھی۔ اور جلد ہی ختم ہو گئی۔ اتنی دیر میں کہ پیٹرسن دوسری فلم ڈالتا دراز پا بھاگ چکی تھی۔ پھر بھی ۲۰ فٹ لمبی فلم اتار لی گئی تھی۔

حق یہ ہے کہ تاحال کوئی ایک ٹھوس ثبوت بھی موجود نہیں جس سے اس فلم میں دکھائے جانے والے جانور کو کوئی بہروپیہ آدمی قرار دیا جائے کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ انسان اور گوریلے کے حوالے سے اس مخلوق پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ ان سب سے جدا ایک علیحدہ ہی مخلوق ہو جو پرائمیٹ (انسان، بندر، گوریلے) کے خاندان سے تعلق رکھتی ہو اور جسے آج تک سائنسی طور پر دریافت نہ کیا جا سکا ہو۔

واشنگٹن اسٹیٹ یونیورسٹی کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر گروور۔ ایس کرانتز Dr. Grovers.Krantz نے شعبہ علم الانسان میں ڈاکٹریٹ کر رکھی ہے۔ ڈاکٹر گروور دراز پا کے معاملے میں خاصی دلچسپی لے رہا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس نے واشنگٹن کی نیلی پہاڑیوں میں دیکھے جانے والے دراز پا کے نقوش کے

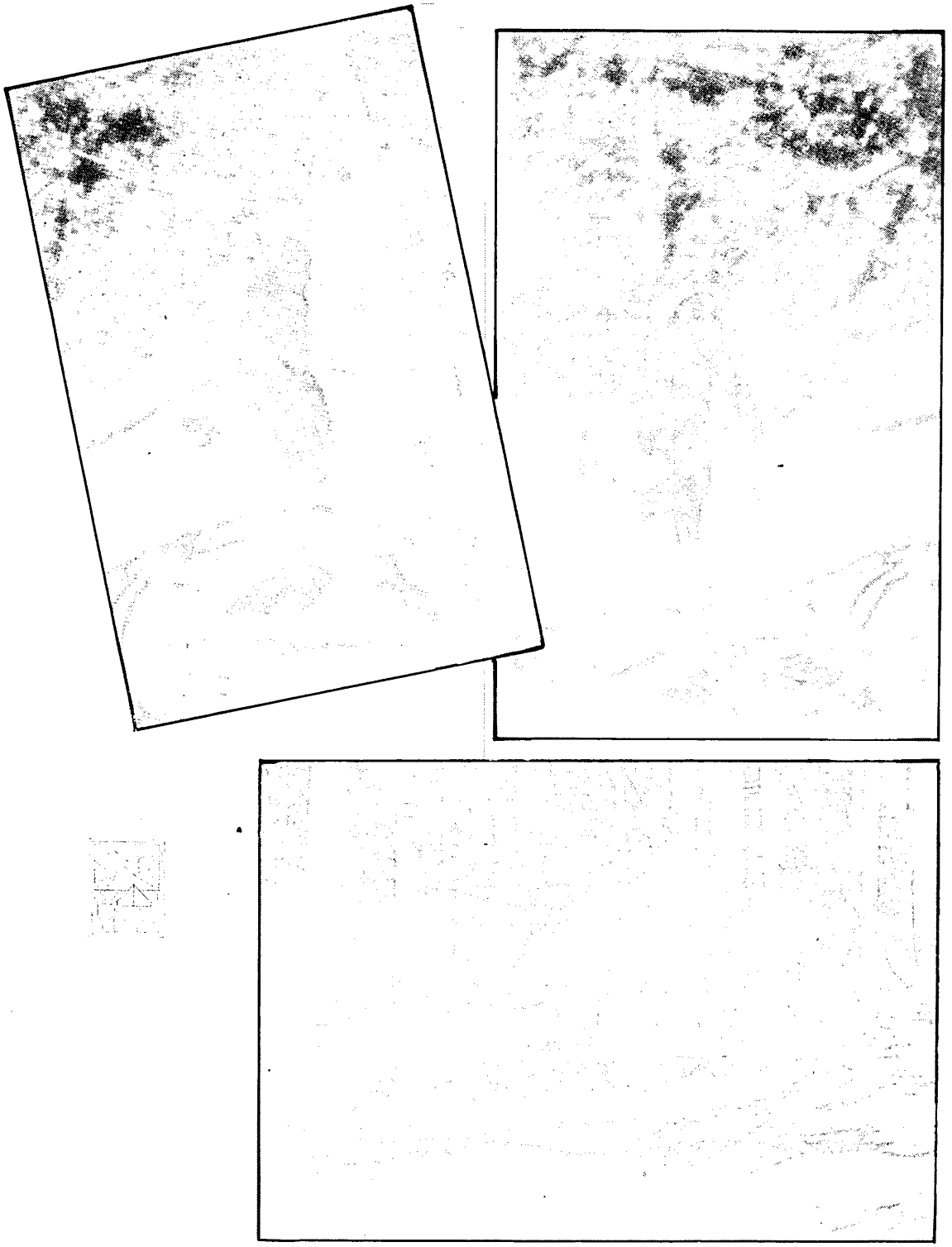

بگ فٹ : ۱۹۶۷ء میں بنائی گئی راجر پیئرسن کی متنازعہ فلم سے چند مناظر

پلاسٹر سے نکالے ہوئے نمونہ دیکھ کر کہا تھا کہ ان پر موجود مہین لکیریں کوئی جعل ساز نہیں بنا سکتا۔ فنگر پرنٹ کے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔[9]

دراز پا کیا کھاتے ہیں۔ لوگوں کا بیان ہے انہوں نے ان جانوروں/انسانی نما مخلوق کو چھوٹے موٹے پرندے، ہرن، پانی کے پودے، انڈے، ٹماٹر او کیڑے مکوڑے کھاتے دیکھا ہے۔ یہ مخلوق دیہاتوں میں لوگوں کے گھروں کے باہر اور جنگلوں میں خیموں کے باہر بڑے کچرہ دانوں کو بھی الٹ پلٹ کر کھانے کی چیزیں نکال لیتی ہے۔ یہ انسانوں سے ڈرتی ہے۔ ان پر حملہ نہیں کرتی۔ اس کی آواز سیٹیوں جیسی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے۔ کہ انہیں دراز پانے اغواء کرنے کے بعد چھوڑ دیا۔ کچھ لوگوں کا بیان ہے کہ انہوں نے اس مخلوق کو پورا کنبہ دیکھا ہے۔ کیا یہ انسان کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ اگر کوئی ایک دراز پا مار کر لایا جائے تو بات بنے۔ مگر کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟

اتنے قیمتی حیوان کا قتل، سائنس دانوں کی تسکین کے لئے کیوں ضروری ہے؟ چنانچہ انہیں انسان کا بھائی بند سمجھنے والے افراد نے واشنگٹن اسٹیٹ کی سکامانیا کاونٹی میں باقاعدہ یہ قانون بنا دیا ہے کہ اگر کسی نے دراز پا ہلاک کیا تو اسے دس ہزار ڈالر کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ کیونکہ آدمی کا کیا ہے اسے موقع ملے تو اس مخلوق کا وجود بھی سرے سے مٹا ہی ڈالے۔ جیسا کہ یورپیوں نے تسمانیہ کے مقامی باشندوں کی نسل کشی کر کے کیا۔

# برفانی انسان

کرۂ ارض کے بلند ترین پہاڑ ہمالیہ کے قرب وجوار میں واقع مقامات کے لوگوں کے ہاں صدیوں سے ایک حیوان کا ذکر چلا آتا ہے۔ یہ ۶ فٹ سے زیادہ لمبا حیوان ہوتا ہے۔ جس کے کندھوں پر لمبے لمبے گھنے بال ہوتے ہیں۔ سینے پر ان کا رنگ سفیدی مائل اور باقی جسم پر خاکی ہوتا ہے۔ یہ بھاری بھرکم، خوفناک مخلوق انسان کی طرح دو پیروں پر چلتی ہے اس کی خوراک برف کے نیچے موجود کائی چھوٹے موٹے پرندے اور علاقے کا مشہور بیل "یاک" ہے جسے یہ درندگی سے پھاڑ کھاتا ہے۔ اس کے بازو لمبے لمبے سے ہوتے ہیں اور کلائیاں گھٹنوں تک پہنچتی ہیں۔ اس کی موٹی اور مضبوط ٹانگیں کمان کی طرح سے ہلکی سی ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ چہرہ انسان سے مشابہ ہوتا ہے، چہرے پر بال نہیں ہوتے جبڑے مضبوط اور دانت بڑے ہوتے ہیں۔ اس کی دم نہیں ہوتی۔ ان کے قدموں کے نشانات برف اور مٹی میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جو عام انسانی قدم سے زیادہ بڑے ہوتے ہیں۔

مغرب کو اس کا پتہ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں لگا جب برطانوی فوج کا ایک کرنل ہاورڈ بوری ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے آیا۔ کرنل اور اس کے ساتھیوں نے ایک جگہ خیمہ لگایا تو انہیں دور اوپر سائے سے چلتے پھرتے دکھائی دیئے اگلے روز وہ لوگ ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اس مقام تک پہنچے تو انہیں برف میں قدموں کے جناتی نشان نظر آئے۔ اس کے ہمراہ مقامی لوگوں نے فوراً ہی نشانات کو پہچان لیا۔ ان کے بقول یہ میٹوہ کنگمی یا بالوں والے جانور کے نقوش پا ہیں۔ جن سے ان کے آباء واجداد بڑے خوفزدہ رہتے تھے۔ واپسی کے سفر پر کرنل نے اس کی اطلاع اخبارات کو دی اور رائے دی کہ یہ جانور کراہت انگیز برفانی آدمی ہے۔ اور اس کا یہ نام اس نے میٹوہ کنگمی کا ترجمہ کر کے لیا تھا۔ مگر مغرب میں مکروہ برفانی آدمی Abominable Sonw Man کے بجائے نیپالی مقامی بولی کی اصطلاح یٹی زیادہ مقبول ہو گئی۔

نیپالیوں کا بیان ہے کہ مادہ یٹی کے پستان اتنے بڑے اور لمبوترے ہوتے ہیں کہ وہ بھاگتے وقت آسانی کے لئے کاندھوں پر ڈال لیتی ہے۔ یٹی سے منسوب یہ واضح پستانوں کی خصوصیات معلوم پرائمیٹ نسل کے جانداروں میں صرف انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے یٹی ریچھوں، گوریلوں وغیرہ کے مقابلے میں انسانوں سے زیادہ قریب ہے۔ اور برفانی انسان کہلانے کی حقدار ہے۔

مقامی لوگوں کا کہنا ہے کہ برفانی انسانوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً چھوٹے قد والے مہ تیہہ (یتی) درمیانے اور بڑے مہ تیہہ اور دیو قامت ذو تیہہ۔

مؤخر الذکر گو انسان سے بڑی جسامت کے ہوتے ہیں مگر آدمی سے ڈرتے ہیں۔ مہ تیہہ البتہ قد میں انسان جتنا ہوتا ہے اور انسان پر حملہ بھی کر دیتا

ایرک شپٹن (دائیں) برف میں یہ نقوش پا (اوپر) دیکھے

ہے۔ بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آدمی ڈھلوان کی طرف بھاگے، تب اس کے لمبے بال آنکھوں کے آگے آجائیں گے اور یہ فوری طور پر جارحیت نہیں کر سکے گا۔

تبت میں بدھ مت کے ماننے والوں کے نزدیک یتی ایک مقدس مخلوق ہے۔ مشہور ہے کہ یہ لوگ اس جانور کی ہڈیاں پوجتے ہیں۔ اور اس کی کھال اور بال ان کے پاس بطور تبرک موجود ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ کھالیں دراصل مقامی چوپائے (بکری وغیرہ) کی ہیں۔ جنہیں بدھ لاما سر پر پہن کر تہواروں میں ناچ کر کے بزعم خویش یتی کا کردار ادا کرتے ہیں بدھ لاما اس کے تقدس کا حوالہ یوں دیتے ہیں کہ یہ مخلوق کبھی بدکار اور بدفطرت آدمی کو نظر نہیں آتی صرف شریف النفس اور نیک لوگ ہی انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ نشہ کرنے والوں سے بھی یہ مخلوق بھاگ جاتی ہے۔

ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا والوں نے یتی کی تلاش میں چند مہمات کا خرچہ برداشت کیا ایک مہم میں کوہ پیما ہیلری اور اس کے ہمراہ حیوانات، طب و جراحت جیسے شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد بھی تھے ان لوگوں نے یتی کے کئی نقوش پا دیکھے۔ ایک روز انہیں معلوم ہوا کہ وادی رول رونگ میں دو بدھ میاں بیوی رہتے ہیں جن کے پاس ایک ایسے یتی کی کھال ہے جسے تبت میں کبھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی کو یہ کھال دیکھنے کو بھی نہیں دیتے مگر ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح وہ کھال حاصل کر لی۔ ماہرین حیوانیات نے دیکھا کہ اس کے بال نیلگوں اور ملائم تھے۔ کندھوں پر یہ زیادہ لمبے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ یہ انسان کی نہیں بلکہ کسی حیوان کی۔ شاید کسی نایاب قسم کے برفانی بھیڑیئے کی کھال تھی مگر ٹیم کے ہمراہ مقامی افراد نے پہچان لیا تھا کہ یہ دیو قامت ذوتنہیہ قسم کے یتی کی کھال ہے۔ اس جیسی کھال والے کسی جانور کی خبر سائنس کو نہیں۔ کھال ملنے کا یہ واقعہ ٹیم کے ایک امریکی کوہ پیما رکن لیفٹننٹ ملگریو نے اپنی کتاب "انسان کے لئے کوئی جگہ نہیں" میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔[10] جب کہ مہم کے منتظمین، ورلڈ بک انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ۱۹۶۰ء کی مہم کے سائنس دانوں کا خیال تھا کہ برف میں بننے والے نقوش پا سورج کی حدت سے عام جانوروں کے نقوش پا پھیلنے سے بن جاتے ہیں۔[11]

Anthony Wooldridge ایک فوٹو گرافر ہے۔ جسے برطانوی رسالے وائلڈ لائف کے لئے تصاویر کھینچنے کے لئے ہمالیہ کے علاقے میں بھیجا گیا۔ ایک موقع پر اس نے برف میں دور ایک حیوان دیکھا جو چھ فٹ طویل تھا۔ اس کا بڑا سا سر تھا اور اس کا پورا بدن گہرے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وولڈرج نے اس مخلوق کی کئی تصاویر لیں۔ ان تصاویر کے بغور تجزیئے کے لئے دو ماہرین سے رابطہ کیا گیا۔ یونیورسٹی کالج لندن کے ماہر رابرٹ مارٹن نے کہا کہ یہ کوئی بڑا پرائیمیٹ قسم کا حیوان ہے جس کے بارے میں ماہرین حیوانیات کو معلوم نہیں ہے۔ ادھر ماہر عضلات جان نیپیئر نے وائلڈ لائف کے ایڈیٹر کو بتایا کہ یہ مخلوق بلاشبہ انسان نما ہے۔[12]

۱۹۵۴ء میں لندن کے اخبار ڈیلی میل کے زیر اہتمام نیپال سے یتی کی تلاش میں ایک اور مہم شروع ہوئی جس میں بہت بڑی تعداد کے لوگوں نے حصہ لیا۔ ان میں جنگلی حیات کا امریکی ماہر جیرالڈ رسل اور لندن چڑیا گھر کا سابق افسر اعلیٰ چارلس سٹوفر بھی شامل تھے۔ ان لوگوں نے برفانی انسان کے نقوش پا کئی روز تک اس قدر تعداد میں دیکھے کہ یہ ان کے لئے کوئی پرکشش چیز باقی نہ رہے انہیں خوب تر کی تلاش تھی۔ کچھ لوگ گوبر لے آئے۔ بتایا گیا کہ یہ یتی کا گوبر ہے۔ اس کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں مقامی چوہوں کی ہڈیاں، مونچھیں، کھال، چکور کا پر کیڑے مکوڑوں کے اجزاء اور گھاس موجود تھی۔ گویا امریکہ کے

دراز پا کی طرح ہمالیائی برفانی انسان بھی ہمہ خور تھا۔ مقامی لوگوں کا بیان بھی یہ تھا کہ یٹی گھاس پھوس، چوہے، پرندے، کیڑے مکوڑے اور چکنی مٹی کھاتا ہے۔ بڑے یتی یاک اور ہرنوں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں۔ اور اگر خوراک کی قلت ہو تو آبادی کا رخ کرتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق سخت بھوک کے عالم میں مادہ یٹی اپنے بچے کو بھی کھا جاتی ہے۔

# زندہ ڈائنوسار اور غیر شناختہ حیوانات

ہم تاریخ عالم میں حیوانات کی معدومی کے دوسرے بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ پہلا دور جو قبل از تاریخ عہد کے ڈائنوسار حیوانات کے خاتمے پر منتج ہوا اور یہ دوسرا دور جس میں ماحولیاتی تباہی حیوانات کی نسلوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہے۔

آئے روز جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ فلاں حیوان کی نسل کا آخری باشندہ بھی راہی عدم ہوا تو فطرت سے پیار کرنے والے دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیا ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو صرف ان جانوروں کی محفوظ شدہ لاشیں اور تصویریں ہی دیکھنے کو ملیں گی؟ لیکن شاید ماہرین سے معدومی کے اعلان میں ذرا غفلت ہو جاتی ہے۔ کتنے ہی حیوانات ہیں جنہیں معدوم قرار دے دیا گیا مگر پھر کافی عرصہ بعد وہ دوبارہ دریافت ہوئے۔ جیسے ۱۹۵۶ء میں اعلان ہوا کہ کیوبا کا مشہور کٹھ بڑھئی پرندہ IVORY-BILLED WOODPECKER ختم ہو گیا ہے لیکن ۱۹۸۶ء میں اس نسل کے پرندہ کو دوبارہ دریافت کر لیا گیا۔ اس سال مڈغاسکر میں اڑوسا کھانے والا لیمر پھر سے دریافت ہوا حالانکہ اسے بہت عرصے سے نہیں دیکھا گیا تھا اور معدوم فرض کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح برطانوی سور جس کے بارے میں خیال تھا کہ سترہویں صدی میں ختم کر دیا گیا تھا، اب باقاعدہ شکار کر کے لایا گیا ہے۔ یہ تمام دریافتیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ کسی حیوان پر معدومی کا لیبل لگانا اتنا آسان نہیں ہے دوسرے یہ کہ ہم بعض مبینہ معدوم جانوروں کے بارے میں پرامید ہو سکتے ہیں۔ نئے حیوانات کی سائنسی دریافت ایک خاصا مشکل کام ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ سائنس دان یہ ماننے کو تیار ہی نہ ہوں کہ کرہ ارض پر کوئی بھی ایسی نسل موجود ہے جس کے بارے میں انہوں نے سائنسی جماعت بندی نہ کی ہو اور جو ان کی معلومات میں نہیں ہے۔ چنانچہ کسی خطے یا علاقے کے لوگ جب کسی غیر معمولی جانور کے دیکھنے کا تذکرہ تواتر سے کرتے ہیں تو اسے ان لوگوں کی عجوبہ پسندی پر محمول کر کے توہمات یا خرافات قرار دیا جاتا ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ مہذب دنیا کے خاصے معقول افراد کے بیانات اور عینی مشاہدوں کو بھی اس وقت تک اہمیت نہیں دی جاتی جب تک وہ مذکورہ حیوان کو خود ہی لا کر سائنس دانوں کے حوالے نہ کریں۔ اس ضمن میں سر ہیری جانسٹن اور ہانس شومبرک کی مثالیں زیادہ دلچسپ ہیں۔

سر ہیری جانسٹن کو کانگو (افریقہ) کے بگمی نسل کے لوگوں نے ایک چوپائے کی بابت بتایا۔ ۱۹۰۰ء میں ہیری نے پہلی بار اس جانور کو دیکھا یہ اوکاپی تھا۔ زرافے کی نسل کا ایک نرالا جانور جس کی جسامت نٹو جتنی تھی اور اس کی رانوں پر زیبرے کی مانند دھاریاں تھیں۔ ۱۹۰۱ء میں ہیری نے اس کی ایک عدد کھال اور دو کھوپڑیاں لندن بھجوا دیں اور اس حیوان کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچائیں۔ ۱۹۱۹ء میں اہل مغرب کو پہلی مرتبہ اوکاپی دیکھنا نصیب ہوا جب اوکاپی یورپی چڑیا گھروں میں رکھوائے گئے۔

۱۸۱۲ء کے لگ بھگ ماہرین حیوانات کا عام تاثر یہ تھا کہ دنیا کے تمام حیوانات کی شناخت کر لی گئی ہے اور اب شاید آئندہ کوئی نئی نسل کا جانور مشکل سے ہی ملے جس کے بارے میں سائنس کچھ نہ جانتی ہو۔ لیکن ۱۸۱۹ء میں سائنس دانوں کا یہ غرور اس وقت ٹوٹ گیا جب ٹرائیکل امریکن ٹاپیر دریافت ہوا۔ پھر تو جیسے یہ سلسلہ سا چل نکلا اکثر کوئی نہ کوئی نیا جانور ملنے کی خبر ملتی رہی۔

۱۹۰۹ء میں ایک جرمن ماہر HANS SCHEURBURK لائبیریا کے علاقے میں روایتی بھاری بھر کم سیاہ سور کی تلاش میں نکلا اسے بڑی جدوجہد کے بعد یہ جانور دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کا قد اچھا خاصا بڑا تھا، جلد سیاہ تھی مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اس جانور کا تعلق سور کے خاندان سے نہیں بلکہ دریائی گھوڑے کی نسل سے ہے۔ شوبرک اس کو پکڑ نہ سکا اور واپس چلا آیا۔ مگر لوگوں نے اس کا ناطقہ بند کر دیا اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ ٹھوس ثبوت فراہم کرے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں شوبرک دوبارہ افریقہ گیا اور اس مرتبہ چار، چار سو پونڈ وزن کے پانچ عدد پستہ قد دریائی گھوڑے پکڑ لایا تب معترضین کو یقین آ گیا۔[13]

زندہ ڈائنو سور کی تلاش میں ڈاکٹر رائے میکال اور ساتھیوں کی مہم

انڈونیشیا سے یہ خبر عام طور پر ملتی تھی کہ یہاں بارہ، بارہ فٹ لمبی ایسی چھپکلیاں پائی جاتی ہیں جن کا وزن ۳۵۰ پاؤنڈ تک ہوتا ہے اور یہ بلا ہرن، ریچھ اور سور تک کا شکار کر لیتی ہے۔ کسی کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ کسی ایسی مخلوق کا وجود حقیقی ہو سکتا ہے۔ پھر لوگوں کو اس جانور کی تصاویر دکھائی گئیں۔ کھال دکھائی گئی اور آخر کار دنیا کو اس وقت یقین آیا جب ایک عدد زندہ چھپکلی لائی گئی اور اب ہم اس جانور کو موڈو کا ڈریگن کہتے ہیں۔

آسٹریلیا کا پلے ٹی پس، چین کا پانڈا، جنوبی ایتھوپیا کا MOUNTAIN NYALA اینڈیز کے علاقے کا بھیڑیا اور جنوب مشرقی ایشیا کا KOUPREY ایسے ہی حیوانات ہیں جنہیں افسانوی سمجھا جاتا رہا۔

۱۹۳۶ء میں افریقی مور، ۱۹۶۰ء میں میکسیکو کی کیلے کی چمگادڑ، ۱۹۳۰ء میں کمبوڈیا کا بیل نما جانور KOUPREY اور ۱۹۸۶ء میں میکسیکو سے دریافت ہونے والے بلی کی نسل کے جانور ONZA اس بات کے ثبوت ہیں کہ انسان ابھی اس کرہ ارض کی بہت سی مخلوقات سے ناواقف ہے۔

۱۹۸۴ء میں کیلیفورنیا میں دوسری مرتبہ میگاماؤتھ شارک جیسے مہیب حیوان کی دستیابی ہمارے لئے چیلنج ہے کہ پانیوں میں بڑے بڑے جانور اپنی دریافت اور سائنٹفک شناخت کے منتظر ہیں۔ CRYPTOZOOLOGY یعنی مخفی حیوانات کے بانیوں میں سے ایک ڈاکٹر برنارڈ ہوولمن Dr. Bournord Heuvelmans ہے۔ (مخفی حیوانیات کا علم ان حیوانات سے بحث کرتا ہے جو ابھی تک سائنسی بنیادوں پر شناخت نہیں کیے گئے۔) مذکورہ ڈاکٹر نے ایک فہرست میں ۱۰۰ سے زائد ایسے حیوانات کا تذکرہ کیا ہے جو اب تک حیوانیات کے ماہرین کے نزدیک روایتی اور افسانوی ہیں اور حقیقی وجود نہیں رکھتے۔ اس ماہر نے ان حیوانات سے متعلق ۲۵ ہزار حوالے دیئے۔

اوہائیو سٹیٹ یونیورسٹی کے ماہر بشریات Frank Poirier کا کہنا ہے کہ بلاشبہ ایسے حیوانات کا وجود خارج از امکان نہیں جنہیں سائنس دانوں نے اب تک نہیں جانا۔

۱۹۷۷ء میں J.I.Menzies نامی ماہر حیوانات نے نیوگنی کے ایک غار سے بل مرز فروٹ بیٹ BULMERS FRUIT BAT نامی چمگادڑ دریافت کی جو اس سے پہلے دس ہزار سال پرانے رکازات میں ملتی تھی۔

پکاری PICCARY سور کی نسل کا ایک جانور تھا جس کا سراغ قدیم برفانی عہد کے بعد نہیں ملا، لیکن ۱۹۷۲ء میں پیراگوئے میں یہ جانور زندہ حالت میں دستیاب ہوا۔

آسٹریلیا میں ۲۰ ہزار برس قدیم رکازات سے ایک حیوان کا سراغ ملا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ ۱۹۶۶ء میں یہ حیوان PYGMY POSSUM زندہ

حالت میں ملبورن سے ۱۳۰ میل دور ایک گھر کے باورچی خانے میں ملے گا۔

۱۹۸۶ء میں سمندر سے ایک ایسا جانور دستیاب ہوا جس کے رکاز ۷۰ لاکھ سال پہلے کی تہوں میں ملتے تھے۔ اس زندہ جانور کی پشت پر سیاہ نقطوں کی دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔

یہ وہ حیوانات تھے جن کی سائنسی طور پر شناخت کی جاچکی تھی اور وہ معدوم تصور کیے گئے تھے لیکن ڈائنوسار حیوانات جن کے بارے میں مروجہ نظریہ یہی ہے کہ ان کی نسلیں مکمل طور پر نابود ہو چکی ہیں کے بارے میں بعض ناقابل تردید شواہد ملے ہیں کہ ان کی نسلوں کی باقیات یا تسلسل میں آج تک کچھ حیوان موجود ہیں۔ دریافتوں کے تسلسل سے بات سامنے آئی ہے کہ یا تو ڈائنوسار کی معدومی کا عمل مکمل نہیں ہوا یا پھر دریافت کیے گئے حیوانات جدید عہد کی ہی ایسی مخلوق ہیں جن کی شناخت سائنٹفک طور پر نہیں کی گئی۔

نامعلوم حیوانات کی دریافت کا سب سے چونکا دینے والا واقعہ ۱۹۷۷ء میں پیش آیا۔ وہ جاپانی مچھیروں کی ایک کشتی تھی جس میں ایک جدید قسم کا جال نصب تھا۔ وہ لوگ بحراوقیانوس میں نیوزی لینڈ کے قریب مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ اچانک ان کے جال میں کوئی بہت بڑی چیز آپھنسی وہ آزاد ہونے کی بڑی کوشش کرتی رہی اور آخر کار مر گئی۔ اسے باہر نکالا گیا اس کی لمبائی ۳۵ فٹ تھی۔ جاپانی سمجھ رہے تھے یہ سمندری اژدہا ہے لیکن ماہرین نے بعدازاں اس کی تصاویر دیکھ کر کہا کہ یہ قدیم ڈیوارسک عہد کی ڈائنوسور بلا پلاسیو سارس ہے۔[14] مگر پلاسیو سارس کو معدوم ہوئے تو ایک زمانہ بیت گیا۔ پھر یہ کیا تھا؟ اس حیوان کا جسم گلنے سڑنے لگا تو جاپانیوں نے اس کی تصاویر کھینچیں اور نقشے بنائے۔ ایک شخص نے جانور کو سمندر میں پھینکنے سے قبل اس کا ایک بال حاصل کر لیا۔ سائنس دان آج تک شناخت نہیں کر پائے کہ یہ کس جانور کا بال ہے۔

گیمبیا میں بنگلو بیچ پر ۱۹۸۳ء میں کسی حیوان کی لاش دیکھی گئی مگر افسوس کہ اس کی کوئی تصویر کھینچی نہ جا سکی تاہم اس کی جسامت اور شکل و صورت کا اندازہ ضرور لگایا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قبل از تاریخ کا کوئی ڈائنوسور نسل کا حیوان تھا۔

وسطی افریقہ میں غیر شناختہ بڑے بڑے جانوروں کا تذکرہ دو سو سال سے ہوتا آرہا ہے۔ ان میں سے ایک موکیل ایم بمب ہے۔

عوامی جمہوریہ کانگو سے اس عجیب و غریب مخلوق کی اطلاعات مسلسل آرہی ہیں۔ جھیل ٹیل اور لیکوالا کے دلدلی علاقے میں دیکھے جانے والے اس جانور کو مقامی لوگ MOKELEMBEMBE کہتے ہیں۔ ۱۹۱۳ء میں کیپٹن لاس نزنے اس علاقے میں موکیل بیمبے کی تلاش کا کام کیا تھا اس نے کہا تھا کہ یہ حیوان بھورا یا خاکی رنگ کا بتایا جاتا ہے۔ اس کی جسامت ہاتھی جتنی یا کم از کم دریائی گھوڑے جتنی ضرور ہوگی۔ جلد ہموار ہے اور ایک لمبی لچک دار گردن ہے۔ اس کا صرف ایک ہی دانت ہے۔ کچھ لوگ اسے دانت کے بجائے سینگ بتاتے ہیں۔ بعض ایک کا بیان ہے کہ اس حیوان کی مگرمچھ کی طرح کی ایک دم بھی ہے۔ یہ پانی کے کناروں پر زیر آب غاروں میں رہتا ہے۔ بعض اوقات دن میں بھی باہر نکل آتا ہے۔ اس کی غذا نباتات پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی کشتی اس کے قریب سے گزرے تو اس پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور جو آدمی ہتھے چڑھے اس کی جان لئے بغیر نہیں رہتا لاشوں کو نہیں کھاتا۔ ویسے اس کا محض نباتات خور ہونا ہی اس لحاظ سے حیران کن ہے کہ یہ بات روایتی موہوم مخلوقات کے برعکس ہے جو ہمیشہ گوشت خور اور آدم خور بیان کی جاتی ہیں۔

"موکیل" کے بارے میں اطلاعات نے ماہرین کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس "بلا" پر تحقیق کریں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں تلاش کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ جیمز ایچ پاول جو مگرمچھوں پر ایک اتھارٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ بذات خود کانگو میں ٹیل جھیل دیکھنے گیا اور عینی شاہدوں سے ملاقات کی۔ اسے ایک سکول کے استاد نے بتایا کہ ۱۹۷۷ء میں اسے موکیل دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس نے ۳۰ فٹ کے فاصلے سے اس بھورے رنگ کے جانور کو دیکھا۔ اس کی گردن انسانی ٹانگ جتنی موٹی ہوگی لیکن یہ سانپ نہیں تھا کیونکہ اس کے بدن کا کچھ اور حصہ بھی دکھائی دیا تھا۔ ایک مچھیرے نے بتایا کہ ۱۹۵۹ء میں ایک عدد موکیل شکار کر لیا گیا تھا لیکن جس جس نے اس کا گوشت کھایا وہ مر گیا۔

۱۹۸۰ - ۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر رائے میکل Dr. Roy Mackal دوبار کانگو گیا اور بعدازاں اپنے سفر اور تحقیقات کو ایک کتاب A LIVING DINOSAUR? میں پیش کیا۔ اس کا خیال ہے کہ یہ یا تو ڈائنوسار عہد کے حیوان ساروپوڈ کی باقیات سے ہے یا چھپکلی کی نسل کا کوئی عجیب الخلقت غیر شناختہ جانور ہے۔ اس کی لمبائی بشمول گردن اور دم ۱۵ سے ۳۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ چار چھوٹی ٹانگیں ہیں، قدموں کے نشانات میں پنجوں کا ثبوت ملتا ہے۔[15]

۱۹۸۳ء میں MARCELLIN AGNAGNA مارسلین اگناگنا نامی ماہر حیوانیات نے کانگو میں موکیلی ایم بمب دیکھنے کا دعویٰ

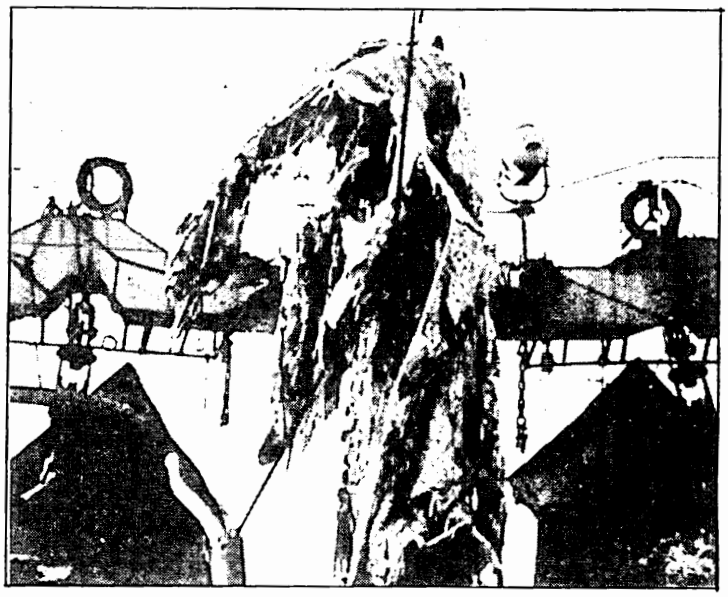

نیوزی لینڈ کے قریب جاپانی مچھیروں نے یہ غیر شناختہ حیوان پکڑا

کیا۔ اس مہم میں وہ دو مقامی باشندوں کے ہمراہ جھیل ٹیلی کے کنارے کھڑا تھا کہ ایک آدمی نے زور زور سے ہاتھ ہلاتے ہوئے ایک جانب اشارہ کیا۔ تینوں نے مڑکر دیکھا تو انہیں کسی جانور کی بڑی سی پشت، لمبی گردن اور چھوٹا سا سر نظر آیا۔ سطح آب پر اس کی جسامت ۱۵ فٹ کے قریب معلوم ہوئی۔ اگرچہ ان کے پاس اس وقت کیمرہ نہ تھا تاہم انہوں نے بیس منٹ تک اس جانور کو دیکھا۔ اگلی بار وہ اپنے ساتھ ویڈیو کیمرہ بھی لے آئے مگر جانور نظر نہ آیا۔(16)

کانگو میں لیکوالا کا علاقہ انتہائی پراسرار ہے۔ آج تک یہاں کا مکمل سروے نہیں کیا گیا۔ یہ گھنے جنگلات اور جوہڑوں سے اٹا پڑا ہے۔ مہذب تو مہذب وحشی نیگرو بھی یہاں جانے سے کتراتے ہیں۔ جن کا یہ اپنا علاقہ ہے۔ یہاں کے نباتات اور حیوانات پر اب تک تحقیق نہیں ہوئی۔ کیا عجب قبل از تاریخ عہد کے ڈائنو سور نسل کے نمائندہ حیوانات یہاں رہائش پذیر ہوں یا کم از کم ایسے مہیب جانور رہ رہے ہوں جن کے بارے میں سائنس دان واقف نہ ہوں۔ مقامی لوگوں کے بیانات کی روشنی میں کم از کم یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

موکیل ایم بمبے کے علاوہ یہ لوگ اور بھی بہت سے غیر شناختہ حیوانات کی تفصیل دیتے ہیں جو انہیں اس علاقے میں بعض اوقات چہل قدمی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

EMELANTOUKA جو موکیل سے مشابہ ہے اور اس کے سر پر ایک ہی سینگ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی اگرچہ سبزہ خور ہے لیکن اتنا خطرناک ہے کہ ہاتھی اور دریائی گھوڑے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور جان سے مار ڈالتا ہے۔ کیا معلوم یہ گینڈے کی کسی غیر دریافت شدہ نسل سے تعلق رکھتا ہو یا شاید سیراٹوپ نسل کے یک سنگی خزندوں کی باقیات سے ہو۔

ایک اور جانور ہے جسے مقامی لوگ "بیلو - بیلو - بیلو" کہتے ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ اس کی پشت پر چپٹی چپٹی ساختیں سی اگی ہوئی ہیں۔ بیلو - بیلو - بیلو کی اس خصوصیت کا سراغ سٹیگو سارس نامی قدیم معدوم ڈائنو سار میں نظر آتا ہے۔

ایک اور مہیب حیوان نگو مونین NGUMA MONENE بتایا گیا ہے۔ یہ کوئی ۱۳۰ سے ۱۹۵ فٹ لمبا سانپ نما جانور ہے جس کی پشت پر آرے کے مسلسل دندانوں کی طرح ساختیں بتائی گئی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں ایک عورت دریائے متابا میں نہا رہی تھی کہ اچانک اس کی چیخیں سنائی دیں۔ دیہاتی دوڑ کر آئے تو عورت کے اشارے پر انہوں نے پانی میں نگو مونین کو دیکھا۔ اس کی پشت کے دندانے دار جھالر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں اس کی دو شاخہ زبان بھی نظر آگئی۔ ۱۹۷۱ء میں پاسٹر ایلیز PASTER ELLIS نامی مشنری نے دریائے متابا پار کرتے ہوئے شاید یہی جانور دیکھا تھا۔ اس کا بیان تھا

کانگو کی جھیل کا پراسرار جانور موکیل

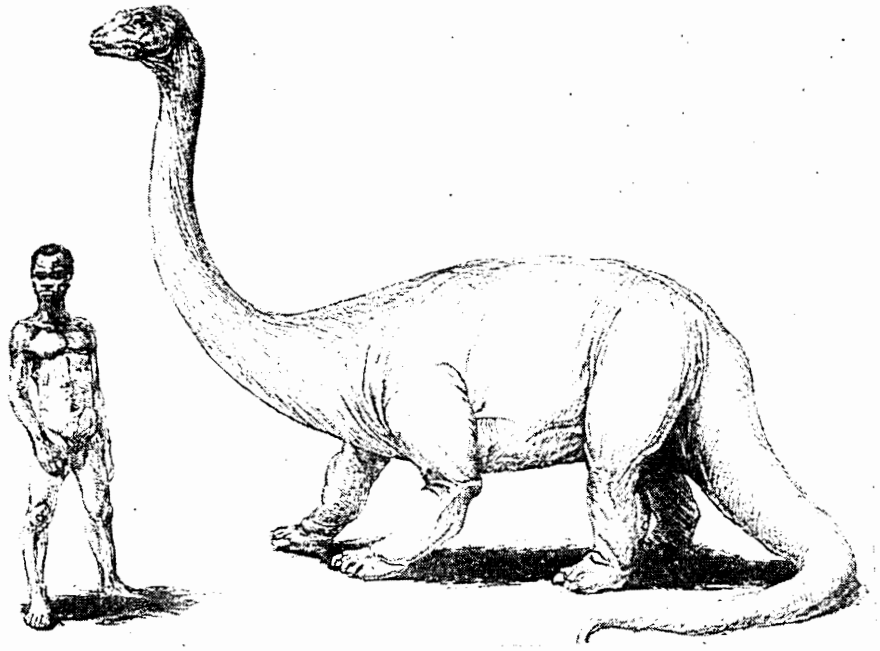

اگر چہ اسے اس کی دم یا سر دکھائی نہیں دیئے لیکن اتنا اندازہ ضرور ہے کہ یہ ۳۰ فٹ سے کم لمبا کیا ہو گا۔ خبر نہیں یہ کوئی سانپ ہے یا دیو قامت چھپکلی یا ان دونوں کے بیچ کوئی کڑی اس علاقے سے ۵۰، ۵۰ فٹ لمبے ہیبت ناک مگر مچھ اور ۱۲ سے ۱۵ فٹ قطر کے بھاری بھر کم کچھوے دیکھنے کی اطلاعات بھی ملی ہیں۔

۲۴ فروری ۱۹۷۶ء کو سکول کے ۱۳ استاد سان انٹونیو (ٹیکساس) جا رہے تھے کہ ان کی نگاہ کے سامنے ایک دیو قامت پرندہ سا آ گیا۔ اس کے پنکھ ۱۵ سے ۲۰ فٹ تک کی جسامت کے ہوں گے یہ پرندہ ہوا میں گلائیڈ کرتا ہوا ان کی گاڑیوں پر سے گزرا تو انہوں نے اس کے پروں کی جھلی میں باریک ہڈیاں نمایاں طور پر دیکھیں۔ یہ کیا بلا تھی؟

کچھ عرصہ بعد انہیں اس پرندے کی تصویر ایک انسائیکلو پیڈیا میں دیکھنے کا موقع ملا تو وہ بھونچکا رہ گئے۔ یہ "ٹرینوڈون" تھا۔ قبل از تاریخ کے دیو قامت اڑنے والے خزندوں کی نسل کا وہ جانور جو سائنس کے مطابق ۶۵ ملین سال ہوئے کرہ ارض سے معدوم ہو چکا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو انہوں نے کیا بلا دیکھی تھی؟[17]

یہ پہلا موقع نہیں تھا اس سے پہلے بھی لوگ کہتے آئے تھے کہ جنوب مشرقی ٹیکساس میں عجیب و غریب پرندے دیکھے گئے ہیں۔ ریمنڈ ولا کا ایک شخص ایک رات گھر سے باہر نکل آیا۔ عجیب سی سیٹیوں کی آواز اور چمگادڑ جیسی پھڑپھڑاہٹ نے اس کی نیند حرام کر دی تھی۔ وہ بیزار ہو کر ادھر ادھر دیکھتا آگے بڑھا کہ پشت پر بڑے بڑے پنجوں کا احساس ہوا پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کی جان ہی تو نکل گئی۔ گرتا پڑتا بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوا۔ اس پر ایک ہیبت ناک پرندے نے حملہ کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پرندے کے پر ۱۰ سے ۱۲ فٹ تک لمبے ہوں گے۔ بدن ۵ سے ۶ فٹ لمبا ہو گا اور چہرہ بندر (یا چمگادڑ) سے مشابہ تھا۔ بڑی بڑی لال آنکھوں اور گہرے رنگ کی بے پر جلد والے اس جانور کی چونچ نہیں تھی۔ اس قسم کی اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی ٹرینوڈون تھا۔

۱۹۸۳ء میں ٹیکساس، میکسیکو سرحد کے قریب ایمبولنس کے ایک ڈرائیور جیمز تھامپسن نے ایک عجیب سا پرندہ دیکھا پہلے پہل اسے خیال ہوا کہ یہ کوئی مصنوعی جہاز کا اڑتا ہوا ماڈل ہے۔ مگر جب ۸ سے ۱۰ فٹ لمبے "پرندے" نے اپنے ۶ فٹ لمبے پروں کو ہلا ہلا کر گھاس پر اڑنا شروع کیا تو وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے سر کے پیچھے ایک گومڑ سا ابھار تھا۔ حلق کے پاس تھیلی سی تھی۔ لیکن گردن محسوس نہیں ہوئی۔ شاید یہ ٹیروڈکٹائل کی طرح کا پرندہ تھا۔

کیا ٹیکساس میں قبل از تاریخ بعد میں ایسے پرندے موجود تھے؟ یقیناً! ۱۹۷۲ء میں ایک طالبعلم نے بگ بینڈ نیشنل پارک ٹیکساس سے ٹیروڈکٹائل

کے ایسے رکاز تلاش کر دکھائے جن کے پروں کی لمبائی ۵۱ فٹ تھی! اتنے بڑے پروں والی مخلوق ہوا میں اڑتی کیا عجیب نظر آتی ہو گی!

چلئے یہ تو ثابت ہوا کہ اس علاقے میں اڑنے والے خزندوں کا راج تھا۔ مگر یہ اڑتے عفریت کیا اب تک اپنی قدیم نسلوں کی بقاء کے ضامن بنے ہوئے ہیں؟ اگر نہیں تو لوگوں نے جو بلائیں دیکھی تھیں وہ کیا تھے؟ شاید غیر معمولی جسامت کے چمگادڑ، شاید۔

ادھر افریقہ میں عرصے سے "اڑتے اژدروں" کی کہانیاں مشہور ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں ماہر حیوانیات آئیوان ٹی اینڈرسن کیمرون (مغربی افریقہ) میں مطالعاتی دورے کے دوران ایک دریا میں جا گرا تو ۱۲ فٹ لمبے پروں والے کسی حیوان نے اسے دبوچنے کے لئے ہوا میں سے اس پر غوطہ لگایا تھا۔ اس واقعے کی تفصیلات اس نے اپنی تصنیف INVESTIGATING THE UNEXPLAIND میں دی ہیں۔ شاید یہ بھی عہد قدیم کے جانوروں کی نسل کا کوئی ٹیروڈکٹائل تھا۔

متعلقہ موضوعات زندہ رکاز

# KRAKEN کراکن

سمندر میں سفر کرنے والے قدیم ملاحوں کے قصے کہانیوں میں ایک خوفناک بحری بلا کا ذکر ملتا ہے۔ جس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ اور مختصر سے دھڑ کے ساتھ آٹھ یا زیادہ تعداد میں، لمبے لمبے مضبوط بازو نکلے ہوتے ہیں۔ روایات کے مطابق یہ ظالم حیوان کشتیوں اور جہازوں کو ڈبونے اور انسان کو جکڑ لے جانے کے حوالے سے بڑا بدنام تھا۔ حیوان کا مبینہ حلیہ معلومہ حیوانات میں سکوئیڈ یا آکٹوپس قسم کے حیوانات سے مشابہت رکھتا ہے۔ مگر ماہرین حیوانات کسی سکوئیڈ یا آکٹوپس کی ایسی جناتی جسامت اور جہازوں اور انسانوں پر حملہ آور ہونے کی عادات سے واقفیت نہیں رکھتے۔ فلم سازوں کی دہشت ناک فلموں میں ایسے جانوروں کو دکھائے جانے کے بعد رویہ یہی ہے کہ ان کا وجود حقیقی نہیں اور سارے قصے محض خرافات ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں مغربی افریقہ کے سواحل کے قریب ایک بحری جہاز لنگر انداز ہوا۔ جہاز کے کپتان جین میگنس کے حکم سے عملے نے جہاز کی صفائی شروع کر دی یکایک پانی سے کسی بہت بڑے حیوان کے بڑے بڑے بازو نمودار ہوئے۔ اور تین آدمیوں کو جکڑ کر پانی کی طرف گھسیٹنے لگے صرف ایک آدمی کو حیوان کا بازو کاٹ کر بچالیا گیا۔ جب کہ باقی دو کو وہ حیوان گھسیٹ کر پانی میں غوطہ لگا کر نظروں سے غائب ہو گیا۔ کپتان کے بیان کے مطابق بازوؤں کے کٹے ہوئے حصے کا ایک سرا نوکیلا تھا اور دوسری جانب سے بازو بہت موٹا تھا۔ یہ ۲۵ فٹ لمبا ٹکڑا تھا اس سے ایک اندازہ تھا کہ وہ بلا ۳۵ سے ۴۰ فٹ کے قریب لمبی ضرور ہو گی۔

۳۰ر نومبر ۱۹۶۱ء کو سپین سے ایک فرانسیسی جہاز Alecton اپنے سفر پر روانہ ہوا تھا تو اس کے عملے نے کھلے سمندر میں ایک بہت بڑا جانور دیکھا۔ عرصے سے یہ بات مشہور تھی کہ سمندر میں قوی الجثہ سکوئیڈ نامی حیوانات پائے جاتے ہیں مگر علمی دنیا میں اس کی تردید کر دی گئی تھی۔ اب ان لوگوں کو اس روایت کی صداقت پر یقین آرہا تھا۔ یہ مخلوق اٹھارہ فٹ لمبی تھی۔ اور اس کے آٹھ بازو تھے۔ سر بہت بڑا تھا جس کے آگے طوطے کی چونچ کی طرح کا منہ سا تھا۔ اس کی ایک لمبی سی دم بھی دکھائی دی اس خوفناک جانور کی رنگت سرخی مائل تھی۔ جہاز الیکٹن کے کپتان لیفٹیننٹ بوٹر نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر اس بلا کی دم کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر شکنجے میں رہ گیا اور وہ بھاگ نکلی دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ٹکڑے کا وزن ۴۰ پونڈ تھا۔

۱۸۰۲ء سے ۱۸۰۵ تک فرانس میں Pierre Denys De Montfort نامی شخص کی تحقیق بعنوان The Natural History of Mollusc کئی جلدوں میں شائع ہوتی رہی اس ضخیم کتاب میں جگہ جگہ ایسے حیوانات کا تذکرہ تھا جن کی بابت سائنس واقفیت نہیں رکھتی تھی۔ اور صرف مچھیروں اور ماہی گیروں کی عینی شہادتیں بار بار ان کا تذکرہ کرتی تھی۔ مونٹ فورٹ کا اصرار تھا کہ سمندروں میں دیوپیکر ہشت نیشن صدفہ (اکٹوپس) پائے جاتے ہیں جنہیں سائنس اب تک مچھیروں کی دیومالا اور توہمات کا حصہ تصور کرتی ہے۔ مونٹ فورٹ اپنے اس دعوے کی تصدیق کے لئے بہت گھوما پھرا اور جگہ جگہ سے ماہی گیروں کی زبانی بحری عفریتوں کی تفصیلات جمع کر کے لاتا رہا۔ لیکن ۲۱ - ۱۸۲۰ء میں انتہائی کس مپرسی اور ذلت کی حالت میں مرا اور اس کی لاش ایک گٹر سے دستیاب ہوئی پیرس بھر میں اسے بہت بڑا جھوٹا مانا جاتا رہا اور اسی روانی میں لوگ اس کی اس خدمت کو بھول گئے کہ مونٹ فورٹ نے Mollusca کے ۲۵ جینیرا ترتیب دیئے تھے جنہیں آج تک استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۶۸۰ء میں ایک عدد Kraken ناروے کے علاقے کے ساحلی چٹانوں میں آن پھنسا اور کچھ عرصہ بعد یہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اس کی لاش سڑنے

سے اس قدر بدبو پھیل گئی کہ توبہ ہی بھلی۔ لوگوں نے آس پاس کی رہائش گاہوں کو وقتی طور پر خیرباد کہہ دینے میں ہی عافیت جانی۔

۱۷۳۴ء میں ڈنمارک کے معزز مشنری Hans Egede نے گرین لینڈ کے قریب ایک بہت بڑا کرائن دیکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بلا کی جسامت کسی بحری جہاز جتنی تھی۔ جس وقت بلا سمندر سے نمودار ہوئی تو اس کا سر جہاز کے بڑے مستول جتنا اونچا تھا۔ بڑے بڑے پنجے تھے جلد کھردری تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں کراکن کا ایک اور اہم تذکرہ ناروے کے بشپ Erik Pontoppidan کی تحریر کردہ کتاب میں ملتا ہے۔ اگرچہ بشپ نے بذات خود اسے نہیں دیکھا تھا لیکن اسے ملاحوں کی بار بار بیان کردہ عینی شہادتوں پر اعتبار تھا۔ اس نے ملاحوں کے بیان کے مطابق بلا کا جو حلیہ بیان کیا ہے وہ اسے خاصا خوفناک ظاہر کرتا ہے۔ بلا کی پشت کوئی لگ بھگ ایک میل لمبی ہو گئی۔ جس وقت جانور سطح آب پر نمودار ہو رہا ہوتا ہے تو اول یوں لگتا ہے جیسے کافی کافی فاصلے پر چھوٹے چھوٹے ٹیلا نما جزیرے ہیں جن کی اطراف میں بحری گھاس کی مانند ساختیں نظر آتی ہیں۔ پھر بہت سے سینگ ایسے نمودار ہوتے ہیں۔ کچھ دیر سطح پر رہنے کے بعد یہ مہیب حیوان آہستہ آہستہ پانی کے اندر بیٹھنا چلا جاتا ہے مگر اس سے پانی میں زبردست تلاطم اور گرداب پیدا ہوتا ہے اور اس کی پہنچ میں ہر چیز ساتھ ہی غرق ہو جاتی ہے۔[18]

کچھ عرصہ قبل پیرو کے پاس ایک گلابی رنگ کا دیو قامت اسکوائیڈ پکڑا گیا۔ سائنس دانوں کو اس کے ۳۵ فٹ لمبے بازو اور ایک فٹ قطر کی آنکھیں دیکھ کر سخت اچنبھا ہوا۔ پھر شکار شدہ وہیل کے معدوں سے سکوئیڈ کے غیر ہضم شدہ ٹکڑوں کی جسامت دیکھ کر اندازہ لگایا گیا کہ ان سکوئیڈز کی جسامت ۱۰۰ فٹ سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ کیا معلوم یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور ایک روز کہیں کراکن سے بھی مڈھ بھیڑ ہو جائے اور دنیائے سائنس تسلیم کر لے کہ وہ فی الحقیقت ایک جیتی جاگتی مخلوق ہے۔

# نیسی ..... لاخ نیس کا عفریت

اسکاٹ لینڈ کی مقامی زبان میں جھیل کے لئے لاخ LOCH کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں صاف پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سکاٹ لینڈ کی جھیل نیس NESS ہے جو کہ لاخ نیس کہلاتی ہے۔ یہ جھیل ۲۳ میل لمبی اور ایک میل چوڑی ہے اور اس کی گہرائی ۷۵۰ فٹ تک کی ہے۔ یہ جھیل ۲۵ ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور گلیشیر کے عمل سے وجود میں آئی۔ اس کے سواحل گھنے جنگلات سے پر ہیں۔ موسم سرما میں شدید برف باری سے علاقہ برف سے اٹ جاتا ہے اور سال میں نو مہینے یہ وحشت خیزی اور ویرانی کا منظر پیش کرتی ہے۔

چودہ صدیوں سے مسلسل اس عظیم آبی ذخیرے کے بارے میں لوگ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ ایک آبی عفریت کی قیام گاہ ہے۔ قدیم زمانے سے سکاٹ لینڈ کی دیومالائی روایات کہتی چلی آ رہی ہیں کہ سکاٹ لینڈ کی جھیلوں میں پانی کی ارواح خبیثہ گھوڑے کی شکل میں گھومتی پھرتی ہیں اور جب کوئی شخص ان پر سوار ہونے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کے ٹخنے جکڑ کر پانی غوطہ لگا دیتی ہیں جس سے بدنصیب شخص ہلاک ہو جاتا ہے۔ ان بلاؤں کا نام کیلپی ہے۔

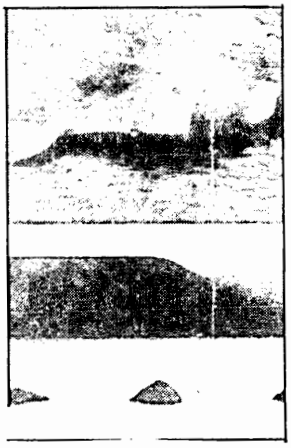

نیسی ــ لاخ کا عفریت

جھیل نیس میں کھینچی گئی تصاویر

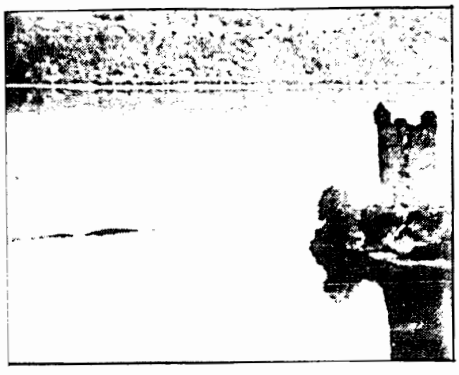

1934ء میں کھینچی گئی تصویر

جھیل چیمپلین میں ساندرا ماتسی نے اس حیوان کی تصویر اتاری



جھیل نیس میں 1977ء میں کھینچی گئی تصویر کسی مخلوق کا سر اور گردن نظر آ رہی ہے

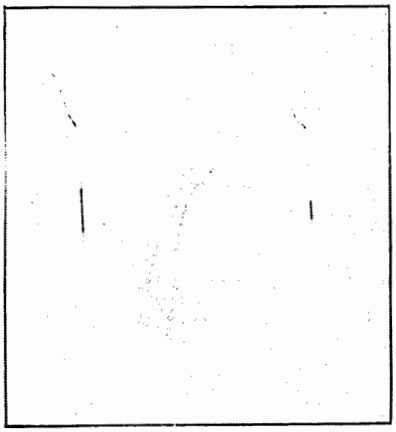

ہیرے کے سے پنکھ کی تصویر

سونار کے ذریعے زیر آب بڑے اجسام کی حرکت کا احوال

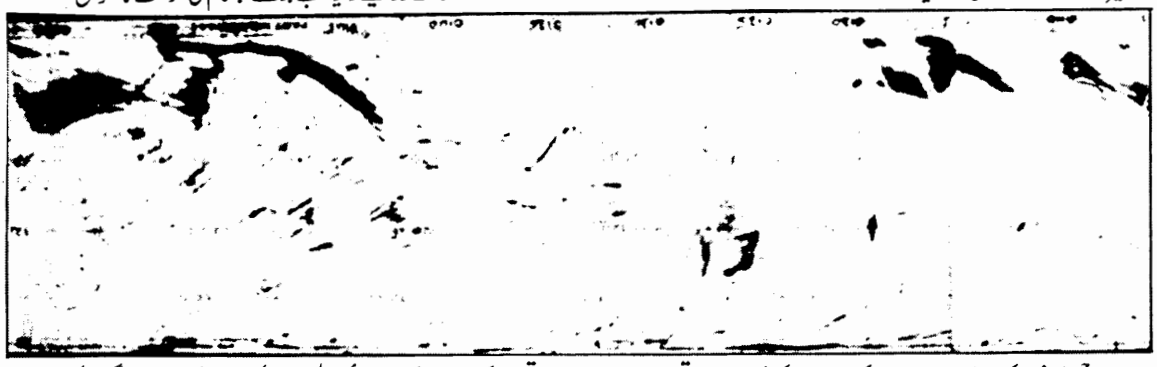



جھیل نیس کی بلا کا قدیم ترین تذکرہ ۵۶۵ء کی ایک مذہبی تحریر سے ملتا ہے اس تحریر کے مطابق ایک عیسائی مبلغ سینٹ کولمبا، جو کہ اسکاچ لوگوں کو عیسائیت قبول کرنے کی ترغیب دینے آیا ہوا تھا، ایک دن نیس کے کنارے پہنچا تو اسے ایک ماتمی جلوس نظر آیا لوگوں نے کولمبا کو بتایا کہ ایک نوجوان مچھیرے کو آبی بلا نے ہلاک کر دیا ہے۔ کولمبا نے اپنے ایک معتقد کو حکم دیا کہ وہ جھیل کو تیر کر عبور کرے۔ ابھی وہ شخص بیچ ہی میں پہنچا تھا کہ پانی میں ہلچل مچی اور ایک بلا نمودار ہوئی۔ اس سے پہلے کہ بلا تیراک کو کچھ نقصان پہنچاتی کنارے سے کولمبا نے بلا کو حکم دیا کہ تیراک کو کچھ نقصان نہ پہنچائے۔

بلا جس تیزی سے آئی تھی اس سے زیادہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔ کولمبا نے کہا کہ یہ بلا جھیل کی دائمی آزادی کی علامت ہے۔[۱۹]

انیسویں صدی کے اوائل میں اسکاٹ لینڈ میں والدین اپنے بچوں کو جھیلوں کے قریب جانے اور کھیلنے سے سختی سے منع کرتے تھے مبادا کوئی بلا انہیں پکڑ

لے۔ ۱۸۱۰ء میں سر والٹر اسکاٹ نے تحریر کیا کہ پورے اسکاٹ لینڈ میں ہر بڑے آبی ذخیرے سے کوئی نہ کوئی پراسرار مہیب مخلوق منسوب ہے۔

۱۸۸۰ء میں ایک تیراک میکڈانلڈ لاخ نیس میں پھنسی ہوئی ایک کشتی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا اس کے مطابق "میں زیر آب کام کر رہا تھا کہ اچانک عفریت میرے قریب سے گزرا۔ اس نے تو مجھے نہیں دیکھا لیکن میں نے اس کی ایک خاکی آنکھ ضرور دیکھ لی۔ لگتا ہے کہ جب تک اس حیوان کو اشتعال نہ دلایا جائے تب تک یہ کوئی نقصان کرنے سے اجتناب کرتا رہے گا"۔

۱۹۳۳ء تک عام لوگوں کے لئے لاخ نیس ایک خوبصورت تفریح گاہ سے زیادہ کچھ نہیں تھی ہزاروں لوگ چھٹی کا دن، یہاں بھرپور طریقے سے مناتے رہے۔ اسی سال لاخ نیس کے شمالی ساحل کے ساتھ سڑک کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ اس تعمیر کے دوران معماروں نے اکثر جھیل کی سطح پر ایک اونچا سا کوہان نمودار ہوتے دیکھا۔ مقامی باشندے تو اس بارے میں بہت پہلے سے واقف تھے لیکن باقی دنیا کے لئے یہ محض مغالطہ تھا۔

پہلی دفعہ برٹش ایلی مونیم کمپنی کے ایک ملازم "گرے" نے لاخ نیس کے عفریت کی تصویر کھینچنے کا دعویٰ کیا۔ گرے کی تصویر میں نیسی کا سر اور گردن نظر آتے تھے۔ چند ماہ بعد رائل کالج آف سرجنز کے ڈاکٹر کے ولسن نے بھی نیسی کی ایک تصویر اتاری جو بہت مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۴ء میں آر ٹی گولڈ کی کتاب منظر عام پر آئی جس میں اس نے شواہد و بیانات جمع کئے تھے۔ لیکن اس کتاب نے اس مسئلے کو اور بھی گھمبیر بنا دیا۔ عینی شاہدوں کے بیانات میں بہت زیادہ تضادات تھے جو نیسی کے وجود کو مشکوک کر رہے تھے۔ کسی کا بیان تھا کہ جانور سلیٹی رنگ کا ہے، لیکن کچھ نے سبز رنگت بیان کی۔ خاکی اور زرد رنگ کا بھی ذکر آیا ہے۔ سطح آب پر ظاہر ہونے والی کوہان نما ساختوں کی تعداد میں ۲ سے ۱۲ تک کا تغیر تھا۔ کسی کا بیان تھا کہ اس جانور کے سینگ بھی تھے۔ جبکہ دوسرے عینی شاہدوں نے سینگوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ کسی کا کہنا تھا کہ گردن ایال دار ہے اور جسم خشک اور کوئی گردن کو بغیر بالوں کے اور بدن چکنا اور لجلجا بتا رہا تھا۔ کسی نے رفتار کا تعین ۳۶ کلومیٹر فی گھنٹہ کیا تھا۔

کتاب کی اشاعت کے بعد اصحاب فکر دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ یہ سب انسان کی اسرار پسند فطرت کی کارفرمائی ہے وگرنہ عینی شاہدوں کے بیانات میں اتنا تضاد نہ ہوتا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ امکان ہے کہ جھیل کے پانی اور فضا کے درجہ حرارت میں فرق کے سبب عجیب و غریب سراب بنتے ہیں۔ ان عوامل کی موجودگی میں کوئی چھوٹا سا پرندہ اڑتا ہو گا تو اس کا دیو قامت عکس پانی میں دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہو گا..... اور لوگ اس کو عفریت سمجھتے ہوں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بڑا سا سڑتا ہوا درخت ہے جو دریاؤں سے بہہ کر جھیل میں آ گرا ہے اور در حقیقت اس کا تنا لوگوں کو تیرتا ہوا جانور نظر آتا ہے۔ فریب نظر کے مفروضے کو تسلیم نہ کرنے والوں کا خیال ہے کہ جھیل میں کوئی دیو قامت لدھر، سیل یا شارک آ گئی ہے۔ (یاد رہے کہ جھیل میں پائی جانے والی سب سے بڑی مچھلی سامن ہے)

دوسری جانب یہ امکان ظاہر کیا گیا ہے کہ جھیل میں ایک سے زائد عفریتیں موجود ہیں جن کے بارے میں سائنس کو علم نہیں ہے۔ (اتنی بڑی جھیل میں ۲۵۰۰ پاؤنڈ کے ۳۰۰ جانور آرام سے رہ سکتے ہیں)

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو جھیل کی بلا کو لوگ بھول گئے۔ ۱۹۵۴ء میں ایک ماہی گیر کشتی میں نصب گونج کے ذریعے رکاوٹوں کی نشان دہی کرنے والے آلے نے زیر آب کسی بڑے جانور کی نشاندہی کی۔ تاہم جب ۱۹۵۷ء میں کان سنن وہائٹ کی کتاب "افسانہ سے بعید تر" منظر عام پر آئی تو برطانیہ سے باہر لوگوں کی توجہ اس جانور کی طرف مبذول ہو گئی۔ ان دنوں بی بی سی نے ایک ٹیلی وژن ٹیم کو خصوصی طور پر معاملے کی تفتیش کے لئے روانہ کر دیا۔ ان لوگوں کے پاس گہرائی ناپنے کا آلہ تھا۔ ایک موقع پر سطح آب سے بارہ فٹ نیچے کسی جانور کو محسوس کیا گیا جو کہ ۶۰ فٹ کے گہرائی کے بعد گم ہو گیا۔ اس سلسلے میں زولوجیکل سوسائٹی آف لندن کے ماہرین حیوانات اور برٹش میوزیم کے اراکین کی رائے طلب کی گئی کیونکہ اب فریب نظر کا مفروضہ غلط ثابت ہو رہا تھا۔ لیکن ماہرین کا کہنا تھا کہ جھیل میں ایسا کوئی جانور نہیں ہے جس سے سائنس لاعلم ہو۔ ضرور وہ کوئی بڑی مچھلی یا درخت کا تنا ہو گا۔

۱۹۶۰ء میں برطانوی انجینئر اٹم ڈینڈیل نے ۱۳۰۰ سے ۱۶۰۰ گز کے فاصلے سے پانی میں تیرتے ہوئے کسی نامعلوم جانور کی فلم بنائی۔ بعد ازاں اتنے ہی فاصلے سے ایک کشتی کی فلم بنائی گئی اور پھر کشتی اور جانور کی جسامت میں فرق کی نسبت سے جانور کی جسامت کا اندازہ لگایا گیا۔ معلوم ہوا کہ جانور ۱۲ سے ۱۵ فٹ لمبا ہے اور ۶ فٹ کے قریب چوڑا ہے۔ یہ فلم بی بی سی سے نشر ہوئی تو عوام نے مطالبہ کیا کہ نیسی کے بارے میں تحقیقات کی جائیں۔ چنانچہ برطانوی رکن اسمبلی ڈیوڈ جیمز نے دو سائنس دانوں پیٹر سکاٹ اور رچرڈ فٹر کے ساتھ ایک تفتیشی ادارہ قائم کیا۔ رضا کاروں کی ایک بڑی تعداد جھیل کے کناروں پر کیمرے کے ساتھ

کھڑی ہو گئی۔ بعدازاں جینر نے ایک ٹی وی انٹرویو کے دوران بتایا کہ ان کے رضاکاروں نے جھیل میں کسی غیر معمولی جسامت کے نامعلوم جانور کو حرکت کرتے دیکھا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جینر کے قائم کردہ ادارے کے لئے شکاگو یونیورسٹی کے حیاتیاتی کیمیا کے پروفیسر ڈاکٹر رائے میکل کو ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ ڈاکٹر میکل نے امریکہ میں جگہ جگہ لیکچر دیئے اور نیسی کی تلاش کے لئے چندہ جمع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں امریکی رابرٹ لو نے سونار کی مدد سے عفریت کی تلاش شروع کی۔ ۱۹۷۰ء میں کچھ کامیابی ہوئی اور سونار کی مدد سے کسی تیرتے ہوئے جانور کا سراغ ملا۔ اسی جانور کی کلکاری ہوئی آوازیں ہائیڈروفون سے ریکارڈ کی گئیں۔ اسی سال بوسٹن کی اپلائیڈ سائنسز کی اکیڈمی کے سربراہ رائن نے بھی تجربات شروع کیے۔ اس کا طریقہ کار بہت مختلف تھا۔

خوراک، خوشبو اور ہارمون کی مدد سے نیسی کی تلاش اور پھر کیمرے اور سونار کی مدد سے تصویر کشی۔ شروع میں رائن کو بالکل کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ۱۹۷۲ء تک رائن کے مطابق جانور کا ایک پنکھ شکل و صورت میں پہلو دار ہیرے سے مشابہ تھا۔ اس آٹھ فٹ لمبے فلے پر کی چوڑائی دو تا چار فٹ کے قریب تھی۔ دم کی لمبائی آٹھ فٹ کے قریب معلوم کی گئی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں رکن اسمبلی جینر کا ادارہ فنڈز کی قلت کی وجہ سے بند ہو گیا۔ تاہم پروفیسر رائن بدستور کام کرتا رہا۔ ۱۹۷۵ء میں وہ پراسرار جانور کے سر، گردن، فلے پر اور جسم کے اگلے دو حصوں کی عمدہ تصاویر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ رائن نے نیسی کو ایک سائنسی نام بھی دے دیا جو کہ کچھ یوں ہے۔ ''Nessiteras rhombopteryx'' یعنی ہیرے کی طرح پنکھ والا نیس کا عجوبہ۔[20]

چلئے یہ تو مان لیا کہ یہ کوئی غیر معمولی حیوان ہے لیکن کس طرح کا؟ جولائی ۱۹۳۷ء میں لندن کے ایک تاجر جارج اسپائسر نے نیسی کو جھیل کے باہر دیکھا تھا اس کا کہنا تھا کہ ''میں نے ایک حیرتناک جانور دیکھا جو جھیل کے پاس سڑک پار کر رہا تھا۔ یہ ایک کریہ المنظر اور مہیب جانور تھا۔ سب سے پہلے اس کی لہراتی ہوئی گردن نظر آئی یہ ہاتھی کی سونڈ سے کچھ ہی موٹی ہو گی۔ مجھے اس کی گردن میں محرابیں دکھائی دیں۔ تھوڑی دیر میں اس کا دھڑ نظر آیا جو چار فٹ اونچا اور الٹی ہوئی کشتی کی مانند تھا اس کی رنگت ہاتھی کے گہرے رنگ کی طرح تھی مجھے تو یہ کوئی بڑا سالمبی گردن والا گھونگا معلوم ہوتا ہے''۔

فورٹ آگسٹس، جو کہ لاخ نیس کے قریب واقع ہے کے ایک مذہبی رہنما نے اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ اصل میں ایک جل تھیلیا ہے جو پانی اور خشکی دونوں پر زندہ رہ سکتی ہے۔ اس کی چار اضافی ٹانگیں یا پنکھ ہیں۔ غیر معمولی لچک کی حامل لمبی گردن بھی ہے۔ چوڑے چکلے شانے اور سینہ ہے اور بڑی چپٹی دم ہے جس کی مدد سے یہ پانی کو ادھر ادھر بخوبی دھکیل لیتا ہے۔

ڈاکٹر میکل کا خیال ہے کہ یہ جانور کسی بھی معلوم حیوان سے تعلق نہیں رکھتا ہے بلکہ مختلف جنس ہے۔ جس کے بارے میں سائنس لاعلم ہے۔

ایک اور نظریہ کے مطابق نیسی ڈائنوسار عہد کا معدوم حیوان پلیسیو سارس ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جن جانوروں کو ہم معدوم تصور کرتے ہیں ان میں سے چند ایک نفوس گردش زمانہ سے بچ نکلے ہوں؟ خوش قسمتی سے اس کا جواب اثبات میں ہے۔ سائنس دانوں کا خیال تھا کہ سیلن کانتھ نامی مچھلی جو قدیم رکازات میں پائی جاتی ہے، دیگر ڈائنوسورز کے ہمراہ معدوم ہو گئی ہے مگر جنوبی افریقہ کے قریب ۱۹۳۹ء عیسوی میں ایک مچھیرے نے ایک عدد زندہ سیلن کانتھ پکڑ لی تو سائنس دانوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بعدازاں اس قسم کی مچھلی لانے پر انعام بھی مقرر ہوا اور اب اس نادر نسل کے تحفظ کی تحریک چلائی جا رہی ہے۔ سیلن کانتھ ۱۹۳۹ء سے قبل ایک رکاز تصور ہوتی تھی جس کے وجود کے آثار صرف متحجرات کی صورت میں ملتے تھے مگر اب اس کے زندہ سلامت ملنے پر امید کی جا سکتی ہے کہ ڈائنوسور عہد کے اور بھی حیوان معدومی سے بچ گئے ہوں اور عین ممکن ہے کہ نیسی ایک زندہ پلیسیو سارس ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی غیر دریافت شدہ حیوان ہو۔

اصل حقیقت اس وقت سامنے آئے گی جب نیسی کو زندہ پکڑا جا سکے گا۔ نیویارک کے چڑیا گھر نے نیسی کو زندہ پکڑنے کے لئے ۵۰۰ پاؤنڈ کے انعام کا اعلان کیا تھا بیڑام ملز سرکس نے ۲۰ ہزار پاؤنڈ اور بلیک اینڈ وہائٹ وہسکی بنانے والوں نے ایک ملین پاؤنڈ کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ لیکن یہ کام کافی مشکل ہے کیونکہ ایک تو جھیل بہت طویل ہے دوسرے پانی اس قدر گدلا ہے کہ ۶ فٹ سے گہرائی میں چیز نظر نہیں آتی ہے پھر سال میں اکثر موسم سرد اور ہوا کہر آلود رہتی ہے۔

# جھیلوں کی بلائیں

دنیا بھر سے مختلف مقامات کی قدیم روایات اور ادب میں مقامی جھیلوں اور پانی کے چھوٹے موٹے ذخائر کے بارے میں یہ روایات ملتی ہیں کہ ان میں

کسی پراسرار مخلوق کا بسیرا ہے۔ مگر دور حاضر میں بھی گاہے بگاہے عینی شاہدوں کے بیانات خبروں کا حصہ بنتے رہتے ہیں کہ انہیں بھی کوئی غیر معمولی مخلوق دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جیسے ۱۷۶۵ء میں لندن کے جنٹلمینز میگزین نے خبر دی کہ سٹاک ہوم کے علاقے کے لوگوں نے بارہا قریبی جھیل میں ایک عفریت دیکھنے کی اطلاع دی ہے جسے وہ نیکر NECKER کہتے ہیں۔ یہ بلا جھیل میں نہانے اور تیرنے کے لئے آنے والوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔

جھیلوں کی ان بلاؤں کی مبینہ شکل و صورت، جسامت اور عادات میں بڑا تنوع دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی اطلاعات دنیا بھر سے مل رہی ہیں۔ سب سے زیادہ اطلاعات انگلینڈ سے آتی ہیں جہاں کی لاخ نیس کے عفریت کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے (دیکھئے نیسی لاخ نیس کا عفریت)

جھیل نیس سے ۳۰ میل پرے ایک اور الگ تھلگ جھیل لاخ مورار ہے۔ نیسی کی طرح اس جھیل سے بھی ایک عفریت منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں برطانوی تلاش کنندگان کی ایک ٹیم نے برطانوی سائنس دان Dr. Neill Bass کی قیادت میں علاقے کی چھان بین شروع کی۔ ۱۴ر جولائی کو یہ لوگ بارش سے بچنے کے لئے جھیل مورار کے قریب درختوں کے نیچے چلے آئے۔ ڈاکٹر باس اور اس کے دو ساتھیوں نے جھیل میں ۳۰۰ گز کے فاصلے پر کوئی سیاہ اور ہموار کوہان نما شے نمودار ہوتے دیکھی۔ جو کچھ دیر بعد پانی کے نیچے غائب ہو گئی لیکن کچھ ہی دیر بعد پانی میں خوب ہلچل مچی جس سے گول گول دائروں میں لہریں پیدا ہونے لگیں باس نے سوچا کہ یہ کوئی بڑی ایل ہے مگر جلد ہی اسے احساس ہوا کہ ایل مچھلی اس طرح سے حرکت نہیں کرتی۔ ڈاکٹر نے رپورٹ دی کہ جھیل میں کوئی ایسی مخلوق آباد ہے جس کی بابت اسے کچھ علم نہیں۔

حیوانیات کے ایک طالب علم نے جھیل کے کنارے بیٹھے ہوئے اپنی دوربین سے ڈیڑھ میل دور ایک گنبد نما سیاہ کوہان پانی سے اوپر آتا دیکھا۔ وہ طالب علم ایلن بٹرور تھ اپنا کیمرہ لینے دوڑا مگر اس کی واپسی تک بلا غائب ہو چکی تھی۔

سکاٹ لینڈ کی طرح آئرلینڈ کی جھیلوں کے بارے میں بے شمار رپورٹیں موصول ہوئی ہیں اور صحیح معنوں میں آئرلینڈ ہی اسکاٹ لینڈ کے مقابلے میں آبی عفریتوں کی تعداد اور اطلاعات کا مقابلہ کرتا ہے۔ بے شمار اطلاعات میں سے ایک ڈبلن کے تین پادریوں کا قصہ ہے جو آئرلینڈ کی جھیل ری پر ٹراؤٹ مچھلی پکڑ رہے تھے۔ یہ مئی ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے۔ تینوں بڑے خوش تھے کہ موسم بھی خوشگوار ہے اور شکار بھی وافر مقدار میں ہے۔ مگر اچانک ان کے رنگ فق ہو گئے۔ قریباً ۱۰۰ گز کے فاصلے سے ایک بلا پانی پر تیزی سے تیرتی ہوئی ان کی جانب چلی آ رہی تھی۔ پھر وہ غوطہ لگا گئی۔ وہ صرف اس کا چپٹا سر دیکھ سکے۔ مگر جسامت کا اندازہ نہ لگا سکے۔

آئرلینڈ کی جھیلوں میں اتنی کثرت سے غیر شناختہ مخلوقات دیکھنے کی اطلاعات ملتی رہی ہیں کہ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے اس علاقے کی ہر جھیل میں ایک نہ ایک جانور ضرور موجود ہے۔ اس علاقے میں جھیل کو LOUGH کہتے ہیں جبکہ سکاٹ لینڈ میں لاخ LOCH کہا جاتا ہے۔

LOUGH REE کے بعد ایک دوسری جھیل مثلاً LOUGH FIDDA کا ذکر کیا جاتا ہے جو اس حوالے سے بھی مشہور ہے کہ ۱۹۶۵ء میں سرونسٹن چرچل کا ایک کزن LESLIE یہاں کی بلا دیکھنے آیا تھا۔ اکتوبر کے مہینے میں وہ یہاں آیا اور جھیل کی ایک چٹان کو دھماکہ خیز مادہ سے اڑا دیا۔ اسے ناکامی نہ ہوئی بلا ارتعاش کے ردعمل سے سطح آب پر آ گئی۔ لیس لی نے اسے ساحل سے ۵۰ گز دوری سے دیکھا اور بعد ازاں ایک انٹرویو میں تسلیم کیا کہ




جھیلوں کی بلائیں : روسی بیالوجسٹ این گیلاڈ یخ نے جھیل کھیر میں ماسکو یونیورسٹی کے ریسرچرز کے ساتھ دیکھی گئی بلا کا نقشہ ۱۹۶۴ء میں مندرجہ بالا صورت میں کھینچا۔

سے یقین ہو گیا ہے کہ جھیل فدا میں ایک عفریت ضرور موجود ہے۔
لیس.لی نے ۱۹۶۹ء میں جھیل کی بلا کو پکڑنے کی کئی کوششیں کیں جو بار آور ثابت نہ ہوئیں اور اس کے ہمراہ جانے والے کیمرہ مین بھی جھک مارتے رہے۔

---

۱۸۵۴ء میں ایک دوغلی نسل کا انڈین شخص برٹش کولمبیا کی جھیل OKANAGAN کے پاس سے اپنے گھوڑوں کو ساتھ لئے جا رہا تھا کہ جھیل سے نمودار ہونے والے ایک بڑے "ہاتھ" نے ان سب کو پکڑ لیا۔ انڈین تو بڑی جدوجہد سے جان بچانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کے گھوڑے اس کی نظروں کے سامنے پانی میں غائب ہو گئے۔ مقامی انڈین لوگوں نے کہا کہ گھوڑوں کو NAITAKA پکڑ کر لے گیا ہے جبکہ غیر مقامی لوگوں نے اسے اوگوپوگو کی کارستانی قرار دیا جو اس بلا کا دوسرا نام ہے۔
۱۹۶۰ء تک جھیل کی یہ بلا بین الاقوامی طور پر مشہور ہو گئی اور لندن میں اس پر گیت بھی لکھا گیا۔
کینیڈا کے محکمہ ماہی گیری کے گشتی دستے کے ایک کپتان نے اوگوپوگو کا حلیہ یوں بیان کیا کہ وہ ٹیلی گراف کے ایسے کھمبے سے مشابہ ہے جس کے آگے دنبے کا سر لگا ہو۔
وان کوور کی رہنے والی ایک عورت نے جو جھیل میں تیر چکی تھی بتایا "میں یہاں اجنبی ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتہ تھا کہ ایسی کوئی چیز موجود ہے لیکن میں نے اسے صاف دیکھا۔ سرگائے یا گھوڑے کی طرح تھا بڑا دلچسپ منظر تھا بدن کے دو ابھار دو بڑے پہیوں کی طرح دمک رہے تھے۔ اس کی پشت پر آرے کی طرح کے دندانے تھے سورج اس پر چمک رہا تھا اور وہ بڑا دلکش دکھائی دے رہا تھا وہ تین مرتبہ اوپر آیا اور پھر غائب ہو گیا"۔
جولائی ۱۹۵۹ء میں R.H. MILLAR نے اپنے ذاتی اخبار میں ۲۰ تاریخ کو اوگوپوگو دیکھنے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد سے کوئی خاص قابل ذکر اطلاع نہیں ملی اور ۱۹۶۴ء میں اوگوپوگو خبروں سے غائب ہو کر رہ گیا۔
تاہم ۲۰ جولائی ۱۹۸۶ء کو ایڈمنڈ نامی شخص نے اوگوپوگو کو دیکھنے کا دعویٰ کیا۔ اس کا اندازہ ہے کہ جانور ۵۰ سے ۶۰ فٹ تک لمبا تھا اور کسی آبدوز کی طرح پانی سے نمودار ہوا اور اوپر سطح اس کی پشت کے چھ کوہان دیکھنے میں آئے جن کے درمیان ۱۰، ۱۰ انچ کا فاصلہ تھا۔
کہتے ہیں کینیڈا سے جھیل کی بلا کی روایت جنوب میں منتقل ہوئی مگر گوروں سے پہلے مقامی شوشون انڈین لوگوں کی بات کوئی سنجیدگی سے سننے کو تیار نہ ہوتا تھا جو طوفانوں کی نگہبان ارواح کے فرستادہ آبی حیوان کا عام طور پر ذکر کرتے تھے۔
۱۸۶۰ء میں سالٹ لیک سٹی کے اخبار ڈیزرٹ نیوز نے ایک معزز شہری کے حوالے سے یہ خبر دی کہ وہ جھیل BEAR LAKE کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے کوئی چیز دکھائی دی۔ وہ سمجھا کہ کسی آدمی کی لاش پانی پر تیر رہی ہے وہ گھوڑے کو لے کر آگے بڑھا تو اس نے ایک ایسا جانور دیکھا جسے اس نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔
اس بلا کا صرف سر ہی دکھائی دیا جو ادھر ادھر حرکت کرتا تھا۔ جب پانی کی لہریں اس سے ٹکرا کر گزر جاتیں تو یہ ناک یا منہ سے پانی خارج کر دیتا۔ اس کے پیچھے نما کان بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اگلے روز یعنی ۲۸ جولائی کو ایک آدمی اور تین عورتوں نے اسے جھیل میں تیرتے دیکھا یہ جانور تو پانی میں اتنی تیزی سے تیرتا جا رہا تھا کہ اس رفتار سے تو خشکی پر کوئی گھوڑا بھی نہیں دوڑ سکتا۔ اس بلا کو بعد ازاں کئی اور افراد نے بھی دیکھنے کا دعویٰ کیا۔
جون، جولائی ۱۹۴۱ء میں IDAHO کی LAKE PAYETTE میں ۳۰ سے زائد افراد نے مختلف مواقع پر جھیل کے پانیوں میں کوئی غیر معمولی جانور دیکھا مگر تضحیک کے خوف سے منہ بند رکھا۔ مگر تھامس روجرز جو بوائس شہر کا آڈیٹر تھا خاموش نہ رہ سکا "عفریت ۵۰ فٹ لمبا تھا اور ۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بل کھاتا تیرتا جا رہا تھا..... اس کا سر جو کسی مگرمچھ سے مشابہ تھا پانی سے ۱۸ انچ کے قریب باہر نکلا ہوا تھا۔ میرا خیال ہے اس کی لمبائی کوئی ۳۵ فٹ کے قریب ہو گی"۔
جھیل کے اس حیوان کو سلائمی سلم SLIMY SLIM کا نام دیا گیا۔ روجرز کی اطلاع کے بعد کئی لوگ کیمرے لئے جھیل پر آئے کہ سلائمی سلم کی

ایک تصویر اتار لیں مگر لطف کی بات یہ ہے کہ یہ بلا ایسے غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

شمالی امریکہ کے دوسرے علاقوں کی جھیلوں سے بھی اطلاعات آنے لگیں مونٹانا کی جھیل فلیٹ ہیڈ نواڈا کی جھیل والکر، کیلے فورنیا کی جھیل فالسم اور ورمونٹ کی جھیل چیمپلین ایسی ہی مشہور جھیلیں ہیں۔ جنوبی کیلی فورنیا کے علاقے مانٹری MONTEREY کے علاقے سے "سان کلیمنٹ" کے "عفریت" جسے مانٹری کا بوڑھا آدمی بھی کہا جاتا ہے کی اطلاعات عام طور سے ملتی رہی ہیں۔ ورمونٹ کی جھیل چیمپلین کے عفریت کا نام چیمپ ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ اور کینیڈا کے درمیان ۱۰۰ میل ایک آبی ذخیرہ ہے۔ جسے چیمپلین کہا جاتا ہے۔ ۳۰ راگست ۱۸۷۸ء کو چھ افراد یہاں پکنک منانے آئے تو انہوں نے جھیل میں ایک عجیب سا جانور دیکھا۔ اس کے سر کے عقبی حصے میں دو تہیں نمایاں تھیں۔ سر کے علاوہ اس کی دم پر واقع دو فولڈ سر سے ۵۰ فٹ کے فاصلے پر پانی کی سطح سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس جانور کو CHAMP کا نام دیا گیا۔ تب سے بے شمار لوگوں نے چیمپ کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان کے مطابق یہ بڑا سا سانپ نما جانور ہے۔ جو شاید سکاٹ لینڈ کے نیسی کا کوئی بھائی بند ہے۔[21]

جوزف زارزنسکی نامی شخص ۱۹۷۴ء سے مسلسل اس بلا کی حفاظت اور تلاش کے اقدامات میں مصروف ہے۔

فرانس، آسٹریلیا، ارجنٹینا، کے علاوہ دنیا کے بیشتر علاقوں سے غیر شناختہ آبی مخلوق کی اطلاعات موصول ہوتی رہتی ہیں۔

سکنڈے نیویا کی جھیلوں میں کوئی روایتی جانور پایا جاتا ہے۔ ۱۸۶۰ء میں انگریز مصنف بیرنگ گولڈ نے یہاں کے معزز اور قابل بھروسہ افراد سے ان کی آنکھوں دیکھی شہادتیں قلم بند کیں۔ وہ لوگ جھیلوں کی اس مخلوق کو SKRIMSL کہتے ہیں۔ بیرنگ نے تحریر کیا کہ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کی بیان کردہ جزئیات میں بھی اختلاف نہیں ہے اور یہی بات اس امر کو یقینی بناتی ہے کہ SKRIMSL ایک حقیقی جانور ہے۔

یہی مصنف ناروے کی جھیل SULDAL کے قریب رہنے والوں کی زبانی جھیل کی بھیانک بلا کا ذکر کرتا ہے جو لوگوں کو اکثر ڈراتی ہے۔ اس کا سر کسی کشتی جتنا بڑا ہے جسم سیلا سیلا سا اور خاکی مائل بھورے رنگ کا ہے۔

سویڈن کی جھیل سٹراجو STROSJO کے عفریت کو ایک ماہر حیوانات ڈاکٹر پیٹر اولسون Dr. Peter Olsson نے ان گنت بار دیکھنے کی اطلاعات دیں اس بلا کا نام LEVIATHAN ہے جو سرخ رنگ کی بتائی جاتی ہے۔ شکل سے یہ غیر معمولی جسامت کا سمندری گھوڑا نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے ۱۸۳۹ء میں چند کسانوں کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ جھیلوں سے منسوب تمام بلاؤں میں اسے سب سے تیز رفتار بتایا گیا ہے۔ اولسون کے مطابق یہ ۴۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر سکتی ہے۔ نیویارک ٹائمز کی ۱۹۴۶ء کی اشاعت میں اسے سب سے زیادہ عجیب مخلوق کا نام دیا گیا۔ اس صدی میں بھی اس کے دیکھے جانے کی اطلاع کئی مرتبہ دی گئی ہے۔ سویڈن کے سیاحت کے محکمے نے اس کی شہرت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے اور اس بلا کی رنگین تصاویر بنا کر فروخت کی جارہی ہیں۔

ماسکو یونیورسٹی کے سائنس دانوں پر مشتمل ایک ٹیم کو ۱۹۶۴ء میں مشرقی سائبیریا کے معدنیاتی ذخائر کی تلاش کے لئے بھیجا گیا ان لوگوں نے جھیل خائر کے کنارے خیمے لگالئے۔ کافی عرصے سے یہ افواہیں گردش میں تھیں کہ اس جھیل میں کسی غیر شناختہ مخلوق کا بسیرا ہے۔ ظاہر ہے سائنس دان ان باتوں کو خرافات پر محمول کرتے تھے۔ سائنس دانوں کی اس ٹیم کا ایک رکن ماہر حیات N. GLADKIKH پڑاؤ سے نکل کر جھیل سے پانی بھرنے کے لئے آگے بڑھا تو بھونچکا رہ گیا۔

وہ خود حیوانات سے متعلق خاصی شدھ بدھ رکھتا تھا مگر ایسی مخلوق تو اس نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ اس کا ایک ننھا سا سر تھا۔ لمبی سی گردن اور بھاری بھرکم سیاہ جسم جس کی پشت پر ایک عدد پنکھ بھی تھا۔ گلاڈ کخ ڈر کر واپس دوڑا اور اپنے ساتھیوں کو خبر کی اور وہ لوگ کیمرے اور بندوقیں لئے وہاں آئے مگر اس وقت تک وہ جانور پانی میں غائب ہو چکا تھا۔

چند روز بعد ایک موقع پر ٹیم کے تمام افراد نے مشترکہ طور پر اس عجیب الخلقت جانور کو دیکھا اور وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ یہ کوئی غیر شناختہ حیوان ہے۔[22]

تبت کی WENBU جھیل کے کنارے چینی کمیونسٹ پارٹی کے ایک افسر نے اپنی آنکھوں سے یہ دہشت ناک منظر دیکھا کہ ایک کریہہ الصورت حیوان جھیل سے نمودار ہوا اور ایک عدد یاک (تبت کا بیل نما جانور) پکڑ کر لے گیا۔ اس بلا کی ساخت کسی ڈائنوسور سے مشابہ تھی۔

منچوریا میں چنگ بائی کے کوہستانی علاقے میں ۱۹۸۰ء میں ایک چینی مصنف نے دو مرتبہ ایک غیر شناختہ آبی مخلوق دیکھی۔ یہ چھ فٹ لمبا طویل گردن والا جانور کوئی خزندہ (رینگنے والا) جانور تھا۔ اس چینی مصنف LEI JIA کی تصدیق موسمیات کے محکمہ کے ۳ افسروں نے بھی کی جنہوں نے نہ صرف اس جانور کو دیکھا بلکہ اس پر گولی بھی چلائی تھی۔

چین کے شمال مشرقی صوبے جلن میں سیاحوں اور موسمیات کے دفتر کے عملے نے بارہا مقامی جھیل میں بطخ کی چونچ کی طرح کے منہ والے بہت بڑے عفریت کو جھیل کی سطح پر کسی موٹر بوٹ کی مانند تیرتے دیکھا ہے۔[23]

پہلے پہل اکا دکا عینی شہادتوں کو درخود اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ مگر جب بڑی تعداد میں اور قابل بھروسہ معزز افراد بھی کسی غیر معمولی جسامت کی حامل آبی مخلوق کا تذکرہ کرتے ہیں تو توجیہات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جن میں سے اکثر خاصی معقول ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جھیل میں کسی بڑی مچھلی کو دیکھا گیا ہو سکتا ہے۔

سٹرجیان مچھلی اس کی عمدہ مثال ہے۔ جو ۱۰ فٹ جسامت کی عام طور پر دیکھی گئی ہے۔ جبکہ وافر خوراک اور کھلے ماحول میں اس کی جسامت میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ کینیڈا کی جھیل سٹین میں ۱۹۶۵ء میں ایک ۲۲ فٹ لمبی سٹرجیان مچھلی دیکھی گئی ایک مزے کا قصہ کیلی فورنیا کا ہے۔ وہاں کی ایک جھیل شانفورڈ میں اکثر ایک غیر معمولی جسامت کی آبی مخلوق دیکھے جانے کی اطلاع ملتی۔ ۱۹۸۴ء میں ڈیم کی مرمت کے لئے جھیل کا پانی نکالا گیا تو ساڑھے چھ فٹ لمبی سٹرجیان پکڑ لی گئی جس کا رنگ سفیدی مائل تھا۔

واشنگٹن کی جھیل واشنگٹن کے بارے میں مشہور تھا کہ اس میں بطخیں کھانے والی بلا موجود ہے۔

نومبر ۱۹۸۷ء میں یہ روایت اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئی جب جھیل سے ۱۱ فٹ لمبی اور آدھا ٹن وزنی مردہ سٹرجیان مچھلی نکالی گئی۔ اس طرح روس میں دریائے وولگا سے ایک سٹرجیان پکڑی گئی جو ۲۴ فٹ لمبی تھی اور ۳۲۴۱ پونڈ وزنی تھی۔

مگر ان دریافتوں کے باوجود ایسی بات بعید از امکان نہیں کہ کرہ ارض کے آبی ذخائر میں ایسی حیرتناک مخلوق موجود ہو جو ابھی تک سائنٹفک شناخت سے محروم ہو۔ تاہم جھیل کے عفریتوں کی تلاش اور بھی دشوار ہو چلی ہے اس کا اہم سبب تیزابی بارشیں ہیں جنہوں نے ممکنہ طور پر جھیلوں کی حیوانی دنیا ختم کر کے رکھ دی ہے۔ سکنڈے نیویا اس کی عام مثال ہے جہاں کی بیشتر جیلوں کی مچھلیاں تیزابی بارش کے سبب مکمل طور پر ہلاک ہو چکی ہیں۔

# حوالہ جات


باب پنجم

۱۔ Ghosts By Peter Haining P:101

۲۔ ایضاً

۳۔ دیکھئے "جنات"

۴۔ دیکھئے "جنات"

۵۔ The Book Great Mystries P:392

۶۔ Great Mystries John Great P:92

۷۔ Modern Mystries of the world P:198

۸۔ ایضاً ص ۱۹۷

۹۔ ایضاً ص ۳۰

۱۰۔ سائنس میگزین ۵۲ ص ۹

۱۱۔ World Book Encyclopedia vol A:

۱۲۔ World of Incredible but true P:189

۱۳۔ ایضاً ص ۲۵۹

۱۴۔ ایضاً ص ۲۵۹

۱۵۔ Modern Mystries of the world P:295

۱۶۔ ایضاً ص ۲۹۵

۱۷۔ ایضاً ص ۲۹۷

۱۸۔ The Book of Great Mystries P:108

۱۹۔ Mysteries of the world P:121

۲۰۔ People's Alamanac II P:1279

۲۱۔ World of incredible But True P:228

۲۲۔ ایضاً ص ۲۳۳

۲۳۔ ایضاً ص ۲۴۵

باب ششم

# جنگیں، جرائم، حوادث
# اور
# ایجادات

# نپولین کا انجام

۱۸۲۱ء میں یورپ کا مردِ آہن نپولین بونا پارٹ افریقہ کے قریب سینٹ ہیلنا کے جزیرے میں قید کے دوران معدے کے سرطان کی وجہ سے موت سے ہمکنار ہوا اور تاریخ کا عظیم باب رقم کر گیا۔ تاریخ میں نپولین کا یہ انجام واضح طور پر درج ہے۔ مگر شواہد کچھ اور کہتے ہیں۔ نپولین ہیلنا میں ہلاک نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس کی جگہ اس کا ایک ہم شکل مرا تھا۔

فرانس میں اپنے عہد کے عروج میں نپولین نے پورے یورپ میں اپنے آدمی بھجوا دیئے تھے کہ اس کے ہم شکل افراد کو جمع کیا جائے۔ بڑی تگ و دو کے بعد ایسے چار آدمی جمع کر لئے گئے انہیں میں سے ایک واٹرلو سے پیشتر زہر دے کر مار دیا گیا۔ یا اس نے خودکشی کر لی۔ دوسرا آدمی گھوڑے سے گر کر ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ اس لئے اس کی بیساکھیوں نے نپولین کا ہم شکل ہونے کے باوجود اس کی اہمیت ختم کر دی۔

دو افراد باقی بچے تھے اور یہ نپولین کے اس قدر ہم شکل تھے کہ مماثل جڑواں دکھائی دیتے تھے۔ دونوں نپولین کے عہد حکومت کے خاتمے اس کے عملے میں شامل رہے۔ ان میں سے ایک شخص فرانکوئس یوجین روبیود تھا۔ جس وقت نپولین واٹرلو میں شکست کھا کر گرفتار ہوا تو روبیود اپنے آبائی گاؤں بالے کورٹ چلا گیا اور اپنی بہن کے ہمراہ کھیتی باڑی کا کام سنبھال لیا۔

ادھر برطانیہ اور فرانس میں نپولین کے مخالفین نے نپولین کو جلاوطن کر کے فرانسیسی فوج کی نگرانی میں جزیرہ سینٹ ہیلنا میں نظر بند کر رکھا تھا اور سمندر میں برطانوی بحریہ کے جہاز گھوما کرتے تھے۔ تاکہ نپولین کو فرار سے روکا جا سکے۔ جزیرے پر متعین ایک فرانسیسی جنرل گور گارڈ سے فرانس کے چند دولت مند افراد کے قریبی تعلقات تھے۔ اور یہ لوگ نپولین کے دوست تھے۔ ان کا پروگرام نپولین کو آزاد کروانے کا تھا۔

۱۸۱۸ء میں جنرل گور گارڈ جزیرے پر اپنی ڈیوٹی سے سبکدوش ہو کر فرانس چلا گیا۔ گور گارڈ کے فرانس جانے کے دو ماہ بعد دریائے میوسی کے کنارے پر واقع گاؤں بالے کورٹ میں غریب کسان روبیود کے گھر کے آگے ایک شاندار بگھی آ کر رکی۔ اس گاڑی میں کون تھا؟ اور اس نے کسان سے کیا باتیں کیں گاؤں والوں کو اصل قصے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ بس اتنا پتہ تھا کہ یہ شخص کوئی امیر کبیر ڈاکٹر ہے جو روبیود کا پتہ اس لئے پوچھتا پھر رہا ہے کہ اسے تجربات کے لئے چوہے چاہئیں۔ اس نووارد کے جانے کے کچھ عرصہ بعد اسی سال موسم خزاں میں ایک رات روبیود اپنی بہن کے ہمراہ اچانک پراسرار طور پر غائب ہو گیا۔ نپولین کے ہم شکل کی تلاش کرنے والے سراغرسانوں کو کچھ سراغ کئی برس بعد ملا۔ روبیود کی بہن ٹورز میں ایک عالیشان مکان میں رہائش پذیر تھی۔ اس سے پوچھا گیا کہ بھائی کہاں ہے تو اس نے کہا کہ وہ لمبے سفر پر گیا ہوا ہے۔ کب؟ کہاں؟ کیسے؟ کیوں؟ کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسے غریب کسان کا ایسا طرز رہائش اور یہ ٹھاٹ باٹ کیا معنی رکھتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس کے تمام اخراجات ایک ڈاکٹر برداشت کر رہا ہے۔ جو ڈاک سے لگی بندھی رقم بھجوا دیتا تھا۔ (حالانکہ شواہد کے مطابق کوئی شخص ہرکارے کے ہاتھ دستی رقم بھجوا رہا تھا)۔ روبیود کہاں تھا؟

جس زمانے میں روبیود اپنی بہن کے ساتھ لاپتہ ہوا تھا اسی سال ۱۸۱۸ء میں ویرونا (اٹلی) میں ایک اجنبی شخص وارد ہوا۔ اس نے ایک چھوٹی سی دکان

کھول لی تھی۔ اپنا نام وہ ریوارڈ بتاتا تھا۔ مگر اس کی شکل نپولین سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ اس کے کاروباری شریک کار پٹروکی کے علاوہ اور لوگ بھی اسے شہنشاہ کہا کرتے تھے۔ ریوارڈ کا کہنا تھا کہ وہ شمالی فرانس سے آیا ہے۔ یہاں اس نے ایک بیوہ سے جواہرات کے تاجر کی حیثیت سے اپنا تعارف کروایا تھا اور سرمایہ دار شخص پٹروکی کو کاروبار میں شامل کر لیا تھا۔ پٹروکی اور اس کے دوستوں کا بیان ہے کہ اگست ۱۸۲۳ء میں ایک ڈاکیہ ریوارڈ کو مہر بند لفافہ دے گیا تھا۔ اس میں موجود پیغام پڑھ کر ریوارڈ بڑا پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے پٹروکی کو ایک مہر بند لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ اسے ضروری کام سے جانا ہے۔ اور اگر وہ تین ماہ میں نہ لوٹے تو یہ لفافہ فرانس کے بادشاہ کو پہنچا دیا جائے اور وہ خود بحری جہاز پر سوار ہو کر نامعلوم منزل کی جانب چلا گیا۔ اٹلی سے ریوارڈ کی روانگی کے بارہ روز بعد ستمبر کی چار تاریخ کو رات گیارہ بجے آسٹریا میں شون برن کے محل کے محافظوں نے دیکھا کہ کوئی خفیہ طریقے سے اندر داخل ہونا چاہتا ہے۔ انہوں نے مشکوک شخص پر گولی چلا دی زمین پر گھسٹنے والے شخص کے پیٹ میں گولی لگی اور وہ وہاں دم توڑ گیا۔ محل کے اندر نپولین بونا پارٹ کے بیوی بچے رہ رہے تھے۔ اور نپولین کا بیٹا سرخ بخار میں مبتلا بسر مرگ پر پڑا تھا۔ نہ جانے نپولین کی بیوی نے یہ عجیب خواہش کیوں ظاہر کی کہ بلا اجازت داخل ہونے والے مشکوک شخص کی لاش ان کے آبائی قبرستان میں دفن کی جائے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اس اجنبی کے پہلو میں نپولین کا بیٹا دفن ہوا۔

سینٹ ہیلنا کے جزیرے میں نپولین کی حالت عجیب ہو چکی تھی۔ فرانس کا شہنشاہ شستہ زبان بول نہیں پا رہا تھا۔ اس کی تحریر میں بھی فرق آ چکا تھا۔ محافظوں کا خیال تھا کہ یہ سب قید کا اثر ہے ۱۸۲۱ء میں مئی کی ۵ تاریخ کو یہ شخص معدے کے کینسر سے ہلاک ہو گیا۔ کیا یہ حقیقی نپولین تھا یا اس کا ہم شکل ریورڈ۔ اٹلی سے روانہ ہونے والا ریورڈ کبھی واپس نہیں لوٹا۔ کیا وہ حقیقی نپولین تھا جو اپنے بیٹے سے آخری بار ملنے گیا اور آسٹریا میں محل کے محافظوں کے ہاتھوں قتل ہوا؟

ویرونا (اٹلی) کے سرمایہ دار پٹروکی نے وہ لفافہ فرانس کے بادشاہ تک پہنچا دیا۔ ۳۰ برس بعد پٹروکی نے حلفیہ بیان دیا کہ اسے ایک لاکھ سونے کے سکے صرف اس بات کے لئے دیئے گئے تھے کہ وہ ریورڈ کی شناخت کبھی ظاہر نہ ہونے دے جو فی الحقیقت ہیلنا سے فرار ہو جانے والا نپولین ہی تھا۔[1]

# ہٹلر کی زندگی کے پراسرار گوشے

جرمنی کے مرد آہن ایڈولف ہٹلر جس نے نسلی برتری کے عقیدے کے زیر اثر عالم انسانیت کو دوسری عالمگیر جنگ میں جھونک دیا کے بارے میں یہودی پروپیگنڈے نے اسے دنیا کے سامنے ایک چیستان بنا دیا ہے۔ اس کی شخصیت پر پراسراریت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ آہنی عزم وارادے کے مالک اس انسان نے چند برسوں میں اہل جرمنی کو فرش سے عرش پر پہنچا دیا تھا جبکہ باقی یورپ افراط زر کے شکنجے میں گرفتار تھا۔ اس کے نفسیاتی تجزیئے نے ماہرین کو ایک عرصے سے پریشان کر رکھا تھا۔ اس کے عقائد کیا تھے؟ واضح طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ آج یہ بات ناقابل یقین دکھائی دیتی ہے کہ کرہ ارض کو جھنجھوڑ دینے والا خوفناک ڈکٹیٹر انتہائی توہم پرست تھا اور دیومالائی روایات پر اندھا یقین رکھتا تھا۔ کیا یہ قابل قبول ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ چھیڑنے کا حوصلہ اسے سحر و سیمیا کی رسومات اور ان کے اثرات پر یقین محکم نے دیا تھا نہ کہ زبردست فوجی قوت نے! وہ ویگنر اوپیرا کے سٹیج ڈراموں کو بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا جہاں دیومالائی کرداروں کے ذریعے عروج و زوال کے قصے بیان ہوتے تھے۔

۱۹۰۹ء میں سحر اور اس کے متعلقات سے ہٹلر کو خصوصی دلچسپی حاصل ہو گئی۔ اس کے قدم سحری مذہب کے ماننے والوں کے علاقے میں جا پڑے۔ ڈاکٹر جارج لینزوان لیبن فیلز Dr. Jorg Lanz Von Leibenfels نے عیسائی مذہب ترک کر کے ڈینیوب کے قریب ایک قلعے میں اپنے سحری مذہب کی پراسرار رسومات انجام دینے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہٹلر کی سحر پسند طبیعت نے یہاں بڑی توانائی حاصل کی اور اس کے اثرات مرتے دم تک اس کا ساتھ نہ چھوڑ سکے۔

۱۹۱۲ء میں ویانا کے ایک ماہر معاشیات ڈاکٹر والٹرسٹین نے سری علوم پر کتابیں فروخت کرنے والے ایک دکاندار سے ایک پرانی کتاب خریدی۔ اس کتاب میں عیسیٰ (ع) سے منسوب مقدس پیالے سے متعلق ایک داستان بڑے دلفریب انداز میں بیان کی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے کتاب میں جابجا پنسل سے لکھے

ہوئے سحراور دیومالا پر مبنی متعلقہ نوٹ دیکھے، جنہیں پچھلے خریدار نے تحریر کیا تھا۔ ڈاکٹر نے کتب فروش سے کتاب کے سابق مالک کا پتہ لیا تو اسے جس شخصیت کا سامنا کرنا پڑا وہ ایڈولف ہٹلر ہی تھا۔

ہٹلر نے ڈاکٹر کو قدیم دیومالائی علوم سے متعلق اپنی معلومات سے حیران کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر کو بتایا کہ مسیحی مذہبی روایات میں ایک نیزے کا تذکرہ ملتا ہے۔ روایات کے مطابق مصلوب مسیح کی پسلیوں کو رومی سپاہی نے اس نیزے سے چھیدا تھا۔ تب سے اس نیزے میں پراسرار طاقتیں داخل ہو گئی ہیں۔ ہٹلر کا کہنا تھا کہ اسے ان روایات پر یقین کامل ہے اور وہ ہیپس برگ کے عجائب خانے میں اس قدیم نیزے کو دیکھ چکا ہے۔ ویٹیکن اور پیرس کے دو عجائب خانوں میں بھی رومی سپاہی سے منسوب دو نیزے موجود تھے۔ لیکن ہٹلر کو ہیپس برگ کے میوزیم میں موجود نیزے پر یقین آ چکا تھا کہ یہی اصل نیزہ ہے جو نسل در نسل صدیوں سے آسٹریا کے شاہی خاندان میں چلا آ رہا ہے اس کی تاریخ روایات کی رو سے یہ تھی کہ بادشاہ شارلیمن اس کی برکت سے ۴۷ جنگوں میں فتح یاب ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ سے یہ نیزہ نکلا تو شارلیمن کو موت نے آلیا۔ پھر سیکسن بادشاہ ہنروچ سے یہ نیزہ فریڈرک بار بروسہ کے ہاتھ لگا۔

ڈاکٹر والٹر سٹین کو ہٹلر کی دماغی حالت پر شبہ ہوا تھا کیونکہ ہٹلر نے اسے بتایا کہ ویانا میں نمائش کے دوران اس نے جس لمحے مقدس نیزے کا دیدار کیا عین اسی لمحے عجیب کیفیات طاری ہو گئیں۔ یوں لگا جیسے نیزہ کوئی مقدس شے ہے۔ "مجھے اپنی عظیم منزل کی خبر ہو گئی اور بلاشک و شبہ مجھے ادراک ہو گیا کہ ایک روز میری رگوں میں موجود خون میرے لوگوں کی ملی روح بن جائے گا۔"

ڈاکٹر کو اندازہ نہیں تھا کہ اس سرپھرے نوجوان کی باتوں میں کس قدر صداقت ہے! دس برس بعد ہٹلر جرمنی کی ایک سیاسی پارٹی کی تنظیم نو کر رہا تھا تو اس وقت بھی اس کے دیومالائی تصورات مکمل طور پر اس کے دل و دماغ پر قابض تھے، اسی لئے تو اس نے سواستیکا جیسی علامت کو اپنی پارٹی کا نشان قرار دیا۔ امنامیاتی عقائد اور مخفی علوم نے اسے انتہا درجے کا توہم پرست بنا دیا تھا۔ ہٹلر کے وزیر البرٹ سپیئر نے اس ضمن میں ایک عجیب بات بتائی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جس وقت ہٹلر میونخ میں جرمن آرٹ کے عجائب خانے کا سنگ بنیاد رکھ رہا تھا تو چاندی کا ہتھوڑا اس کے ہاتھ سے ٹوٹ گیا۔ ہٹلر سخت خوفزدہ ہو گیا اور اس نے سپیئر سے کہا کہ یہ بڑا برا شگون تھا پھر کامل تین ماہ ہٹلر کا وہم اسے بے آرام کرتا رہا مگر جنوری ۱۹۳۴ء میں جب اسے عجائب خانے کے معمار اور اپنے دوست پال لڈوگ ٹروسٹ کی ناگہانی موت کا علم ہوا تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ بلا ٹل گئی ہے کیونکہ اس نے ٹروسٹ کو نگلنا تھا مجھے نہیں۔ اس سال ہنرخ ہملر نازی تحریک کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اس نے بھی حد ہی کر دی اور تمام مروجہ یہودی عیسائی مذہبی رسومات اور تہواروں کو بند کراتے ہوئے اپنے خود ساختہ تہوار رائج کرانے کی کوشش کی۔ خود ہٹلر کو بھی اس نائب نے خاصا پریشان کیا کیونکہ ہملر اپنے آپ کو ہنرچ کا دوسرا جنم قرار دیا تھا۔ (ہنرچ سیکسن سلطنت کا اولین بادشاہ تھا اور ہیپس برگ میں موجود مقدس نیزہ اس کی ملکیت تھا)

۱۹۳۸ء میں ہٹلر جرمنی کے چانسلر کی حیثیت سے ویانا میں عوام کے سامنے آسٹریا کو نازی سلطنت میں ضم کرنے کا اعلان کر رہا تھا تو اس کے سپاہی پیچھے عجائب گھر میں داخل ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے تاکہ ہٹلر کی پرانی خواہش کے مطابق مقدس نیزہ اس کے حوالے کیا جائے۔ چنانچہ مقدس نیزے کے ساتھ ساتھ دوسرا تمام سامان بھی نیور مبرگ میں نازیوں کی سینٹ کیتھرین چرچ میں منتقل کر دیا گیا۔ ہٹلر نے نیزے پر دسترس حاصل کر کے اگلے ہی سال یورپ پر ہلہ بول دیا۔ شاید اسے یقین محکم تھا کہ وہ مقدس نیزے کی برکتوں اور پراسرار قوتوں سے نیزے کے گزشتہ جنگجو ملکوں کی مانند فتح یاب ہو گا۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی چار برس میں نازی افواج کی کامیاب پیش قدمی جاری رہی۔ حتیٰ کہ اچھے خاصے سلجھے ہوئے لوگ ہٹلر کی مافوق الفطرت قوتوں کے قائل ہو گئے۔

ہٹلر کی حرکتیں عجیب تر ہوتی گئیں اس نے برلن میں باقاعدہ مخفی علوم کا بیورو قائم کیا جہاں بڑے بڑے منجموں اور روحیت کے ماہرین کو جنگ میں مشاورت کے لئے طلب کر لیا گیا۔ اب ہوتا یوں تھا کہ ہٹلر صاحب حملے سے بیشتر ان لوگوں سے مشورہ کر رہے ہوتے اور ادھر باہر جنرل سر پکڑے ہٹلر کی واپسی اور احکامات کے انتظار میں سوکھ رہے ہوتے کیونکہ منجموں کی رائے کو آخر الامر فوقیت حاصل تھی۔ دراصل مسٹر انیاک نامی شخص نے ایک مرتبہ نقشے پر ہٹلر کو اپنی روحی قوت کی مدد سے "پرنزیوجین" نامی لڑاکا بحری جہاز کی اصل پوزیشن بتلائی تھی یہ جہاز ایک خفیہ مشن پر بھیجا گیا تھا۔ تب سے ہٹلر اس کی روحی صلاحیتوں کا معترف ہو گیا تھا اور یہ شخص نازی بحریہ کو کھلے سمندروں میں بیٹھے بیٹھائے خواہ مخواہ دوڑا دیا کرتا تھا کہ دشمن موجود ہے اسے جالو۔ یہ لوگ وہاں جاتے تو حسب توقع دور دور تک خالی سمندر ان کا منہ چڑا رہا ہوتا۔

یہ لوگ ماہرین روحیت اور انتر جامیوں کے ان غلط اندازوں سے اکثر اس قسم کے نامعقول کام کرتے رہتے۔ ادھر تو ہٹلر کے روحی ہرن ایسے گل کھلا

رہے تھے ادھر برطانیہ والوں کو بھی عجب عجب کام کرنے پڑ رہے تھے جب سے انہیں پتہ چلا تھا کہ ہٹلر کس طرح مخفی علوم کے دعوے داروں سے مشاورت کر رہا ہے۔ تب سے چرچل اور اس کی جنگی کابینہ نے بھی خفیہ طور پر نجوم اور علوم مخفی کا شعبہ قائم کر لیا تھا تاکہ ہٹلر کے روحی مشیروں کی آراء کا قبل از وقت جائزہ لے کر جوابی کارروائی ممکن بنائی جائے۔ چرچل انتظامیہ میں ایک شخص بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ یہ تھا والٹر شین۔ وہی ماہر معاشیات جس نے ہٹلر سے اس کی نوجوانی میں ملاقات کی تھی اور ماورائیت پر اس کے خیالات سن کر اسے خبطی سمجھا تھا۔ یہ شخص نازیوں سے بڑی مشکل سے جان بچا کر لندن آ گیا تھا اور اس نے ہٹلر سے اپنی پرانی ملاقات کا کل احوال برطانوی ذمہ دار افسران سے کہہ دیا تھا اور انہیں بتا دیا تھا کہ ہٹلر پر ماورائیت اس قدر حاوی ہے کہ وہ منجموں کی باتوں پر سنجیدگی سے عملدر آمد کرے گا۔

شین کی بات درست تھی ہٹلر کو ماورائیت پر اس قدر بھروسہ تھا کہ ۱۹۴۵ء میں جب نازی سلطنت اتحادی افواج کے پیروں تلے تقریباً روندی گئی تھی تب بھی آخری ایام میں ہٹلر شدت سے کسی ایسے معجزے کے رونما ہونے کا منتظر تھا جو نازیوں کو بالکل ہی برباد ہو جانے سے بچا لے۔ جب اسے امریکی صدر روزویلیٹ کی اچانک موت کا علم ہوا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا کہ شاید یہی معجزہ ہے لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ نئے امریکی صدر کی پالیسی جرمنی کے خلاف اور بھی سخت تھی۔ مگر ابھی ایک امید باقی تھی۔ آخری امید۔

اکبوتر ۱۹۴۴ء میں اتحادی افواج کی بمباری سے نیورمبرگ کھنڈرات میں بدل رہا تھا۔ حق تو یہ تھا کہ شہری آبادی کو حفاظتی طور پر شہر سے نکال لیا جاتا مگر ہٹلر نے حکم دیا کہ ۲۲ ہزار ایس ایس دستوں، ۱۰۰ ٹینکوں اور آرٹلری کی ۲۲ رجمنٹوں کو نیورمبرگ میں تعینات کر دیا جائے۔ پھر حکم دیا گیا کہ کیتھرین چرچ سے تمام مقدس زیارتیں بمع نیزے کے ایک محفوظ تہہ خانے میں منتقل کر دیئے جائیں۔

اپریل ۱۹۴۵ء کو امریکی فوجی نیورمبرگ میں داخل ہو گئے چھوٹی بڑی جھڑپوں میں کئی نازی فوجی گرفتار ہوتے چلے گئے۔ پوچھ گچھ کے دوران ایک زخمی ایس ایس فوجی عہدیدار نے امریکیوں کو بتایا کہ اس کے عملے کے ہزاروں آدمیوں نے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں صرف اس لئے کہ ہٹلر کے احکامات کی تکمیل ہو جن کی رو سے ہر قیمت پر مقدس نیزے کو اتحادیوں کی دسترس سے دور رکھنا لازم تھا۔ امریکیوں کو جو یہ پتہ چلا تو لگے ادھر ادھر ڈھونڈنے۔ دس روز بعد لیفٹننٹ ولیم ہارن کی زیر قیادت یہ لوگ تہہ خانہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

تہہ خانے کے فولادی دروازے اور مضبوط دیواریں توڑ کر یہ اندر داخل ہوئے ایک جانب مقدس نیزہ نظر آ گیا ولیم ہارن نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ نیزے کے ایک فٹ لمبے پھل کے نیچے سونے کی زنجیر بندھی تھی جس کے دوسرے سرے پر زنگ خوردہ پرانا کیل بھی موجود تھا۔ جس کے بارے میں عیسائی کہتے تھے کہ یہ مسیح کو مصلوب کرنے کے لئے ٹھونکنے کے کام آیا تھا۔ اس وقت لیفٹننٹ یہ نیزہ لے کر اپنے ہیڈ کوارٹر چلا آیا جو بعد ازاں حکومت امریکہ کی ملکیت ٹھہرا۔

ہٹلر کو شاید علم نہیں تھا کہ دس روز قبل ۶ر اپریل کو جب وہ اپنی ۵۶ ویں سالگرہ منا رہا تھا تو ایک سچا نازی امریکیوں کو نیزے کی خبر دے رہا تھا مگر آج جونہی اسے خبر ملی کہ مقدس نیزہ چھن چکا ہے تو بالکل ناامید ہو گیا اور پستول چلا کر اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ یہ ۳۰ر اپریل کی رات تھی وہ رات جو قدیم سحری اقوام میں ظلمت کی علمبردار قوتوں کے جشن کے طور پر منائی جانے والی اہم ترین رات تھی۔②

# ٹائی ٹینک کی تباہی

اپریل ۱۸۹۸ء کی ایک خنک رات۔ دنیا کا سب سے بڑا، سب سے شاندار اور آرام دہ بحری جہاز ٹائی ٹن بحر اوقیانوس میں رواں دواں ہے۔ اس کے بارے میں دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ محفوظ بحری جہاز ہے۔ ایک مسافر سے عملے کے آدمی نے کہا "خود خدا بھی اس بحری جہاز کو نہیں ڈبو سکتا" لیکن آنے والے لمحات بڑے خوفناک ثابت ہوئے ایک ناقابل یقین سانحہ، جہاز ایک آئس برگ سے ٹکرا گیا۔ اور ۲۵ سو مسافر غرق ہو گئے۔ کیوں؟ ستر ہزار ٹن وزنی جہاز کے ہمراہ صرف ۲۴ حفاظتی کشتیاں تھیں۔ اتنے سارے مسافر کیسے بچائے جاتے؟

اتنا بھیانک حادثہ ہو گیا لیکن عوام الناس نے بالکل سوگ نہیں منایا! ! وجہ یہ کہ غرقابی کی یہ المناک داستان محض ایک فرضی قصہ تھا جو ایک انگریز مصنف مارگان رابرٹ سن نے اپنے ناول " ٹائی ٹن کی تباہی " میں بیان کیا۔[3]

مصنف کوئی خاصا مقبول شخص نہیں تھا تاہم چودہ برس بعد ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ حقیقت میں اپریل ۱۹۱۲ء کی ۱۴ تاریخ ہی تھی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ برطانیہ کا شہر آفاق بحری جہاز ٹائی ٹینک شمالی اوقیانوس میں ایک بڑے آئس برگ سے متصادم ہوا۔ رات کا وقت تھا۔ بڑی تعداد میں مسافر یخ پانی میں ڈوب گئے۔ کتنا بڑا المیہ تھا کہ ۴۷ ہزار ٹن وزنی ٹائی ٹینک کے ساتھ صرف ۲۰ عدد حفاظتی کشتیاں تھیں!

۱۸۹۸ء میں رابرٹ سن نے کیسی عجیب باتیں کی تھیں۔ افسانہ میں ٹائی ٹین تھا حقیقت میں ٹائی ٹینک۔ اصل اور افسانوی سانحہ دونوں اپریل کی ایک سرد رات کو بحر اوقیانوس میں ہی پیش آتے ہیں۔ دونوں جہاز بے پناہ مضبوط تصور ہوتے ہیں۔ دونوں پر مسافروں اور عملے کے افراد کی ایک بڑی تعداد سوار ہے۔ دونوں تیرتے ہوئے برفانی تودے سے ٹکرا کر غرق ہوتے ہیں۔ دونوں جہازوں کے افراد کی غرقابی کا سبب حفاظتی کشتیوں کی کم تعداد (افسانے میں ۲۴ حقیقت میں ۲۰) کیا یہ مشابہت محض اتفاقیہ تھی؟ کیا رابرٹ سن نے حادثے سے چودہ برس پیشتر اس امر کا "ادراک" کر لیا تھا؟

اس بھیانک حادثے میں برطانوی صحافی ڈبلیو ٹی اسٹیڈ بھی جان بحق ہوا۔ حادثے سے کچھ عرصہ قبل وہ لندن کے ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا تو اس نے ایک افسانہ شائع کیا جس میں کسی جہاز کی غرقابی کی کہانی درج تھی۔ جس کا صرف ایک مسافر ڈوبنے سے بچتا ہے اور یہ کہانی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے ساتھ اسٹیڈ نے لکھا " بالکل عین اسی طرح ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح ہو گا اگر مسافر کشتیوں کے ساتھ حفاظتی کشتیاں کم تعداد میں رکھی جاتی رہیں " کچھ عرصہ بعد اس نے ایک رسالے میں ایک آرٹیکل میں ایک کہانی بیان کی جس میں ایک جہاز آئس برگ سے ٹکرا کر تباہ ہو جاتا ہے کیا اسے بھی اصل ٹائی ٹینک کی تباہی کا خدشہ تھا؟ شاید! کیونکہ حادثے کے بعد مستقبل کا حال بتانے والے دو افراد کے بارے میں علم ہوا کہ انہوں نے اسٹیڈ کو ایک بار کہا تھا کہ وہ ایک یا دو سال کے اندر اندر امریکہ جانے کے لئے بحری جہاز میں سوار ہو گا۔ ایک نے کہا " میں ایک ہزار سے زیادہ لوگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ تم (اسٹیڈ) بھی انہی میں شامل ہو۔ وہ مدد کے لئے چیخ پکار کر رہے ہیں اور پانی میں جان بچانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نقصان اٹھا رہے ہیں۔ تم بھی۔ " اور اسٹیڈ ان باتوں کے باوجود ٹائی ٹینک میں سوار ہوا اور جان گنوا بیٹھا۔

اس وقت کی دنیا کے اس سب سے بڑے جہاز کی لمبائی ۲۶۹ میٹر تھی اس جہاز کی آرائش میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی تھی۔ اس کے کمرے اتنے نفیس اور آرام دہ سامان سے پر تھے کہ جہاز کو تیرتا ہوا مکان کہا جاتا تو بے جا نہ تھا۔ ماہرین کا کہنا تھا کہ یہ جہاز ڈوب ہی نہیں سکتا۔ یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ انگلینڈ سے اس کی منزل نیویارک تھی۔

جہاز کا کپتان اے جے سمتھ تھا۔ بحر اوقیانوس کے اس علاقے میں جہاز رانی کے تجربے میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس بدقسمت شخص کا ملازمت سے ریٹائر ہونے سے پہلے یہ آخری پھیرا تھا۔ روانگی کو چوتھا روز تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ ہر کوئی بے فکر تھا۔ کہتے ہیں جہاز کو وائرلیس سے اطلاع دی گئی کہ آگے برف ہے۔ مگر سنی ان سنی کر دی گئی۔ پھر کوئی چیخ کر پکارا کہ آگے برف ہے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ایک جانب سے برفانی تودے نے جہاز کی ۶ حفاظتی چادریں پھاڑ ڈالی۔ ۹۰ فٹ کا شگاف پڑ گیا۔ جہاز کی غرقابی یقینی ہو چکی تھی۔ مدد کے لئے پیغامات نشر کئے گئے۔ مگر بدبختی سر کھولے منڈلا رہی تھی۔ قریب سے گزرتے ہوئے دو جہازوں کی روشنیاں نظر آئیں مگر ایک بھی مدد کو نہ آیا۔ حفاظتی کشتیاں بہت کم تھیں۔ لوگوں کو حواس باختگی سے بچانے کے لئے بینڈ پر دھنیں بجائی جاتی رہیں۔ پہلے درجہ اول اور دوم کے مسافروں کو سوار کیا جاتا رہا۔ اور اس دوران جہاز کے زیریں حصہ میں موجود تیسرے درجے کے غریب مسافروں پر بندوقیں تان رکھی گئیں کہ وہ حفاظتی کشتیوں میں سوار ہونے کے لئے اوپر جا کر امیر مسافروں کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائیں۔ رات ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر جہاز عموداً کھڑا ہو گیا۔ بوائلروں کے گرنے کی زور دار آواز آئی۔ بچوں، عورتوں اور مردوں کی مدد کی حسرت ناک اور خوف سے بھری آوازیں بچ جانے والے ۷۰۵ افراد کی سماعتوں کا پیچھا کرتی رہیں پھر ڈوبتے جہاز کے ساتھ معدوم ہو گئیں۔

ان ۷۰۵ افراد کو ایک جہاز کارپاتھیا نے بچا لیا۔ چھیالیس ہزار تین سو اٹھائیس ٹن وزنی جہاز حادثے کے بعد ڈھائی گھنٹے میں غرقاب ہوا۔ یہ جہاز کس قدر بدقسمت تھا پہلے سفر میں ہی غرقاب ہو گیا۔ کوئی بات ضرور تھی۔ مسافروں میں سے بعض ایک کی طبیعت خواہ مخواہ گھبرا رہی تھی۔ عملے کے افراد کو ضروری سامان کی کمی کی شکایت تھی۔ جہاز کی بدقسمتی کی انتہا تھی کہ وہ اس زاویئے سے متصادم ہوا کہ ممکنہ انتہائی نقصان پہنچ سکے۔ محض اگر ۱۰ سیکنڈ پہلے وہ اپنا رخ تبدیل کر لیتا تو

تصادم سے بچ جاتا اور اگر ۱۰ سیکنڈ بعد مڑ گیا ہوتا تو سیدھا ٹکراتا جس سے اتنا نقصان متوقع نہیں تھا۔ مگر جہاز بڑے ہی غلط طریقے سے رگڑ کھا گیا تھا۔

کتنی جانیں ضائع ہوئیں؟ اس پر اختلاف ہے اندازاً ۲۲ سو مسافر سوار تھے۔ ایک برطانوی تحقیقاتی ادارے نے ۱۴۹۰ اور برٹش بورڈ آف ٹریڈ نے ۱۵۰۳ افراد کی ہلاکت کی اطلاع دی۔ امریکی کابینہ کی تحقیقاتی کمیٹی کا کہنا تھا کہ ۱۵۱۷ انسان جاں بحق ہوئے۔④

غرقابی کی اس داستان کے پیچھے بعض لوگ ایک اور کہانی بیان کرتے ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ دست شناس کیرو نے ایک شخص ڈگلس کا ہاتھ دیکھ کر اس سے کہا تھا کہ مصر کے سفر کے دوران اگر کوئی چیز خریدنے کے لئے کہے تو انکار کر دینا تاہم اس نے ایک عدد ممی خرید لی جو کسی قدیم مندر کے پروہتوں کی سربراہ آئندا کی بتائی جاتی ہے۔ اس ممی کا خریدنا تھا کہ ڈگلس کے برے دن شروع ہو گئے۔ پے در پے کی اموات، مسائل اور مشکلات سے گھبرا کر ڈگلس نے منحوس ممی اپنی ایک واقف کار مصنفہ کو دے دی مگر وہ بھی جلد ہی اس کی نحوست کی قائل ہو گئی اور ممی واپس کر دی۔ ڈگلس کو اس کے ایک دوست نے جو ماہر آثار قدیمہ تھا ممی کو برٹش میوزیم کے حوالے کرنے کا مشورہ دیا مگر اس ماہر آثار قدیمہ سمیت میوزیم کے عملے اور ممی کا خاکہ اتارنے والے مصوروں کی غیر متوقع اموات نے عجائب گھر کے افسران کو متوحش کر دیا اور فیصلہ کیا گیا کہ ممی نیویارک کے میوزیم میں رکھ دی جائے چنانچہ ممی کو ٹائی ٹینک بحری جہاز پر رکھوا دیا گیا مگر حنوط شدہ لاش اپنی نحوست کے زیر اثر بحری جہاز ٹائی ٹینک کو لے کر اوقیانوس کے تاریک پانیوں میں اتر گئی۔⑤

# لوسی تینیا کی غرقابی

۱۹۱۴ء میں یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ برطانیہ اور فرانس جرمنی سے پنجہ آزمائی کر رہے تھے۔ امریکہ الگ تھلگ تھا لیکن مئی ۱۹۱۵ء کی دوپہر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے امریکہ کو بھی پہلی جنگ عظیم میں گھسیٹ لیا۔ یہ واقعہ تھا، مسافر بحری جہاز لوسی تینیا کی غرقابی!

امریکہ جنگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ جب یورپ میں آگ اور خون کا کھیل جاری تھا۔ تو امریکی پرسکون حالات میں خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ امریکہ جنگی علاقوں سے بہت دوری پر واقع تھا۔ مگر برطانیہ کو امریکہ کی اس طرح غیر جانبداری ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی۔ اور وہ زور شور سے جرمنی کے خلاف پورے یورپ کو ہڑپ کرنے کے عزائم کا الزام لگا رہا تھا۔

ادھر امریکہ مکمل غیر جانبدار بھی نہیں تھا کیونکہ وہ جنگ عظیم اول کے دوران دونوں فریقین کو اپنا اسلحہ فروخت کر رہا تھا۔ لیکن یکم مئی کے اخبارات میں جرمنوں نے گویا امریکہ کو غیر جانبداری ختم کرنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ جرمن حکومت کی جانب سے نیویارک کے بڑے اخباری اشتہارات کا متن یہ تھا کہ جو بحری جہاز برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا پرچم لگائے گا اسے غرق کر دیا جائے گا۔ اس تنبیہ پر کسی نے بھی کان نہ دھرا۔ چنانچہ اسی روز مسافر بحری جہاز لوسی تینیا ساڑھے بارہ بجے بلا خوف و خطر بندرگاہ سے نکلا۔ سفر پر روانگی میں ڈھائی گھنٹے کی تاخیر ہو چکی تھی۔ کسی مسافر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موت سمندر میں اس جہاز کی منتظر ہے۔ اگر آج جہاز تاخیر نہ کرتا تو شاید یہ بھیانک واقعہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔ ایک ہزار نو سو انسٹھ افراد لوسی تینیا پر سوار تھے۔ ان میں بچے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب ہی تھے۔ جن میں بڑے نامی گرامی اور امیر افراد بھی شامل تھے۔

جہاز کا کپتان ٹرنر بظاہر خاصا مطمئن تھا۔ ان کا سفر ختم ہونے کو تھا۔ مگر آئرلینڈ کے ساحل کے پاس وہ ہوا جس کی توقع نہیں تھی۔

مئی کی سات تاریخ تھی۔ پانی کے اندر جرمن ۲۰۔ U گھوم رہی تھی۔ اس کا کمانڈر والٹر شوائگر تھا۔ اس نے پیری سکوپ سے دیکھا کہ ایک بحری جہاز سمندر میں رواں دواں ہے۔ یہ اس کا ہدف تھا! اور کوئی مشکل نہ تھی۔ ٹرنر کے دماغ میں کیا سمائی تھی؟ وہ تو اچھا خاصا تجربہ کار آدمی تھا۔ اسے آبدوزوں کی تباہ کاریوں کا علم تھا پھر اس نے جہاز کو کم رفتار پر کیوں چلا رکھا تھا اور وہ خلاف معمول جہاز کو بالکل سیدھ میں چلا رہا تھا۔ حالانکہ اسے پیچ در پیچ چلانے کا حکم تھا۔ اور یہ حرکت جرمن آبدوز کو نشانہ باندھنے میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔

پھر ایک دھماکہ ہوا۔ لوسی تینیا پر کامیاب حملہ ہوا تھا۔ جہاز لرز گیا۔ ذرا آگے کو بڑھا کہ ایک اور دھماکہ ہوا۔ بس پھر اٹھارہ منٹ میں جہاز ڈوب گیا۔ ایک ہزار ایک سو اٹھانوے افراد نے یہیں جان دے دی۔ لیکن موت کی دیوی کا جی نہیں بھرا تھا کیونکہ ابھی تو اس حادثے کی بناء پر امریکہ کو بھی جنگ میں اترنا تھا۔

مزید انسانوں کو جنگ کی بھینٹ چڑھانے کو! چنانچہ اپریل ۱۹۱۷ء کو امریکہ نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ لیکن لوسی تینیا غرقابی کے ساتھ کئی الجھنیں چھوڑ گیا۔

جہاز کا کپتان کیپٹن ٹرنر بچ گیا تھا۔ اس کی انکوائری ہوئی مگر یہاں سے وہ صاف بچ نکلا۔ بلکہ ۱۹۱۷ء میں اسے ایک اور جہاز کی کپتانی دی گئی۔ لطف کی بات یہ کہ یہ دوسرا جہاز بھی تارپیڈو کا نشانہ بن کر غرق ہو گیا اور ٹرنر اس بار بھی زندہ بچ گیا۔

لوسی تینیا کی بربادی کا سن کر عام حلقوں میں جرمنی کے خلاف نفرت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ مگر جرمنوں کا موقف اور تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسافر بردار جہاز میں اسلحہ و بارود منتقل کیا جا رہا تھا اور اس اعتبار سے اسے تباہ کرنا ایک درست جواز تھا۔ ادھر بچ جانے والوں کے بیانات نے بھی عوام الناس کو سوچنے پر مجبور کر دیا کہ حکومت سے اس بابت پوچھ گچھ کی جائے۔ آخر غرقابی سے قبل دوسرا دھماکہ کیوں ہوا تھا؟ کیا یہ سب ایک سازش تھی؟ جہاز دیر سے روانہ ہوا تھا اوپر سے کپتان ٹرنر کا رویہ خلاف معمول تھا آخر کیوں؟

مختلف جوابات دیئے گئے لیکن کوئی بھی غیر متنازعہ نہیں۔ یہ جوابات اور آراء خود بھی متضاد ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب "دی لوسی تینیا" کا مصنف ولن سمپسن ایک عرصہ سے تحقیق کر رہا ہے اس کا کہنا ہے کہ جہاز میں ۷ سو افراد تو عام سویلین مرد عورتیں اور بچے تھے مگر باقی سب سادہ لباس میں فوجی تھے اور جہاز میں اسلحہ بارود بھی موجود تھا جسے برطانیہ امریکہ ملی بھگت سے خفیہ طور پر برطانیہ لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اور مسافر جہازوں سے، بھی یہ گھناؤنا کام جاری تھا جس پر جرمنوں کو بڑی بے چینی تھی۔ چنانچہ انہوں نے برطانوی پرچم والے جہازوں کو غرق کر دینے کا اعلان کیا تھا۔ جرمنوں کا کہنا تھا کہ دوسرا دھماکہ درحقیقت تارپیڈو کے اثر سے تباہ ہونے والے اسلحہ بارود کا تھا جسے جہاز میں چھپا رکھا گیا تھا۔ ادھر برطانیہ کا موقف یہ تھا کہ دوسرا دھماکہ جہاز کے بوائلر کے پھٹنے سے ہوا تھا۔ نہ کہ پوشیدہ اسلحے و بارود سے۔ پھر اگر اسلحہ موجود بھی تھا تو کم از کم تارپیڈو کی رسائی اس مقام تک نہیں ہو سکتی تھی جہاں مبینہ اسلحہ موجود تھا۔

ٹرنر بھی متنازعہ ٹھہرا۔ "دی لاسٹ وائج آف لوسی تینیا" کا محقق و مصنف اے اے ہوئنگ اس سارے واقعے کی ذمہ داری ٹرنر کے سر تھوپتا ہے اس کا کہنا ہے کہ ٹرنر کو خصوصی طور پر سفر میں آبدوزوں کے خطرات کی اطلاع دی گئی تھی اور جہاز کو نازک علاقوں سے تیز رفتاری سے اور چکر کھاتے ہوئے گزرنے کی ہدایات دی گئی تھیں مگر اس نے ان پر بالکل کان نہیں دھرا۔ وہی اس واقعے کا ذمہ دار ہے۔ مگر کولن سمپسن کی رائے مختلف ہے وہ ٹرنر کو بالکل بے قصور قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ٹرنر کو سفر سے پیشتر حکام نے جہاز کو خاص انداز میں چلانے کی کوئی ہدایت نہیں کی تھی۔ بلکہ جب حادثہ ہو گیا تو بعد میں پچھلی تاریخوں کے تحت جھوٹ موٹ ایسی ہدایات تحریر کر کے برطانوی حکومت نے ٹرنر کو اس واقعے کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

پھر اصل مجرم کون تھا؟ کولن سمپسن نے ایک بڑی بات کہہ دی۔ وہ امریکی و برطانوی بحریہ کو اس سازش کا ذمہ دار بتاتا ہے فرینکلن ڈی روزویلٹ اور ونسٹن چرچل گہرے دوست تھے۔ جنگ عظیم اول کے دنوں میں یہ دونوں امریکہ اور برطانیہ میں بحریہ کے وزیر تھے۔ سمپسن کا بیان ہے کہ چرچل نے جان بوجھ کر برطانیہ سے امریکہ جانے والے لوسی تینیا کی غرقابی کے ایسے انتظامات طے کر دیئے تھے۔ جس سے امریکہ اس کے ملک کا حلیف بننے پر مجبور ہو جائے۔ اس کی بدنیتی کا ایک اور ثبوت اس کے وہ براہ راست احکامات ہیں جن کی رو سے آئرلینڈ کے قریب لوسی تینیا کی خبر گیری اور اسے آگے بحفاظت لے جانے کے لئے مقرر کردہ حفاظتی بحری جہاز کو بندرگاہ سے روانگی کے وقت روک دیا گیا تھا اور بے چارہ ٹرنر وہاں اس جہاز کو نہ پا کر پریشان بھی ہوا۔[6]

چرچل یہ مجرمانہ احکامات صادر کر کے ایک ہفتہ کی چھٹی پر پیرس چلا آیا تھا اور پھر حادثے کے بعد اگلے روز واپس آیا پیرس میں اس کے سیر سپاٹے کی کوئی اہل اطمینان توجیہہ نہیں کی گئی۔ کہا گیا ہے کہ لوسی تینیا پر لادے جانے والے مال و اسباب کی دو فہرستیں تیار کی گئیں تھیں۔ اصل فہرست میں اس فوجی ساز و سامان کی تفصیل موجود تھی جسے خفیہ طور پر لے جایا جا رہا تھا۔ مگر حادثے کے بعد تحقیقات شروع ہوئیں تو اصل اور جعلی دونوں فہرستیں غائب کر دی گئیں تھیں۔ کیوں؟ پھر ۲۵ برس بعد یہ دونوں فہرستیں بحریہ سے متعلق یادگار اشیاء جمع کرنے والے ایک شوقین کے حوالے کر دی گئیں اور اس کا نام تھا "فرینکلن ڈلانو روزویلٹ"! چرچل کا یار جو جنگ عظیم اول میں برطانوی چرچل کی طرح امریکی بحریہ کا وزیر تھا اور دوسری عالمی جنگ کے دوران امریکہ کا صدر بنا۔ اور وہاں برطانیہ میں چرچل وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ کیا یہ دونوں لوسی تینیا کی غرقابی کے جرم میں شریک تھے؟

دوسری عالمگیر جنگ میں پرل ہاربر پر جاپانی حملے سے قبل بھی ایک ایسے واقعے نے امریکہ کو جنگ میں فریق بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ لوسی تینیا کے بعد اس

مرتبہ بحری جہاز "ایتھلینیا" کی باری تھی۔

یہ جہاز بھی مسافر بردار تھا۔ ۳ ر ستمبر ۱۹۳۹ء کی رات یہ لیورپول کی بندر گاہ سے نکل کر مونٹریال کی جانب عازم سفر تھا مگر درحقیقت، اپنی موت کی جانب بڑھ رہا تھا جس نے ہیبری ڈیز سے مغرب میں دو سو میل دور اسے نگل لیا۔ جہاز ایک دھماکہ سے تباہ ہو کر غرق ہو گیا۔ اسے کس نے تباہ کیا؟

حسب سابق یہ جرمنوں کی کارستانی قرار دی گئی۔ مگر برطانوی بحریہ کا ریکارڈ اس روز کے بارے میں صاف کہتا ہے کہ کوئی جرمن آبدوز سمندر میں نہیں دیکھی گئی۔ یوں اگر ایتھلینیا جرمن تارپیڈو کا شکار نہیں ہوا تھا تو دھماکہ کس طرح ہوا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جہاز کے تہہ خانے میں گودام کے سامان میں ٹائم بم رکھ دیا گیا ہو..... ویسے بھی جہاز کے مسافروں میں زیادہ تر امریکی تھے۔ اور یوں امریکہ کو جنگ میں کود پڑنے کا ٹھیک ٹھاک جواز مل گیا۔ مگر ٹائم بم رکھنے کی ضرورت کس کو تھی۔ شاید برطانوی بحریہ کے وزیر ونسٹن چرچل کو؟ جس نے جرمنی کے خلاف ایک مضبوط حلیف حاصل کرنے کو یہ گھناؤنا کام کیا! ایک بار پھر۔ شاید۔ (7)

# ہنڈن برگ کی بربادی

ہنڈن برگ کیا تھا؟ ہواؤں میں اڑتی ہوئی ایک عظیم انسانی سواری۔ ٹیکنالوجی کا ایک عظیم کارنامہ نازی جرمنی کا وجہ افتخار۔ ایک زبردست ایجاد جس نے فضا میں سفر کی تاریخ کا ایک نیا باب رقم کیا لیکن ایک المناک حادثے کا شکار ہو کر فضائی مسافر جہازوں کے شعبے کے اختتام کا سبب بنا۔

جرمن سائنس دان کاؤنٹ زیپلن نے ہوا میں اڑنے والے ہوا سے ہلکے طیاروں کی داغ بیل ڈالی جن کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل جرمنی کا وہ دیو ہیکل فضائی مسافر جہاز تھا جسے ہنڈن برگ کا نام دیا گیا۔ یہ ۷۷ ناٹ کی رفتار سے پرواز کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ۱۲۰۰ ہارس پاور کے ۴ انجن نصب تھے۔ انتابڑ جہاز ہٹلر اور اس کی تیسری رائش کے ولولہ انگیز افراد کے حوصلے اور جرمن کاریگری کا ایک عظیم مظہر تھا۔ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا یہ ہوائی جہاز جس کی لمبائی ایک میل کا چھٹا حصہ تھی جب فضا میں گزرتا تو دیکھنے والوں کے منہ اس عجوبے کو دیکھ کر کھلے کے کھلے رہ جاتے۔ لوگ کام کاج چھوڑ کر اسے دیکھا کرتے جس نے بحر اوقیانوس کو عبور کیا تھا اور چہار اطراف دھوم مچا دی تھی۔ پیر ۳ ر مئی ۱۹۳۷ء کو ہنڈن برگ فرینکفرٹ سے سوا آٹھ بجے امریکہ کے لئے روانہ ہوا۔ اس پر ۳۶ مسافر سوار تھے۔ ہر کوئی اس شاندار سواری سے بڑا خوش تھا۔ ان لوگوں سے ماچس اور لائٹر لے لئے گئے تھے کیونکہ وہ جہاز کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ سگریٹ نوشی کے لئے الگ کمرے کا انتظام تھا۔ عملے کے آدمیوں کے جوتوں کے تسموں میں بھی دھات استعمال نہ ہوا تھا۔ مبادا وہ ٹکرا کر چنگاری پیدا کر دے۔

جمعرات کی صبح یہ سواری نیویارک کی فضاؤں میں داخل ہوئی۔ مسافر اس آرام دہ سفر سے بڑے مسرور تھے۔ نیچے جہاز اتارنے کی تیاریاں ہو رہی تھی۔ کمنٹیٹر خوشگوار لہجے میں سامعین کو جہاز کی آمد اور اس کے لنگر انداز ہونے کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ دے رہا تھا کہ اچانک وہ ہوا جو کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔ لنگر انداز ہوتے ہوئے جہاز کے عقبی حصے میں ایک زبردست دھماکہ ہوا گیس نے آگ پکڑ لی اور جہاز کا پنجر مسافروں سمیت زمین پر آن گرا۔ کمنٹیٹر سے ضبط نہ ہو سکا اور اس کا گلا رندھ گیا اور اس نے روتے ہوئے یہ دلخراش واقعہ سنایا۔ ہنڈن برگ تباہ ہو گیا تھا۔

یہ واقعہ محض حادثہ تھا یا تخریب کاری؟ جو کچھ بھی تھا۔ یہ سب کچھ اتنا بھیانک تھا کہ گیس کے مسافر جہازوں کی تقدیر پر مہر لگ گئی تھی۔ زیپلن جہازوں کی ۳۰ برس پر محیط فضائی بادشاہت اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ ہنڈن برگ ہوا سے ہلکے جہازوں کا نقطہ معراج تھا۔ سچ کہا گیا کہ عروج کی انتہا زوال کی ابتداء ہوا کرتی ہے۔

واقعات کے مطابق وہاں لیک ہرسٹ پر طوفان بادو باران دیکھ کر ہنڈن برگ کی لنگر اندازی ملتوی کر دی گئی تھی۔ وہ کچھ دیر فضا میں گھومتا رہا اور جب بارش کا زور ٹوٹا تو اترنے کی تیاری شروع ہو گئی۔ زمینی عملہ لنگر باندھنے کو مستعد تھا۔ جہاز کو صبح سات بجے پہنچنا تھا مگر وہ بارہ گھنٹے تاخیر سے پہنچا تھا۔ وہ لوگ جہاز کے اگلے حصے کو مقررہ مستول تک لانے میں بڑی دشواری محسوس کر رہے تھے۔ جہاز ابھی ۳۰۰ گز دور تھا۔ شام کے ۷ بجکر ۲۵ منٹ ہو رہے تھے۔ زمینی عملے کے ایک رکن نے دیکھا کہ جہاز میں نارنجی رنگ کا آتشیں گولہ نمودار ہوا اور اس کے ساتھ ہی زبردست دھماکہ ہوا۔ کیا بجلی کا شارٹ سرکٹ ہوا تھا؟ جرمن

ماریگروں نے اتنا ادھورا کام نہیں کیا ہو گا۔ قدرتی اسباب کا امکان بہت کم ہے پھر تو یہ تخریب کاری تھی۔ وگرنہ اس کی حفاظت کی احتیاطی تدابیریوں دھری کی دھری نہ رہتیں۔ اگر ایسا ہی تھا تو تخریب کاری کیوں کی گئی؟ ایک خیال کے مطابق یہ کارروائی کسی نازی دشمن کی تھی۔ درحقیقت اتنا عظیم جہاز نازی جرمنی کے لئے چلتا پھرتا پروپیگنڈہ ہی تو تھا۔ نازی ازم سے نفرت کرنے والے جب بھی اسے فضاؤں میں اڑتا دیکھتے تو ان کے سینے سے مغلظات کا طوفان اٹھنے لگتا۔ وہ ہواستینیکا کو آسمان کی رفعتوں میں کیوں کر دیکھ سکتے تھے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہٹلر ازم سے نفرت نے ہنڈن برگ کو تباہ کر دیا۔

ایک مصنف اے اے ہوئکلین کا تجزیہ ہے کہ ہنڈن برگ کو ٹائم بم کے ذریعے تباہ کیا گیا۔ وہ عملے کے ایک نوجوان ایرک سکیل کا نام لیتا ہے۔ ہوئکلین کا کہنا ہے کہ ایرک کا تعلق ایک ایسی خاتون سے تھا جو نازی دشمن تنظیم کی رکن تھی۔ چنانچہ ایرک نے جہاز کے عقب میں چوتھے سیل میں ٹائم بم نصب کر دیا اور اس پر وہ وقت سیٹ کیا جب جہاز کے تمام مسافر اتر چکے ہوتے۔ مگر بدقسمتی سے پرواز اترنے میں تاخیر ہو گئی اور یوں معصوم لوگ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، عملے کا یہ نوجوان ایرک بھی ہلاک ہو گیا۔ شاید اس کا ارادہ محض جہاز تباہ کرنے کا تھا۔ نہ کہ مسافروں کو ضرر پہنچانے کا۔ عملے کے ایک فرد کی حیثیت سے جہاز کے چوتھے گیس سیل میں بم نصب کرنا اس کے لئے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا ہو گا۔[8]

ادھر جرمنی کا رویہ اس معاملے میں بظاہر سادہ تھا۔ نازیوں نے اس واقعے کو محض ایک حادثہ قرار دے دیا۔ مگر در پردہ زبردست طریقے سے چھان بین شروع کر دی اور ہر اس شخص کو جو اس حادثے سے متعلق ہو سکتا تھا تحقیقات میں شامل کر لیا۔ نازیوں نے اسے اوپری طور پر حادثہ اس لئے قرار دیا تھا کہ وہ کبھی یہ طعنہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ جرمن اپنے طیارے کی حفاظت میں ناکام رہے۔

ویسے اگر امریکہ چاہتا تو یہ حادثہ نہ ہوتا اور ۳۲ انسان جہنمی شعلوں میں جان سے ہاتھ نہ دھوتے۔ فضائی جہازوں میں ہوا سے ہلکی دو گیسیں استعمال ہو سکتی تھیں۔ ہائیڈروجن اور ہیلیم۔ مگر ہائیڈروجن ایک سخت احتراق پذیر گیس ہوتی ہے اور اس کے استعمال سے ہر وقت جہاز میں آگ بھڑکنے کا خدشہ موجود رہتا ہے پھر جرمنوں نے زیپلن میں یہ گیس بھرنے کی غلطی کیوں کی؟ وجہ یہ ہے کہ اس کے علاوہ ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔ ہیلیم جیسی گیس جو فضائی غباروں کے لئے بہترین اور بے ضرر ہوتی ہے اس زمانے میں صرف امریکہ کے پاس قابل فروخت حالت میں موجود تھی۔ لیکن امریکہ نے ۱۹۲۷ء میں ایک قانون کے تحت ہیلیم کی فروخت پر پابندی لگا دی تھی۔ چنانچہ جرمنی کی بار بار درخواست پر بھی یہ گیس انہیں فراہم نہ کی گئی اور مجبوراً ہائیڈروجن استعمال میں لائی گئی۔

ہنڈن برگ کی کہانی کے چند اور پہلو بھی خاصے دلچسپ ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس شاندار جہاز کو کسی خاص تقریب افتتاح اور دعائیہ کلمات کے بغیر ہی استعمال شروع کر دیا گیا تھا۔ دوسرے سرکاری طور پر اس جہاز کو کوئی نام نہ دیا گیا تھا۔ پہلے پہل کسی نے اسے "ایڈولف ہٹلر" کا نام دیا۔ مگر ہٹلر کب اپنا نام کسی ایسی خطرناک چیز سے منسوب ہونے دیتا جو حادثہ کی صورت میں جل کر راکھ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کا نام ہنڈن برگ تجویز کیا۔ لیکن اس کے خدشات درست ثابت ہوئے اور یہ عظیم سواری جل کر ملبے کا ڈھیر بن گئی۔ کیسا عجیب تھا وہ وقت جب لیک ہرسٹ کے علاقے کے لوگ مرعوب نگاہوں سے اس پرشکوہ سواری کی آمد کا مظاہرہ کر رہے تھے اور کتنا روح فرسا تھا وہ منظر جب چند ہی لمحوں بعد یہ آگ میں اس طرح سے بھسم ہو گیا کہ اس کے فولادی پنجر زبردست حرارت سے ٹیڑھا میڑھا ہو کر زمین پر جا گرا اور اس میں سوار بچے عورتیں اور مرد کسی مکروہ سازش کے شکار بن کر شعلوں میں جل مرے۔

# پرل ہاربر پر جاپانی حملہ

۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء کو اتوار کی صبح سات بج کر پینتیس منٹ پر جاپانی بحریہ نے بحرالکاہل میں متعین اس امریکی بحری بیڑے پر حملہ کر دیا جو پرل ہاربر کے مقام پر لنگر انداز تھا۔ پرل ہاربر میں ہر کوئی مگن تھا کسی کے خواب و خیال میں نہیں تھا کہ جاپان یہاں پر بھی مار سکتا ہے۔

علی الصبح لوگ ابھی بیدار ہو رہے تھے کہ انہیں تباہی نے آن لیا۔ اتوار کا دن تھا ہر کوئی معمول کے مطابق چھٹی منا رہا تھا۔ کوئی سمجھا کہ امریکی فوج خصوصی تربیت یا مشقیں کر رہی ہے مگر اتوار کو کیوں؟۔ جاپانیوں نے بڑی چالاکی کی جنگ میں پہلا حملہ ہی اتنا شدید اور اچانک تھا کہ مخالفین کو مدافعت کے لئے سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔

حملہ کے دوسرے دن امریکی صدر روزویلٹ نے اعلان جنگ کر دیا۔ پوری امریکی قوم کو اس بلاسبب اور اچانک حملے پر سخت صدمہ ہوا۔ اس غیر متوقع حملے سے جاپان کو ہوائی میں جو کامیابی حاصل ہوئی کسی کے خواب وخیال میں نہ تھی امریکی بیڑا تباہ ہو گیا تھا اگر جاپانی آگے یورش جاری رکھتے ہوئے کیلی فورنیا کے ساحل پر اپنی فوج اتار دیتے تو وہاں حفاظتی اقدامات نہ ہونے کے برابر تھے۔

جنگی حکمت عملی کے اعتبار سے بھی یہ بڑا زبردست حملہ تھا۔ یہ ایک ذہین شخص اوسورو کو یاماموتو نے تیار کیا تھا۔ اس موثر اور اچانک حملے کی منصوبہ بندی اس طرح کی گئی تھی کہ بہت بڑی فوج شمالی جاپان سے "ہوائی" کے شمال میں خفیہ طور پر اتار دی جاتی۔ جس کے ہمراہ منتخب فوجی اور تباہ کن ہتھیاروں سے لیس ۲۸ آبدوزوں کو پرل ہاربر پر ہلہ بولنا تھا۔ یہ اس قدر خفیہ رکھا گیا تھا کہ واشنگٹن میں جاپانی سفیر تک کو اس کی خبر نہ تھی اور وہ بذات خود حملے کا سن کر سخت متحیر ہو گیا تھا طے تو یہ تھا کہ جاپان اعلان جنگ کرتا اور تھوڑی دیر بعد حملہ ہو جاتا مگر اعلان جنگ میں کچھ تاخیر ہو گئی اور یوں پرل ہاربر تاریخ میں سب سے خفیہ حملہ کے حوالے سے مشہور ہوا۔ اس حملے میں دو ہزار چار سو تین امریکی ہلاک ہوئے۔ یو ایس ایس ایری زونا بحری جہاز زبردست دھماکہ سے پھٹ کر غرق ہو گیا۔ بم بالکل ٹھیک طور پر اپنے اہداف کو نشانہ بناتے رہے کیونکہ بندرگاہ کے قریب ایک پہاڑی پر سے ایک جاپانی جاسوس نے صحیح اطلاعات بہم پہنچائیں تھیں۔ یہ جاپانی "یاشاکو" ہولولمالو کے جاپانی سفارت خانے میں ملازم تھا اور بعد میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یہ حملہ تاریخی حوالوں سے معموں کا مجموعہ ہے مثال کے طور پر ایک معمہ یہ ہے کہ جاپانی بم کس راستے سے لائے گئے۔ اس پر خاصی بحث ہوئی ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جاپانی طیارے کو لاکوری نامی درے سے نکل کر جھپٹے تھے۔ لیکن حقائق اس مفروضے کی تائید نہیں کرتے۔ جاپانیوں کی وہ دستاویزات جو انہوں نے حملے کے فوراً بعد مرتب کی تھیں مختلف شواہد فراہم کرتی ہیں لیکن یہ تو محض واقعاتی تضادات ہیں اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔

معمہ یہ ہے کہ کیا یہ حملہ واقعی اچانک تھا؟ کیا امریکی افواج بالکل بے خبر تھیں؟ ادھر تاریخی حوالوں پر تحقیقات نے آج ایسے گوشے بے نقاب کر دیئے ہیں جس سے اس شبہ میں اضافہ ہو جاتا ہے کہ امریکی حکومت سے کہیں نہ کہیں دانستہ طور پر ایک بڑا جرم سرزد ہوا۔ کوئی نہ کوئی اس حملے سے پیشگی آگاہ ضرور تھا مگر اس نے جانتے بوجھتے اس کی اطلاع نہیں دی۔ کیا یہ سیاست کا مکروہ طریقہ کار تھا جس کے ذریعے دو ہزار سے زائد قیمتی جانوں کا خسارہ کر دا کے بعض مقاصد حاصل کرنے کی سازش کی گئی۔ کیا اس وقت کے امریکی صدر روز ویلٹ کو اس کی خبر پہلے سے تھی؟ اگر ایسا تھا تو یقیناً وہ شخص امریکی تاریخ میں ایک بدنما داغ تھا اور بدترین غدار بھی۔ حملے کے بعد بری اور بحری فوج کے کئی کمانڈروں کو غفلت کے الزام میں برطرف کر دیا گیا۔ لیکن اصل غفلت کس کی تھی؟ ایک محقق جان ٹولینڈ کا بیان ہے کہ "۲ اور ۳ دسمبر کو امریکی بحریہ کے سراغرسانی کے شعبے نے دو طیارہ بردار جہازوں کو پرل ہاربر کے پاس دیکھ لیا تھا اور یہ خبر صدر روز ویلٹ کو دے دی گئی ہو گی بعض کا کہنا ہے کہ بحریہ نے دانستہ یہ خبر صدر سے پوشیدہ رکھی اگر ایسا ہوا تھا تو یہ بڑا جرم تھا۔"

حالیہ تحقیقات کے مطابق یہ چونکا دینے والی بات معلوم ہوتی ہے کہ جزیرہ ہوائی میں راڈار پر متعین دو فوجیوں نے پونے سات بجے راڈار پر ایک فضائی بیڑہ دیکھنے کی اطلاع دو مرتبہ اپنے افسر کو دی مگر انہیں جواباً مطمئن رہنے کے لئے کہا گیا۔ چنانچہ ۷:۳۹ پر جب ہوائی جہاز ایک پہاڑی چوٹی کے پیچھے اوجھل ہو گیا تو یہ دو فوجی بھی راڈار کا سوئچ بند کر کے ناشتہ کرنے چلے گئے یوں کہا جا سکتا ہے کہ امریکی فوج کو حملے سے ٹھیک ایک گھنٹہ قبل اطلاع مل گئی تھی پھر آخر انہوں نے دفاع کی عملی کوشش سے کیوں پہلو تہی کی؟

دسمبر ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتے میں جس وقت جاپانی بحری بیڑہ ہوائی کی طرف بڑھ رہا تھا تو ان کے ریڈیو سگنل پکڑے گئے تھے اور اس کی اطلاع امریکی فوج کو دے دی گئی تھی۔

بحریہ کی انٹیلی جنس کے ایک رکن رابرٹ اوگ جس کا کوڈ نام "سی مین ذی" تھا یہ کہا ہے کہ وہ سان فرانسکو میں متعین تھا۔ ۶ر دسمبر کو ٹریکنگ کے دوران اس نے اندازہ لگایا تھا کہ بحری بیڑہ اوہاؤ میں ۵۰۰ میل کے فاصلے تک آن پہنچا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اسے یقین تھا کہ اس سلسلے میں امریکی فوج کوئی کارروائی تو نہیں کرے گی مگر اس بات کی اطلاع صدر کو ضرور کر دی جائے گی۔ چنانچہ یہ اطلاع سان فرانسسکو کے بحریہ کے ناظم کپتان کو پہنچا دی گئی اور اس نے کہا کہ یہ خبر صدر کو دے دی گئی ہے۔ کیا واقعی صدر کو خبر دی گئی تھی؟ ایک محقق رابرٹ سٹینٹ Robert Stinnet کا بیان ہے کہ صدر سے کی جانے والی خط و کتابت پر واضح طور پر لکھا ہوتا تھا کہ یہ صدر کو دکھایا جائے۔ لیکن اس اطلاعی لفافے پر کسی کے بھی دستخط نہیں۔ شبہ ہے کہ بحریہ میں کسی غدار نے یہ حرکت کی اور جان بوجھ کر یہ خبر صدر تک نہ پہنچنے دی ادھر ایک محقق اور مصنف فریڈ گوئرنر کا کہنا ہے کہ ۲۰ برس کی تحقیقات کے بعد اسے ایک ثبوت بھی نہیں ملا کہ

روزویلٹ حملے سے پیشگی آگاہ تھا۔ یوں اگر صدر روزویلٹ کا دامن صاف تھا تو پھر یہ معمہ سامنے آتا ہے کہ خبر کیوں کر دبا دی گئی۔[9]

۴ر مارچ کو واشنگٹن میں کانگریس کے اجلاس میں پرل ہاربر کے مسئلے پر بحث ہو رہی تھی۔ ایسے میں امیرالبحر ہسبنڈ کیبل پر شک کیا جا رہا تھا۔ جو اس علاقے کے بحری نظم و نسق کا نگران تھا۔ یہ شخص پرزور طریقے پر اس الزام کی تردید کر رہا تھا۔ اس نے بیان دیا کہ وہ یہ اب تک سمجھ نہیں سکا کہ جب حملے کی خبر واشنگٹن کے بحری محکمے کے پاس تھی تو ہفتے کی رات یا اتوار کی صبح کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ بحرالکاہل میں متعین امریکی بحری فوج کو اس کا حق تھا کہ اسے لڑائی کا موقع ملے اور واشنگٹن سے بہترین اور بروقت اطلاعات بہم پہنچائی جائیں۔ مگر ایسا نہ ہوا حالانکہ اس قسم کی معلومات کے لئے درخواست بھی کی گئی تھی۔

# جم جونز اور ہزار انسانوں کا قتل

انسانیت کا نجات دہندہ؟ اس کا نام ریورنیڈ جم جونز تھا۔ اپنے دور کی مقبول ترین شخصیات میں سے ایک۔ کیا وہ ایک راہبر تھا؟ جس نے ہزاروں انسانوں سے ارضی بہشت کا وعدہ کر رکھا تھا یا ایک ہزار معصوم افراد کا قاتل؟

وہ ۱۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو انڈیانا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جنگ عظیم اول سے معذور ہو چکا تھا۔ ماں کو گھر کا خرچ برداشت کرنے کے لئے فیکٹری میں ملازمت کرنا پڑی تھی۔ جم مذہبی جنونی تھا۔ اوائل عمری سے بائبل کا مطالعہ اس کی عادت بن چکی تھی۔ مذہبی تعلیمات کے حصول کے لئے ہی اس نے انڈیانا یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور فیس کے لئے ہسپتال میں ملازمت اختیار کر لی اور وہیں ایک نرس سے شادی کی۔ وہ مساوات کا علمبردار تھا۔ چرچ کے گوروں کو اس کے اس نظریئے سے سخت اختلاف تھا کہ کالے افراد کو بھی چرچ میں گوروں جیسی عزت دی جائے۔ چنانچہ جم کو چرچ کو خیرباد کہنا پڑا اور اس نے اپنے نظریات کی علیحدہ سے تبلیغ شروع کر دی اور اپنے متبعین کی مدد سے علیحدہ چرچ "عوامی عبادت گاہ" کے نام سے قائم کر لیا۔ اس نے سات کالے، گورے اور ایشیائی بچوں کو گود لیا اور پھر کالے مذہبی رہنماؤں کے طریقہ تبلیغ کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ لوگ عوام کی نظر میں محترم ٹھہر کے عیاشی کے سامان کیے ہوئے ہیں۔

اس نے بھی یہی راہ اختیار کی اور خود کو مضبوط قوت ارادی کا مالک مشہور کرا دیا۔ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے اس نے مشہور کر دیا کہ اس دور کی "کلوکلکس کلان" نامی گوروں کی متعصب تنظیم نے اس پر قاتلانہ حملے کرائے ہیں۔ یوں اسے مقامی انسانی حقوق کے کمیشن میں ملازمت کے حصول میں آسانی ہوئی۔

۱۹۶۰ء کے دوران امریکہ میں نیوکلیئر جنگ کا ہوا گرد ش کر رہا تھا۔ ایسے میں ایک مشہور اخبار میں ان مقامات کے بارے میں بتایا گیا کہ جو ایٹمی جنگ کی صورت میں محفوظ ترین ثابت ہو سکتے تھے۔ جم جونز نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے متبعین کے ہمراہ کسی ایسے ہی محفوظ مقام پر منتقل ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک محفوظ مقام کی تلاش میں اس نے جنوبی امریکہ کا دورہ کیا اور اس کی نظر انتخاب "گیانا" کے علاقے پر جا ٹھہری کیونکہ وہ نو آزاد اشتراکی علاقہ جم جونز کے سماجی برابری کے نظریات کو عملی شکل دینے میں کار آمد ثابت ہو سکتا تھا۔ تاہم اس نے دعویٰ کیا کہ ایٹمی تباہی کا خطرہ کچھ عرصہ کے لئے ٹل گیا ہے لیکن اس دوران پہلے ہی اس کے متبعین نے اپنے تمام اثاثے حاصل کر کے اپنی رہائش گاہیں چھوڑ کر اس امید پر کہ جم ان کی زندگیوں کا محافظ ہے عام زندگی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ انہیں لے کر میکسیکو چلا آیا جہاں اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے کیونکہ اس کے متبعین نے انتھک اور بے غرضی سے کام کرنے کی شاندار مثالیں قائم کیں۔ وہ اپنی آمدنی جم کے حوالے کر دیا کرتے۔ پھر وہ سب سان فرانسسکو منتقل ہو گئے جہاں ایک اور عوامی عبادت گاہ قائم کی گئی اور اراکین کی تعداد ۷۵۰۰ تک ہو گئی۔

جم کا عمل دخل سیاست میں بھی بڑھ گیا اگلے صدارتی انتخابات میں اس نے جمی کارٹر کی حمایت کی اور اسے کامیاب کرا دیا اور پھر خصوصی دعوت پر واشنگٹن کا دورہ کیا۔ اس نے لوگوں میں مشہور کر رکھا تھا کہ وہ ہزاروں یتیم بچوں کی سرپرستی کر رہا ہے اور گیانا کے علاقے میں کتنے ہی بچے اس کے چرچ کی امداد

سے فاقہ کشی سے بچے ہوئے تھے لیکن ایسے میں کچھ لوگوں نے عجیب بات کہی۔ انکے مطابق جم جونز ایک جنونی تھا۔ وہ اخلاقی جرائم میں ملوث تھا اور بچوں پر تشدد کے حوالے سے بھی اپنے قریبی افراد اس پر الزام لگاتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ اخبارات اور پولیس کے ڈیوٹی کے دوران ہلاک ہونے والے کارکنوں کے پسماندگان کو ہرماہ امدادی رقوم دیتا رہا تھا۔ اس کی نیک نامی میں فرق آتا جارہا تھا۔

جم نے یہ دیکھ کر فرار کا منصوبہ تشکیل دیا۔ اس نے پہلے ہی بیس ہزار ایکٹر کا علاقہ لیز پر حاصل کر لیا تھا۔ یہ جگہ پورٹ کیٹوما کے قریب واقع تھی جہاں جم کے بقول ایک جدید، اشتراکی، انصاف کے اصولوں پر مبنی معاشرہ تشکیل دیا جانا تھا۔ ہزاروں افراد جم کی ارضی جنت کے لئے روانہ ہونے لگے۔

لیکن جم کی شامت آ گئی تھی۔ اس کے متبعین میں سے بعض کے اقارب نے ایک مشہور سیاست دان لیوریان سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ ان کے عزیز جم جونز کے ہاں خوشی سے نہیں رہ رہے بلکہ انہیں مجبور کیا گیا ہے۔ اب یہ شخص لیوریان بھی عجیب آدمی تھا ایک طرف کانگریس کا اعلیٰ پائے کا سیاستدان دوسری طرف ایک عملی انسان جس نے محض قیدیوں سے متعلق واقفیت کے حصول کے لئے کچھ عرصہ جیل میں گزارا ہوا تھا۔ لیوریان، ٹی وی اور اخباری رپورٹروں کی ایک ٹیم کے ہمراہ جم جونز کے علاقہ میں چارٹرڈ جہاز سے جا اترا۔ وہاں اس نے جم کے مسلح گارڈوں کے سامنے جم کے متبعین سے خطاب کیا اور کہہ دیا کہ اگر کوئی اس کے ہمراہ لوٹنا چاہے تو صاف صاف کہہ دے تاکہ وہ اس کی زندگی کی ضمانت دے کر اپنے ساتھ لے جائے۔ اگلے روز تک بیس کے قریب سہمے ہوئے افراد لیوریان کے گرد واپس لوٹنے کو تیار کھڑے تھے۔ وہ ایک ٹرک میں ہوائی جہاز کے لئے روانہ ہوئے۔ کوئی دم میں وہ جہاز میں سوار ہو کر مہذب دنیا میں جا کر جم جونز کا پول کھول دیں گے، لیکن نہیں! بساط الٹ گئی ان لوگوں پر حملہ کر دیا گیا۔ لیوریان اور رپورٹر فوراً قتل کر دیئے گئے۔ کیمرہ مین کو بھی نہیں بخشا گیا۔ اور ادھر جم جونز اپنے پیروکاروں کو جمع کر کے مخاطب ہوا "میں نے متنبہ کیا تھا کہ یہ کچھ ہو گا۔ ہم اس دنیا کے لئے بہت اچھے تھے۔ اب آؤ، میرے ہمراہ اور میں تمہیں ایک بہتر جگہ لے جاؤں۔" بائبل کی تلاوت شروع کر دی گئی زہر سے بھرے محلول کے ڈرم لائے گئے۔ شیر خواروں کو پہلے زہر دیا گیا۔ پھر بچوں کی باری آئی اور آخر میں والدین نے زہر کے جام چڑھا لئے۔ وہ جنہوں نے فرار ہونے کی کوشش کی انہیں گولی سے اڑا دیا گیا یا زبردستی زہر دیا گیا۔

اگلے روز گیانا سے آنے والے دستے جب جنگل میں داخل ہوئے تو موت کا کھیل تکمیل پا چکا تھا۔ ہزار کے قریب معصوم انسان ایک دوسرے سے محبت سے لپٹے زندگی سے منہ موڑ چکے تھے۔ ان میں ہر عمر کے لوگ تھے۔ بچے بھی، بوڑھے بھی اور عورتیں بھی اور انہیں کے درمیان ان کا مسیحا۔ ان کا سردار جم ویرن جونز مردہ پڑا تھا۔ جس کے بھیجے میں ایک گولی پیوست تھی۔

لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی ایک عرصے تک کہا جاتا رہا کہ یہ افسوسناک واقعہ مذہبی پاگل پن کے باعث پیش آیا مگر اشتراکی روس کی خفیہ تنظیم نے ایک اور ہی کہانی سنائی۔ کے جی بی کی خفیہ تحقیقات نے ایک ایسا راز افشا کیا کہ جس سے انسان تھرا اٹھتا ہے۔ جم جونز اور اس کے متبعین نے اجتماعی خودکشی ہرگز نہیں کی۔ انہیں قتل کیا گیا ہے اور اس کے پیچھے سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔

سوویت ڈائجسٹ اسٹنک کی اشاعت میں کے جی بی کی تحقیقات پیش ہوئیں۔ جم جونز معصوم تھا۔ وہ اشتراکیت کا علمبردار تھا۔ اس نے سرمایہ داروں کے درمیان اشتراکی معاشرے کے قیام کا ایک تجربہ کیا تھا جو کامیابی سے ہمکنار ہونے والا تھا لیکن سی آئی اے فوراً حرکت میں آ گئی اور اس سے پہلے کہ ارضی جنت کے نمونے سے باقی امریکہ بھی متاثر ہو جائے اس پورے گروہ کو بندوقوں کے زور پر خودکشی پر مجبور کر دیا گیا اور پروپیگنڈہ سے اس قصے کو خوب اچھالا گیا جو پیچھے بیان ہوا ہے۔

کے جی بی کا بیان ہے کہ معروف سیاستدان لیوریان بھی درحقیقت جم جونز کی ارضی جنت کا معترف ہو چکا تھا لیکن عوامی سطح پر اس خبر کو پہنچانے سے پہلے ہی اس کا خاتمہ بھی ضروری سمجھا گیا۔

کچھ بھی ہو ایک بات طے شدہ ہے۔ جم جونز اشتراکیت کا علمبردار تھا، بلکہ وہ کسی حد تک دہریہ تھا۔ اس سلسلے میں لیوریان کا بیان خاصا معنی خیز ہے۔ یہ بیان ریان کے مرنے سے کچھ ہی دیر پہلے ٹی وی عملے نے ریکارڈ کیا تھا جو بعدازاں معائنہ ٹیم کو لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے ملا۔ اس کے الفاظ تھے "جم جونز محبت، بھائی چارے اور انسانیت اور اپنے ایمان اور مذہب کی قوت پر بہت بات کرتا ہے لیکن میں نے اسے ایک مرتبہ بھی خدا کا ذکر کرتے تک نہیں سنا۔"

یوں ریورینڈ جم جونز اور اس کے پیروکاروں کی المناک موت ایک معمہ بن جاتی ہے کہ انہوں نے اجتماعی خودکشی کی تھی یا وہ سی آئی اے کے انسانیت کش مظالم کا شکار بنے تھے۔

# ساڑھے اٹھارہ منٹ کا وقفہ

واشنگٹن۔ یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔ جون کی ۱۷ تاریخ تھی اور دوپہر کے دو بجے تھے۔ امریکہ کی ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر دفتر واقع واٹر گیٹ بلڈنگ میں ۵ افراد کو عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ پارٹی کی اہم فائلوں اور دستاویزات پر ہاتھ صاف کرنے والے تھے۔ واشنگٹن ڈی سی میں پیش آنے والا بظاہر یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن اس کے اثرات اس قدر ہوئے کہ ایک شخص جو صدارت کا امیدوار تھا اپنے سیاسی کیریئر سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ شخص سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن تھا۔

ابتدائی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ ملزموں میں سے ایک میکارڈ، صدر نکسن کے دوبارہ انتخاب کرنے والی کمیٹی کا سیکورٹی چیف تھا۔ بعدازاں اس امر کے شواہد بھی ملے کہ اس کمیٹی نے باقاعدہ طور پر ان نقب زنوں کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ صدر نکسن دوبارہ صدارت کے حصول میں کامیاب ہو۔ وقوعہ کے تین روز بعد نکسن نے دن کے گیارہ بجکر چھبیس منٹ پر اپنے مشیر ہالڈیمن سے ملاقات کی اور اس واردات کے بارے میں بات چیت کی۔ یہ تمام گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ دراصل نکسن نے خفیہ طور پر انتظامیہ کے اہم دفاتر اور خود اپنے دفتر میں ٹیپ ریکارڈ فٹ کرا رکھے تھے جو ہر لمحہ گفتگو ریکارڈ کرتے تھے۔ یوں اس روز کی ملاقات کے دوران جو ایک گھنٹہ ۱۹ منٹ جاری رہی نکسن اور اس کے مشیر کی آواز ریکارڈ ہوتی رہی۔

اگلے برس "ارون کمیٹی" نے جو واٹر گیٹ سیکنڈل کی تفتیش کر رہی تھی، مئی ۱۹۷۳ء میں نکسن پر ۱۹۷۲ء کے انتخابات میں دھاندلی، سرمایہ داروں سے سرمائے کے حصول اور واٹر گیٹ کی واردات میں ملوث ہونے کے الزامات کی چھان بین شروع کر دی۔ جولائی ۱۹۷۳ء میں مستغیث خصوصی، آرچی بالاڈ لوکس نے اس ٹیپ کا تذکرہ کیا جو نکسن اور ہالڈیمن کی آواز ریکارڈ کرتی رہی تھی۔ اس کے جاری کردہ سمن کی نکسن نے چار ماہ تک مخالفت کی مگر آخر کار ہتھیار ڈال دیئے۔

نومبر کی ۲۱ تاریخ کو نکسن کے وکیلوں نے ایک عجیب انکشاف کیا کہ ۲۰ جون کی نکسن ہالڈیمن گفتگو کی ٹیپ کے درمیان میں اچانک جھنجھناہٹ سی ہونے لگتی ہے جو ساڑھے اٹھارہ منٹ تک جاری رہی ہے۔ اس کی وجہ سے گفتگو کا وہ حصہ جو واٹر گیٹ کے متعلق تھا سننے کے قابل نہیں رہا۔ مقدمے کے جج نے چھ افراد پر مشتمل ایک پینل تشکیل دیا جن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ٹیپ میں اس طویل وقفے کے اثرات اور اسباب کا سراغ لگایا جائے۔ چنانچہ ۱۵ جنوری ۱۹۷۴ء کو پینل نے یہ رپورٹ دی کہ آواز مٹانے کا عمل اس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے کیا گیا ہے۔ جو نکسن کی پرائیویٹ سیکرٹری "روز میری ووڈ" کے زیر استعمال رہتا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا کہ کم از کم ۵ مرتبہ جدا جدا طور پر وقفے پیدا کیے گئے جن کا مجموعی دورانیہ ساڑھے اٹھارہ منٹ تھا لیکن اصل مسئلہ اپنی جگہ تھا یعنی اس دوران کیا گفتگو ہوئی؟ اور وقفے کا اصل ذمہ دار کون ہے؟

مقدمے کی کارروائی جاری تھی کہ نکسن کی پرائیویٹ سیکرٹری روز میری عدالت میں نمودار ہوئی "مجھ سے ایک بہت خوفناک غلطی سرزد ہوئی ہے" اس کا کہنا تھا کہ کم از کم ساڑھے چار سے چھ منٹ تک کے تعطل کی ذمہ داری اسے قبول ہے۔ بقول اس کے ہوا یوں تھا کہ ریکارڈنگ کے دوران اسے ایک ٹیلیفون کال وصول کرنا پڑی جس کے دوران اس نے غلطی سے Stop کے بجائے ریکارڈ کا بٹن دبا دیا اور پیر سے بے دھیان میں پیڈل کو بھی دبائے رکھا جس کے سبب ریکارڈنگ میں وقفہ ہو گیا۔

لیکن اگر روز میری ووڈ کی اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو کم از کم ۱۲ منٹ کا دورانیہ حل طلب معمہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اصل قصہ کیا ہے تو یہ نکسن اور ہالڈیمن ہی جانتے ہیں یا شاید پھر سٹیو بل جس کے ذمے ریکارڈ شدہ ٹیپ روز میری کو پہنچانا تھا اور خود روز میری جس نے ریکارڈنگ کی نقل تیار کرتے وقت اصل کیسٹ سے غفلت برتی تھی، اصل گفتگو سے واقف ہو سکتی تھی۔(10)

# وائرلیس کا موجد کون؟
# مارکونی یا سٹیبل فیلڈ

مارکونی ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوا اس کی ماں آئرش اور باپ اطالوی تھا۔ وہ خاصا ذہین تھا۔ ۲۰ برس کی عمر میں وہ لاسلکی (بے تار برقی) کے تجربات کر چکا تھا۔ ایک روز آدھی رات کے وقت اس نے اپنی ماں کو جگا کر اوپر کمرے میں بلایا اور وہاں ایک تماشہ دکھایا۔ وہ مورس کے آلے کا بٹن دباتا تھا تو ۱۲ فٹ دور رکھی برقی گھنٹی، بجنے لگتی تھی۔ کئی ماہ تک وہ اسے کھیل ہی سمجھتا رہا۔ لیکن پھر اس نے سنجیدگی سے اشارے بھیجنے کے سلسلے میں اس آلے کی اہمیت کا احساس کیا۔

وہ اپنا سامان باغ میں لے گیا اور تجربات کے ذریعے سگنلز کو قریبی پہاڑی کے پار پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا بھائی پہاڑی کی چوٹی پہ کھڑا ناچنے لگا تاکہ مارکونی کو تجربے کی کامیابی کی اطلاع ہو جائے۔ ۱۸۹۶ء میں وہ دو میل تک پیغامات بھیجنے لگا۔ اس کی آئرش ماں نے اسے لندن جا کر اپنی ایجاد کو متعارف کرانے کا مشورہ دیا۔ اٹلی سے مارکونی لندن چلا گیا۔ اور یہاں اپنی ایجاد پیٹنٹ کرائی۔ پہلی مرتبہ جرنل پوسٹ آفس کے انجینئر ولیم پریس نے دفتر کی چھت پر آلہ نصب کر کے دوسرا سیٹ دور دریائے ٹیمز کے پاس ایک مکان پر نصب کر کے آلے کی آزمائش کرائی۔ مارکونی کو اپنے بھدے خود ساختہ آلات کی خرابی اور اتنے لوگوں کے سامنے رسوائی کا خوف تھا مگر تجربہ کامیاب رہا۔ اگلی آزمائش سالسبری میں ہوئی۔ بحریہ اور بری فوج کے افسروں کے سامنے مارکونی نے ۸ میل دور سگنل بھیجا۔

مئی ۱۸۹۸ء میں پہلا ریڈیو ٹیلی گراف سٹیشن قائم کیا گیا۔ اگرچہ کارکردگی تسلی بخش نہ تھی۔ کامیاب تجربات جاری رہے۔ سارے یورپ میں مارکونی کی دھوم مچ گئی۔ ایک وقت تھا کہ حاسد اسے "بغیر بندر کا مداری" کہتے تھے۔ اب وہ ایک ہیرو تھا۔

پرنس آف ویلز سمندری سفر پر بیمار پڑ گیا۔ ملکہ وکٹوریا بیٹے کی علالت پر خاصی متفکر تھی۔ مارکونی نے شہزادے کے جہاز سے محل تک رابطہ قائم کرا دیا۔ ۱۶ روز کے دوران دونوں طرف سے ۱۵۰ (ڈیڑھ سو) کامیاب پیغامات کی ترسیل ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں امریکی صدر روز ویلٹ نے اسی شہزادے کو جو اب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم تھا بے تار برقی کے ذریعے پیغام بھیجا اس واقعے سے مارکونی کو بہت عزت ملی اور اس نے بڑی دولت کمائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مارکونی کو اس عزت کے حصول سے قبل بڑی ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ زیادہ فاصلے تک سگنل بھیجنے کی تجربات کے دوران وہ نیو فاؤنڈ لینڈ کے یخ بستہ ماحول بس ٹوٹے اور ٹپکتی چھت والے جھونپڑے میں بیٹھا سمندر سے پار سگنل موصول ہونے کا منتظر تھا۔ اس کا رفیق "کیمپ" پاس بیٹھا تھا۔ پہلے مارکونی نے سنا اور پھر ریسور کیمپ کو پکڑ دیا نک نک نک کی مقررہ تین آوازوں نے انہیں خوشی سے پاگل کر دیا مگر کامیابی کی اطلاع نے عجب رنگ دکھایا ایڈیسن نے کہا کہ مارکونی کو سمندر پار سے کوئی آواز نہیں آئی اس کے کان بجے ہیں۔ کچھ سائنس دانوں نے کہا مارکونی مکار ہے۔ کہا گیا کہ اس شخص نے عالمگیر سطح پر بے تار برقی کے نظام پر مکمل اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان تمام باتوں سے اس کی ایجاد کی افادیت پر چنداں فرق نہ پڑا مگر ایک اعتراض ایک سوال ایسا بھی ہے جو مارکونی کو اس انقلاب آفرین ایجاد کا اصل موجود قرار دینے میں بڑی رکاوٹ ہے۔

کہانی کافی پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ مقام ہے امریکہ کا قصر شاہی اور ۱۸۹۲ء کا سال مارکونی ۱۸ برس کا جوان اٹلی میں تعلیم حاصل کر رہا ہے اور ادھر امریکہ کے قصر شاہی کے صحن میں بہت سے لوگ جمع ہیں۔

ایک شخص نتھان سٹیبل فیلڈ کا دعویٰ ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے بغیر کسی تار کے آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر کے دکھائے گا۔

وہ دو عدد ڈبہ نما آلات اٹھا لایا۔ دونوں ڈبے ۲ مربع فٹ کے تھے اور انہیں ایک دوسرے سے ۲۰۰ فٹ کے فاصلے پر رکھ دیا گیا۔ ان کے درمیان کوئی تار موجود نہیں تھی اور ان میں ٹیلی فون جیسے آلات لگے ہوئے تھے۔ لوگوں کے سامنے سٹیبل فیلڈ کا بیٹا ایک آلے کی طرف چلا گیا اور فیلڈ خود دوسرے آلے کے پاس آ گیا۔ پھر انہوں نے آپس میں بات چیت شروع کر دی۔ دونوں باپ بیٹے کی آواز صاف آ جا رہی تھیں۔ تجربہ مکمل ہوا مگر یہ کیا شائقین اس پر آوازیں کس رہے تھے اور اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اس ناقدری کو دیکھتے ہوئے سٹیبل فیلڈ نے سارا سامان اٹھا کر گاڑی میں پھینکا اور کلوے کاؤنٹی کنٹکی میں واقع اپنے

فارم کو چلا آیا۔

کسی نہ کسی طرح اس کی ایجاد کی خبر پوسٹ ڈسپیچ اخبار والوں کو ہو گئی۔ انہوں نے درخواست کی کہ فیلڈ ان کے سامنے اپنی ایجاد کا مظاہرہ کرے۔ فیلڈ نے ایک ہفتے بعد انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

اخبار کا نمائندہ ۱۹۰۲ء میں جنوری کی ۱۰ تاریخ کو اسٹیبل فیلڈ کے گھر پہنچا۔ وہاں اسے فیلڈ نے ایک عدد ڈبہ پکڑا دیا۔ نمائندے نے دیکھا کہ اس آلے کے نیچے ۴ فٹ لمبی ۲ عدد دھاتی سلاخیں لگیں ہیں۔ فیلڈ نے اس سے کہا کہ وہ آس پاس کہیں بھی چلا جائے اور ان سلاخوں کو زمین میں گاڑ دے اور آلے کو کانوں سے لگا لے۔ نمائندہ آلے کو لے کر رہائش گاہ سے ایک میل دور آ گیا۔ جب اس نے آلہ کانوں سے لگایا تو اسے فیلڈ کے بیٹے کی آواز بالکل صاف اور واضح سنائی دی۔ اس نے اخبار میں لکھا "یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لڑکا ساتھ والے کمرے سے بول رہا ہے۔"

اسٹیبل فیلڈ کے بارے میں مضمون شائع ہوا تو فلاڈلفیا کے سرمایہ داروں نے اسے بلا لیا تاکہ دیکھا جائے کہ یہ شخص جس کا دعویٰ ہے کہ وہ برقناطیسی فیلڈ کے ذریعے بے تار برقی پیغامات کی ترسیل کر رہا ہے اور جو پیش گوئی کر رہا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب کنٹکی کے کسان دارالحکومت سے نشر کردہ موسمی رپورٹ سنا کریں گے۔ کس حد تک درست کہتا ہے۔

فیلڈ نے ان کے سامنے کامیاب تجربے کئے اور پھر واشنگٹن چلا آیا۔ ورجینیا کے ساحل پر ایک مقررہ جگہ پر کئی معزز اور معتبر افراد کے سامنے ایک چھوٹی سی کشتی میں آلات رکھ کر ساحل سے دور لے جایا گیا۔ کشتی پر موجود معتبر افراد کی صاف آواز ساحل پر بھی سنی گئی۔ فیلڈ ایک مرتبہ پھر اپنا لوہا منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ واشنگٹن کے اخبار ایوننگ سٹار نے ۲۰ر مئی ۱۹۰۲ء کی اشاعت میں اس واقعے کی خبر جلی سرخیوں میں شائع کی۔

اخبار نے لکھا "تاریخ میں پہلی مرتبہ کنٹکی کے کسان سٹیبل فیلڈ کی ایجاد کی بدولت بے تار برقی کا پیغام نصف میل کے فاصلے سے سنا گیا۔" فیلڈ کو کئی سرمایہ داروں نے رقم کی پیش کش کی مگر وہ نہ مانا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اس کی ایجاد کا راز نہ پا لے۔ اس نے اپنی ایجاد کو پیٹنٹ بھی کرا لیا۔ مگر اس بات کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی۔ ورجینیا سے وہ اپنا سامان سمیٹ کر پھر کنٹکی میں اپنے فارم پر چلا آیا۔ ۱۹۲۹ء میں اطلاع آئی کہ وہ اپنے پرانے بوسیدہ جھونپڑے میں مردہ پڑا ہے اور اس کا سارا ساز و سامان بھی غائب ہے۔ بلاشبہ وہ ایک نابغہ انسان تھا۔[11]

اس کی یاد میں سرکاری محل میں اس جگہ ایک یادگاری مجسمہ نصب کیا گیا جہاں پہلی مرتبہ کامیاب تجربہ کا مظاہرہ کرنے کا انعام اسے عوام کی گالم گلوچ اور ٹھٹے مخول کی صورت میں ملا تھا۔ کیا وہ وائرلیس کا اصل موجد تھا؟ پھر مارکونی کو یہ اعزاز کیسے حاصل ہو گیا؟

# پانی کا ایندھن - جعل سازی یا حقیقت؟

یہ ۱۹۱۶ء کا ذکر ہے ایک روز دو افراد موٹر میں سوار نیویارک نیوی یارڈ میں آ دھمکے ایک شخص جان اینڈریوس اپنے آپ کو میکسی پورٹ کے علاقے کا موجد بیان کرتا تھا جب کہ دوسرا جان کرنی، اپنے آپ کو پنسلوانیا کا بینکار بتلاتا تھا۔ اس شخص نے دعویٰ کیا کہ وہ دونوں بڑی دور سے آ رہے ہیں اور سارے سفر میں انہوں نے جو ایندھن استعمال کیا اس میں بڑی مقدار پانی کی تھی۔ اور اس عجیب ایندھن کی ایجاد کا سہرا جان اینڈریوس کے سر ہے جس کے بل پر وہ پٹس برگ سے نیویارک پہنچے تھے ان کی درخواست تھی کہ اس بات کا جائزہ لیا جائے اور تسلیم کیا جائے کہ یہ ایک نئی انقلاب آفرین ایجاد ہے۔ اس وقت یارڈ پر انجینئر جیسوپ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اسے جب اس بات کی خبر ملی تو اس نے انہیں آزمانے کا فیصلہ کیا اور اپنے سامنے ایندھن کی تیاری کا فیصلہ دیا۔

اگلے روز دونوں اشخاص سامان کے ساتھ آ پہنچے۔ اینڈریو کے پاس ایک خالی گیلن تھا اور ایک چھوٹا تھیلا۔ بحریہ کے آدمیوں نے اسے ٹنکے کا پانی دیا اور اس نے تجربے کی تیاری شروع کر دی اور کچھ ہی دیر بعد گیلن کو بھر کر انجن کے ٹینک میں انڈیل دیا لیکن جیسوپ اور اس کے ساتھیوں کو شک ہوا کہ اینڈریو نے گیلن میں پانی ہی بھرا ہے یا چالاکی سے کوئی اور چیز؟ لیکن انہوں نے محض بڑبڑانے پر اکتفا کیا۔ اب اینڈریو نے جیب سے ایک ننھی سی بوتل نکالی اور اس میں موجود سبز محلول کے چھ سات قطرے انجن کے اس خانے میں ٹپکائے جہاں اس نے ٹنکے کا پانی ڈالا تھا "انجن چالو کرو" اینڈریو نے کہا۔ انجن چند لمحوں کے لئے پھٹپھٹایا اینڈریو نے یہ دیکھ کر جلدی سے انجن کے پرزوں کو ہلایا اور انجن رواں ہو گیا۔

انجن کی کارکردگی ۷۵ فیصد تک صحیح تھی اور یہ اس وقت تک کام کرتا رہا جب تک کہ ٹینک میں موجود آمیزہ ختم نہ ہو گیا۔ بہت خوب۔ لیکن کل ایک مرتبہ پھر تجربہ دہرایا جائے۔ بحریہ کے عملے نے فیصلہ دیا۔

چنانچہ اگلے دن اینڈریو پھر آ گیا۔ ایک بالکل خالی کمرے میں گزشتہ رات بحریہ کے عملے نے سمندری پانی کا ایک گیلن بھر کر رکھ چھوڑا تھا تاکہ پانی کو کمرے میں کہیں گرایا نہ جا سکے۔ لیکن اینڈریو نے پھر ایندھن تیار کر دکھایا اور اس سے فوراً ہی انجن بھی چلا دیا۔ حیرت ناک۔ ناقابل یقین، کیا انسان نے ایندھن کے ایک اور عمدہ اور سستے ذریعے کا سراغ لگا لیا تھا۔ ؟

فوری طور پر واشنگٹن ڈی سی میں بحریہ کے سیکرٹری جوزیفس ڈینیل کو اطلاع دی گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اور چند سائنس دان بذات خود ایک مرتبہ پھر یہ تجربہ دیکھنا پسند کریں گے لیکن یہ کیا؟ عین وقت پر اینڈریو صاحب غائب ہو گئے۔ اطلاع یہ ملی کہ وہ اس تجربہ بازی سے اکتا گئے ہیں۔ ایک اور اطلاع تھی کہ موصوف پرتگال کے دورے پر گئے ہیں تاکہ اپنی جنم بھومی کی سیر سے دل بہلائیں۔ ایک اور صاحب کا کہنا تھا کہ وہ انگلینڈ جا چکے ہیں۔

یہ کوئی عمدہ بات نہ تھی۔ اگر وہ شخص فراڈ نہیں تو پھر بحریہ سے ایک بھاری غلطی ہوئی تھی۔ انہوں نے معاملے کی چھان بین شروع کر دی لیکن انہیں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ اس نے کیمیکلز کی دکانوں سے احتراق میں استعمال ہونے والے عام سے کیمیائی مادے خریدے تھے۔ جنگ عظیم اول کا ہوا ختم ہوا۔ تو اینڈریو کی یاد بھی تقریباً محو ہو گئی لیکن پھر جنگ عظم دوم چھڑ گئی۔ امریکہ کو ایندھن کے حصول میں دشواری کا سامنا تھا۔ اینڈریو کی تلاش دوبارہ شروع ہو گئی۔ لیکن بے نتیجہ رہی۔ اس کے بارے میں میکسیس پورٹ کے لوگ بھی لاعلم تھے۔ جہاں وہ عرصے سے رہ رہا تھا لہٰذا تلاش کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔

انٹرنیشنل نیوز سروس کے ایک نامہ نگار جیمز۔ ایل۔ کلگالن نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے ذہن میں اخبارات کی وہ خبر چپک کر رہ گئی تھی جو بحریہ سے متعلق تھی جس کے مطابق جنگ عظیم اول میں ایک پراسرار موجد نے پانی کا ایندھن بنانے کا تجربہ کیا تھا لیکن پھر اچانک روپوش ہو گیا۔ کلگالن نے بغیر کسی دشواری کے اس شخص کو ڈھونڈ نکالا! (یا جیسا کہ اس نے دعویٰ کیا) اس نے کہا کہ ۵۵ سالہ اینڈریو اسے رابرٹ ہالو کے علاقے میں ملا تھا۔ وہ ۱۴۵ ایکڑ کے فارم پر اپنی بیوی اور ایک بیٹی کے ہمراہ رہتا ہے۔ اس نے رابرٹ کو بتایا کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ اس نے پہلی جنگ عظیم میں بحریہ کے سامنے پانی کو ایندھن میں تبدیل کرنے کا تجربہ کیا تھا لیکن اس خبر میں کوئی صداقت نہیں کہ وہ بذات خود واشنگٹن ڈی سی گیا تھا اور حکومت نے اس کی خواہش کے مطابق دو ملین ڈالر کی رقم ادا کرنے کی حامی بھر لی تھی۔ یہ قصہ اخبارات نے گھڑا تھا "انہوں نے مجھے ایک پنی کی پیش کش بھی نہیں کی اور نہ ہی میں نے ایک پنی کے لئے کہا۔ "

اس سوال کہ "وہ تجربہ کے بعد اچانک کہاں چلا گیا تھا؟" کا جواب اس نے یہ دیا کہ اسے تجربات کے سلسلے میں برطانیہ کا سفر کرنا پڑا تھا لیکن وہ ناکام رہا۔ لہٰذا اس نے اس تجربہ پر کام چھوڑ کر دیگر تجربات پر زیادہ توجہ دینی شروع کی اور اب اس ایندھن کا فارمولا بھول چکا ہے۔ لیکن اگر حکومت کی خواہش ہوئی تو وہ دوبارہ کوشش کرنے کو تیار ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ ہر ممکنہ طور پر بلا کسی اجرت کی تمنا کے، حکومت کی مدد کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ فی الوقت وہ اپنی تجربہ گاہ میں دیگر کئی منصوبوں کے علاوہ ایک نئے قسم کے مصنوعی ربڑ کی تیاری میں مصروف ہے جو ربڑ کی مروجہ تمام مصنوعی اقسام سے بہتر ہو گا۔

لیکن اینڈریو سے پھر کبھی حکومت نے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور وہ خود بھی اپنی ایجادات بغیر پیٹنٹ کرائے ۱۹۵۳ء میں ۶۷ برس کی عمر میں انتقال کر گیا اور اپنے پیچھے یہ سوالات چھوڑ گیا کہ کیا وہ ایک نابغہ روزگار تھا جس کے ایجاد کردہ ایندھن کا طریقہ اگر معلوم ہو جاتا تو انسانی تہذیب پر تہلکہ مچا دینے والا اثر پڑتا؟ اور وہ کون سے کیمیکلز تھے جنہیں وہ اپنے تھیلے میں لئے پھرتا تھا؟ وہ کون سا سبز محلول تھا جس کے چند قطرے پانی کی کایا پلٹ کر رکھ دیتے تھے؟ بحریہ کے عملے نے اس کی تلاش میں مستعدی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا حالانکہ وہ اسے جعل ساز ثابت نہیں کر پائے تھے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا وہ اتنا حساس تھا کہ محض اپنے تجربات کے بارے میں سرکاری اہلکاروں کے نامناسب رویئے کے سبب نسل انسانی کو ایک عظیم ایجاد سے محروم کر گیا؟ یا ان سب باتوں کے برعکس ایک باکمال شعبدہ باز جس نے کسی نامعلوم طریقے پر بحریہ کے اعلیٰ عہدہ داروں کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ (12)

# نکولا تیسلا ۔ ایک عظیم اور پراسرار موجد

برقیات کے طالب علم ایک اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ برقی امالہ Electrical Induction برقی امالہ کی اکائی کو تیسلا کہا جاتا ہے۔ یہ اکائی ایک عظیم برقیات دان نکولاس تیسلا کے نام پر رکھی گئی ہے۔

نکولا تیسلا ۱۸۵۷ء کروشیا (یوگوسلاویہ) کے علاقہ سمل جان میں پیدا ہوا۔ وہ خاصا ذہین شخص تھا۔ مگر غربت نے اسے یوگوسلاویہ میں ٹکنے نہ دیا اور ۱۸۸۴ء میں ۲۸ برس کی عمر میں وہ نیویارک چلا آیا۔ یہاں قسمت نے یاوری کی اور اسے ایڈیسن کمپنی میں ملازمت مل گئی اور یوں اسے اپنی صلاحیتیں منوانے کا خوب موقع ہاتھ آگیا۔ چنانچہ کمپنی کی جانب سے اس نے نیاگرا آبشار کے برقی پلانٹ کے لئے جنریٹر بنایا۔ ۲۴ مختلف قسم کے ڈائنمو ایجاد کئے۔ بے تار برقی ریڈیائی مواصلات میں شاندار تجربات کئے اور بغیر فلامنٹ کے برقی بلبوں کے علاوہ تیسلا کوائل اور انڈکشن موٹر ایجاد کئے۔

وہ بڑا عجیب مردم بیزار اور من موجی قسم کا آدمی تھا۔ طبیعیات کے نوبل پرائز کے سلسلے جب اس کی نامزدگی کی کوشش کی گئی تو اس نے اسے ٹھکرا دیا۔ رائل سوسائٹی کے صدر لارڈ کیلون نے نکولا کو "اصل نابغہ" کہا تھا۔ اس کی ایجادات سے لوگوں نے لاکھوں ڈالر کمائے مگر خود اس کا انجام کیا ہوا؟

وہ ۱۹۴۳ء میں ہیٹن کے نیویارک ہوٹل کے ایک سستے سے کمرے میں تنگ دستی کے عالم میں مرا لیکن اپنے پیچھے عجیب کہانیاں چھوڑ گیا کیونکہ ابھی اس کی تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ امریکہ محکمہ خفیہ F.B.I کے آدمیوں نے ہوٹل کے کمرے سے تیسلا کی تمام تحریروں اور کاغذات بحق سرکار قومی مفاد کے تحت ضبط کر لئے۔

وہ حقیقتاً نابغہ روزگار تھا۔ ایڈیسن کمپنی سے الگ ہونے کے بعد اس نے ذاتی الیکٹرک کمپنی بنا لی تھی اور صرف ۱۲ ماہ کے قلیل عرصے میں اپنی ۳۰ سے زائد ایجادات پیٹنٹ کرائی تھیں۔ لیکن یہ اس کا مطمح نظر نہ تھا۔ کیونکہ ایجادات کو پیٹنٹ کرانے سے جو رقم حاصل ہوئی تھی اس نے اسے اپنے اہم تر تجربات کے لئے کولریڈو کے راکیز پہاڑوں میں ایک خفیہ تجربہ گاہ بنانے میں صرف کر دیا تھا۔ وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟ اور اس کی موت کے بعد ایف بی آئی نے اس کے کاغذات کیوں محفوظ کر لئے تھے؟

اس شخص کے ذہن کو داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ وہ اس دور میں جب جہاز بھی ایجاد نہ ہوا تھا۔ ایٹمی شعاعوں کے ہتھیاروں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور شاید اس نے اس سلسلے میں کامیابی بھی حاصل کی تھی۔ شاید یہ بات بھی درست ہو کہ اس نے بیلاسٹک میزائیلوں کی ایجاد سے ۷۰ سال قبل ہی ان میزائیلوں کو تباہ کرنے والی قوت کا پتہ چلا لیا تھا!

کولریڈوں کے پہاڑوں میں تیسلا ایک اہم تجربہ کر رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ زمین کو ایک بوسٹر کے طور پر استعمال کرتے ہوئے پورے کرہ ارض پر محیط ایک ایسا توانائی کا فیلڈ پیدا کرے جس سے وہ اپنے طاقتور جنریٹر چلا سکے۔ اس کی تجربہ گاہ کے باہر ۲۰۰ فٹ لمبا دھاتی مستول نصب تھا جس کی چوٹی پر ۳ فٹ قطر کا تانبے کا ایک گولا لگا ہوا تھا۔ اندر تجربہ گاہ میں موجود برقی کوائل کی کم وولٹیج کو وہ اپنے ٹرانس میٹر کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ جب کہ ایک اور کوائل باہر مستول کے گرد لپٹا ہوا تھا۔ تیسلا کی کوشش تھی۔ کہ کرہ ارض کی اپنی توانائی کے بے پناہ ذخائر استعمال میں لاتے ہوئے برقی رو کو بغیر کسی تار کے دور تک پہنچایا جائے۔

تجربہ کامیاب رہا اور مستول کے گرد لپٹے کوائل سے ۲۵ میل پرے تک لگے ہوئے۔ ۲۰۰ قمقموں سے بھرپور روشنی حاصل ہوئی حالانکہ درمیان میں برقی رو کے لئے تاریں استعمال نہ ہوئی تھیں۔ اب تیسلا کا ارادہ زمین کی مخفی قوت کو کام میں لانے کا تھا۔ چنانچہ اس نے بالائی فضا کی جانب اونچے تعدد والی ریڈیائی امواج پھینکیں جو ٹکرا کر واپس آئیں تو ان واپس آنے والی لہروں کو پھر اچھالا گیا یوں لہروں کی بازگشت کے آنے جانے سے مستول میں توانائی بڑھتی جانے لگی۔ یہاں تک کہ تانبے کا گولہ پھٹ گیا۔ اور اس سے چنگاریاں نکل کر کئی سو فٹ بلندی تک گئیں۔ کان پھاڑ دینے والی آوازیں بلند ہوئیں اور تیسلا نے گرج چمک کا مصنوعی طوفان پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

یہ بلاشبہ انسان کی فطرت پر ایک بڑی کامیابی تھی لیکن تیسلا نے نامعلوم وجوہات کی بناء پر تجربات کو موقوف کر دیا حالانکہ اسے سرمائے کی پیشکش بھی

ہوئی تھی مگر وہ اپنی تحقیقی دنیا میں مشغول ہو گیا۔ شواہد کے مطابق اس نے ایک اور خوفناک چیز ایجاد کر لی تھی۔

وہ گوشہ نشین سا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک آلہ ایجاد کیا تھا اور اس کے بارے میں جو تشریحات دی گئی ہیں ان کے مطابق بے شک یہ آلہ لیزر آلات پر پورا اترتا ہے۔ یوں بظاہر لیزر ہتھیاروں کے سلسلے میں انسان کو ۱۹۶۰ء میں کامیابی ہوئی مگر پراسرار سائنس دان تیسلا ۱۹۳۴ء میں ہی اس سے واقفیت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے یہ آلہ تیار کر لیا تھا اور اسے اس کی جنگی اہمیت کا بھرپور اندازہ تھا۔ یہ ایک ایسا جوہری ہتھیار تھا جس کی مدد سے دور دور تک کی چیزوں کو اس طور سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا کہ راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو تباہ کیا جا سکے۔

اگرچہ اس آلے کے بارے میں تیسلا نے کوئی خاطر خواہ تفصیلات نہیں دیں مگر اس خوفناک ایجاد کے بارے میں اس نے اپنے تحقیقی کاغذات میں اس کے بارے میں چند رازوں کو بڑے محتاط طریقے سے قلم بند کیا تھا اور ان کاغذات کو تیسلا کی موت کے تھوڑے دیر بعد حکام نے ضبط کر لیا تھا۔

مگر تیسلا مرا نہیں اس کی موت کے بعد گاہے گاہے اس کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ مثلاً ۱۹۷۷ء میں اس کی موت کے ۳۵ برس بعد اس کا تذکرہ کیا گیا۔ ہوا یوں کہ کینیڈا سے سرکاری اطلاع ملی کہ آرکٹک کی بالائی فضا میں پراسرار برقی طوفان اور ریڈیائی لہروں میں پیچیدہ وقفے دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ چنانچہ واشنگٹن میں سی آئی اے کو اس مسئلہ کے اسباب کا سراغ لگانے کا حکم دیا گیا۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ سیمی پلانٹنسک Semipalantinsk کے مقام پر واقع روسی فوجی بیس سے تجربے کے دوران جوہری شعاع پھینکی گئی ہے جس سے بالائی فضا کی تہیں پھٹ گئی ہیں اور اسی لئے ریڈیائی نشریات میں تعطل اور وقفے پیدا ہو رہے ہیں بتایا گیا کہ جوہری شعاع کا ہتھیار روسیوں نے نکولا تیسلا کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر بنایا ہے۔

جنگی اعتبار سے امریکہ کے لئے یہ کافی بڑی خبر تھی۔ تیسلا کی تحقیق نے آج یہ دن دکھایا تھا کہ اگر امریکہ کسی نشانے پر نیوکلیئر میزائل داغتا تو اسے راستے میں ہی روسی جوہری شعاع سے تباہ کر سکتے تھے۔

تیسلا کی ایجاد سے اور خطرات بھی رونما ہوئے جوہری شعاعوں سے زمین کے گرد موجود قدرتی حفاظتی فضائی غلاف میں سوراخ ہو گئے تھے۔ اس کے اثرات بڑے دور رس ہوئے اور آب و ہوا میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

چنانچہ اونٹاوا میں کینیڈا کے شعبہ مواصلات کے ایک ڈائریکٹر والٹن ڈبلیو سکاٹ نے خدشہ ظاہر کیا کہ ان جوہری تجربات کے نتیجے میں ہی برطانیہ ۱۹۷۶ء میں خشک سالی کا شکار ہوا۔ گرین لینڈ کے درجہ حرارت میں اضافہ سے گلیشیر پگھلنے لگے اور میامی میں برف باری ہوئی۔

کینیڈا کے سائنس دان اینڈریو مائیکرو وسکی نے کہا "مجھے صاف پتہ ہے کہ روسی تیسلا کے تصورات کی بنیاد پر یہ تجربات کر رہے ہیں۔ اور انہی (تجربات کی) وجہ سے انہوں نے دنیا کا موسم تبدیل کر دیا ہے۔"[13]

# بارش برسانے والے

زمانہ قدیم سے ایسے افراد مختلف معاشروں میں موجود رہے جنہیں شامن کہا جاتا تھا، جو مظاہر فطرت کو متاثر کرنے کے دعویدار ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ بارش برسانے کے مدعی بھی تھے۔ یہ لوگ خشک سالی کے دوران جنگلات میں آگ لگا کر بارش کرواتے تھے۔

شاید اسی تصور کے تحت سول وار کے دوران امریکی فوجیوں کا خیال تھا کہ توپوں سے نکلنے والا دھواں آسمان پر جاتا ہے اور بارش برسا دیتا ہے۔ یہ بات ان کا عام مشاہدہ تھی۔

۱۹ویں صدی کے اواخر میں آسٹریلیا کا ایک شخص فرینک میلبورن امریکہ میں وارد ہوا اور وہاں اشتہارات دیئے کہ اگر بارش برسانا ہو تو اس سے رابطہ کیا جائے۔ اس کی شہرت سن کر گڈلینڈ (کنساس) کے کسانوں نے اسے بلا بھیجا تاکہ خشک سالی دور کرائی جائے۔ کئی روز سے وہاں بادل کا ایک ٹکڑا بھی دیکھنے میں نہیں آ رہا تھا۔ فرینک نے تجربہ شروع کیا۔ ۳۰ مربع فٹ زمین کے ارد گرد کینوس کی چادریں تان دی گئیں۔ اوپر چھنی کے ۳۰ فٹ لمبے پائپ سے کیمیائی تعاملات کے نتیجے میں دھوئیں کے مرغولے نکلنے لگے۔ سہ پہر کے قریب نہ جانے کہاں سے گہرے بادل آ کر جمع ہو گئے اور رات کو خوب بارش ہوئی۔

اگلے برس معمول کے مطابق بارشیں ہوئیں۔ لہٰذا فرینک کی ضرورت نہیں پڑی اور وہ افریقہ چلا گیا۔ ایک اور شخص سی بی جیول ایک اور طریقہ استعمال

کرتا تھا۔ وہ غبارے کے ساتھ ڈائنامائیٹ باندھ کر ۵۰۰ یا ہزار فٹ کی بلندی پر لے جا کر ٹیلیفون کی تار کے ذریعے دھماکہ خیز مادے کو پھاڑ دیتا۔ نئے دور میں اس حوالے سے چارلس میلوری ہاٹ فیلڈ نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ بارش برسانے کا شوق اسے پہلی بار ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب سے ہوا جس میں سائنسی طریقوں سے بارش برسانے کے غیر مصدقہ تجربات درج تھے۔ ۱۹۰۲ء میں اس نے اپنے تجربات کی ابتداء کی اور خاصی شہرت حاصل کی۔ وہ لکڑی کے بڑے ڈبوں کو ڈنڈوں کے ذریعے ۱۲ فٹ بلندی پر کھڑا کر دیتا تھا۔ پھر ان میں موجود پانی میں کچھ کیمیائی مادے حل کر دیتا تھا اور ساتھ ہی تیزاب ملا دیتا تھا اور پھر ڈبوں کا منہ لکڑی کے ڈھکنوں سے مضبوطی سے بند کر دیتا تھا۔ ۲۰ منٹ بعد وہ ڈھکنا ہٹاتا تو اندر سے بخارات نکل کر ہوا میں مل جاتے اور پھر بارش ہو جایا کرتی۔

اس طریقے پر اس نے ۲۵ برس تک لاس اینجلس میں مختلف مواقع پر بارش برسانے کا کام کیا۔ وہ ایک تجربہ قیمت ۵۰ سے ۱۰ ہزار ڈالر کے درمیان وصول کرتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے جھیل ہیمٹ کے آبی ذخیرے میں ۱۱ انچ بارش برسانے کی حامی بھری تھی مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ صحرائے موجاو کا ہے جہاں اس نے ۳ گھنٹے کے دوران ۴۰ انچ بارش برسا کر ایک ریکارڈ قائم کر دیا تھا[14]

# افق کے پار دیکھنے کا علم

وہ افق سے پرے موجود کشتی یا جہاز کا پتہ لگا لیتا تھا حالانکہ وہ دکھائی نہیں دے رہی ہوتی تھی۔ اس شخص کا پورا نام بھی معلوم نہیں۔ یار دوست اسے بوٹینیو Bottineau کہتے تھے۔ اس کی پیدائش ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ فرانس میں ہوئی تھی ۱۷۶۲ء میں فرانس میں بحریہ میں ایک معمولی عہدے پر ملازم ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی کشتیاں یا جہاز جو لہروں پر رواں دواں ساحل کی جانب آ رہے ہوں تو ان سے کرہ ہوائی متاثر ہوتا ہے۔ فضا میں یہ تبدیلی کوئی "صاحب نظر" آدمی دیکھ لے تو کشتی یا جہاز کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے آنے کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ خواہ عام انسانی آنکھ یا دوربین بھی اسے دور دور تک نہیں دیکھ پا رہی ہو۔

۱۷۶۴ء میں اسے جزائر ماریشس میں تعینات کیا گیا۔ یہاں اس نے اپنے نظریئے پر کام شروع کیا۔ ۶ ماہ کی مسلسل کوشش کے بعد وہ اپنے تجربات میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس نے ایک نیا تماشا شروع کیا وہ اپنے ہم پیشہ افراد سے شرطیں لگاتا کہ ۲ یا ۳ روز بعد ایک یا زیادہ بحری جہاز یا کشتیاں ماریشس کے ساحل پر پہنچنے والی ہیں۔ یہ کوئی تکا نہیں تھا۔ یہ بندرگاہ کوئی خاص مصروف بھی نہیں تھی دور دور تک سارا سمندر صاف شفاف ہوتا۔ لوگ دوربین لگا لگا کر دیکھتے مگر افق تک تاحد نگاہ سارا سمندر سنسان پڑا نظر آتا اور لوگ بوٹینیو سے شرط لگا لیتے مگر ہار جاتے کیونکہ واقعتاً ۲ یا ۳ روز میں اس کی بتائی ہوئی تعداد کے مطابق کشتی یا جہاز افق پر نمودار ہو جاتے۔ اس نے بڑی شرطیں لگائیں اور خوب دولت کمائی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اس سے شرط لگانا ہی چھوڑ دی۔ مگر ہر شخص اس کی اس پراسرار صلاحیت کا معترف ہو گیا۔ آخر وہ افق سے پیچھے کیسے دیکھ لیتا تھا؟

اس نے کبھی روحانیت کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ اپنی اس حیرت انگیز صلاحیت کو ایک فن قرار دیتا تھا اور اس فن کی تشریح اس طرح کرتا تھا کہ کشتیاں اور جہاز پانی پر چلتے ہوئے فضاء میں اپنے نقوش چھوڑتے جاتے ہیں اور انہیں نقوش کو دیکھ کر وہ ان کی آمد کا پتہ چلا لیتا ہے اور ان نقوش کو دیکھنا کوئی خاص مشکل بات نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ۳ یا ۴ روز کی مسافت پر آنے والے جہازوں کو "دیکھ" لیتا تھا۔

اپنے دور ملازمت میں ۱۷۸۲ء۔۱۷۷۸ء کے دوران اس نے ماریشس آنے والے ۵۷۵ جہازوں کی آمد کی بالکل درست پیش گوئی کی۔ بعض اوقات بظاہر اس کی پیش گوئی غلط ہو جاتی کیونکہ جہاز جزیرے پر نہ پہنچتا تب معلوم کرنے پر پتہ چلتا کہ فی الحقیقت جہاز آ رہا تھا مگر جزیرے سے کچھ ہی فاصلے پر اس نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا۔

مئی ۱۷۸۲ء میں بحریہ کے وزیر نے ماریشس کے گورنر کو حکم جاری کیا کہ بوٹینیو کی پیش گوئیوں کا باقاعدہ ریکارڈ تیار کیا جائے۔ ۲ برس تک بوٹینیو کی جہازوں کی آمد سے ۲ سے ۳ روز پہلے ہی کی جانے والی بے خطا پیش گوئیوں کا مستقل طور پر اندراج کیا جاتا رہا۔ تجربے کے اختتام پر بوٹینیو کو ۱۰ ہزار لور رقم بطور

انعام اور ۱۲۰۰ سالانہ پنشن کی پیش کش اس شرط کے تحت کی گئی کہ بوٹینیو اپنے فن کا راز حکومت فرنس کے سامنے افشا کر دے۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔

بوٹینیو نے اس فن کو Nauscopie کا نام دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک بالکل نیا علم ہے مگر ہر شوقین شخص اسے سیکھ سکتا ہے۔

اس علم کی حربی افادیت کا احساس پہلی مرتبہ اس وقت ہوا جب اس نے ماریشس کے گورنر کو ۱۱ بحری جہازوں کی آمد کی اطلاع دی جو جزیرے کی جانب بڑھے چلے آرہے تھے۔ اس وقت حالات خاصے کشیدہ تھے۔ چنانچہ گورنر نے ان جہازوں کی خبر لینے ایک جنگی جہاز کو بوٹینیو کی بتائی گئی سمت میں بھیجوا دیا مگر بوٹینیو نے اس کے جانے کے بعد خبر دی کہ ۱۱ جہازوں نے رخ تبدیل کر لیا ہے۔ جنانچہ اس فرانسیسی جنگی جہاز نے واپس آکر بوٹینیو کی تصدیق کی۔ اب بوٹینیو کا ارادہ تھا کہ اپنی اس قیمتی دریافت کو مادر وطن فرانس کے حوالے کر دے۔ جزیرے پر موجود مختلف معتبر اور محترم افراد نے اس کے عظیم فن کو تسلیم کرتے ہوئے اسے تعریفی اسناد سے نوازا تاکہ فرانس میں اسے اپنی شناخت کرانے میں دشواری نہ ہو۔

فرانس کی جانب بحری سفر میں اس کے ہم سفر کپتان کو بارہا اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہوا۔ اس نے سمندر میں ۲۷ جہازوں کا پتہ دیا جو جہاز سے بالکل بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ یہیں اسے علم ہوا کہ یہ فن خشکی کی طرح پانی میں بھی ویسا ہی کار آمد ہے چنانچہ دوران سفر اس نے کپتان کو یہ بھی بتایا کہ ان کا جہاز خشکی سے کتنا دور یا نزدیک ہے۔(15)

۱۳ر جون ۱۷۸۴ء کو بوٹینیو فرانس پہنچ گیا۔ مگر وہاں حالات خاصے کشیدہ تھے۔ یہ زمانہ انقلاب فرانس سے کچھ بیشتر کا تھا۔ بوٹینیو کو انعام کا لالچ تھا مگر دیوالیہ حکومت اسے کچھ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور اس سے بڑھ کر افسوس ناک بات یہ ہے کہ کسی نے اس کو وہ توجہ اور عزت بھی نہیں دی جس کا وہ مستحق تھا۔ وہ سیدھا پیرس گیا تاکہ وزیر بحریہ سے ملاقات کر سکے مگر سرکاری عملہ اس کی راہ میں رکاوٹ بنا رہا۔ ہفتوں بعد جا کر جواب ملا کہ تمہاری پیش کش پر غور ہو رہا ہے۔ خدا خدا کر کے ایک روز "مرکیورے ڈی فرانس، کا مدیر ایبے فونٹینے بوٹینیو کو ملا۔ بوٹینیو نے لاکھ کہا کہ اس کی تعریفی اسناد اور معززین کے تحریر کردہ تعارفی خطوط کو ایک نظر دیکھا جائے مگر فونٹینے نے حد کر دی اس نے کاغذات کے پلندے کو نظر انداز کر کے الٹا بوٹینیو کے علم کی اصلیت میں ہی شبے کا اظہار کر دیا۔ وہ جو ناسکوپی کو اٹھارویں صدی کا طرہ امتیاز سمجھ بیٹھا تھا۔ اسے ایڈیٹر نے کتنی گھٹیا بات کہہ دی۔ اس نے کہا کہ بوٹینیو کی کشتیاں وغیرہ سمندر کے بحری جہاز نہیں بلکہ ہوائی قلعے ہیں۔

حد ہو گئی تھی اتنے دن کے بے جا انتظار کا ایسا نتیجہ نکلا؟ بوٹینیو دل مسوس کر رہ گیا۔ وہ منظر عام سے غائب ہو گیا۔ ۵ برس بعد انقلاب سے کچھ پہلے جون ۱۷۸۹ء میں سکاٹس میگزین نے خبر دی کہ بوٹینیو نامی شخص جس نے جہازوں کی آمد کا پتہ لگانے کا طریقہ ایجاد کیا تھا بڑی کسم پرسی کے عالم میں پونڈیچیری کے مقام پر وفات پا گیا ہے۔

اس شخص نے اپنے اس حیرت انگیز فن کی بابت کوئی تحریر نہیں چھوڑی جس کے بارے میں ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر حکومت فرانس اسے سنجیدگی سے حاصل کرنے کی کوشش کرتی اور بوٹینیو کو اس کی قیمت ادا کر دیتی تو ٹریفیلگر کی جنگ میں فرانس کامیاب ہو جاتا اور نپولین نے انگلینڈ فتح کر لینا تھا۔ کیونکہ اگر ناسکوپی کا علم فرانسیسیوں کے پاس ہوتا تو نیلسن کا حملہ آور بحری بیڑا یوں بے خبری میں اچانک حملہ نہ کر سکتا۔

بوٹینیو اپنے ساتھ یہ راز قبر میں لے گیا۔ لیکن ۱۸۱۸ء میں ماریشس جزائر میں ایک بوڑھا لوگوں کو کہتا پھرتا تھا کہ اس نے بوٹینیو سے یہ علم سیکھ لیا تھا۔ یہ بڈھا برطانوی ملاحوں کو اپنی اس صلاحیت کے بل پر حیرت زدہ کر دیتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں پیٹر گرین نامی شخص کی خبر آئی جو TRISTAN DA CUNHA کے جزیرے پر رہتا تھا کہ اسے بھی ناسکوپی پر گرفت حاصل ہے۔ مگر حقیقی طور پر اب یہ قیمتی علم انسانوں کی غلطی سے ناپید ہو چکا ہے۔

# حوالہ جات

## باب ششم


1. World of incredible But True P:104
2. World's Greatest Mystries
3. The Book of Great Mystries P:485-486
4. World Book Encyclopedia
5. World Famous Supernatural Mystries P:27
6. Granada T.V. Programme Sacre & Mysteries
7. تیری رائشتاخ از سید احمد حسین
8. Granda T.V. Program Secrets & Myst
9. ایضاً
10. People's Alamanac II P:1270
11. سائنس سے عجیب تر صابر کلوری
12. People's Almanac II P:1354
13. World's Greatest Mystries P:160
14. World of Incredible But True P:143
15. People's Almanac II P:1254

باب ہفتم

# نامعلوم انجام
# اور
# پراسرار گمشدگیاں

# گمشدہ سرزمین

قدیم ادوار سے انسانی تاریخ میں کسی ایسی سرزمین کا تصور ملتا ہے، جو مکمل طور پر حسن کا مرقع ہے جہاں غم نام کو نہیں جہاں کی آسائشیں انسانی تصور کی قید میں نہیں آسکتیں۔ آسمانی کتابوں سے پیشتر اقوام میں اس کا تذکرہ مختلف انداز میں ملتا ہے۔ سید سبط حسن (ماضی کے مزار) میں دوسرے باب میں سومیر کے بارے رقمطراز ہیں "ایک جنگ ۲۵۵۰ قبل مسیح میں سومیر کی دو ہمسایہ ریاستوں لگاش اور امہ کے درمیان ہوئی۔ نزاع کا سبب ایک سرحدی اراضی تھی جس کا نام لوعدین تھا۔ عدین سومیری زبان میں چراگاہ کو کہتے ہیں۔ باغ عدن کا تصور غالباً یہیں سے آیا ہے۔"[1] قدیم عراقی دیومالائی روایات میں نن ہورسگ (زمین) اور انکی (پانی) کے قصے میں ایک سرزمین دلمون کا تذکرہ ملتا ہے جو کسی جانب سے کم دکھائی نہیں دیتی کیونکہ وہاں فراوانی اور فراغت ہے، جوانی اور تندرستی ہے، امن اور سکون ہے، وہ پاک اور صاف ستھری جگہ روشن اور منور ہے جہاں طائر موت کی آواز نہیں سنائی دیتی جہاں امراض کا وجود بھی نہیں اور بڑھاپا بھی نہیں آتا۔

مسلمانوں کی آسمانی کتاب اور روایات میں بیان کردہ جنت کا نقشہ نہایت دلفریب ہے۔ عدن، بہشت اور جنت الفردوس اس جنت کے مختلف درجات میں سے چند ہیں۔ احادیث بتاتی ہیں کہ جنت کا وقوع بلند ترین آسمان کے اوپر عرش الٰہی کے نیچے ہے۔

قرون وسطیٰ کے لوگوں میں یہ روایت یقین کا درجہ حاصل کر چکی تھی کہ انسانوں کی فردوس گم گشتہ کرہ ارض پر ہی کہیں موجود ہے۔ کولمبس کے زمین کو گول ثابت کرنے کے لئے روانہ ہوتے وقت یہ بات بھی سامنے تھی کہ ممکن ہے کہ دوران سفر اسے گمشدہ بہشت کا سراغ مل جائے۔

تصوراتی دنیا سے بھی ہٹ کر ایسے بہت سے مقامات، شہر، علاقے اور جزائر ہیں کہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اب بھی وجود رکھتے ہیں یا کم از کم ان کی باقیات ضرور موجود ہیں۔

یونانی دیومالا میں بیان کردہ ایک باغ ہیسپیرائڈز جہاں پر ہرکولیس سیبوں کی تلاش میں گیا تھا۔ ایسی ہی شہرت کا حامل ہے۔ دراصل جب سے ہومر کے بیان کردہ ٹرائے کی باقیات یکے بعد دیگرے تباہ ہو کر ایک دوسرے پر تعمیر ہونے والے شہروں کے کھنڈرات کی صورت میں ۱۸۷۰ء میں ہینرخ شلیمان نے دریافت کر لیں تب سے دیومالائی سرزمینوں کے حقیقی وجود پر بحث میں شدت سی آ گئی ہے۔

بلاشبہ گمشدہ سرزمینوں میں اہمیت کے اعتبار سے اولین حیثیت اٹلانٹس کو حاصل ہے جس کے بارے میں افلاطون کے عہد سے تذکرہ ملتا ہے کہتے ہیں کہ یہ نسل انسانی کا اولین گھر تھا جہاں سے تہذیب کو فروغ ہوا۔ افلاطون نے اپنی دو کتابوں تمائس اور کرائیٹیاز میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے اس شہر کا تذکرہ اپنے دادا سے سنا تھا جس کی معلومات کا ذریعہ قدیم ایتھنز کا مشہور قانون دان سولن تھا۔ جس نے مصر کے سفر کے دوران پروہتوں سے سنا تھا کہ ۹ ہزار سال پہلے اٹلانٹس کے علاقے میں ایک زبردست سلطنت تھی جس کی حدود جبرالٹر (ہرقل کے ستونوں) سے مصر اور اطالیہ تک پھیلی تھیں۔ یہاں کے لوگ تصور سے بڑھ کر امیر تھے۔ سونے اور چاندی کی اتنی ریل پیل تھی کہ مندروں کی تعمیر میں استعمال ہوتے تھے۔ وہ بڑے دانشمند لوگ تھے۔ عظیم معمار تھے، قانون کے پابند

تھے۔ ان کے معبد، اور گھر پر شکوہ گھر تھے۔ ان کے سمندر کی گودیاں تجارتی مال سے بھری رہتی تھیں وہاں کبھی قحط نہیں پڑا تھا۔ حیوانات بکثرت تھے لیکن دولت اور طاقت کا نشہ رنگ لایا۔ انہوں نے مصر اور یونان پر چڑھائی کی خاطر زبردست فوج تیار کی لیکن زیس دیوتا سخت ناراض ہوا۔ صرف ایک دن اور ایک رات میں آندھیوں، بارشوں اور طوفان کی زد میں آکر یہ جزیرہ بحرہ اوقیانوس میں ڈوب گیا۔ اپنے تمام باسیوں اور ان کی بے تحاشہ دولت لئے ہوئے۔

پروفیسر احمد الدین مارہروی اپنے مضمون "ہولناک زلزلے نے پورے شہر کو نگل لیا" میں لکھتے ہیں " آج ان حالات کو پڑھ کر لازمی طور پر آپ کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوں گے اور ایسا ہونا انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ جب افلاطون کی یہ تحریریں معاصرین کی نظروں سے گزریں تو انہوں نے بھی اسے جھوٹ جانا۔ افترا پرداز اور خدا معلوم کیا کیا کہا۔ جس کے جواب میں ایک طرف تو خود اس نے ان حقائق کو علم کی روشنی میں ثابت کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف خود ان کے شاگرد جن میں ارسطو بھی شامل تھا اس کا ثبوت حاصل کرنے کی غرض سے مصر گئے۔ قدیم مندر پر منقوش کتابت کو بچشم خود دیکھا۔ مخطوطات کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور ہر طرح سے مطمئن ہو کر جب وطن واپس آئے تو انہوں نے قوم کو بتایا کہ واقعی کئی ہزار سال پہلے ایسا شہر دنیا کے نقشے پر موجود تھا جو یکایک زیر آب مدفون ہو گیا اور اب صرف یہ تحریر ہی اس کی یاد تازہ کرنے کے لئے باقی رہ گئی ہے۔ یہ تو تھا ایک دانشور اور قابل اعتماد مورخ کا بیان لیکن جب ہم دوسری اقوام کی تاریخی روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو نہ صرف یورپ، ایشیاء، افریقہ بلکہ نئی دنیا امریکہ کی ثقافتوں میں بھی اس قسم کی گمشدہ جنت ارضی کا پتہ چلتا ہے مختلف قوموں اور زبانوں میں گو اس کے جداگانہ نام ملتے ہیں لیکن اولین توجہ سے ہی یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ سب کا مخرج ایک ہی ہے، مثلاً عربی کا عدن انگریزی کا ایڈن بریری کا اطلان، یونان کا، اٹلانٹا/ اٹلانٹس مصر کا اینٹی سپین کا اینٹیلا اسی طرح امریکہ میں ازٹک اور مایا کا اطلان سب ایک ہی شہر کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور وسطی امریکہ کی تمام قومیں جن میں مایا اپنی تہذیب کے لحاظ سے سب میں ممتاز ہے اپنے آپ کو اس سرزمین کا قدیمی باشندہ تصور کرتی ہیں۔ ان کی قدیم تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو ایک دو نہیں بیسوں روایات ایسی ملیں گی جن میں اسی جنت ارضی کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ بیان ہوا ہے "جس جگہ آج اوقیانوس موجزن وہاں کسی زمانے میں ایک بے انتہا زرخیز سرسبز شاداب ملک تھا کھیتیاں ایسی لہراتی تھیں کہ قحط کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا پھل پھول

1644ء کے ایک نقشے میں ایٹلانٹس کا وقوع دکھایا گیا ہے

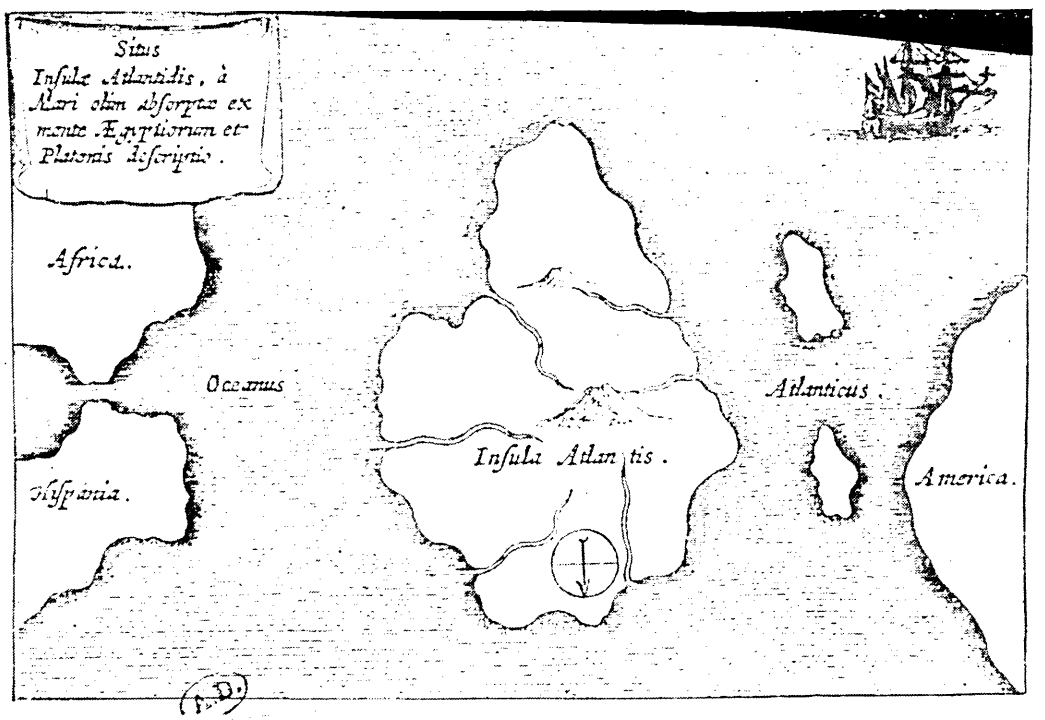

ترکاریوں کی کمی نہ تھی سمندری غذاؤں سے بازار اٹے پڑے تھے۔ مچھلیاں کیکڑے جھینگے اور کچھوے زیادہ تھے اور آدمی ان کے مقابلے میں کم لوگ عمدہ سے عمدہ پوشاک پہنتے اور ٹھاٹ کی زندگی بسر کرتے تھے"۔

اٹلانٹس کا مفصل ترین احوال افلاطون (۵۰۰ ق م) کے ۲ مکالموں کریٹیاس اور تماثس میں ملتا ہے اس کا بیان ہے کہ یہ ساری معلومات اسے بالواسطہ مصری پروہتوں سے حاصل ہوئیں۔ جن کے مندر کے ستونوں پر یہ حالات درج تھے۔ مقنن سولن جو افلاطون کے آباء میں سے تھا یہ معلومات حاصل کر کے آیا تھا۔

اپنے مکالموں میں افلاطون نے اٹلانٹس کا اس طرح مفصل بیان دیا ہے کہ یہ کسی مسافر کے لئے سفری معلومات کا کتابچہ سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ گو

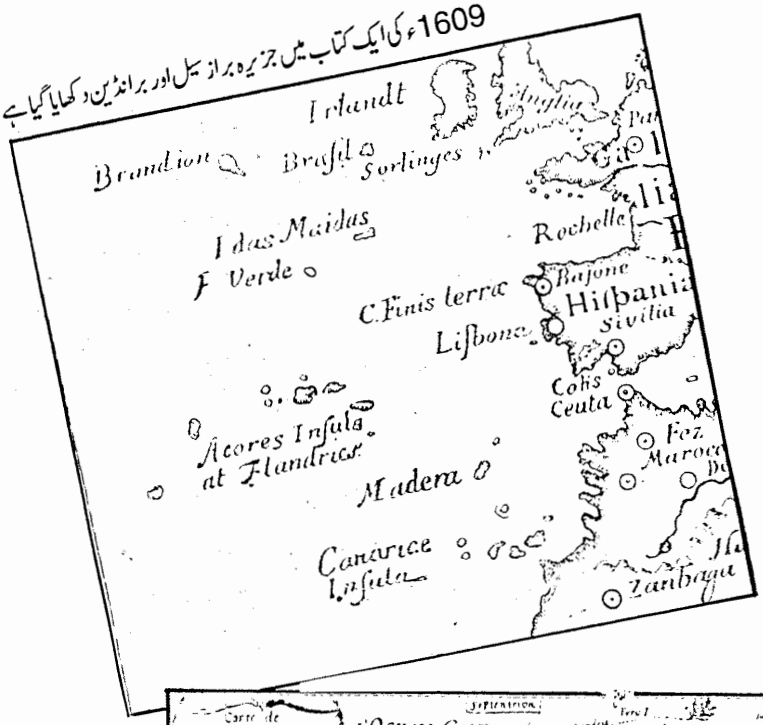


1609ء کی ایک کتاب میں جزیرہ براز یل اور برانڈین دکھایا گیا ہے

1634ء میں فرانسیسی جغرافیہ دان نے اس نقشے میں جزیرہ براسل دکھایا ہے

افلاطون پر الزام تھا کہ اٹلانٹس کا خیال اس نے اپنے ذاتی نظریات کے لئے تمثیلی انداز میں استعمال کیا۔ مگر گزشتہ صدیوں میں اس حوالے سے بھی کام کیا گیا ہے کہ افلاطون کی بیان کردہ معلومات کسی حد تک حقیقت سے قریب ہو سکتی ہیں۔ ایسے میں دو گروہ سامنے آئے ہیں۔ ایک کا کہنا ہے کہ یہ سارا قصہ محض فسانہ گوئی ہے۔ جب کہ دوسرا گروہ اس کی بنیادیں حقائق کی روشنی میں تلاش کرتے ہوئے قابل توجہ معلومات فراہم کرتا ہے۔

اس نظریئے کے مطابق تباہ ہوتے ہوئے اٹلانٹس سے لوگ باگ جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑے ہوئے اور اوقیانوس کے ہر دو جانب خشکی تک جا پہنچے۔ شاید یہی لوگ ان خصوصیات کا سبب ٹھہرے جو اتنے عظیم سمندر کے دو اطراف الگ تھلگ تہذیبوں میں مشترک دکھائی دیتی ہیں۔

امریکہ میں ہاتھی نہیں پایا جاتا مگر انڈین قبائل کے ہاں بعض نقوش و نگار میں دیگر مقامی حیوانات کے علاوہ ہاتھی نما جانور کی تصاویر کی موجودگی ایک معمہ ہے۔ شاید ہاتھی کی یاد انڈین قبائل کو اٹلانٹس سے آنے والوں سے منتقل ہوئی۔ کیونکہ افلاطون کے بیان کے مطابق جزیرے پر ہاتھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔

اوقیانوس کے دونوں جانب کی تہذیبوں کے ہاں قدیم زمانے میں انتہائی وزنی پتھروں کا تعمیراتی و یادگاری استعمال بھی مشترک ہے۔ افلاطون کا بیان تھا کہ اٹلانٹس میں مہیب سنگی تعمیرات موجود تھیں۔ جزیرے کی تعمیر میں استعمال ہونے والے پتھروں کا جو رنگ بیان ہوا ہے۔ وہ اوقیانوس کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ میکسیکو کی روایات میں داڑھی والے دیوتا قوئے زل قوتل نے کہا تھا کہ وہ تحریر اور دوسرے فنون سرخ اور سیاہ سرزمین سے لایا ہے۔ افلاطون کا بیان تھا کہ اٹلانٹس میں کانوں کی کھدائی سے سیاہ، سفید اور سرخ پتھر نکالے جاتے تھے۔

افلاطون نے اٹلانٹس کے بیان میں گرم اور ٹھنڈے قدرتی چشموں کا تذکرہ کیا ہے جو کہ اوقیانوس کے جزائر میں عموماً موجود ہیں۔ نہری نظام کی جھلک پیرو کے ساحلی علاقوں میں نظر آتی ہے۔ جیسی اٹلانٹس میں دکھائی گئی ہیں۔

اٹلانٹس کے ۱۰ بادشاہ تھے جو انتخاب کے ذریعے مقررہ مدت تک کے لئے اپنے میں سے ایک بادشاہ کو حاکم کے طور پر چن لیتے تھے۔ یہ لوگ بیل کی قربانی دیتے تھے۔

۱۰ بادشاہوں کی روایت امریکی انڈین قوم "مایا" اور اوقیانوس کے جزیرہ کنری کے ۱۰ حاکموں کی یاد دلاتی ہے۔

بحیرہ روم کے آس پاس کے مقامات کے رسوم و رواج اور امریکہ کی انڈین اقوام کے رسوم و رواج کے تقابلی مشاہدے سے حیران کن شباہتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ خیال پیدا ہوتا ہے کہ دونوں جانب کی اقوام ایک ہی منبع سے متاثر ہوئی تھیں۔ جو شاید اٹلانٹس کی غرقاب سرزمین سے آنے والے لوگ تھے۔

اس ضمن میں اٹلانٹس کا لفظ بھی قابل توجہ ہے۔ افلاطون نے اٹلانٹس کا مفہوم ایٹلس کی بیٹی یا ایٹلس کی سرزمین قرار دیا تھا (ایٹلس اصنامیاتی دیو تھا جس نے کاندھوں پر بہت بھاری وزن اٹھا رکھا تھا) اب لطف کی بات یہ ہے کہ شمال مغربی افریقہ سے پہاڑوں کا ایک سلسلہ نکلتا ہے جنہیں ایٹلس کہا جاتا ہے یہ سلسلہ پانی میں غائب ہو جاتا ہے۔ اور آگے جا کر جزائر کنری میں نمودار ہوتا ہے۔ جہاں اسے اٹالیا کہا جاتا ہے۔ رومن جانتے تھے کہ جزائر کنری آباد ہیں اور وہ ان لوگوں کو کسی گمشدہ براعظم کے پسماندگان کہا کرتے تھے۔ اسی تناظر میں شمال مغربی افریقہ کے باسیوں کو اٹلانٹیز اور اٹلانٹاؤی کہا جاتا تھا۔ کئی قدیم مصنف ہسپانویوں کو اٹلانٹوس قرار دیتے تھے۔

فونیشیا اور کارتھیج والوں نے اوقیانوس میں ایک عظیم جزیرے انیٹلاک تک سفر کر رکھا تھا۔

ہسپانوی قابضین کو قدیم ازنکوں نے بتایا کہ ان لوگوں کے اجداد مشرق کے ایک غرقاب علاقے ازٹلان سے آئے تھے۔ جب کہ تہذیب بخشنے والا استاد قوئزل کوتل خود طولان سے آیا تھا ازنک زبان میں پانی کو اٹل کہا جاتا تھا۔ جب کہ سمندر پار ایٹلس کے پہاڑوں میں رہنے والے غیر عرب بربر قبائل کے ہاں بھی پانی کو اٹل ہی کہا جاتا تھا۔

وسطی امریکہ کے مایا ازٹلان کو یاد کرتے تھے جب کہ وزویلا کے "سفید انڈین" (جو ریڈ انڈین نہیں تھے۔ ہسپانویوں کے ہاتھوں ان کی قوم مکمل طور پر قتل ہو گئی) کسی اٹلان کا ذکر کرتے تھے۔

قدیم ریڈ انڈین اقوام کا Origion بہت مشکوک ہے۔ مایا قوم کے آثار چچن انزا کے علاقے میں دریافت کرنے والے شخص کا بھی یہی خیال تھا کہ اہل مایا اٹلانٹوی تھے اور اس نظریئے کو تقویت اسے زبرجد کے نئے اور پرانے ٹکڑوں کے سائزوں سے ملی تھی جو اس کے خیال میں اٹلانٹک سے لائے گئے

تھے[2]۔ مایا کے شمال میں ازٹک قبائل کی روایات بھی کسی ایسے خطے کی جانب اشارہ کرتی ہیں جس کا خاتمہ ان کی ۵ سو پشتوں پہلے ہوا تھا۔ اگر مقفن سولن کا زمانہ ۶۰۰ ق م تسلیم کریں تو افلاطون کے بیان کردہ ۹ ہزار سالوں کا مجموعی زمانہ ۹۶۰۰ سال بنتا ہے اور ۹۶۰۰ ق م وہ زمانہ ہے جو کہ اتنی مہذب اور ترقی یافتہ قوم کے وجود سے انکار کرتا ہے اور تحقیق بھی یہی کہتی ہے کہ اتنے قدیم دور میں کسی ایسی سلطنت کا تصور محال ہے جو کہ ایک مکمل فلاحی ریاست کا تصور عملی طور پر پیش کرتی ہے۔ شاید اسی لئے پہلے پہل ارسطو یہ سوچتا رہا کہ اس کے استاد افلاطون نے اس قصہ کو اس لئے گھڑا ہے کہ وہ اپنے سیاسی نظریات کی تشریح کر سکے۔ لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ افلاطون کی بیان کردہ تفاصیل کانسی کے دور کے کریٹ کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ اب ذرا غور سے پڑھئے کہ ۱۵۰۰ ق م میں کریٹ کے شمال میں واقع ہے جزیرہ تھیرا یا سانتورینی میں ایک ایسا زبردست آتش فشانی دھماکہ ہوا تھا جس سے اس کا مرکزی حصہ پانی میں غرق ہو گیا تھا۔ اس کی بربادی نے کریٹ کی قوت پر بھی اثر ڈالا۔ لیکن ہمیں دو باتیں ایک دم متوجہ کرتی ہیں اول یہ کہ افلاطون کے بیان کردہ اٹلانٹس کا نقشہ کریٹ سے ملتا جلتا ہے۔ اور تھیرا کریٹ کے پاس واقع ہونے کے سبب ضرور ویسے ہی تہذیبی خدوخال کا حامل ہو گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر افلاطون کے بیان کردہ ۹ ہزار برس کو ۹ سو برس پڑھیں (افلاطون سے بھی ایسی غلطی ہو سکتی ہے) تو سولن کے ۶۰۰ ق م کو ملانے سے وہی ۱۵۰۰ ق م کا زمانہ آتا ہے جو تھیرا کی تباہی کا زمانہ ہے۔

بظاہر مسئلہ حل ہوتا نظر آتا ہے لیکن ایسا نہیں پہلی بات یہ ہے کہ تھیرا کی بربادی کریٹ کی تہذیب کی بربادی کا سبب بنتی نظر نہیں آتی۔ دوسری بات یہ کہ مصری راہبوں کی روایات ۱۵۰۰ ق م سے پہلے کی بربادی کی نشان دہی کرتی ہیں اور پھر یہ کہ افلاطون بڑی شدت سے اٹلانٹس کا محل وقوع اٹلانٹک کے علاقے میں بیان کرتا ہے نہ کہ مشرقی بحر روم میں۔

روایات کا تسلسل برقرار رہا اور پھر جب امریکہ دریافت ہوا تو دنیا چونک گئی ادھر کولمبس نے جب غرب الہند کے زرخیز جزائر کی جھلک دیکھی تو وہ پکار اٹھا تھا کہ ضرور یہ وہی اٹلانٹا ہے جس کا ذکر افلاطون نے کیا تھا۔ بحرحال روایات جب بعد کے لوگوں تک پہنچیں تو بہت سی تک بندیاں کی گئیں اگرچہ اٹلانٹس کا محل وقوع پرانی دنیا کی روایات مغرب میں اور نئی دنیا کے پرانے ریڈ انڈینوں کی روایات مشرق میں قرار دیتی ہیں جو بحر اوقیانوس کا علاقہ ہو سکتا ہے تاہم اٹلانٹس کے بارے میں اندازوں کی بھرمار رہی ہے۔ انار کٹیکا، گرین لینڈ، سائبیریا کے قرب وجوار سے لے کر افریقہ پر تنگال اور سری لنکا تک آس پاس اس ڈوبے ہوئے جزیرے کی دریافت کے دعوے کیے گئے اور یہاں تک کہا گیا کہ دراصل فونیشیا والے جو دور دراز کے بحری سفر کرتے تھے شاید امریکہ جا پہنچے تھے۔ اور ادھر کے انڈینز کی روایات لے کر لوٹے تو افلاطون تک بھی یہ بات پہنچی جس نے باقی حصہ خود گھڑ لیا۔

لیکن تلاش جاری رہی سترھویں صدی کے فرانسس بیکن سے ہوتے ہوئے انیسویں صدی کے جرمن سائنس دان وان ہمبولٹ تک اب اسے باقاعدہ اٹلانٹولوجی کہا جانے لگا۔ دور حاضر کی تحقیق جو سنجیدگی سے جاری ہے کا سہرا بلاشبہ ۱۸۸۲ء میں شائع ہونے والی ایک کتاب "اٹلانٹس، طوفان نوح" سے پہلے کی دنیا" از گنانز ڈنلے کے سر ہے۔ جو امریکی سیاست دان اور مصنف تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے کام میں کافی تیزی آ گئی ۱۹ ویں صدی کے برطانوی منسٹر ولیم گلیڈسٹون نے ایک مرتبہ گمشدہ سرزمینوں کی تلاش کی خاطر خزانے سے کچھ فنڈ کی درخواست کی تھی۔ جو نامنظور ہو گئی۔[3]

تاریخ دانوں کی ایک بڑی تعداد اٹلانٹس کے حقیقی وجود کی سختی سے تردید کرتی رہی ہے ایک ماہر بحریات پرنس کا کہنا ہے کہ "آج بھی مورخوں کو اس بات کا خوف ہے کہ کہیں اس تہذیب کا اگر پتہ چل گیا تو دنیا کی تاریخ کو ایک بار پھر شروع سے لکھنا ہو گا مصری سمیری اور بابلی تہذیبیں جن پر دانشور فخر کرتے رہے ہیں گہنا جائیں گی اور ان کی ہزار سالہ محنت اور کدو کاوش پر پانی بھر جائے گا اور آئندہ آنے والی نسلیں طعنہ دیں گی کہ یہ لوگ کس قدر جاہل اور ناواقف تھے۔

۱۹۴۰ء میں امریکہ کے منجم نے ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء کے دوران اٹلانٹس کے باقیات دریافت ہو جانے کی پیش گوئی کی۔ اس منجم ایڈگر "کیسی" کی پیش گوئی کافی عرصہ تک مشہور رہی پھر بھلا دی گئی۔ ۱۹۵۳ء میں اطلاع آئی کہ شمالی سمندروں کے غوطہ خوروں کو اٹلانٹس کے زیر آب آثار بیلیگو لینڈ کے نزدیک دکھائی دیئے ہیں لیکن اس پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ اس سے پہلے بھی تلاش کا کام شروع کیا جانے والا تھا لیکن جنگ عظیم دوم کی وجہ سے روک گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اٹلانٹک کو اگر خشک کر دیا جائے تو شمالاً جنوباً آئس لینڈ سے انار کیٹکا تک ایک پہاڑی سلسلے کی قطار دکھائی دے گی۔ کہنے والوں نے کہا ہے کہ یہ غرقاب اٹلانٹس کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے۔ جو کلیشئر کے عمل سے پھیل گئی ہے۔ لیکن ماہرین علوم ارضی اس کی تردید کرتے ہیں۔

ماہر نجوم "کیسی" کی پیش گوئی ۱۹۶۸ء میں شاید پوری ہو گئی چند ہوا بازوں نے جزائر برمودا کے قریب زیر آب سڑکوں اور دیواروں کے آثار دیکھنے کی

رپورٹ دی۔ جو اوپر سے ہرے اور اودے رنگوں کے نظر آتے تھے لیکن بعد کی فضائی کارروائیوں میں یہ نظر نہ آ سکے اور اسے ہوا بازوں کی نظر کا دھوکہ قرار دیا گیا۔ اور ماہرین نے کسی بھی زیر آب تعمیر کے وجود سے انکار کر دیا لیکن چند ماہ بعد ۳ ماہرین ڈاکٹر مینس، ویلن ٹائن اور ڈیمرٹی برسی نے جزیرہ اینڈروس کے قریب زیر آب مندر دریافت کیا۔ اسی سال بہامس میں بمعنی کے قریب زیر آب ایک سنگین دیوار دریافت ہوئی۔ اول اول تو انہیں بھی نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بعد ازاں یہ ثابت ہو گیا کہ یہ پراسرار تعمیرات انسانی ہاتھوں کا کرشمہ ہے۔ شہر کے باسیوں کی رہائش گاہوں اور سڑکوں کا سراغ لگایا گیا۔ اور پھر حیرت انگیز سٹائل کے فرش دیکھے گے جن کی چمک صدیاں گزرنے پر بھی ماند نہیں پڑی تھی اور یہ آپس میں کسی ایسے مسالے سے جوڑی گئی تھیں کہ جس سے ان میں کوئی جھری بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔

زیر آب آثار قدیمہ کی تلاش زور و شور سے جاری تھی۔ لامار یونیورسٹی کے ایک پروفیسر ڈیوڈ زنک نے بڑی جدوجہد کے بعد زیر آب بہت سے ستونوں کا ایک بڑا جال دریافت کیا۔ جس کی چھت بہہ چکی تھی۔ ڈاکٹر ویلنسن کو بھی ایسے نوادرات کا سراغ یوں ملا کہ ایک مقامی بوڑھے نے نشے کی حالت میں زیر آب تعمیرات کا راز کہہ دیا۔ اس کے آباؤ اجداد ڈوبے ہوئے مقامات کے بارے میں جانتے تھے۔ اور اکثر روایتی دولت کی خاطر غوطہ خوری کرتے رہے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں بہاما کے قریب ایک ایسے اہرام کا سراغ لگایا گیا جو بڑی حد تک مصر (غزہ) کے اہرام سے مشابہ تھا۔

۱۹۷۹ء میں روسی ماہر بحریات نے پرتگال اور میدیریا کے درمیان اٹلانٹک کی گہرائیوں میں بڑی سنگین دیواریں دکھائی دینے کی اطلاع دی زیر آب آثار قدیمہ کی کھوج اور ان کے ملنے کی اطلاعوں کا سلسلہ اب تک جاری و ساری ہے۔

کیا اٹلانٹس محض ایک گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ جس کی جزئیات تک تفصیلاً فراہم کی گئی ہیں۔ یا وہ ہومر کے ٹرائے کی مانند حقائق سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر اس کا وجود تھا تو دنیا کے کس حصے میں؟ کیا وہاں کے باسی مغربی یورپ کے ساحلوں بالٹک کے کناروں بحیرہ اسود بحیرہ کیسپین سے آگے مسی سپی دریا اور جنوبی امریکہ کے ساحلوں سے آگے ایمیزون دریا کے درشن کر آئے تھے۔ کیا وہاں سے تہذیب انسانی کا آغاز ہوا تھا۔ کیا وہ اپنے دور میں سائنس کے بہت سے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ یہ اٹلانٹس کے ان بہت سے اسرار میں سے چند پریشان کن سوالات ہیں جن کا جواب غالباً آنے والا وقت دے گا۔

☆.....○.....☆

گمشدہ شہروں غرقاب براعظموں اور تخیلاتی سرزمینوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ بلاشبہ اس کا بڑا حصہ مفروضوں پر مبنی ہے جیسے مور کی یوٹوپیا۔

غرقاب جزائر کی فہرست میں ایک اور مشہور نام "مو" ہے۔ ۱۸۹۶ء میں آگسٹس لی پلانگون کی کتاب "ملکہ مو اور مصری سفنکس" شائع ہونے کے بعد سے اس جزیرے مو کی شہرت پھیل گئی۔ مصنف کا کہنا تھا کہ اس کتاب کی بنیاد امریکہ سے ملنے والی قدیم اور پراسرار مایا قوم کی تحریروں پر ہے تاہم اس تحریر کا سراغ آج تک نہیں مل سکا جو آگسٹس لی پلانگون کی بیان کردہ ہے اس طرح مو کا وجود مشکوک تر ہو جاتا ہے۔ کرنل جیمز چرچ ورڈ نے ۳۰ - ۱۹۲۰ء کے دوران ۴ کتابیں اس گمشدہ جزیرے کی بابت شائع کیں اس کا دعویٰ تھا کہ اسے ہندوستان کے ایک مندر سے قدیم پتھر کی تختیاں دستیاب ہوئیں جن پر گمشدہ سرزمین کا نام "مو" ورج ہے۔ (مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ پتھر کی تختیاں بھی کبھی نہیں دیکھی گئیں)[4]

بحیرہ ہند کے جزیرے مو اور ایک اور تصوراتی سرزمین لیمور یا کو بسا اوقات ایک ہی مقام تصور کیا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں میں فرق ہے۔ لیمور یا کا لفظ ۱۹ ویں اور ۲۰ ویں صدی کے دوران اس وقت اختراع کیا گیا جب بحر ہند کے آس پاس کے علاقوں میں ایک حیوان "لیمر" کے پھیلاؤ کی تشریح پیش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا یہ حیوان، جنوبی انڈیا اور ملایا کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ فلپ سکلیٹر نے پہلی مرتبہ اس کی تشریح کے لئے کسی گمشدہ سرزمین کا تصور پیش کیا۔ تصور یہ تھا کہ مڈغاسکر اور ملایا کے درمیان خشکی کا بڑا ٹکڑا موجود ہو گا۔ فلپ کا کہنا تھا کہ موجودہ زمانے کے لیمر اسی غرقاب جزیرے سے جان بچا لینے والے لیمروں کی نسل ہیں۔[5]

ماہرین روحیت نے عجیب و غریب ناقابل یقین اور کسی حد تک مضحکہ خیز باتیں کیں مثلاً یہ کہ لیمور یا اٹھارہ لاکھ سال پہلے زہرہ سیارے سے آنے والوں نے بسایا تھا۔ لیکن جنس اور اس کے متعلقات سے آگاہی ان کی پرمسرت زندگی کے لئے بربادی کا سبب ٹھہریں جرمن حیات دان ارنسٹ ہیکل نے بھی حد کر

ی۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مقام نسل انسانی کا اولین گھرانہ تھا۔ کرنل جیمز نے غالباً انہی بنیادوں پر ۴ کتب شائع کیں تھیں وہ دراصل متعصب آدمی تھا س کا خیال تھا کہ سفید انسان دوسری تمام نسلوں سے اعلیٰ ہے کیونکہ وہ اس جزیرے کے فوق الفطرت مخلوق کی باقیات ہیں اور اس جنت نظیر علاقے کی بربادی سے پہلے دنیا میں پھیل گئے تھے۔ شمالی کیلی فورنیا کے شستا پہاڑ کے بارے میں روایات ہیں کہ یہاں لیموریا کے باسی رہائش پذیر ہیں، جو سونے کے ڈلے رقم کے طور پر ستعمال کرتے ہیں اور ایک بڑے مایائی اہرام کو پوجتے ہیں۔

۱۹۳۳ء میں جیمز ہلٹن نے ناول "لوسٹ ہورین" تحریر کیا۔ کہانی یہ تھی کہ دو ہوا باز تبت کے علاقے میں راستہ بھول کر شنگریلا نامی سرزمین تک جا پہنچے جو عقل و دانش کے عظیم ترین مرتبوں پر فائز لوگوں کا مقام تھا اور باقی دنیا سے منقطع، شادمانی اور امن و امان کا گہوارہ تھا۔ ہلٹن کے شنگریلا کو لوگوں کی بڑی خداد نے حقیقی قرار دیا۔ اسی طرح تبت اور چین کے کوہساروں، گوبی کے صحراؤں، قطبین کے برف کے میدانوں، منگولیا اور روس کے آلتائی پہاڑی سلسلہ سے پراسرار جنت نظیر سرزمینوں اور مافوق الفطرت لوگوں کی روایتیں منسوب ہیں۔ کیلی فورنیا کے شستا پہاڑ کے علاوہ جنوبی امریکہ میں انڈیز کے علاقے کو بھی لیموریا کے برباد خطے سے فرار ہونے والوں کا مسکن قرار دیا جاتا رہا ہے۔

"شمبالا" بھی ایسی ہی پراسرار زمینوں میں سے ایک ہے جن کی روایات دہرائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ انسان کی جنت ارضی کی شدید تمنا کے اظہار کا ذریعہ زار دیئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ان کے وجود کا قطعی انکار بھی مختلف اعتبار سے ناممکن ہے۔ اس کے لئے ہومر کا ٹرائے ایک بڑا اچھا ثبوت ہے ایسے علاقوں کا وجود نا ممکنات میں سے نہیں جو سیلاب زلزلوں اور دیگر ارضی و سماوی آفات کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو گئے ہوں۔ آخر سائنس دان اس بات کا بھی تو اقرار کرتے ہیں کہ پہلے تمام براعظم یکجا تھے اور ایک بہت بڑا خشکی کا ٹکڑا "پنگیا" بنائے ہوئے تھے جو بعد ازاں گونڈوانا لینڈ اور لاریشیا میں تقسیم ہو گیا اور پھر رفتہ رفتہ ٹوٹنے کا عمل جاری رہا اور آج کے براعظم سامنے آئے۔ کیا ایسے ارضیاتی تعبیر و تبدل کے نتیجے میں کسی جزیرے کے بربادی بعید از قیاس ہے؟ رہا ان ناقابل یقین روایات کا سوال تو وہ ٹرائے کے ایکلیز اور اگامنان کے بارے میں بھی کتنی شہرت رکھتی ہیں۔ روایات ناقابل یقین ہیں۔ لیکن ٹرائے تو اپنی جگہ ہے۔

# بنو اسرائیل کے گمشدہ قبائل

عہد نامہ قدیم کے بیان کردہ اہم واقعات میں سے چند کے بارے میں محققین کی تحقیق وقوعہ اور تاریخ کے حوالے سے مندرجہ ذیل معلومات ہم پہنچاتی ہے۔

اندازاً ۲۰۰۰ ق م :۔ ابراہیمؑ کو میسوپوٹیمیا کو چھوڑ دینے کا حکم ہوتا ہے۔

۱۷۰۰ ق م :۔ یوسفؑ کو مصر میں اقتدار ملتا ہے اور ان کے والد یعقوبؑ مصر آ جاتے ہیں۔

۱۳۰۰ ق م :۔ موسیٰؑ اسرائیلوں کو مصر سے نکالتے ہیں۔ دس احکامات کا نزول۔

بنو اسرائیل فلسطین میں داخل ہوتے ہیں۔

۱۰۰۰ ق م :۔ داؤدؑ برسر اقتدار آتے ہیں اور زبور کا نزول شروع ہوتا ہے۔

۹۷۴ ق م :۔ سلیمانؑ کا دور

۷۰۰ ق م :۔ اسور اسرائیلی سلطنت پر حملہ کرتا ہے اور شمالی حصے کے لوگوں کو قید کیا جاتا ہے۔

۵۸۰ ق م جنوبی حصے کے لوگ بھی محفوظ نہیں رہتے اور بابل انہیں غلام بناتا ہے۔ بعد ازاں وہ واپس لوٹتے ہیں اور یروشلم میں ہیکل کی تعمیر نو کرتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ۱۲ بیٹوں نے مصر میں آ کر شادیاں کیں اور ہر ایک کے ہاں اس قدر اولادیں ہوئیں کہ ان ۱۲ بیٹیوں کے ۱۲ قبائل بن گئے۔ ادھر یعقوبؑ کا نیا نام اسرائیل ہوا اور اس رعایت سے یہ بارہ قبیلے مجموعی طور پر بنی اسرائیل یا اسرائیلی قوم کہلائے۔ یہ لوگ اندازاً چار سو برس تک مصر میں آرام سے رہے مگر پھر مصر کے بادشاہ نے انہیں غلام بنالیا اور پھر معرکہ فرعون و کلیمؑ درپیش ہوا۔ جس کے بعد بنو اسرائیل اس سرزمین کی جانب روانہ ہوئے

جس کا وعدہ خدا نے ابراہیمؑ سے کیا تھا یعنی فلسطین۔ بائبل کے مطابق اس وقت بال بچوں کو چھوڑ کر چھ لاکھ مرد اس گروہ میں شامل ہوئے۔ تین ماہ بعد کوہ سینا کے پاس پہنچے اور دس احکامات نازل ہوئے لیکن بنی اسرائیل شرارت سے باز نہ آئے اور یوں سزا کے طور پر مصر سے فلسطین کا وہ فاصلہ جو محض گیارہ دنوں کی مسافت کا تھا چالیس برس تک صحرا میں بھٹکتے ہوئے مکمل ہوا۔ اس دوران موسیٰؑ بھی وفات پا گئے کیونکہ عیسائی عقیدے کے مطابق خدا نے حکم دیا تھا کہ موسیٰ چٹان کو حکم دیں تو وہ پانی کے چشمے جاری کر دے گی مگر انہوں نے چٹان پر چھڑی ماری جس سے ۱۲ چشمے تو پھوٹ پڑے لیکن خدا کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی۔ یوں فلسطین میں داخلے کے وقت اسرائیلیوں کی رہبری سردار یشوع کے سپرد تھی۔ مقامی لوگوں سے جنگوں کے بعد اسرائیل فلسطین کے مختلف علاقوں پر جا جمان ہو گئے۔ صرف لاوی ایسا قبیلہ تھا جس نے کاہن ہونے کے سبب زمین پر ملکیت کا دعویٰ نہ کیا۔ رفتہ رفتہ بنی اسرائیل امیر ہوتے گئے اور پھر ساؤلؑ اپنا پہلا بادشاہ بنایا۔ جس کے بعد داؤدؑ کی بادشاہت کا دور آیا اور ان کے بعد ان کا بیٹا سلیمانؑ (؟) تخت نشین ہوا (یہ اپنی جگہ ایک بحث اور تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ قرآن اور بائبل کے سلیمان ایک ہی شخص ہیں یا جدا جدا شخصیتیں)۔

سلیمان بن داؤدؑ نے بنی اسرائیل کو عظمت کا احساس دلایا مگر عظیم الشان تعمیرات پر جہاں سیم و زر بے تحاشا خرچ ہوتے تھے وہاں ان کے لئے اسرائیل کو بڑے بھاری ٹیکس ادا کرنے پڑے تھے۔ سلیمانؑ کی وفات کے بعد گو نئے بادشاہ "رہوبوم" سے نیکی کی امید تھی مگر وہ اپنے باپ سلیمانؑ سے بھی زیادہ جابر ثابت ہونے لگا تو عوامی انقلاب آ گیا جس کے بعد بنی اسرائیل دو گروہوں میں بٹ گئے۔ شمالی فلسطین میں سلطنت اسرائیل (جس کا دارالحکومت سامرہ تھا) قائم ہوئی۔ جہاں دس قبائل نے رہائش اختیار کی جن میں روبن، جد، زبولون، شمعون، دان، آشر، نفتالی، اشکار، افرام اور لاوی شامل تھے۔ یہاں کا حکمران یربعام بن نباط تھا۔

دوسرے گروہ نے جو دو قبائل بن یامین اور یہودہ پر مشتمل تھا جنوبی فلسطین میں یہوداہ نامی سلطنت قائم کر لی اور باگ ڈور اسی "رہوبوم" کے ہاتھ میں دے دی۔ یہوداہ کا دارالحکومت یروشلم تھا۔

اس کے بعد سے کامل دو صدیوں تک کی تاریخ میں سازشوں کے ذریعے بادشاہوں کا قتل، نئے تخت نشینوں کا پھر سازشوں سے قتل، یہوداہ اور اسرائیل کے مابین اور دیگر پڑوسیوں سے خونریز جھڑپوں اور طوائف الملوکی کے واقعات ہی کا ذکر ملتا ہے۔

قریباً ۷۳۴ ق م میں آشوریہ کا بادشاہ "تگلت پلاسرسوم" سلطنت اسرائیل پر چڑھ دوڑا۔ پہلے مرحلہ میں وہ دولت لوٹ کر لے گیا اور بعد کے دو حملوں میں وہ بے شمار اسرائیلیوں کو غلام بنا کر لے گیا۔ اور انہیں بابل اور آشور کے دیگر علاقوں میں منتقل کر دیا اور اہل بابل اسرائیلی دارالحکومت سامرہ میں جا بسے۔ پلاسر دو لاکھ یہودی غلاموں کو اسرائیل سے اس لئے لے آیا تھا کہ بغاوت کا امکان نہ رہے۔ اس کے بعد شلمانیسر پنجم اور سارگان دوم سامرہ پر حملہ آور ہوتے رہے اور ۷۲۲ ق م تک یہ بالکل برباد ہو کر رہ گیا۔ سارگان نے یہاں سے ۲۷۲۹۰ یہودی غلام بنائے۔ یہی وہ موقع ہے کہ جب سے بنی اسرائیل کے دس قبائل سلطنت اسرائیل کی بربادی کے بعد تاریخ کے کسی گمنام گوشے میں جا چھپے اور صدیوں سے ان کا سراغ لگایا جا رہا ہے۔

یہود کے بقایا دو قبائل اور یہودا کا حال بھی شمالی لوگوں سے مختلف نہ ہوا۔ اسرائیل کی بربادی سے پہلے ہی جنوبی، یہوداہ ریاست آشوریوں کے ماتحت رہنے لگی تھی۔ یہاں تک کہ آشوریوں کے نئے کسدی بادشاہ بخت نصر یا بنوکد نضر نے یروشلم پر حملہ کر دیا ستر ہزار اسرائیل قتل کر دیئے۔ بادشاہ یہوداصدقیاہ کی آنکھوں میں نیل کی سلائیاں پھروا کر قید کرا دیا۔ چن چن کر تورات کا ہر نسخہ جلا دیا گیا۔ ہیکل سلیمانی کا نشان مٹا دیا۔ بھگوڑے شہزادوں کو مصر تک پیچھا کر کے جا لیا اور ساٹھ ہزار باشندگان یہودا کو غلام بنا کر اور تمام مال و اسباب پر قابض ہو کر یہودیوں کی عظمت کو خاک میں ملاتا ہوا۔ میسوپوٹیمیا لوٹ لے گیا جہاں ستر سال بعد فارس نے حملہ کر کے بابل کے یہودیوں کو آزادی دلائی جو واپس لوٹ گئے اور دوبارہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا۔ یہ تھے موجودہ دور کے یہود کے آباء۔ (گویا یہودا اور بن یامین کے دو قبائل کی باقیات) باقی ماندہ دس قبائل پر کیا گزری؟ یہی تاریخ کا ایک بہت بڑا معمہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ تلاش کی اہمیت کیا ہے؟ اس کے پیچھے ایک یہودی روایت کار فرما ہے۔ جس کو عہد نامہ قدیم کے دور کے مختلف فقیہوں مثلاً عزرائیل اور یرمیاہ وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ آخر کار بنی اسرائیل کے دونوں گروہوں یہودا اور اسرائیل کا انضمام ہو کر رہے گا۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ قریباً ۷۰۰ ق م سے گم شدہ قبائل کو ڈھونڈ نکالا جائے اور عظمت رفتہ بحال کی جائے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے تباہ حال یہود نے اس تلاش کی اہمیت کو بہت زیادہ محسوس کرنا شروع کر دیا۔

عہد نامہ قدیم میں اس سے متعلق سلاطین (۶.۱۷) میں ملتا ہے جہاں بیان ہے کہ آشوری بادشاہ نے سامرہ پر قبضہ کیا۔ اور اسرائیل کے لوگوں کو دور لے گیا اور دریائے گوزان کے قریب ہالہ اور ہراہ کے مقامات اور میدز کے شہروں میں بسایا۔ اندازہ ہے کہ یہ علاقہ بالائی میسوپوٹیمیا ہے مگر مقامات کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ تاریخ دان فلے ویس جوزیفس (پہلی صدی عیسوی) کا بیان ہے کہ دس قبائل تاحال فرات کے قریب بڑی تعداد میں آباد ہیں اس بات کا اظہار اس نے ۹۳ء میں اپنی کتاب "یہود کی قدیم ترین تاریخ" میں کیا۔ اسی دور میں عزرا فقیہہ نے کہا کہ دس قبائل نے ایک اور مقام پر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس مقام کو "ازاریتھ" کہتے ہیں۔

اب یہ لفظ ازاریتھ بذات خود ایک معمہ ہے۔ جس کی کئی تاویلات کی گئی ہیں۔ کیا یہ کسی مقام کا نام ہے جس سے اس وقت کے بنی اسرائیل واقف تھے۔ لیکن آج بھلا دیا گیا۔ یا یہ لفظ "ایرزاہارتھ" سے نکلا ہے جس کے معانی عبرانی زبان میں ہوتے ہیں "ایک اور سرزمین"!

اس کے بعد نویں صدی عیسوی میں تیونس میں ظاہر ہونے والے ایک مسافر کا تذکرہ ملتا ہے جو اپنا نام "الداد ہا" بتاتا تھا اور دعویٰ کرتا تھا کہ وہ دان قبیلے کا فرد ہے جو اس کے بقول تین اور گمشدہ قبائل کے ہمراہ حبشہ کے قریب آباد ہے۔ "الداد ہادانی" یہ بھی بیان کرتا تھا کہ موسیٰؑ کے فرزند کسی سمباتیان نامی ناقابل عبور دریا کے پار اب تک رہائش پذیر ہیں۔ ان باتوں سے یہ تصور قائم ہوا کہ مشرق میں کہیں نہ کہیں بنی اسرائیل کی شاندار سلطنت قائم ہے جس سے اہل مغرب واقف نہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ہاں البتہ حبشہ میں فلاشاس اور ترک خزار یہودیت قبول کر چکے تھے لیکن وہ ہرگز دس قبائل سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

بارھویں صدی عیسوی میں ایک شخص جسے لوگ تطیبہ کابن یامین کہتے تھے۔ ۱۱۳۵ء میں ہسپانیہ سے جرمنی آیا اور اعلان کیا کہ دس قبائل فارس میں رہائش پذیر ہیں جنہوں نے ایک شخص "یوسف امر کلا" کو اپنا بادشاہ مقرر کیا ہوا ہے۔(6)

برتی نورو کے اوبادیاہ نے یروشلم سے ۱۴۸۸ء میں تحریر کیا کہ تین گمشدہ قبائل کا سراغ پریسٹر جان (دیکھئے گمشدہ سرزمینیں) کے عہد کے حبشہ سے مل سکتا ہے۔

۱۵۲۴ء میں داؤد دیبونی نامی شخص نے یورپ کا دورہ کیا اس کا بیان تھا کہ وہ خیبر (عرب) میں مقیم یہودی قبائل کے سردار یوسف کا بھائی ہے۔ شاہ پرتگال اور پوپ نے ابتداً اس کی بڑی آؤ بھگت کی تاہم بعد میں وہ اس پر شک کرنے لگے۔ انجام کار بدنام زمانہ انکوئزیشن نے اسے ٹکٹکی سے بندھوا کر جلا دیا۔

ادھر مشرق میں بعض مفکرین کے مطابق خراسان اور افغانستان کے باسی ہی گمشدہ قبائل کی باقیات ہیں۔ خصوصاً افغانستان کے باسیوں کے منبع کے سلسلے میں تو بڑے شدومد سے کہا جاتا رہا ہے کہ وہ یہود کی باقیات ہیں۔ اس موضوع پر ایک نہایت اہم کتاب مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی تصنیف "مسیحؑ ہندوستان میں" ہے۔ دراصل ان کا مطمح نظر عیسیٰؑ کی وفات اور ان کی قبر کا کشمیر میں ہونا ثابت کرنا ہے۔ مگر مسیحؑ کی آمد کی ضرورت ظاہر کرنے کے لئے انہیں یہ ثابت کرنا تھا کہ کشمیر، نیپال اور افغانستان کے علاقوں میں وہ بنی اسرائیل بستے ہیں کہ جن کے بارے میں عیسیٰؑ کا قول ہے "میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کے لئے ہی بھیجا گیا ہوں" اور اسی کام کی تکمیل کے لئے وہ ان علاقوں میں تبلیغ کے لئے تشریف لائے۔

ادھر افغان اپنے آباء و اجداد سے سنتے آرہے ہیں کہ وہ اسرائیلیوں کی اولاد ہیں۔ طبقات ناصری کے مطابق چنگیز خان کے حملے کے وقت بھی یہ لوگ موجود تھے جنہوں نے بعثت محمدیؐ کے دور میں ہرات میں رہائش اختیار کر لی تھی اور قریشی سردار خالد بن ولید کی اطلاع پر پانچ چھ سردار منتخب کر کے عرب بھیجے گئے جن کی سربراہی ایک شخص قیس کر رہا تھا جس نے بعد ازاں خالد بن ولید کی بیٹی سے نکاح کیا اور اس سے افغان قوم شروع ہوئی۔ قیس کا نسب نامہ "مجمع الانساب" کے مطابق یہ ہے کہ یعقوبؑ کا بڑا بیٹا یہودا تھا۔ اس کا بیٹا اسرک۔ اسرک کا بیٹا اکنور، اس کا بیٹا معالب، اس کا بیٹا فرلائی، فرلائی کا بیٹا قیس، اس کا بیٹا طالوت، اس کا بیٹا ارمیاہ اور ارمیاہ کے بیٹے افغان کی اولاد قوم افغان کہلائی۔ یہ شخص افغان بنو کدنصر کا ہم عصر تھا اور چالیس بیٹوں کا باپ تھا۔ دو ہزار سال بعد افغان کی چونتیسویں پشت میں وہ قیس نامی سردار پیدا ہوا کہ جو محمدؐ کا ہم عصر تھا اور آپ کے پاس حاضر ہوا تھا۔ موجودہ افغانستان میں آباد افغان دراصل قدیم افغان کے سب سے بڑے بیٹے کی اولاد ہیں۔ جو شام سے ہجرت کر کے ہرات آ گیا تھا۔ اس بات کا حوالہ جے ٹی ویگن ایف جی ایس کی کتاب "آنریٹو آف اوزٹ ٹو غزنی کابل افغانستان" میں ملتا ہے۔ جو ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔

افغان قبائل کے متعلق بہت سے صدیوں پرانے مخطوطوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہیں مثلاً ابراہیم بٹنی کی تصنیف کے قلمی نسخوں میں اس بات کا ذکر ہے۔ ۱۷۱۷ھ میں ابو سلیمان داؤد بن ابوالفضل محمد البتاکتی نے اپنی کتاب "روضۃ الالباب فی التواریخ الاکابر والانساب" میں اس کا تذکرہ کیا۔ مغل بادشاہ بابر کے عہد میں شیخ قلی، ملک احمد اور شیخ عبدالواحد بلگرامی کا تذکرہ ملتا ہے اور بابر کے پوتے اکبر کے عہد میں سعد اللہ سڑہ بنی اخوان اور اخون درویزہ افغانوں کو بنی اسرائیل قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ شہنشاہ اکبر کے بیٹے جہانگیر کے دور میں ایک سپہ سالار خان جہان لودی ابن دلادر خان نے نعمت اللہ" سے افغانوں کی تاریخ "مخزن افغان" تحریر کرائی جس میں افغانوں کو بنی اسرائیل کہا گیا۔

بابری عہد کے شیخ ملی یوسف زئی نے پشتو زبان کی قدیم ترین نظم اور نثر کی دو کتابیں "فتح سوات" کے نام سے تحریر کیں۔ شیخ ملی نے اس عہد میں افغان قبائل کے شجرے باہمی مشاورت سے لکھ کر پشاور کے علاقے کو قبائلی بنیاد پر تقسیم کر دیا۔ یہ وہ شجرے تھے کہ جن پر سب کا اتفاق تھا اور جب انگریزی دور حکومت میں نئے شجرے بنا کر پیش کیے گئے تو افغانوں نے انکی صحت سے انکار کر دیا اور صرف شیخ ملی کے شجروں ہی کی تصدیق کی جس کی بنیاد پر ۱۸۷۰ء میں تقسیم اراضی کا کام مکمل کرایا گیا۔ ان تمام شجروں میں افغانوں کو بنی اسرائیل ہی دکھایا گیا ہے۔

اکبر اعظم کے عہد میں اخون درویزہ نے "تذکرہ الابرار والاشرار" میں بحث مباحثہ کے بعد افغانوں کو بنی اسرائیل ثابت کیا ہے۔ ۱۴۷۶ء میں میاں عبدالکریم چمکنی نے "المعالی شرح امالی" کے دیباچہ میں اس بات کا اقرار کیا۔

۱۸۷۰ء میں گوپال داس نائب افسر بندوبست نے "تاریخ پشاور" میں اسی امر کا اقرار کیا اور یہ سلسلہ دور تک جاتا ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں ایک نئے نظریئے نے جنم لیا کہ افغان دراصل آریاؤں کی شاخ ہیں لیکن اس نظریئے کی بڑی مذمت ہوئی ۱۹۱۴ء میں منشی دوار کا پرشاد افق لکھنوی نے بحث کے ذریعے ثابت کر دکھایا کہ آریائی اقوام اور بنی اسرائیل (افغانوں) میں بہت فرق ہے اور کسی طور پر بھی ماضی میں یہ ملتے دکھائی نہیں دیتے ۱۸۹۹ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے "مسیح ہندوستان میں" ۱۸۹۸ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ کا حوالہ دیا جس میں بیلیو Bellew کا بیان درج تھا کہ افغانوں کی تین بڑی شاخوں میں سے ایک "سارابور" کے نام سے موسوم ہے جو پشتو زبان میں پرانے وقتوں کے سورج بنسی راجپوتوں کا نام تھا جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ مہابھارت کی لڑائی میں چندر بنسی خاندان سے شکست کھا کر افغانستان آ بسے تھے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ممکن ہے افغان بنی اسرائیل ہوں جو قدیمی راجپوتوں سے مل گئے ہوں۔

اسی گزٹ میں درج ہے "ہندوستان کی مغربی سرحد کے پٹھان یا پکٹان باشندوں کا حال قدیمی تاریخوں میں موجود ہے اور بہت سے فرقوں کا ذکر ہیروڈوٹس نے اور سکندر اعظم کے تاریخ نویسوں نے کیا ہے۔ وسطی زمانے میں اس پہاڑ کا ایک غیر آباد اور ویرانہ "کلروہ" (کہلاتا) تھا اور علاقے کے باشندوں کا نام رہیلہ تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ روہیلے یا پٹھان قوم افغانان کے نام ونشان سے پہلے ان علاقوں میں آباد تھے۔ اب افغان پٹھانوں میں شمار کیے جاتے ہیں کیونکہ وہ پٹھانی زبان پشتو بولتے ہیں لیکن وہ ان سے کسی رشتے کا اقرار نہیں کرتے۔ اور سب اسی مجموعہ قوانین ملکی کو مانتے ہیں جس کا نام پکتان والی ہے اور جس کے بہت سے قواعد پرانی موسوی شریعت سے عجیب طور پر مشابہت رکھتے ہیں اور بعض اقوام راجپوت کے پرانے رسم ورواج سے بھی ملتے جلتے ہیں۔ اگر ہم اسرائیلی آثار کو زیر نظر رکھ کر دیکھیں تو ظاہر ہو گا کہ پٹھانوں کی قومیں دو بڑے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہیں..... یعنی اول وہ فرقے جو ہندی الاصل ہیں۔ جیسے وزیری، آفریدی، اور کزئی وغیرہ اور دوسرے افغان جو سامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور کم سے کم یہ ممکن ہے کہ پختون ولی جو ایک غیر مکتوب ضابطہ قواعد ملکی ہے سب کا مل کر تیار ہوا ہے۔ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ موسوی احکام، راجپوتی رسوم سے ملے ہوئے ہیں جن کی ترمیم اسلامی رسوم نے کی ہے" پھر درج ہے "اگر ہم قوم افغان کا قوم اسرائیل سے کوئی قدیمی رشتہ نہ مانیں تو ان اسرائیلی ناموں کی کوئی وجہ بیان کرنا ہمارے لئے مشکل ہو جاتا ہے جو عام طور پر رائج ہیں۔ اور بعض رسوم مثلاً عید فصح کے تہوار کے رائج ہونے کی وجہ بیان کرنا مشکل ہے۔ یوسف زئی (ایک افغان قوم) اگر عید فصح کی حقیقت کو سمجھ کر نہیں مناتے تو کم سے کم ان کا تہوار عید فصح کی نہایت عجیب اور عمدہ شکل ہے۔"

یہود اور پٹھانوں کے مابین مشابہت اور تعلق کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے مثلاً جی پی فرائز (فرانس) نے افغانوں کی تاریخ میں درج کیا ہے کہ جب نادر شاہ ہند پر حملہ آور ہوتے ہوئے پشاور پہنچا تو انہی یوسف زئیوں نے اسے بائبل کا عبرانی نسخہ پیش کیا اور دیگر کئی اشیاء بھی پیش کیں جنہیں یہود سے متعلق قرار دیا گیا۔

مرزا صاحب نے کہا ہے کہ افغان شکل و شباہت سے ہر طرح یہود نظر آتے ہیں اور انہی کی طرح چھوٹا بھائی، بڑے بھائی کی بیوہ سے شادی کرتا ہے اور شباہت کے حوالے سے فرانسیسی ڈاکٹر برنیر نے سیر و سیاحت کشمیر (جلد دوم) میں تحریر کیا کہ لباس، چہرے اور بعض رسوم قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں کہ کشمیری بلاشبہ اسرائیلی خاندان میں سے ہیں اور فادر سٹرنے توحد ہی کر دی ہے جب یہ کہا کہ قیام کشمیر کے دوران اسے یہی محسوس ہوتا رہا کہ جیسے وہ یہودیوں کے درمیان رہ رہا ہے۔ اسی سلسلے میں سب سے زیادہ قابل ستائش کام خان روشن خان کی تحقیق ہے۔ انہوں نے دو کتابوں "پٹھانوں کی اصلیت اور ان کی تاریخ" اور "افغانوں کی نسلی تاریخ" میں اس موضوع پر خاصا کام کیا ہے اور پشتون، روہیلہ، سلیمانی، پٹھان اور افغان ایک ہی قوم کے مختلف نام قرار دیئے ہیں اور پشتو زبان میں قدیم عبرانی الفاظ کی نشاندہی کی ہے"۔

افغانستان کے اس خطے میں پشتونوں کے آباء کے ورود کی بابت عبداللہ خان ہراتی کی رائے یوں ملتی ہے کہ ملک طالوت (ساؤل) کے دو بیٹے افغان اور بالوت تھے (حالانکہ "نخزن افغانی" کے مترجم برنہارڈ ڈورن خار کو یونیورسٹی نے ۱۸۳۶ء میں طالوت کے شجرہ میں آصف بن برخیا بن طالوت اور افغان بن رمیاہ بن طالوت درج کیا ہے۔ یوں افغان طالوت کا پوتا ہوا) بخت نصر کے حملے کے بعد افغان کی اولاد یہود سے عرب کی جانب فرار ہو گئے تاہم بعد ازاں آبی وسائل کی کمی کے سبب ہندوستان آ گئے اور ابدالیوں کا ایک گروہ عرب میں پڑا رہا اور ابو بکرؓ کے عہد میں ان کے ایک سردار نے خالد بن ولید سے رشتہ قائم کیا..... جب ایران عربوں کے قبضہ میں آیا تو یہ لوگ ایران کے علاقوں فارس اور کرمان میں جا بسے۔ چنگیز خان کے حملے اور تشدد کی وجہ سے ابدالی مکران، سندھ اور ملتان کے راستے ہندوستان پہنچے۔ اور وہاں سے کوہ سلیمان پر منتقل ہو گئے۔ خواجہ نعمت اللہ ہراتی کے مطابق بخت نصر نے شام پر قابض ہو کر اقوام بنی اسرائیل و جلاوطن کر کے غور، غزنی، کابل، قندہار اور کوہ فیروز کے کوہستانی علاقوں میں لا بسایا جہاں خاص کر آصف اور افغان کی اولاد رہائش پذیر ہو گئی۔ کاونٹ جورن سٹرنا کا کہنا ہے کہ بخت نصر نے انہیں بامیان کے علاقے میں جلاوطن کر دیا جب کہ بامیان، غور کے متصل افغانستان میں واقع ہیں۔

لیکن ڈاکٹر وولف جس نے بڑے عرصے تک دس فرقوں کی تلاش کی، ان کا کہنا ہے کہ اگر افغان اولاد یعقوب ہیں تو وہ یہود اور بن یامین کی نسل سے ہیں اور اگر وولف کی یہ تحقیق درست ہے تو پھر دوبارہ دس قبائل کی گمشدگی کا معمہ سامنے آتا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا آف انڈیا ایسٹرن اینڈ سدرن ایشیا ازای بیلفور کے مطابق یہودی ایشیاء کے وسط جنوبی اور مشرق میں پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلے زمانے میں یہ لوگ چین میں ضلع شو میں بکثرت آباد تھے اور صدر مقام یہ چو میں ان کا معبد تھا۔ پریسٹر جان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے قسطنطنیہ میں کام نی نس شہنشاہ کو خط میں تحریر کیا تھا کہ مملکت تاتار میں دریائے آملو کے پار ۱۰ قبائل آباد ہیں۔ ڈاکٹر مور کی تحقیقات کے مطابق تاتاری نسلاً یہودی ہیں اور ان میں اب تک یہودی مذہب کے قدیم آثار پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ختنہ کی رسم ادا کرتے ہیں۔

۱۹۴۰ء کی دہائی میں جاپان میں ایک سوسائٹی "ماکویا" کا قیام عمل میں آیا جس کا کہنا تھا کہ جاپانی قوم دراصل گمشدہ قبائل کی باقیات ہیں۔ یہ لوگ یہود و نصاریٰ کے مذہبی افکار سے متاثر ہیں اور نئی مملکت اسرائیل سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک اور لطیفہ ۱۸۸۰ء کی دہائی میں چھوڑا گیا کہ برطانیہ کے قدیم اور اصل آباد کار دراصل یہودی ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق قریباً بیس لاکھ افراد کو اس نظریئے کی صحت پر یقین تھا حالانکہ محققین نے جلد ہی اسے باطل کر دکھایا تھا۔

ایک اور نظریہ اس وقت پیدا ہوا جب براعظم امریکہ دریافت ہوا۔ اس کے مطابق امریکہ کے ریڈ انڈین افراد ہی گمشدہ قبائل ہیں۔ اس نظریئے کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس پر اب تک تحقیق ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے ہسپانوی ملاحوں نے یہ شوشہ چھوڑا تھا جن کے مطابق انہوں نے عبرانی الفاظ سے ملتے جلتے الفاظ ان ریڈ انڈینوں سے سنے تھے۔

مایائی تہذیب کے بارے میں بشپ ڈی ڈلانڈا نے ان کی ایک روایت قلم بند کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس سرزمین (امریکہ) میں مشرق سے وارد ہوئے تھے جب خدا نے ان کے لئے سمندر میں ۱۲ راستے کھول دیئے تھے۔ ڈی لانڈا کے مطابق اگر یہ بات صحیح تھی تو یہ لوگ یہود کے بارہ قبائل کی باقیات ہیں۔

۱۶۰۷ء میں گریگورو گریشیا نے "اوریجن آف انڈینز ان دا نیو ورلڈ" میں لکھا کہ "پیرو" اور "یوکوٹان" نامی علاقوں کے نام دراصل بائبل کے بیان کردہ "اوپر" اور "جوکتان" ہیں۔ اسی کو بنیاد بناتے ہوئے پیڈرو ڈوران نے میکسیکو میں گھوم پھر کر یہی نتیجہ نکالا کہ گمشدہ قبائل بازیاب ہو گئے ہیں۔

۱۶۴۴ء میں "آرن لیوی ڈی مونٹیز نیوس" نامی شخص نے جنوبی امریکہ کے سفر سے واپسی پر ایمسٹرڈم کے ربی کو بتایا کہ اسے پیرو میں ایسے ریڈ انڈین لوگوں کا قبیلہ ملا کہ جن کی مذہبی رسومات یہودی رسومات سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ اسی بنیاد پر ۱۶۵۰ء میں ربی مناسح بن اسرائیل نے "داہوپ آف اسرائیل" تحریر کی۔

نئی دنیا کے باشندوں کے بارے میں "پرانی دنیا" کے لوگوں کا یہ نظریہ کہ وہ بنی اسرائیل کے دس گمشدہ قبائل ہے۔ بڑا مقبول ہوا ہے۔ کاٹن ماتھراور روجر ولیمز نے بھی اس کی تائید کی بلکہ ایک اور شخص ولیم پین نے بھی کشمیر میں قیام کرنے والے فارسٹر کی طرح عجیب بات کہی۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس نے پہلی مرتبہ ریڈ انڈینوں کو دیکھا تو ایسا لگا کہ وہ برطانیہ کی یہودی آبادی میں گھوم پھر رہا ہے۔ ۱۸۲۳ء میں ایتھن سمتھ نے کہا کہ تمام ریڈ انڈین زبانوں کا منبع ایک ہی ثابت ہوتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ عبرانی اور انڈین زبانو میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے کیونکہ یہ دو زبانوں میں حروف جار کا استعمال نہیں ہوتا اور یہ کہ دونوں سابقے اور لاحقے کے استعمال میں بہت فراخ ہیں۔

۱۸۳۶ء میں انڈین قبیلے یوچی کو جارجیا سے اوکلاہاما منتقل کیا گیا۔ اس دوران خصوصی توجہ کا مرکز رہنے کے سبب بہت سی نئی باتوں کا پتہ چلا۔ ان کے رسوم ورواج میں یہودی رسوم کی بڑی واضح مشابہت ملتی ہے۔ بلکہ ۱۹۲۵ء تک تحقیقات کے بارے میں "نیوز ویک" کا کہنا ہے کہ شکل وصورت، رسوم و رواج اور عادات واطوار کے حوالے سے ان میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ یوچی قبیلے کا تعلق قدیم یہودیوں سے ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں لندن میں لارڈ کنگز برو نے "اینٹیکوئیٹیز آف میکسیکو" شائع کی۔ نو جلدوں پر مشتمل کتاب میں مصنف نے انڈین اقوام کو اسرائیل کے گمشدہ قبائل قرار دیا۔ آج کل مارمن چرچ میں نصابی کتاب "مارمان فرقے کی کتاب" پڑھائی جاتی ہے۔ جس میں مفروضوں کی بنیاد پر بنی اسرائیل کے ایک فرقے کے حالات درج ہیں جو دو ہزار قبل مسیح میں شمالی امریکہ میں داخل ہوا تھا۔ ایک اور کولمبین محقق فادر میگوئل، ایس ایم ہپورٹا ۳۰ برس سے زائد عرصے سے اس نظریئے پر کام کرتا رہا ہے۔ اس نے کچھ ایسے نقوش بھی پیش کئے ہیں جو اس کے مطابق یہودیوں سے متعلق ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ سلیمان کے دور میں یہودی امریکہ دریافت کر چکے تھے۔

ان تمام بعید از قیاس نظریات کے بعد موجودہ دور کے محققین کا خیال یہی ہے کہ ۱۰ قبائل دراصل کہیں غائب نہیں ہوئے بلکہ وہ محض دیگر اقوام عالم میں رچ بس گئے اور رفتہ رفتہ اپنی شناخت کھو بیٹھے اور صرف دو قبیلے، یہودا اور بن یامین ہی اپنی پہچان برقرار رکھ سکے۔ تاہم "نیو جیوش انسائیکلوپیڈیا" کا بیان ہے کہ کرہ ارض پر بکھرے ہوئے یہودی افراد بارہ قبائل کی اولاد ہیں۔

# پریسٹر جان کی گمشدہ سلطنت

بارھویں صدی عیسوی کا دور یورپی عیسائیوں کے لئے بڑا صبر آزما اور دشوار تھا۔ مقامات مقدسہ اور سرزمین پاک کو "آزاد" کرانا اور پھر ترک مسلمانوں کے زبردست حملوں کو روکنا اتنا آسان نہ تھا۔ ایسے میں بہت سے عیسائی سورماؤں کو اس بات کا یقین تھا کہ عیسائیت کو بچانے کا کارنامہ پریسٹر جان ہی انجام دے سکتا ہے۔

پریسٹر جان ــــ ایک روایتی شخصیت جس کے بارے میں عیسائی دنیا کا عقیدہ تھا کہ یہ دنیا کی ایک عظیم، دولت منداور عیسائی فلاحی ریاست کا زبردست شہنشاہ ہے۔ اس کی شاندار مملکت مشرق کے کسی وسیع علاقے پر محیط ہے۔ بے پناہ دولت مندی کے باوجود وہاں جرائم کا تصور نہیں اور عدل وانصاف کی حکمرانی ہے۔ لیکن اس عظیم سلطنت کا محل وقوع کسی کو بھی معلوم نہیں۔

بس اتنا تصور عام تھا کہ یہ مملکت انڈیا میں واقع ہے۔ کون سا "انڈیا"؟ دراصل اس دور میں نیل اور دجلہ کی جانب تمام علاقہ انڈیا کہلاتا تھا۔ (کولمبس نے بھی امریکہ دریافت کرنے پر مقامی لوگوں کو انڈین اسی حوالے سے کہا۔ درحقیقت پریسٹر جان کی مملکت کے سراغ کے لئے کئی مہمات روانہ ہوئیں۔ جن کی وجہ سے نئے روٹ اور نئے علاقے دریافت ہوئے۔

گویا تیرھویں صدی عیسوی سے پہلے "انڈیا" کی سرزمین تک پہنچنا بے حد دشوار تھا تاہم پھر بھی باقی عیسائی دنیا سے منقطع یہاں عیسائیت کا تیسرا بڑا گروہ "نیسٹورین" بڑے عرصے سے موجود تھا جس کے متعلق باقی دو بڑے گروہوں (بازنطینیوں اور رومنوں) کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں مشرق میں یہ گروہ کیسے پیدا ہوا؟ کچھ کا کہنا ہے کہ ۴۳۱ء میں قسطنطنیہ سے ایک بشپ نیسٹوریس کو ملعون قرار دے کر دیس نکالا دیا گیا۔ وہی مشرق میں نئے فرقے کا بانی ہوا۔ لیکن عیسائیت کی تبلیغ کا سراغ اس سے بہت پہلے ملتا ہے۔ مثلاً بائبل کا بیان ہے:

"مسیح کا حواری توما رسول خراسان اور ہندوستان کے علاقوں میں تبلیغ کرتا رہا اور مالابار سے مدراس گیا جہاں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کے مقبرے پر گرجا بنا دیا گیا۔ لیکن خود نیسٹورین فرقے کے افراد کا دعویٰ ہے کہ سینٹ تھامس نے انہیں عیسائیت کی تبلیغ کی تھی جس نے ۵۳ء میں انڈیا میں وفات پائی۔ اس کے پیروکاروں کے تعلقات بعد کے مسلمانوں سے خوشگوار ہی رہے ان لوگوں کے متعلق جب مغرب میں روایات پہنچیں تو یہ تصور پیدا ہوا کہ انڈیا، فارس یا منگولیا میں کہیں نہ کہیں کوئی عیسائی مملکت موجود ہے۔

۱۱۴۵ء میں تاریخی طور پر پہلی مرتبہ پریسٹر جان کا تذکرہ ملتا ہے۔ جب مشرق سے ایک شخص پوپ کو خبر دینے آیا کہ ایشائے کوچک کا شہر "ایدیسا" ترکوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اس بات کو تاریخ دان اوٹو نے درج کیا پیغام لانے والے نے یہ بھی بتایا کہ آرمینیا اور فارس سے اس پار مشرق بعید میں ایک بہت وسیع اور عریض سلطنت ہے جس کا شہنشاہ ایک نیسٹورین فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ پریسٹر جان جو میدیز اور فارس کی فتح کے بعد یروشلم کو آزاد کرانے کا ارادہ رکھتا تھا، دجلہ اس کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا اور اسے اپنی افواج کے ہمراہ واپس لوٹنا پڑا۔

۱۱۶۵ء میں ایک اور حوالے کا ذکر ملتا ہے۔ ایک پراسرار خط جو لاطینی زبان میں تھا اور جس کے نیچے منجانب "پریسٹر جان، انڈیا کا بادشاہ" درج تھا۔ بازنطینی شہزادے مانیول کمنینس، فریڈرک باربروسہ اور پوپ الیگزنڈر ثالث کے نام بھیجا۔ ۱۲ روز بعد پوپ نے ایک پیغام رساں مجسٹر فلپس کو خط کا جواب دے کر روانہ کیا۔ لیکن یہ پیغام رساں کبھی واپس نہ آیا۔ جب کہ اصل خط بھی گم ہو گیا۔ اور اب محض اصل خط کی نقلوں کا شہرہ ہے۔ جن کے مطابق خط کی عبارت یہ تھی۔

"ہماری عظیم حکومت تین انڈیاؤں پر قائم ہے اور ہماری مملکت انڈیا سے دور وہاں تک ہے جہاں تھامس رسول آرام فرما رہے ہیں۔"

اس کے بعد لکھنے والے نے اس سلطنت کی عظمت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے وسیع علاقے عظیم محل، جواہرات، طلسمی آئینے اور چشمہ جوانی کا بیان کیا ہے ایک آتش فشاں پہاڑ کا ذکر بھی کیا ہے جہاں آتشیں مخلوق "آگیا بیتال" یا "سمندر" کا بسیرا ہے۔ مملکت میں ایک آنکھ والے اور کتے کے چہرے والے ارنے انسانوں، اژدروں، قنطوروں اور گرفن بلاؤں کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ الغرض اس خط میں فضول بکواس کی گئی ہے۔

پھر ۱۲۲۱ء میں بشپ آف ایکر جیکوائس ڈی ورٹی اور کارڈنیل پلاگوئس نے صلیبی فوجوں کے اعلیٰ سالاروں کی حیثیت سے "داؤد نامی بادشاہ" کے نام خطوط ارسال کئے جس نے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور بغداد پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ ان اعلیٰ فوجی عہدیداروں کو یقین تھا کہ داؤد اگر پریسٹر جان نہیں تو اس کا بیٹا یا پوتا ضرور ہے۔

لیکن اس عظیم سلطنت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور تیرھویں صدی عیسوی میں چنگیز خان نے دنیا کو غفلت سے بیدار کر دیا۔ تاہم ایسے میں بھی کچھ لوگوں کو پریسٹر جان کی صداقت کا یقین تھا چنانچہ فرائر نامی شخص نے دعویٰ کیا کہ وسطی ایشیاء میں پریسٹر جان نے چنگیز خان کے بیٹے اوگادی کو شکست دے دی ہے۔

۱۲۵۳ء میں ربرک کے ولیم نے کہا کہ پریسٹر جان اب تک چنگیز خان سے نبرد آزما ہے۔ اور اس کا ایک بھائی انک خان، چنگیز سے شکست کھا کر فرار ہو چکا ہے۔ جس کی بیٹی چنگیز خاں کی بہو بن چکی ہے۔ اس بات کے ۲۵ برس بعد مارکو پولو نے مغرب کو بتایا کہ اب انک خاں پریسٹر جان کی جگہ لے چکا ہے لیکن جلد ہی یہ بات پھیل گئی کہ اسے چنگیز خان نے جان سے مار ڈالا۔

چودھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی جان مانٹ کارونیو اور اس کا ایک ساتھی ہند چینی علاقوں میں اسی گمشدہ سلطنت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔

۱۳۵۶ء میں سر جان ماڈیویلی نے ایک شوشہ چھوڑا کہ اسے پریسٹر جان کی سرزمین دیکھنے کا اتفاق ہو چکا ہے۔ اس چیز نے بڑی شہرت پائی یہاں تک کہ

انڈیا سے تلاش میں ناکام لوٹ کر آنے والے ایک شخص نے اعلان کیا کہ درحقیقت اس سرزمین کا حقیقی محل وقوع افریقہ میں ہے کیونکہ پریسٹر جان چنگیز خان سے شکست کھا کر افریقہ چلا گیا ہے چنانچہ ۱۴۸۷ء میں پرتگالی جہاز جان دوم کے حکم پر حبشہ میں گمشدہ مملکت کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نے کہا کہ یہ مملکت موزمبیق کے قریب ہے۔

نشاۃ الثانیہ کے دور کے نقشوں میں حبشہ کی جگہ "پریسٹر جان کی سرزمین" کا اندراج ہوتا رہا ہے لیکن تلاش آخر کار بند کر دی گئی اور روایت کی اصل کھوج لگایا جانے لگا۔ بیان کردہ تمام روایتوں کو غلط فہمی ٹھہرایا گیا۔ مثلاً اوٹو سے ملنے والے پیغام رساں نے غلطی سے "یہوتاشی" نامی شخص کو پریسٹر جان ما جس نے وسطی ایشیاء میں کارا کیٹائی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ادھر پراسرار خط کو بارھویں صدی عیسوی کے کسی ادیب کی کارستانی قرار دیا۔ ۱۲۲۱ء میں بھی چنگیز خان کی اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی کے سبب اسے پریسٹر جان یا اس کا پوتا سمجھا گیا۔ مارکوپولو کے انک خان کی شناخت تاتاری سالار اور چنگیز کے ساتھی طغرل خان کی شکل میں کی گئی لیکن محققین اس کے باوجود بضد ہیں کہ پریسٹر جان کے بارے میں تمام روایات عیسائی مذہبی عالم اور بادشاہ ایک ساتھ بیان کرتے ہیں یوں یہ کوئی اور شخصیت ہے۔ عیسائی مذہبی کتب کی تحریف کے دور کے ایک شخص تھامس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے مدراس (انڈیا) میں "میلاپور" کے بادشاہ سودائی نے قتل کر دیا تھا۔ مگر بادشاہ کا بیٹا وزان بعد میں عیسائی ہو گیا اور انڈیا عیسائیت اور عیسائی سلطنت کے قیام کی کوشش کرنے لگا۔ وزان سے بگڑ کر جان بنا اور یوں مشرق کی عیسائی سلطنت کی روایت کی داغ بیل پڑی۔

بعض کا کہنا ہے کہ پریسٹر جان درحقیقت چوتھی بائبل اور "مکاشفات" کا مصنف جان رسول ہے جس کا لقب "جان پریسٹر" (بڑا جان) ہے۔ کیونکہ صرف اس کی انجیل میں سینٹ تھامس کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس نے عالم کشف میں مسیح کے ہمراہ نیک لوگوں کو ہزار برس تک ایک عظیم سلطنت پر حکومت کرتے دیکھا۔ اسی روایت نے ایشیا میں پہنچ کر اس قدر تبدیلی اختیار کی کہ پورا یورپ اس کے لئے جذباتی انداز سے سوچنے لگا۔[7]

یوں یہ محض قیاس آرائی بھی ہو سکتی ہے اور صلیبی فوجوں کا حوصلہ بند رکھنے کے لئے ایک گھڑی ہوئی کہانی بھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ پریسٹر جان کی گمشدہ مملکت کے سراغ اور کھوج نے مغرب پر دولت کے دروازے کھول دیئے۔

# جنرل بخت خان روہیلہ

جنرل بخت خان برصغیر کی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے ایک اہم کردار تھے۔ ابتداً انہوں نے انگریزوں کی ملازمت اختیار کی کیونکہ مالی حالات نے مجبور کر رکھا تھا۔ اس ملازمت کے دوران عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر انگریزوں نے انہیں توپ خانے کا افسر مقرر کیا۔ جنگ افغانستان میں جلال آباد کے محاذ پر بخت خان نے بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا جس کے اعتراف کے طور پر انگریزوں نے ان کی توپوں پر پھولوں کے تاج چڑھا دیئے اس کے باوجود ۱۸۵۷ء میں جب بخت خان کے مرشد مولوی سرفراز علی نے انہیں انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے کو کہا تو بخت خان نیمچ چھاؤنی سے راتوں رات کچھ وفادار ہندوستانی سپاہی اور اپنی توپیں لے کر فرار ہو گئے اور بریلی آ گئے مئی میں یہاں سے انگریزوں کو بھگا کر خان بہادر کو حاکم بنا دیا۔ جولائی میں بخت خان دہلی بہادر شاہ ظفر کے پاس مدد کے لئے آ پہنچے اور وہاں بادشاہ کی اجازت سے نظم و نسق یوں قائم کیا کہ بے اطمینانی اور عوام کی بے چینی بہت کم ہو گئی بادشاہ نے انہیں جنرل کا خطاب دیا۔

اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے مظاہرے کے بعد بخت خان نے انگریزوں کے خلاف جہاد کے فتوے حاصل کیے اور پھر ایک رات پانچ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ دہلی سے کچھ فاصلے پر حملے کے لئے تیار انگریز فوج پر حملہ کر دیا اور ۴۰ آدمی مار کر واپس پلٹ گئے۔ دہلی کے گرد گھیرا ڈالنے والی انگریز افواج کو بخت خان نے تنگ کر دیا تھا نہ صرف ان پر حملے ہوئے بلکہ رسد بھی ٹھیک طرح سے جاری نہ تھی۔ اور بخت خان آنے والی کمک پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔

انگریزوں نے یہ صورت حال دیکھ کر غداروں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ایک غدار مرزا الٰہی بخش کو استعمال کرتے ہوئے بارود کا ذخیرہ برباد کر ڈالا۔ اگرچہ یہ معمولی حادثہ نہ تھا لیکن بخت خان نے اس لمحے بھی ہمت نہ ہاری اور بادشاہ کو اپنے ساتھ دہلی سے نکل بھاگنے اور کہیں اور دستہ بندی کرنے کا

مشورہ دیا جو بادشاہ نے غداروں کے زیر دباؤ قبول نہ کیا۔ یہ دیکھ کر دل شکستہ بخت خان نے سامان، توپیں اور فوج کو لیا اور دشمن کو دھوکہ دے کر بدایوں بھاگ آئے پھر وہاں سے فرخ آباد پھر لکھنؤ اور آخر میں نیپال کی طرف کوچ کر گئے کہاں؟ ہمیں معلوم نہیں۔

محمود الرحمٰن نے "آزادی کے مجاہد" میں تحریر کیا ہے "ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنے اس سب سے بڑے دشمن کی بہت تلاش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بقول رکٹس غدر کے اختتام پر بڑی جستجو کی گئی لیکن وہ کہیں نہ ملا نہ اس کے متعلق کچھ سنا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ وہ کسی لڑائی میں مارا نہیں گیا۔ ایسا ہوتا تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔ ایک دو توپیں بھی نہ مل سکیں۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا کے مطابق روایت یہ ہے کہ بخت خان کو اودھ کے قصبہ نواب گنج میں ۱۸۵۹ء میں مار دیا گیا تھا۔

آج تاریخ اس بارے میں خاموش ہے کہ بخت خان نے انگریزوں کے چنگل سے نکل کر اپنا آخری زمانہ کہاں گزارا۔ کب ان کی وفات ہوئی۔ کہاں وہ دفن ہوئے۔ اس کے باوجود اس عظیم جرنیل کے کارنامے رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

# بے چاری ایمیلیا

ایمیلیا ایئر ہارٹ امریکی تاریخ میں ایک ہیروئین کی حیثیت رکھتی ہے وہ ۱۸۹۸ء میں کنساس میں پیدا ہوئی اس نے اپنی زندگی میں بہت سے کام کیے۔ نرس، ٹیلی فون آپریٹر، ٹرک ڈرائیور، سماجی کارکن، لیکچرر، مصنف اور مدیر۔ مگر اس کی شہرت کا اصل حوالہ اس کا عشق تھا جو اسے ہوائی جہاز اڑانے سے تھا۔ یہ شوق جنگ عظیم اول کے دوران 'سے ٹورانٹو کے ہسپتال میں بحیثیت نرس کام کرتے اس وقت چرایا تھا جب وہ زخمی پائلٹوں کی تیمار داری کے دوران ان سے پرواز کے بارے میں باتیں سنا کرتی۔ یہ وہ دور تھا جب امریکہ میں خواتین کی آزادی اور مساوات کی تحریک عروج پر تھی۔ ایمیلیا اس تحریک کی روح رواں تھی۔

لاس اینجلس میں جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کر کے اس نے ۱۹۲۲ء میں ذاتی جہاز خرید لیا۔ صرف ۳ ماہ بعد اس نے خواتین کی بلند ترین پرواز ۱۴۰۰۰ فٹ کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ مگر اسے اصل شہرت ۱۷ر جون ۱۹۲۸ء کو ملی۔ ایمیلیا نے ایک شرابی پائلٹ اور آرمی کے ایک سبکدوش مکینک کے ہمراہ نیو فاؤنڈ لینڈ سے ایک فوکر طیارے میں ۲۱ گھنٹے بعد ویلز پہنچ کر جہاز سے اٹلانٹک پار کرنے والی اولین عورت کا اعزاز حاصل کر لیا۔ پھر مئی ۱۹۳۲ء میں اس نے تنہا طیارہ اڑا کر اٹلانٹک پار کر کے ایک اور ریکارڈ قائم کیا۔ اس کے بعد تو ریکارڈوں کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا۔ مثلاً خواتین کی کراس کنٹری کی رفتار کا ریکارڈ (۱۹ گھنٹے۔ ۵ منٹ) ۱۹۳۲ء۔ ہوائی سے کیلی فورنیا تنہا ہوائی جہاز اڑا کر لانے والی پہلی شخصیت کا اعزاز ۱۹۳۵ء۔ لاس اینجلس سے میکسیکو تنہا سفر کرنے والی اولین شخصیت کا اعزاز ۱۹۳۵ء اور میکسیکو سے نیو یارک تنہا جانے والی پہلی شخصیت کا اعزاز ایمیلیا نے ہی حاصل کیا۔

۱۹۳۱ء میں ایمیلیا نے ایک دولت مند ناشر جارج پامر پٹنام سے شادی کر لی۔ اوائل ۱۹۳۷ء میں اپنے شوہر جارج پامر پٹنام کی حوصلہ افزائی پر ایمیلیا نے دنیا کے گرد چکر لگانے کی دیرینہ تمنا کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ طے یہ پایا کہ سب سے لمبا اور دشوار راستہ اختیار کیا جائے گا کیونکہ جہاں تک دنیا کے گرد چکر لگانے کا سوال تھا تو اس سے پہلے بھی لوگ اس میں کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ چنانچہ ۲۷۰۰۰ میل کا طویل سفر جو خط استواء کے ساتھ ساتھ طے ہونا تھا، مارچ میں ہونولولو سے شروع ہوا۔ اس کے ہمراہ ایک ۴۴ سالہ مرد پائلٹ فریڈرک نونین بھی تھا جو پہلے پان ایم کا پائلٹ تھا۔ مقررہ روٹ پورٹو ریکو، برازیل، افریقہ، پاکستان، برما، سنگاپور، آسٹریلیا، نیو گنی، جزیرہ ہالینڈ، ہوائی اور بالآخر واپس اوکلینڈ تھا۔

۳۰ر جون کو ان کا دو انجنوں والا الیکٹرا طیارہ نیو گنی میں اتر چکا تھا۔ بغیر رکے چار ہزار میل سفر کرنے کی اہلیت رکھنے والا یہ طیارہ تاریخی اہمیت حاصل کرنے والا تھا۔ اب ایمیلیا سفر کے دشوار ترین حصے کا آغاز کرنے والی تھی۔ انہیں ۲۵۵۶ میل دور مشرق میں ایک جزیرے ہالینڈ پر اترنا تھا جہاں ایک کوسٹ گارڈ بحری جہاز اتاسکا ان سے ریڈیو کے ذریعے رابطے کا منتظر تھا۔ جولائی کی ۲ تاریخ کی صبح ساڑھے دس بجے اس منحوس سفر کا آغاز ہو گیا۔ اتاسکا نے جس کا کام الیکٹرا کی سمت کو درست رکھوانا تھا ۲:۴۵ پر ان کا پہلا پیغام سنا۔ وہ ابر آلود موسم کی شکایت کر رہے تھے۔ شاید اسی وجہ سے رابطہ ٹھیک طور پر بحال نہیں ہو رہا تھا۔ پیغام آ رہا تھا کہ جہاز کا ایندھن کم ہو چلا ہے۔ ایمیلیا نے اتاسکا سے رابطہ بحال کرنے کی درخواست کی مگر ایمیلیا کی ٹرانسمشن اتاسکا کے لئے ناکافی تھیں۔ ۷:۵۸ پر ایمیلیا نے پھر کہا کہ اسے اتاسکا سے کوئی آواز نہیں آ رہی۔ پھر ۸:۴۵ پر آخری پیغام آیا "ہماری پوزیشن ۱۵۷ ڈیش ۳۳۷ ہے..... ہم شمالاً

جنوباً جا رہے ہیں۔ پھر آواز بند ہو گئی۔

آخری پیغام کے بعد ایک گھنٹے تک اتاسکا جزیرے پر ان کا منتظر رہا۔ ان سے ریڈیائی رابطے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے سیاہ دھواں بھی چھوڑ رکھا تھا۔ جو میلوں دور سے نظر آ سکتا تھا۔ تاکہ بھٹکے مسافر بآسانی راستہ تلاش کر سکیں۔ لیکن سب بے سود الیکٹرا اپنے عملے کے دو افراد کے ہمراہ گم ہو چکا تھا۔

ایمیلیا کی گمشدگی کی خبر دھماکے سے کم نہ تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ گمشدگی کی اطلاع ملتے ہی چھوٹے بڑے بحری جہازوں نے علاقے میں چھان بین کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان میں اس دور کا مشہور جہاز ولنگٹن بھی شامل تھا۔ جسے ۶۰ ہوائی جہازوں کی مدد حاصل تھی۔ ان سب نے دو لاکھ پچاس ہزار مربع میل کا علاقہ چھان مارا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا۔ چنانچہ تین ہفتوں بعد یہ کوشش ترک کر دی گئی۔ اس بے نتیجہ منصوبے پر ۴ ملین ڈالر کی کثیر رقم خرچ ہو گئی۔

.جو بات پڑھے لکھے طبقے میں زیادہ مقبول ہوئی وہ اس دور کے حالات کے تناظر میں صحیح معلوم ہوتی تھی۔ امریکہ اور جاپان کے درمیان کشیدگی پائی جاتی تھی۔ خیال یہ تھا کہ جنگ کے پیش نظر دنیا کے گرد چکر کی آڑ میں ایمیلیا دراصل جاپانی افواج کی صورت حال کے جائزے کے خفیہ مشن پر گئی تھی۔ عمومی تاثر یہی تھا کہ وہ جاپانیوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ ادھر حکومت نے اس بات کی سختی سے تردید کرتے ہوئے امکان ظاہر کیا کہ ایمیلیا اور نونین ایندھن کی کمی کی وجہ سے سمندر میں ڈوب گئے ہیں۔ وقتی طور پر بات پر پردہ پڑ گیا۔

جولائی ۱۹۴۴ء امریکی افواج نے جاپانی مقبوضہ جزائر کے مرکز سائپان پر قبضہ کر لیا۔ اس جاپانی ہیڈ کوارٹر میں گھومتے پھرتے ایک امریکی سارجنٹ نے عجیب چیز دیکھی۔ یہ ایک الیکٹرا طیارہ تھا جسے بعد میں تباہ کر دیا گیا تھا۔ اس کا رجسٹریشن نمبر وہی تھا جو ایمیلیا کے الیکٹرا کا تھا۔ کیا ایمیلیا واقعی جاپانیوں کی قید میں تھی؟ اس شک کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوئی جب امریکی بحریہ کے عملے نے جاپانی قیدیوں کے پاس ایک فائل دیکھی جس میں ایمیلیا کے بارے میں بحیثیت ہوا باز اس کا ماضی کا ریکارڈ درج تھا۔ رہی سہی کسر ایک اور دریافت نے پوری کر دی۔ یہ ایک کتاب تھی جس کا نام تھا "ایمیلیا ایئر ہارٹ کی دس سالہ ڈائری" ایک سوٹ کیس بھی ملا جس میں کسی خاتون کے کپڑے تھے۔ مقامی لوگوں نے پوچھ گچھ کے دوران بتایا کہ انہیں یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے ۲ گورے مرد عورت جاپانی سپاہیوں کی حراست میں جنگل سے گزرتے دیکھے تھے۔ بعد ازاں انہیں معلوم ہوا کہ گوری خاتون (جس کے بیان کردہ خدوخال ایمیلیا سے مشابہ تھے) پیچش کا شکار ہو کر وفات پا گئی اور مرد کی گردن اڑا دی گئی۔

امریکی بحریہ کے دو افراد مقامی لوگوں کے ہمراہ اس جگہ گئے جہاں بقول ان کے دونوں گورے دفن تھے اور قبریں کھود کر ہڈیاں نکال لے گئے۔ انہوں نے یہ سب تفاصیل جب اپنے افسر کے گوش گزار کیں تو اس نے انہیں سختی سے اپنا منہ بند رکھنے کو کہا۔ کیوں؟ امریکی فوجی دستوں کو ٹوکیو میں ایمیلیا سے متعلق ایک فائل ملی لیکن اس کا قصہ بھی گول کر دیا گیا۔ آخر اس کے پیچھے کیا بھید پوشیدہ تھا کہ بیشتر چیزیں کہ جن کی مدد سے ایمیلیا کے انجام کا اندازہ ہو سکتا تھا، غائب کر دی گئیں؟ ضرور حکومتی عناصر اس واقعے میں ملوث ہوئے ہوں گے کہ دانستہ اس قسم کا طرز عمل اختیار کیا گیا۔

۱۹۶۸ء میں کیلیفورنیا کی ایک خاتون کا بیان اخبار میں شائع ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ ۱۹۳۷ء میں جب وہ سائپان میں تھی تو اس نے دو امریکی جنگی قیدی مرد اور عورت دیکھے تھے جن کا حلیہ ایمیلیا اور نونین پر ہی پورا آتا تھا۔ اس خبر کی بنیاد پر سان فرانسسکو کے ایک صحافی، فریڈ گوئرنر نے سائپان جانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے دورے میں اسے ۱۳ مقامی باشندوں نے بتایا کہ انہوں نے گورے مرد عورت قید میں دیکھے تھے۔ ایک نے کہا اس دور میں وہ خود جیل میں تھا اور اس کا کمرہ امریکی قیدیوں کے کمرے سے قریب تھا جاپانی دوران گفتگو یہی کہتے پھرتے تھے کہ یہ امریکی ہوا باز جاسوسی کرتے ہوئے گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ اس بات کی تصدیق دوسروں نے بھی کی اور ایمیلیا اور نونان کو تصویروں سے شناخت بھی کر لیا۔ لیکن گوئرنر نے ان سب سے بڑھ کر دو بڑی ٹھوس شہادتیں حاصل کر لیں۔ ایک تو ہوائی جہاز کا جنریٹر جو سائپان کی بندرگاہ ٹانا پانگ میں نصب تھا اور دوسرے دو انسانی ڈھانچے جو زمین کھود کر نکالے گئے۔ کیا یہی ہوا بازوں کا انجام تھا؟

نہیں ــــ گوئرنر کی دونوں دریافتیں غلط ثابت ہوئیں۔ جنریٹر جاپانی ساخت کا تھا۔ صرف امریکی جنریٹر سے مشابہت رکھتا تھا اور ڈھانچے۔ یہ مقامی سائپانیوں کے تھے۔ گوئرنر کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑی۔ جو ۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والی کتاب "ایمیلیا ایئر ہارٹ کی تلاش" سے کس حد تک کم ہو گئی۔ گوئرنر نے ہزاروں افراد کے جو کسی طرح ایمیلیا سے تعلق رکھتے تھے۔ انٹرویو کئے اور اپنی محنت شاقہ کا نچوڑ اس تصنیف میں پیش کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ درحقیقت ایمیلیا اور نونین حکومت کی درخواست پر خفیہ مشن پر روانہ ہوئے کہ ٹرک جزائر کی جاپانی مقبوضات میں جاپانی افواج کی پوزیشن کا سراغ لگائیں۔ وہ مشن میں کامیاب

رہے لیکن واپس لوٹتے ہوئے طوفان میں پھنس گئے اور مجبوراً انہیں آٹل جزائر مارشل میں ایندھن کی کمی کے سبب کریش لینڈنگ کرنا پڑی وہاں موجود جاپانی فوجیوں نے انہیں دھرلیا۔ سائپان لے جاکر ان سے پوچھ گچھ ہوئی اور پھر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ ۱۹۴۴ء میں ملاحوں نے ان کی ہڈیاں تلاش کر لیں اور واشنگٹن لے آئے جہاں انہیں خاموشی سے قومی یادگاروں کے ادارے کی تحویل میں لے لیا گیا۔

گوئرنر کے اس بیان کی تصدیق ۱۹۶۶ء میں بستر مرگ سے امریکی بحریہ کے ریٹائرڈ ایڈمرل چیسٹر نمز نے مرنے سے کچھ دیر پہلے ایک بیان میں کی کہ ایمیلیا اور نونین جزائر مارشل میں جاپانیوں کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ یاد رہے کہ جنگ عظیم دوم میں ایڈمرل چیسٹر اسی علاقے میں تعینات تھا۔ ادھر جاپانی حکومت نے ایمیلیا کے متعلق ہر قسم کے الزام کی تردید کی اور اس کے انجام سے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ایک اور مصنف "جو کلاس" نے خیال پیش کیا کہ گرفتاری کے بعد ایمیلیا ٹوکیو کے شاہی محل میں محبوس رہی پھر جنگ بندی کے بعد خفیہ طور پر جاپان سے کہیں اور چلی گئی۔ اسے دو برس قید رکھنے کا مقصد محض یہ تھا کہ اس کے بل پر امریکہ سے شرط منوائی جائے کہ جنگ کے خاتمے پر جاپانی شہنشاہ کو مجرم نہیں گردانا جائے گا اور ایسا ہی ہوا۔[8]

بہرحال ایک بات پر بیشتر تلاش کنندگان اور محققین کا اتفاق ہے کہ ایمیلیا کے انجام سے کوئی واقف ہے تو وہ صرف امریکی حکومت ہے جو باوجود عوامی اصرار کے اس راز سے پردہ اٹھانے کو تیار نہیں۔

# ہٹلر اور دوسرے نازیوں کا انجام

جنگ عظیم دوم کے خاتمے کے ایام میں روسی افواج ہٹلر کی پناہ گاہوں میں جا گھسیں تو انہیں بتایا گیا کہ ہٹلر نے اپنی بیوی ایوا براں کے ہمراہ خودکشی کر لی ہے۔ ان دونوں کی لاشوں کو ہٹلر کی خواہش کے مطابق جلا دیا گیا ہے۔

دنیا کو ہٹلر کی موت کی تفصیلات کا علم واضح طور پر نہ ہو سکا۔ اپریل کی ۳۰ تاریخ کو جب اتحادی فوجیں برلن میں داخل ہو رہی تھیں، تو ہٹلر نے زہر کا کیپسول کھاتے ہوئے اپنے آپ کو گولی مار کر ختم کر ڈالا تھا۔ اگلے روز یکم مئی ۱۹۴۵ء کو نیویارک کے اخبارات کی شہ سرخی تھی "ہٹلر جنگ میں مارا گیا" حالانکہ اس نے خودکشی کی تھی۔

ہٹلر کے انجام کے بارے میں شکوک و شبہات کا سلسلہ اس وجہ سے شروع ہوا کہ برلن میں زیرزمین بنکروں پر حملہ آور ہونے والے فوجی اشتراکی روس سے تعلق رکھتے تھے اور اشتراکی روس خواہ مخواہ کی راز داری برتنے میں شہرت کا حامل ہے۔ چنانچہ ہٹلر کے انجام کے واقعات پر بھی پردہ ڈالا گیا۔

"نیوز ویک" ادارے نے ایک سابق فوجی ملازم جیمز اوڈینل کو ۴ر جولائی کو حکم دیا کہ وہ برلن جاکر خدمات سرانجام دے۔ یہاں اوڈینل نے ہٹلر کے ذاتی ملازمین، افسروں اور آخری دنوں کے عینی شاہدوں سے بے شمار انٹرویو کرنے کے بعد ایک کتاب "دی بنکر" ترتیب دی جس میں آخری پناہ گاہ کے آخری ایام کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ بیانات کے مطابق آخری روز ہٹلر جس وقت اپنے کمرے میں ایوا براں کے ہمراہ داخل ہو رہا تھا تو سب کو علم ہو چکا تھا کہ وہ خودکشی کرنے کو ہے۔ باہر کھڑے لوگ منتظر تھے کہ اندر سے گولی چلنے کی آواز کب آتی ہے۔ کافی دیر بعد فائر کی آواز آئی۔ وہ لوگ منتظر تھے کہ دوسری گولی کی آواز بھی آئے گی مگر ایسا نہ ہوا۔

اس کمرے کے سب سے زیادہ قریب ایک جرمن میجر آٹو کھڑا تھا۔ بعدازاں جب روسی وہاں پہنچے تو انہوں نے میجر آٹو کو گرفتار کر لیا تھا کہ اس سے ہٹلر کے بارے میں پوچھ گچھ کی جائے۔ میجر آٹو کو روس لے جایا گیا جہاں اس پر بڑی سختیاں کی گئیں لالچ دیا گیا کہ وہ کوئی بات اگل دے وہ وقوعے سے سب سے زیادہ قریب ضرور تھا مگر عینی شاہد نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ روسیوں کے اس طرز عمل کا مقصد یہ تھا کہ میں کسی طرح یہ کہہ دوں کہ ہٹلر کو میں نے یا کسی اور قریبی معتمد نے بذات خود اس کے اپنے پستول سے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ کمرہ جس میں ہٹلر نے خودکشی کی، دہری دیوار والے دروازے سے بند تھا۔ لوہے کے یہ بند دروازے فائر پروف اور ساؤنڈ پروف تھے۔ چنانچہ گولی کی آواز سنائی نہیں دی۔ ہمیں حکم تھا کہ دس منٹ بعد داخل ہوں۔ چنانچہ وقت مقررہ اندر داخل ہوئے تو ایوبران صوفے پر بیٹھی نظر آئی اس نے زہر کا کیپسول کھالیا تھا۔ جب کہ ہٹلر نے کن پٹی پر گولی چلائی تھی۔ بعدازاں پروفیسر بیس نامی شخص نے، جس

سے ہٹلر آخری ایام میں خاصی دیر تک سہل خودکشی اور مرنے کے بعد لاشوں کو ٹھکانے لگانے پر بحث کرتا رہا تھا، بتایا کہ ہٹلر نے سایانائیڈ زہر کا کیپسول ایک ہاتھ سے منہ میں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے گولی چلالی تھی۔

اس موقع پر جرمنی کا سب سے بڑا سراغ رساں جنرل ہوبر بھی موجود تھا۔ مگر نشے کی حالت میں تھا۔ بعدازاں اسے روسی فوج گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ دس برس تک روس میں قید رہا مگر اس کا بیان روسیوں کے شک یا مقصد کو تقویت دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہٹلر کو زہر کے کیپسول ہملر نے بھجوائے تھے اور ہٹلر کو زہر کی طاقت پر شبہ تھا چنانچہ اس نے کسی اور کو (غالباً میجر آٹو کو ہی) حکم دیا تھا کہ وہ اسے گولی مار دیں۔ یہ جنرل اپنے موقف پر اتنی سختی سے اڑا رہا کہ میجر آٹو پر تشدد تیز کر دیا گیا کہ وہ اصل حقیقت سامنے لائے۔ مگر وہ اپنے بیان سے منحرف نہ ہوا بصورت دیگر روسی کہہ دیتے کہ جرمنی کے مرد آہن کی بزدلی اس وقت دیدنی تھی، جب وہ اپنے آپ پر گولی چلانے کی ہمت نہ رکھتا تھا اور دوسروں نے اسے زندگی کے عذاب سے آزاد کیا۔

ہٹلر نے وصیت کی تھی کہ اس کی اور ایوا براں کی لاشوں کو خوب اچھی طرح سے جلا کر خاکستر کر دیا جائے۔ تاکہ لوگ ان کی لاشوں کی توہین بھی اس طرح نہ کریں جس طرح اس کے دوست اطالوی آمر مسولینی کی لاش کو ٹھڈوں سے چیتھڑوں میں تبدیل کر کے اور تھوک تھوک کر بے اندازہ بے حرمتی کر دی گئی تھی۔ ہٹلر نے اس بات کی تفصیل الگ الگ نو معتمد افراد کو خصوصاً سمجھا دی تھی اور کہا تھا کہ آخری رسومات میں اور کوئی بھی شریک نہ ہو۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ تین فوجی اونی کمبلوں میں ہٹلر اور ایوا ہٹلر کی لاشوں کو لپیٹ کر باہر لے آئے۔ انہیں ایک تنگ سی خندق میں ڈال دیا گیا اوپر فضا میں روسی توپوں کے گولوں کا شور مچا ہوا تھا۔ چار آدمیوں نے کئی گیلن پٹرول الٹ کر آگ لگا دی۔

کافی دیر بعد رات ۱۰ بجے یہ لوگ وہاں گئے ایک سپاہی نے بتایا کہ لاشیں ناقابل شناخت ہو چکی ہیں۔ جنرل ہوبر نے لاشوں کی باقیات کو قریبی ۶ فٹ گہری خندق میں دفن کرنے کا حکم دیا۔ مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خندق کہاں کھودی گئی تھی۔ پھر کسی بھی ذمہ دار آدمی نے ہٹلر کے وصیت کا پاس نہ کیا۔ یعنی کوئی ایک بھی یہ نہ دیکھنے گیا کہ ہٹلر کی لاش اچھی طرح جل چکی ہے یا نہیں۔ محض سپاہی کے بیان پر اکتفا کی گئی۔ حالانکہ تنگ گڑھے میں ہوا کی کمی کی وجہ سے لاشیں اچھی طرح نہیں جلی تھیں۔ ہٹلر کے جسم کے اوپری اوپری حصے جلے تھے۔ مگر اب بھی دانت کھوپڑی وغیرہ ایسی حالت میں تھے کہ ان سے شناخت ممکن تھی۔ دراصل سپاہی ایوا کی اکڑی لاش دیکھ کر گھبرا سے گئے تھے۔ جلد بازی سے دونوں لاشوں کو بموں کے ایک خالی کریٹ میں ڈال کر دور دفن کر دیا گیا۔ ایک عرصہ تک یہ معمہ بنا رہا کہ سوختہ لاشیں کہاں دفن ہوئیں۔ ایسے میں جنگ کے خاتمے کے بعد گاہے گاہے افواہیں آتی رہیں کہ ہٹلر اب تک زندہ ہے۔ اور اسے لوگوں نے دیکھا ہے۔ گرفتار شدہ نازی لیڈروں کو سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ کو پھانسی ہوئی اور کچھ نے خودکشی کر لی۔ بعض ایک فرار بھی ہو گئے۔ مثال کے طور پر کئی برس بعد ارجن ٹینا سے ایک مشہور نازی ایک مین کو گرفتار کر کے لایا گیا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ جنوبی امریکہ میں یہودی کتوں کی مانند بھگوڑے اور روپوش نازیوں کا کھوج لگاتے رہے اور چن چن کر انہیں اغواء کر کے اسرائیل لایا جاتا رہا اور عدالتوں میں مقدمات چلا کر سزائے موت دی جاتی رہی۔

ہٹلر کے بارے میں افواہ گرم تھی کہ وہ بھی جنوبی امریکہ میں روپوش ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ہٹلر فرار ہو کر آئرلینڈ اور پھر ارجنٹینا چلا گیا تھا۔ ۱۹۹۲ء میں اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ چلی میں ایک شخص نے بڈھے ہٹلر کو دیکھا ہے اور ایک بوسیدہ مکان میں تمغات اور کتب دیکھنے کا بیان دیا ہے۔ پھر چند ہفتوں بعد ایک سستے قسم کے اخبار نے خبر لگائی کہ ہٹلر چلی کے ایک ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے ساتھ ہی اس کی تصویر بھی شائع کی گئیں۔ جس میں ایک ہسپتال میں اس کا مردہ بدن ایک بستر پر دراز دکھایا گیا۔ اس کی صورت میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ مگر چہرے پر بے شمار جھریاں پڑی دکھائی گئی تھیں۔ وہ جس گاؤں میں رہائش پذیر تھا وہاں کے بچے اسے ڈاکٹر ایڈولف کہتے تھے۔ وہ بچوں سے بڑے پیار سے پیش آتا تھا۔ مگر اس قسم کی باتصویر خرافات سے کوئی قابل ذکر ہلچل پیدا نہ ہوئی۔ البتہ ۲۴ر فروری ۱۹۹۳ء کو روس کی سرکاری یادگاروں کے ڈائریکٹر سرگی میرونکو نے بیان دیا کہ اس کی لائبریری میں ایک ڈبے میں ہٹلر کے جبڑے اور کھوپڑی کی ہڈی محفوظ ہے اور یہ یادگار ۱۹۴۵ء میں ہٹلر اور ایوا کی نعشوں کی شناخت کا سبب بنی اب برائے فروخت ہے۔

جرمن رسالے اسپیگل نے ان کے حصول کے لئے بہت بڑی رقم کی پیشکش کی کہ اس ٹوٹی کھوپڑی کے ہمراہ چھ جلدوں میں جمع شدہ تاریخی ریکارڈ اور ہٹلر کی موت کے ثبوت بھی دیئے جائیں۔

کارڈ بورڈ کے ڈبے میں موجود کھوپڑی کے لئے خفیہ جملہ: بے پر درج تھا۔

"نیلی روشنائی۔ قلموں کے لئے" اس کا سراغ پہلی مرتبہ ایک خاتون صحافی نے لگایا اور اخبارات میں خبر لگا دی۔ معلوم ہوا ہے کہ ہٹلر کی لاش ۴ر مئی کو

یک روسی سپاہی نے دریافت کر لی تھی۔ مگر یہ خبر دنیا بھر سے چھپا دی گئی تھی۔

حال ہی میں برطانوی فوجی سرجن ڈاکٹر تھامس نے یہ کہہ کر کہ معاملے کو مزید ہوا دی ہے کہ ہٹلر نے قطعاً خودکشی نہیں کی تھی۔ اسی کی ہمنوائی میں برطانوی مورخ میرر نے بیان دیا ہے کہ شواہد ڈاکٹر تھامس کے نظریئے کی تائید کرتے ہیں۔ ایک اور برطانوی تاریخ دان نارمن اسٹون کا کہنا ہے کہ روس سے ملنے والی تازہ فائلوں کے مطابق ہٹلر کو ایس ایس دستے کے کمانڈر ہینز لینگے نے ہلاک کروا کر لاش جلوا دی تھی کیونکہ یہ لوگ زیر زمین پناہ گاہوں میں شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھے اور ہٹلر کی موجودگی میں اور بھی اذیت کا سامنا کر رہے تھے چنانچہ پناہ گاہوں سے فرار سے قبل انہوں نے ہٹلر کو قتل کر دیا۔

روس میں ان دنوں ہٹلر کے انجام کے سلسلے میں باقاعدہ تحقیقات ہو رہی ہیں تاحال حکومت ۷ کے قریب لاشیں ماہرین کو تجزیئے کے لئے دے چکی ہے مگر ان باقیات کے معائنے سے ایک بھی ہٹلر کی لاش ثابت نہیں ہوئی۔

جرمن رسالے اسپیگل کا بیان ہے کہ کے جی بی کی فائلوں سے معلوم ہوا ہے کہ کے جی بی کے چیف یوری آندروپوف نے ۱۹۷۰ء میں ہٹلر کی لاش کی ہڈیاں نذر آتش کروا دی تھیں۔ نارمن اسٹون اس ضمن میں کہتا ہے کہ آندروپوف نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ اس زمانے میں نیونازی پارٹی کے اراکین ایک پارکنگ کی جگہ ہٹلر کے مقتل کے حوالے سے یادگار بنانے کی کوششیں کر رہے تھے اور آندرے پوف ہٹلر سے متعلق ایسے پروپیگنڈے کو ہر صورت میں روکنا چاہتا تھا۔

ہٹلر کے دیگر معتمدین میں سے کئی کے بارے میں آج تک لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جنگی جرائم کی عدالت سے فرار ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک مشہور نام مارٹن بورمین کا ہے۔ ہٹلر کی خودکشی کے فوراً بعد مارٹن بورمین چند اعلیٰ افسروں کے ہمراہ ٹینکوں میں سوار ہو کر فرار ہوا۔ اسی شام سرکاری طور پر وہ ایک گمشدہ شخص تھا۔ نیورمبرگ کی جنگی جرائم کی عدالت میں اسے موت کی سزا دی گئی۔

پھر عجیب و غریب اطلاعات یا افواہیں سنی گئیں۔ کچھ کا کہنا تھا کہ بورمین ڈنمارک میں ہے اور جس وقت اس نے ہٹلر کے جانشین ایڈمرل کارل ڈوئنز سے رابطے کی کوشش شروع کی اس وقت قتل کر دیا گیا۔ کچھ کا کہنا تھا کہ وہ آلپس کے پہاڑوں سے اٹلی میں داخل ہو گیا ہے۔ ادھر یہ افواہ بھی زوروں پر تھی کہ وہ آبدوز کے ذریعے جنوبی امریکہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ بلکہ ۱۹۷۳ء میں اسے بولیویا کے ایک ہسپتال میں دیکھنے کا دعویٰ بھی کیا گیا۔[9]

# جزیرے کی آنکھ مچولی - گمشدہ جزیرہ

یہ ۱۷۳۹ء کا ذکر ہے کہ انٹارکٹیکا کے علاقے کی چھان بین کے لئے روانہ ہونے والے ایک فرانسیسی شخص جین بووٹ نے کیپ آف گڈ ہوپ سے ۱۵۰۰ میل پرے، گلیشیر سے ڈھکا ایک جزیرہ دیکھا اور اپنے نام پر اس جزیرے کو بووٹ کا نام دیا۔ کچھ عرصے بعد اس علاقے کے قریب سے گزرتے ہوئے دو برطانوی گروپوں نے ایسے کسی بھی جزیرے کی عدم موجودگی کی رپورٹ دی کیونکہ یہ ان کے پاس موجود بحری راستے کے چارٹ میں بھی ظاہر نہیں کیا گیا۔

۱۸۰۸ء اور ۱۸۲۲ء میں برطانوی جہاز رانوں نے نہ صرف بووٹ جزیرے کو عین اس جگہ دیکھا جہاں جین بووٹ نے اس کی موجودگی کی اطلاع دی تھی بلکہ جزیرے کے ساحل پر قیام بھی کیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے نئے نقشوں پر جزیرے کی نشاندہی شروع کر دی گئی لیکن ۱۸۴۵ء میں اس علاقے سے گزرنے والے مہم جو لوگوں نے دوبارہ اطلاع دی کہ انہیں اس جزیرے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے لہٰذا برطانوی بحریہ نے اسے بحری نقشوں سے ہٹا دیا۔

دس برس یونہی گزر گئے اور جزیرہ تقریباً بھلا دیا گیا لیکن پھر جلد ہی تین مختلف بحری جہازوں نے اس کی موجودگی کی ایک مرتبہ پھر اطلاع دی۔ بحریہ کے لئے ایک تماشا بن گیا کچھ نئے نقشوں میں جزیرے کو دکھایا گیا تھا اور کچھ میں ہٹا دیا گیا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے ۱۸۹۸ء میں جرمن سٹیمر "والدیویا" سے اس کی تصاویر اتاری گئیں چنانچہ اس پانچ مربع میل کے جزیرے کو امریکی اور برطانوی بحریہ کے نقشوں کا مستقل طور پر حصہ بنا دیا گیا اور یہ تاحال موجود ہے۔

لیکن حیرت ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ناروے کی سروے مہم سیٹو نجور نے جزیرے کے غائب ہو جانے کی اطلاع ایک بار پھر دے دی! دیکھیں کہ یہ بنجر اور سنسان جزیرہ پھر کب ظاہر ہوتا ہے۔[10]

گرین لینڈ کے جنوب میں ایک جزیرہ ہوا کرتا تھا۔ فرائزلینڈ FRIESLAND - یہاں اچھی خاصی آبادی ہوا کرتی تھی۔ ۱۵۵۰ء اور ۱۶۶۰ء کے دوران یہاں کے لوگ یورپ اور گرین لینڈ سے تجارت کیا کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ سترھویں صدی کے اواخر میں جتنے بھی نقشے بنائے گئے ان میں اس جزیرے کا ذکر گول کر دیا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جزیرہ غرقاب ہو گیا ہو گا۔ کس طرح؟ یہ معلوم نہیں ادھر کچھ نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ جزیرہ تو ضرور غرقاب ہوا مگر فرائزلینڈ نہیں بلکہ اس کا ایک قریبی جزیرہ جسے غلطی سے فرائزلینڈ سمجھا گیا اور نقشوں سے اسے ہٹا دیا گیا یوں شاید فرائزلینڈ ابھی تک موجود ہو اور دنیا کو اس کی خبر نہ ہو۔[11]

# برمودا مثلث

کہا جاتا ہے کہ برمودا مثلث کی اصطلاح ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک مصنف وِنسنٹ گیڈس Vincent Gaddis نے سب سے پہلے استعمال کی۔ اس سے اس کی مراد وہ مثلث نما علاقہ ہے جو بحر اوقیانوس میں امریکی ریاست فلوریڈا کی جنوب مغربی راس سے لے کر بہامس، پورٹو ریکو، شمال میں برمودا اور پھر واپس جنوب مغرب میں فلوریڈا تک کھینچے گئے فرضی خطوط کے درمیان موجود ہے۔

گیڈس کی اصطلاح اس قدر مقبول ہوئی کہ اکثر افراد جنہیں برمودا کے پراسرار علاقے کے مثلث نما ہونے پر یقین نہیں بلکہ وہ اسے دائروی بیضوی یا بے ترتیب اور گیڈلیس کے مقرر کردہ علاقے سے زیادہ وسیع خیال کرتے ہیں وہ بھی اسے برمودا ٹرائی اینگل ہی لکھتے چلے آ رہے ہیں۔

یہ علاقہ شروع سے پراسرار سمجھا جاتا رہا ہے۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے جزائر غرب الہند پر لنگر انداز ہونے سے پہلے ایک واقعہ جہاز کے روزنامچے میں تحریر کیا کہ انہوں نے ایک بہت بڑے آتشیں گولے کو سمندر میں گرتے دیکھا ہے۔ ۱۱ر اکتوبر کی شام کولمبس اور عملے کے ایک آدمی نے پانی کی سطح پر ایک غیر معمولی چمک کو نمودار ہو کر یکدم غائب ہوتے دیکھا۔

کولمبس کو سفر سے پہلے یہ بات معلوم تھی کہ ملاحوں کا خیال ہے کہ مغرب کی جانب سفر کرنے سے جہاز دنیا کے پرلے کنارے جا گریں گے۔ بعض تجربہ کار ملاحوں کا کہنا تھا کہ آگے سارگیسو سمندر آتا ہے۔ جہاں کی بلائیں کسی جہاز کو صحیح سلامت آگے جانے نہیں دیتیں۔

کولمبس جس وقت اس سمندر سے گزر رہا تھا تو اس نے یہ غیر معمولی بات نوٹ کی کہ قطب نما کی سوئی شمال سے شمال مغرب کی جانب انحراف کر رہی ہے۔ جوں جوں یہ آگے بڑھتے رہے قطب نما کی سوئی کے انحراف میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ عملے کے تمام ارکان سخت خوفزدہ ہو گئے کہ ضرور کوئی انہونی بات ہو کر رہے گی۔ کیونکہ قطب نما کی یہ غیر معمولی حرکت ثابت کر رہی ہے کہ وہ کسی پراسرار علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ ان میں بغاوت کے جراثیم سر اٹھانے لگے۔ ادھر کولمبس کو بھی یقین تھا کہ قطب نما کی سوئی قطبی تارے کی بجائے کسی اور ہی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ درحقیقت سوئی کرہ ارض کے قطب شمال کی جانب اشارہ دے رہی تھی اور کولمبس پہلا شخص تھا جس نے یہ انحراف دیکھا۔[12]

بعدازاں معلوم ہوا کہ دنیا میں بعض مقامات ایسے ہی ہیں جہاں قطب نما کی سوئی بیک وقت قطبی تارے کی اصلی شمالی سمت اور زمینی مقناطیس کا شمالی قطب ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے اور برمودا مثلث کا مغربی خط ۸۰ طول البلد پر ایسا ہی مقام ہے۔

امریکہ کی دریافت کے بعد سے سمندر کا یہ علاقہ بحری اور فضائی ٹریفک کے اعتبار سے بہت پررش ہوتا چلا گیا۔ زیادہ رش کے تناسب سے حادثات کے امکانات بھی بڑھتے گئے مگر پے در پے ایسے حیران کن حادثات وقوع پذیر ہوئے جنہوں نے ذمہ دار افراد کو پریشان کر دیا۔ اس علاقے سے گزرنے والے کئی بحری جہاز، کشتیاں، آبدوزیں، حتیٰ کہ لڑاکا اور مسافر ہوائی جہاز اس طور سے غائب ہوئے کہ کہنا پڑتا ہے کہ زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

اس سلسلے کی ابتداء ۱۹۴۵ء سے ہوئی دسمبر کی ۵ تاریخ کو ۵ عدد بمبار طیارے فلوریڈا سے ۳۲۰ میل پر محیط مشق کے لئے روانہ ہوئے۔ انہیں فلائٹ ۱۹ کا نام دیا گیا تھا۔ ان طیاروں پر ۱۵ تجربہ کار افراد سوار تھے۔ ان کا سفر مشرق سے شمال میں بہامس کی طرف اور وہاں سے واپس مستقر کی جانب طے تھا۔[13]

پرواز کے دو گھنٹے بعد ہوا باز ٹیلر نے اطلاع دی کہ اس کے دونوں قطب نما غیر معمولی طور پر غلط ریڈنگ دے رہے ہیں اور انہیں کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ پھر انہوں نے نامعلوم وجوہات کی بناء پر اندازہ لگایا کہ وہ اصل راستے سے بھٹک کر دو سو میل دور فلوریڈا کیز کے علاقے تک آ گئے ہیں۔ اس کے

بعد ٹوٹ ٹوٹ کر نہ سمجھ میں آنے والی آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تین گھنٹے تک جاری رہا۔ آخر میں یوں معلوم ہوا جیسے ایندھن ختم ہو رہا ہے اور وہ لوگ اترنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ہنگامی حالات کے پیش نظر ایک تیز رفتار مارٹن طیارے کو فوری طور پر بھجوا دیا گیا۔ اس میں یہ خوبی تھی کہ پانی پر بھی اتر سکتا تھا۔ اس میں پندرہ افراد سوار تھے مگر روانگی کے کچھ دیر بعد یہ بھی اچانک گم ہو گیا۔ اگلے چند روز تک بری بحری اور فضائی دستے دو لاکھ پچاس ہزار میل کے رقبے میں چھ جہازوں یا ان کے عملے کے افراد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مگر کسی چیز کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ دسمبر ۱۹۴۵ء سے آج تک سینکڑوں کی تعداد میں ہوائی جہاز اور کشتیاں اس منحوس علاقے میں بغیر کسی سراغ کے غائب ہو چکے ہیں۔

محققین نے برمودا کے علاقے سے گزرنے والے پائلٹوں سے ادھر کی غیر معمولی وارداتوں کی تفصیل معلوم کی ہے۔ مثلاً بعض پائلٹوں کا بیان ہے کہ کسی موقع پر جب وہ برمودا کے علاقے کی فضا میں سے گزر رہے تھے تو یہاں ان کے الیکٹرانک آلات نے اچانک کام بند کر دیا اور کچھ دیر رکنے کے بعد پھر سے ٹھیک طور پر چلنے لگے۔ کچھ پائلٹوں نے فضا میں روشنی خارج کرتے ہوئے بادل دیکھنے کی اطلاع دی۔

چارلز برلز نے پرواز نمبر ۷۲ کا قصہ سنایا ہے کہ میامی کے اڈے پر موجود راڈار میں حسب معمول جہاز کی نشاندہی ہو رہی تھی کہ اچانک جہاز راڈار پر سے غائب ہو گیا۔ اڈے پر سراسیمگی پھیل گئی مگر دس منٹ بعد جہاز پھر سے راڈار پر اچانک نظر آنے لگا۔ جس وقت جہاز منزل پر پہنچا تو عملے سے پوچھا گیا کہ کیا کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ ان کا بیان تھا کہ کوئی خاص بات نہیں بس جہاز دس منٹ تک ایک روشن بادل سے گزر رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ روشن بادلوں میں راڈار کی مدد سے کسی شے کو نہیں دیکھ سکتیں۔ عملے اور مسافروں نے ایک اور عجیب بات نوٹ کی کہ بادل والے واقعے سے کچھ دیر قبل سب نے اپنی گھڑیاں زمینی وقت کے مطابق چیک کر لی تھیں مگر اب جو دیکھا گیا تو جہاز پر تمام افراد کی کلائی کی گھڑیاں دس منٹ پیچھے تھیں۔ گویا یہ روشن دھند کے بادل وقت میں جھول پیدا کر سکتے ہیں۔

وہ جن کے عزیز و اقارب برمودا کی شیطانی مثلث کا شکار ہوئے جب اس قسم کے واقعات سنتے ہیں تو بیم و رجاء کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ نظریہ سازوں کے خیال میں برمودا کے روشن بادلوں میں وقت کی رفتار بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔ کیا معلوم کہ جتنے لوگ غائب ہوئے ہیں وہ بھی کسی بادل میں مقید ہوں۔ وقت کی سست روی سے ان کی عمر میں اضافہ کی قدرتی رفتار بھی سست پڑ چکی ہو اور کسی دن اچانک وہ پھر سے باہر آ جائیں تو ان کے سب عزیز و اقارب مر کھپ چکے ہوں۔

شاید وقت اور برمودا مثلث کے درمیان غیر معمولی تعلق ہے۔ گمشدگی کی بے شمار اطلاعات کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی اطلاعات بھی آئی ہیں جن سے پریشانی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ یہ اطلاعات آسیبی جہازوں کی ہیں۔ ایک ہی وقت میں کئی افراد اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سمندر میں انہیں ایک ہوائی جہاز گرتا دکھائی دیا ہے۔ کوسٹ گارڈ دوڑے آتے ہیں مگر وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۷ء میں کوئن الیزبیتھ بحری جہاز کے دو ملازمین نے ایک چھوٹے سے ہوائی جہاز کو بحری جہاز کی جانب بڑھتے دیکھا۔ قریب تھا کہ وہ بحری جہاز کے اوپر سے گزر جائے کہ اچانک ان لوگوں کے سامنے سمندر میں جا گرا۔ ان لوگوں نے بحری جہاز کو واپس چلوایا کہ اگر بدقسمت جہاز کے عملے کے افراد کی جان بچائی جا سکے مگر وہاں تو کچھ نہیں تھا۔

قیاس ہے کہ یہ ہوائی جہاز برمودا میں وقت کی غیر معمولی حرکت کے نتیجے میں اپنے قید خانوں سے نکل کر اپنے انجام کی المناک کہانی دہراتے ہیں اور برقناطیسی امواج میں ان کی تصاویر نمودار ہو جاتی ہیں یا پھر یہ برمودا کی نحوست کا شکار ہونے والی مجبور روحیں ہیں جو بے چینی کے عالم میں اس طرح کے اشاروں سے کوئی پیغام دینا چاہتی ہیں۔ اپنی یا دنیا کے لوگوں کی مدد کے لئے۔

۱۹۷۲ء میں حکومت امریکہ کے بھیجے گئے تمام موسمیاتی مصنوعی سیاروں کے بارے میں قومی بحری اور ہوائی فضائی ایڈمنسٹریشن کی جانب سے یہ اطلاع ملی کہ جیسے ہی مصنوعی سیارہ برمودا کے علاقے پر سے گزرتا ہے تو اس دوران زمین پر آنے والی لہریں ایک دم سے کمزور پڑ جاتی ہیں۔ خیال تھا کہ اس علاقے میں مقناطیسی شعاعوں کا بے پناہ اثر موجود ہے جو بالائی فضا میں ۸۰۰ میل کی بلندی پر گزرتے ہوئے مصنوعی سیاروں کی مقناطیسی ٹیپوں پر برے اثرات ڈال رہا ہے جس کے نتیجے میں ٹیپ چلتا چلتا رک جاتا ہے یا واپس گھومنے لگتا ہے۔

برمودا مثلث کے مظاہر کی ایک تشریح اڑن طشتریوں کے حوالے کی گئی ہے چونکہ کئی لوگوں نے اس علاقے میں اڑن طشتریوں کی غیر معمولی نقل و حرکت دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لہٰذا بعض لوگوں کا خیال ہے جتنے افراد بھی غائب ہوئے یا تو اڑن طشتریوں نے انہیں بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا یا پھر اغواء کر کے

لے گئیں۔

ایک تشریح گمشدہ براعظم اٹلانٹس (دیکھئے گمشدہ سرزمین) کے حوالے سے ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ صدیوں پہلے یہاں ایک آباد خطہ اٹلانٹس تھ جہاں کی انسانی تہذیب نے بے حد و حساب ترقی کر لی تھی۔ ارضی آفات نے اس خطے کو ڈبو دیا مگر اٹلانٹس کے عقل مند باشندوں نے زیر آب رہنے کا گر سیکھ لیا۔ ان کی زیر آب سرزمین میں ایسے لیزر ہتھیار لگے ہوئے ہیں جو برمودا پر سے گزرنے والی سواریوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔ یا پھر اٹلانٹوی ذہنی کے لوگوں اور سواریوں کو تجربات کی خاطر اغوا کر لیتے ہیں۔

برمودا مثلث کی بدنام شہرت کے بعد دنیا کے اور علاقوں کے بارے میں بھی لوگوں کے بیانات ملے ہیں کہ وہاں بھی اس قسم کے واقعات پیش آرہے ہیں۔ ایسے مقامات کو FLAP AREAS یا ANOMALIC ZONES کہا گیا ہے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اسرار کی چھان بین کرنے والی مشہور سوسائٹی کے صدر آئیون سینڈرسن نے کرہ ارض کے گرد ایسے بارہ پراسرار علاقوں کا نظریہ پیش کیا جس میں قطبین کے علاوہ برمودا کے مخالف سمت میں واقع جاپان کا شیطانی سمندر بھی شامل کیا گیا۔ ڈیولز سی یا شیطانی سمندر جنوب مشرقی جاپان، آئیوجیما (جزار بونن) اور میریانا جزائر کے درمیانی علاقے کا نام ہے جہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران بڑی تعداد میں گمشدگی کے واقعات پیش آئے۔ مگر یہ علاقہ برمودا کی طرح مشہور نہیں ہو سکا۔ حتیٰ کہ ایک سروے کے مطابق جاپان میں بہت ہی کم لوگوں کو اس حوالے سے اس علاقے کے بارے میں کوئی معلومات ہیں۔ ۱۵۰ درجے کا طول البلد اس علاقے سے گزرتا ہے اور یہاں ایک مقام پر برمودا کی طرح قطب نما کی سوئی میں اصل شمال اور قطب شمالی کے درمیان انحراف دیکھنے میں آتا ہے۔ مشہور ہوا باز ایمیلیا (دیکھئے بے چاری ایمیلیا) اس علاقے میں میریانا کے قریب غائب ہوئی تھی۔

# گمشدہ خزانے

## ایلڈوراڈو کا خزانہ

سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات اور قیمتی موتی، انسان کی ہوس اسے دولت مند کہلانے کے لئے ان اشیاء کے حصول پر مجبور کرتی ہے۔ بعض اوقات اسے اپنی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور کبھی وہ درندگی کے شرمناک مظاہرے کرتا ہے۔

مغرب کی ہوس زر نے اسے مشرق اور مغرب بعید پر چڑھائی کرائی۔ قزاقوں کے درمیان ان علاقوں کے بارے میں عقل کو حیران کرنے والی روایات پھیلی ہوئی تھیں۔ براعظم امریکہ دریافت ہوا تو حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ وہاں کے "وحشی" ریڈ انڈین قبائل کے ہاں سونے کی اشیاء کی اس قدر فراوانی ہے کہ جیسے مغربی دنیا میں لوہے کی اشیاء۔ ہسپانوی لٹیروں نے شمالی اور جنوبی امریکہ کے سادہ لوح ریڈ انڈینوں سے پہلے پہل شیشے کے چمکدار ٹکڑوں کے عوض سونے کی اشیاء کا تبادلہ کیا۔ کیونکہ انڈین یہ جانتے ہی نہیں تھے کہ پیلی دھات نے سفید چمڑی والوں کے ہاں کس قدر طوفان مچا رکھا ہے۔ وہ شیشے کے چمکدار ٹکڑوں کو زیادہ قیمتی خیال کرتے رہے۔ مگر ہسپانیوں اس سستے سودے پر مطمئن نہیں تھے بس ہوس تھی تو یہ کہ سونے کے تمام ذخائر پر قبضہ کر لیا جائے۔

ہسپانوی قزاق کورٹیز میکسیکو کے عظیم ازٹک قبائل پر حملہ آور ہوا۔ وہ بے چارے ایسی مخلوق کو پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ جس کے پاس چار ٹانگوں والا پھرتیلا سواری کا جانور (گھوڑا) تھا۔ انہوں نے بیل گاڑی کے پہیوں کی شکل اور جسامت کے سونے کے بڑے بڑے گول چکر ان ہسپانویوں کی خدمت میں پیش کیے تاکہ وہ ان علاقوں سے چلے جائیں مگر ان کو یہ حرکت بڑی مہنگی پڑی ہسپانویوں نے کاہے کو اتنا سونا دیکھا تھا ان کی رال ٹپک پڑی اور پھر ازٹکوں کا وہ حشر ہوا کہ توبہ ہی بھلی۔

ہسپانوی حملہ آوروں نے واپسی پر پورے یورپ میں انڈین اقوام کے پاس سونے کے ناقابل تصور ذخائر کی خبر پھیلا دی۔ اور لٹیروں کے گروہ گنگا سے ہاتھ دھونے کو تیار ہو گئے۔

۱۵۳۶ء میں ایک سپاہی "گونزالوڈی قوئی ساڈا" اپنے ہمراہ چھ سو سپاہی اور ۸۵ گھوڑے لے کر سونا لوٹنے نکل کھڑا ہوا۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ جنوبی

امریکہ میں اینڈیز پہاڑوں میں ایک بے پناہ دولت مند تہذیب موجود ہے جس کا بادشاہ "ایل ڈوراڈو" ہے۔ جس کا لقب "صاحب زر" ہے۔ وہ اپنے بدن پر سونے کا برادہ چھڑک کر سونے کے ننھے سے مجسمے ساتھ لے کر ایک مقدس جھیل گواٹاویٹا میں جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ دیوتاؤں کے نام پر پانی میں پھینک دیتا ہے۔ "قوئی ساڈا" اور اس کے ہمراہیوں کا ارادہ "صاحب زر" ایلڈر رازڈز سے یہی سونا چھیننے کا تھا۔ اور جھیل میں ڈبوئے جانے والے سونے پر بھی ان کی نظر تھی۔

ہسپانوی لشکر سفر کی بے پناہ صعوبتیں اٹھاتا دلدلوں سے بچتا بچاتا جنوبی امریکہ کے گھنے جنگلات میں سے نکل کر اندرونی میدانوں تک پہنچا تو اسے بدترین مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں ننگ دھڑنگ آدم خور وحشیوں نے ان پر زہریلے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس آفت سے چھٹکارا پانے کے بعد آخر وہ اینڈیز کے پہاڑوں میں جا پہنچے۔ اب تک ان کے دو سو ساتھی اس سفر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ان کا ارادہ صاحب زر ایلڈوراڈو سے جھڑپ کرنے کا تھا۔ مگر وہاں کوئی ایک ایلڈوراڈو تھا؟ وہ علاقہ تو "اصحاب زر" سے بھرا پڑا تھا۔ یہاں ریڈ انڈین قبائل چب چا اور موئز کا نے موجودہ کولمبیا کے دو علاقوں بگوٹا اور تنجہ پر حکمرانی قائم کر رکھی تھی۔ یہ لوگ آدم خوروں کے مقابلے میں نسبتاً مہذب تھے۔ لیکن ہسپانویوں اور گھوڑے جیسی مخلوق دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے تھے۔ ہسپانوی دھڑلے سے تنجہ میں داخل ہو گئے۔ بیچارے چب چا شہر سے بھاگ گئے تھے۔ اور اپنا سونا پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ قوئی ساڈا نے یہاں زبردست لوٹ مار کے بعد بگوٹا کا رخ کیا۔ یہاں کے بادشاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا مگر اس وقت اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا جب اسے معلوم ہوا کہ شاہی خزانہ بڑی ہوشیاری سے جنگل میں غائب کر دیا گیا ہے ریڈ انڈینوں پر بے پناہ تشدد کیا گیا لیکن انہوں نے نہ خزانے کا پتہ بتانا تھا اور نہ بتایا۔

اب سونے کے حصول کے لئے ان کی نگاہیں جھیل گواٹاویٹا کی جانب اٹھیں۔ قدیم روایات کے مطابق ہر نیا بادشاہ اپنی حکومت کی ابتداء میں جھیل گواٹاویٹا میں سورج دیوتا کے نام پر سونا اور قیمتی پتھر پھینکا کرتا تھا۔ ادلین کوشش قوئی ساڈا کے بھائی ہرنن نے کی اسے معلوم ہوا کہ ۱۵۵۰ء میں ایک شخص لیون نے کہا تھا کہ اگر جھیل سے پانی نکال دیا جائے تو خزانہ حاصل کرنا مشکل نہ ہو گا پس ہرنن نے بہت سے انڈین جمع کئے اور انہیں تھیلوں میں جھیل سے پانی نکال کر دور پھینکنے کے کام پر لگا دیا۔ مگر یہ کام مو ثابت نہ ہوا اور ہرنن کو سونے کی تھوڑی سی مقدار ملی۔ اس کے بعد ہسپانوی سوداگر سیبیل ویڈا نے ۸ ہزار انڈین مزدوروں کے ذریعے جھیل خالی کرانے کے عظیم منصوبے پر کام شروع کیا۔ ابتداً بڑی کامیابی ہوئی اور انڈین سرداروں کے چھاتی پر سجائے جانے والے سونے کے زیورات دریافت کیے گئے اور پانی کی سطح بھی ۲۰ میٹر کے قریب گرا دی گئی۔ مگر ایک روز بڑا سخت حادثہ ہوا جھیل سے نکالا ہوا سارا پانی بند توڑ کر کئی مزدوروں کو ہلاک کرتا ہوا واپس جھیل میں بھر گیا۔ سیبیل ویڈا کی کمر ٹوٹ گئی وہ بڑی کس مپرسی کے عالم میں مرا۔

اگلی دو صدیوں میں خزانے کے حصول کی ناکام کوششیں جاری رہیں ۱۸۰۱ء میں ایک مشہور مصنف الیگزنڈر ہمبولٹ نے جب یہ کہا کہ جھیل کی تہہ میں تین سو ملین ڈالر کا خزانہ موجود ہے تو اور بہت سے لوگوں کو بھی شوق چرایا۔ برطانوی بحریہ کے کپتان کاچرین نے جھیل کے پاس نہریں کھود کر پانی نکالنے کا منصوبہ تشکیل دیا۔ مگر جھیل کے پانی نے ان نہروں کو توڑ کر کاچرین کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ کیا جھیل خالی نہیں ہو سکتی؟ اکثر لوگوں کا یہی خیال تھا اسی لئے کوئی بھی سرمایہ لگانے کے لئے تیار نہ تھا۔

مگر ۱۸۹۹ء میں سرمایہ داروں نے ایک انجینئر ہرنانڈو ڈی ویلا کی خدمات حاصل کی۔ اس بیدار مغز شخص نے وہ کر دکھایا جو صدیوں سے مشکل تصور ہوتا تھا۔ اس نے زیر زمین ایک سرنگ کھدوائی جو جھیل کی تہہ میں ملتی تھی۔ جھیل کا سارا پانی اس زمین دوز سرنگ کے ذریعے باہر نکال دیا گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گئے کہ تہہ میں گاد اور کیچڑ کی ایک موٹی تہہ بچھی ہوئی ہے۔ اس میں خزانے کو کیسے نکالا جاتا رہی سہی امید اس وقت ختم ہو گئی جب دھوپ کی شدت سے کیچڑ کنکریٹ کی مانند سخت ہو کر خشک ہو گیا اور پھر کچھ ہی عرصے بعد جھیل دوبارہ پانی سے بھر گئی۔

۱۹۳۲ء میں غوطہ خوروں نے خزانہ نکالنے کی کوشش کی مگر کیچڑ کی تہہ دوبارہ آڑے آئی اور ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی ۱۹۳۵ء میں بے شمار ناکامیوں کے بعد ایک اور بحری انجینئر پرلے نے جھیل کی تہہ پر فولاد کے ایک گولے پر پنجے نما ساختیں لگا کر ڈریج کا کام لیا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ جھیل گواٹاویٹا نے اپنے خزانے کو اگلنے سے انکار کر دیا ہے۔ (14)

## پیرو کا خزانہ

امریکہ کا جنوبی خطہ قدرت کی فیاضی کے سبب سونے کے قدرتی ذخائر سے مالا مال رہا ہے۔ اس علاقے کی دریافت کے ساتھ ہی اقوام مغرب نے یہاں حریصانہ نگاہیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ اور بعد ازاں یہاں کی عجیب و غریب تہذیبیں مٹانے کے پیچھے بھی حرص و ہوس کا ہاتھ تھا۔

پیرو، بحرالکاہل کے مغربی کنارے پر آباد ایک مملکت تھی۔ جہاں عظیم ریڈ انڈین قوم انکا کی وسیع سلطنت سولہویں صدی عیسوی تک قائم رہی پھر بعد کی تین صدیوں تک ہسپانوی یہاں غاصبانہ طور پر حکمران رہے۔ ۱۸۲۱ء میں جمہوری طرز حکومت کا اجراء ہوا تو پیرو کے تعلقات ہمسایہ ملک سے کشیدگی اختیار کرتے چلے گئے۔ انیسویں صدی کے ان ابتدائی ایام میں پیرو حکومت نے محسوس کیا کہ ہمسایہ ملک چلی ان پر چڑھائی کرنے والا ہے۔ چونکہ کمزور فوجی قوت کے بل پر چلی کو روکنا ان کے بس سے باہر تھا۔ لہٰذا خفیہ طور پر تمام قومی خزانہ جو سونے، چاندی کی اینٹوں اور جواہرات سے مزین مجسموں پر مشتمل تھا پانچ بڑے بحری جہازوں میں لاد دیا گیا۔ اور جہازوں کو سمندر میں اس وقت تک گھومتے پھرنے کا حکم دیا گیا جب تک سرحدی کشیدگی کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ لیکن بحری قزاقوں کو اس عظیم خزانے کی سن گن مل گئی اور انہوں نے چار جہاز لوٹ لئے جب کہ صرف سونے سے لدا پانچواں جہاز انہیں نغمہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔ تھامس نامی شخص اس جہاز کا کپتان تھا۔ وہ جہاز کو لے کر کوسٹاریکا سے ۳ میل مغرب میں واقع ایک ۴ میل لمبے بے نام جزیرے کی طرف نکل گیا۔ اس ویران اور پراسرار جزیرے کو اس نے کوکوس کا نام دیا۔ اور اپنے ملک کی امانت کو وقتی طور پر محفوظ کرنے کے ارادے سے یہیں دفن کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ حالات سازگار ہوتے ہی خزانہ نکال کر پیرو واپس لے جائے گا۔ لیکن تقدیر نے اس سے بڑا کھیل کھیلا۔ کوکوس سے لوٹتے ہوئے اسے قزاقوں نے گھیر لیا۔ اور واپس کوکوس لے آئے۔ پیرو کے ان فرزندوں پر طرح طرح کے ستم ڈھائے گئے مگر انہوں نے خزانے کی بابت ایک حرف نہ کہا۔ ناچار قزاقوں نے انہیں آزاد کر دیا۔ مگر تھامسن کی ہاتھوں کی انگلیاں اور زبان کاٹ ڈالی۔ تاکہ وہ کسی کو بھی خزانے کا پتہ زبانی یا تحریری طور پر بتانے سے معذور ہو جائے۔ یہ لوگ پیرو چلے آئے۔ تھامسن کے زخموں میں زہر پھیل گیا اور وہ ایڑیاں رگڑنے لگا۔ موت سے چند لمحے پہلے معاً وہ تڑپ کر اٹھا اور پیروں کی انگلیوں میں قلم پھنسا کر کاغذ پر کوکوس کا نقشہ بنا کر اس مقام کی نشاندہی کی جہاں خزانہ گاڑا گیا تھا اور پھر دم توڑ دیا۔ ڈاکٹر نے یہ نقشہ چھپا لیا اور کسی کو اس کی خبر نہ کی۔ صرف اپنی بیوی اور بہن کو اطلاع دی اور ایک روز بیوی کو ساتھ لے کر ایک کرائے کے جہاز پر کوکوس روانہ ہوا مگر جہاز کو ساحل سے دور روک کر ایک چھوٹی کشتی میں بیوی کو بٹھایا اور ملاحوں سے کہہ دیا کہ وہ جزیرے سے ادویات کی تیاری کے لئے جڑی بوٹیاں لینے جا رہے ہیں۔ وہ روزانہ جزیرے پر آتے جاتے رہے مگر ایک روز ایک سخت طوفان نے ان دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا اور ملاح واپس لوٹ گئے۔ لالچی ڈاکٹر کی بہن نے ان کے مرنے کی خبر سن کر لوگوں کو اصل قصہ سنایا تو خزانے کے لالچ میں بہت سے لوگوں نے کوکوس کی راہ لی۔ مگر ہر کوئی ناکام ہوتا رہا۔ ایک بڑی کوشش برطانوی بحریہ کے کمانڈر پالی سٹر نے کی۔ اور فوج کی فوج لے کر کوکوس کی چھان پھٹک شروع کر دی۔ مگر حکومت برطانیہ نے ذاتی منفعت کے لئے فوج کو اس طرح استعمال کرنے کو جرم قرار دیا اور پالی سٹر کو ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ لیکن وہ بھی چپکا نہ بیٹھا۔ ۱۸۹۹ء میں ایک بحری جہاز خرید کر پھر کوکوس آ گیا اور تا حیات مٹی کھودتا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں مشہور کھلاڑی میکم کیمپبل کو خزانے کا شوق چرایا تو ایک ٹیم لے کر کوکوس چلا گیا۔ اور کئی برس تک خزانے کے حصول کی ناکام جدوجہد کرتا رہا آخر کار کوشش ترک کر دی۔ تب سے اب تک کروڑہا روپے مالیت کا سونا گھنے درختوں والے جزیرے کوکوس میں کہیں مدفون ہے اور منتظر ہے کہ کب کوئی اس کا سراغ لگاتا ہے۔[15]

## جزیرہ اوک کا خزانہ

اوک آئی لینڈ نووا سکوشیا میں خلیج ماؤں کے قریب واقع ایک جزیرہ ہے۔ سفر کے دوران جہاز صفائی کے لئے اور مسافر تکان دور کرنے کے لئے ایک عرصے تک یہاں رکا کرتے تھے۔ روایات کے مطابق ایک زمانے میں یہ جزیرہ قزاقوں کا مسکن تھا۔ انہوں نے یہاں جھونپڑوں کی بستی بنالی تھی۔ لیکن پھر یہاں کے مکین پراسرار طور پر اس علاقے کو خیرباد کہہ گئے۔ خیال یہ ہے کہ اس کا بنیادی سبب روز روز کے جھگڑے ہوں گے۔ شراب کے نشے میں انہیں اپنے پرائے کی تمیز نہ ہوئی ہو گی اور ایک دوجے پر فائر بھونک دیتے ہوں گے۔ پھر شاید ان پر مقدمات چلا کر سزائے موت دے دی گئی ہو گی۔ جس سے جزیرہ ویران ہو کر رہ گیا۔

۱۷۹۵ء میں ۳ افراد ٹونی ودگان، ڈینی لگ گی نس اور جیک سمیتھ نے اوک میں قیام کیا۔ ٹونی نے سب سے پہلے ایک درخت میں کوئی خاص بات نوٹ کی۔ اور دوستوں کو متوجہ کیا۔ یہ شاہ بلوط کا ایک درخت تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ اس کی شاخوں سے لمبے رسوں کے سرے بندھے ہوئے تھے۔ جب کہ رسوں کے دوسرے سرے نیچے مٹی میں گاڑے گئے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ ضرور یہ کوئی خاص علامت ہے۔ اور ممکن ہے کسی پوشیدہ خزانے کا پتہ لگ جائے۔ انہوں نے رسوں کے ساتھ نیچے کی طرف کھدائی شروع کر دی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہاں کوئی کنواں تھا جس میں کوئی وزنی چیز رسوں کی مدد سے اتاری گئی تھی اور پھر اسی مٹی سے کنواں بھر دیا گیا تھا۔

تینوں آدمی کھدائی کرتے گئے حتیٰ کہ مہینوں گزر گئے اور وہ لوگ اس جدوجہد سے اکتا گئے کیونکہ تاحال کوئی خوش آئند بات ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ تھک ہار کر انہوں نے ایک اور شخص ڈاکٹر جان لنڈز کو بلا لیا وہ اپنے ساتھ مزدور لے آیا اور ۳۵ فٹ کی گہرائی میں ناریل کے پرانے ریشے دیکھ کر اسے بھی یقین ہونے لگا کہ ضرور یہاں کوئی دفینہ موجود ہے۔ ڈاکٹر جان کے مزدوروں نے ۱۰ فٹ مزید گہرائی تک زمین کھود ڈالی یہاں شاہ بلوط کے تختوں کی موٹی سی تہہ نظر آئی۔ جب انہیں اکھاڑا گیا تو دوبارہ ناریل کے ریشوں کی ایک اور تہہ ملی۔ انہیں پتہ چلا کہ یہ سامان اندازاً دو ہزار میل دور جزائر غرب الہند سے لایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کچھ پرامید تھا کہ اب خزانہ نکلا ہی چاہتا ہے۔ کھدائی پھر سے شروع ہوئی گہرائی میں ۸ فٹ مزید اضافہ ہوا۔ یہاں سے ایک چپٹا پتھر ملا جس پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے اب اپنی بچی کچی آمدنی سے ایک برما خرید لیا اور کنویں کو ۱۰۰ فٹ گہرائی تک پہنچا دیا۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ گویا نیچے کہیں کرے نما خلا ہے۔ برمے کے پھل نے موٹی سخت لکڑی اور کچے پلستر کو توڑتے ہوئے اپنا راستہ اور آگے بنایا تو نیچے سے پانی نکلنے لگا۔ اور دھیرے دھیرے کنویں میں بھرنے لگا۔ لیکن پانی کی سطح پر سونے کے ٹکڑے اور کاغذوں کے ٹکڑے دیکھے گئے۔ ڈاکٹر کی باچھیں کھل گئیں۔ کہ آخر کار خزانہ مل ہی گیا لیکن اس کی خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ برمے سے ذرا سی کھدائی مزید کی تھی کہ پانی دباؤ سے باہر نکلا اور تیزی سے کنویں میں بھرنے لگا۔ ۳ مزدور پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گئے ڈاکٹر ہمت ہار گیا۔ اتنی دیر سے کی گئی صبر آزما جدوجہد کا نتیجہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر لالچ بری بلا ہے۔ ۱۹۴۹ء ایک بار پھر ڈاکٹر کی نیت خزانہ نکالنے کی ہوئی اس نے دوسرے سرمایہ داروں کو بھی بلایا کیونکہ پچھلے موقع پر تو خود دیوالیہ ہو چکا تھا۔

کھدائی پھر سے شروع ہوئی۔ ۱۰ فٹ کی مزید گہرائی میں سونے کی ایک زنجیر دریافت کی گئی۔ یہاں سیمنٹ کی ایک تہہ تھی۔ برمے نے جونہی اس تہہ کو توڑا پانی کا ایک فوارہ پھوٹ گیا۔ سارے مزدور اندر ہی ہلاک ہو گئے۔ ڈاکٹر لنڈز میں اب مزید کام کرنے کا حوصلہ نہیں تھا اس لئے اس نے کوشش ترک کرنے کا اعلان کیا تو دوسروں نے قسمت آزمائی شروع کی۔ تلاش کرنے والوں میں سب سے مشہور شخصیت سابق امریکی صدر روز ویلٹ کی تھی جس نے بہت سرمایہ خرچ کیا۔ برقی آلات نصب کیے گئے۔ یہ تو پتہ چل گیا کہ سونے کے وسیع ذخائر یہاں دفن ہیں لیکن پانی کا تماشہ سمجھ سے بالا تھا۔

پھر یہ معمہ بھی حل ہو گیا۔ نامعلوم کون تھے وہ لوگ جنہوں نے زبردست کاریگری سے زمین کے اندر ہی اندر سمندر تک سرنگیں کھود ڈالی تھیں جو کنویں میں سمندر کا پانی کھینچ لاتی تھیں۔ ۱۹۵۷ء میں امریکی انجینئروں نے اعلان کر دیا کہ خزانے کا حصول امکان سے باہر ہے اور ڈیڑھ سو سال سے جاری کوششوں کا نتیجہ صفر ہے۔[16]

## برے فوگل کی گمشدہ کان

۱۸۵۲ء میں فارلے، ٹاؤن اور کیڈویلاڈر نامی تین دوست کیلیفورنیا جا رہے تھے راستے میں پیناماؤنٹ کے پہاڑوں میں کہیں انہیں مردہ سنگ اور چاندی کا ذخیرہ دکھائی دیا۔ تینوں کو اگرچہ دولت ملنے کی خوشی تھی ہی مگر ساتھ یہ صحرا کے وحشت ناک ماحول میں پانی اور غذا کی فراہمی کی تکلیف کا احساس بھی تھا۔ چنانچہ انہوں نے معدن کا تھوڑا سا نمونہ ساتھ لے لیا اور لاس اینجلس چلے آئے جہاں معدن کو جانچا گیا۔ کچ دھات میں چاندی کی مقدار ۸۵ فیصد پائی گئی۔ چاندی کی اس کثیر فیصدی مقدار کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

سب سے پہلے فارلے نے کچ دھات لانے کے لئے ایک گروپ تشکیل دیا۔ وہ لوگ کان سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھے کہ گروپ کے ایک آدمی اور

فارلے میں تلخ کلامی ہو گئی۔ اور اس شخص نے فارلے کے سینے میں فائر بھونک دیا جس سے وہ وہیں دم توڑ گیا اور باقی لوگ خالی ہاتھ لوٹ آئے۔

پھر ٹاؤن نے معدن کے کاروبار کا ارادہ کیا مگر ناگہانی موت نے اسے بھی راہ ہی میں دبوچ لیا۔ اب صرف کیڈویلاڈر رہ گیا تھا جسے چاندی کے ذخیرے کی خبر تھی مگر قدرت نے ایک عجیب مذاق کیا وہ بلانوشی کے سبب ہلاک ہو گیا اور اب کسی کو بھی چاندی کے ذخیرے کی خبر نہ تھی۔

۱۸۵۵ء میں ایک شخص بیلے نے اعلان کیا کہ اسے کان مل گئی ہے۔ لوگوں نے اس کے پاس چاندی دیکھ رکھی تھی چنانچہ بیشتر لوگ کان کی کھدائی میں سرمایہ کاری کرنے کے متمنی ہو گئے مگر بیلے کبھی راضی نہ ہوا۔ اسی سال ایک اور آدمی ڈیوڈ بیول نے تلاش کا ارادہ کیا مگر صحرا میں ریڈ انڈینوں نے حملہ کر کے اس کے سارے خچر ہتھیا لئے اور وہ بیچارہ گرمی سے بے حال پیاس سے تڑپتا واپس آیا۔

۱۸۶۴ء - ۱۸۶۵ء میں کیلی فورنیا کے ایک سرکاری عہدیدار جیک برے فوگل نے کان کی تلاش کا تہیہ کیا یہ شخص بڑا بدنصیب ثابت ہوا اسے دو بار خزانے کا اتہ پتہ ملا مگر دونوں مرتبہ وہ صحیح نشانیاں یاد رکھنے میں ناکام ہو کر خزانہ پانے میں ناکام رہا۔ پہلے موقع پر وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ڈیتھ ویلی کے ایک شورزدہ چشمے کے پاس بیٹھا تھا کہ ریڈ انڈینوں نے حملہ کر دیا اور صرف برے فوگل فرار ہو سکا۔ وہ شمال کی طرف گرتا پڑتا جا رہا تھا کہ ایک جگہ اسے سونے کا معدنی ذخیرہ دکھائی دیا اگرچہ یہ گمشدہ کان نہیں تھی مگر یہ کیا کم تھا کہ سونا مل گیا مگر برا ہو ریڈ انڈینوں کا انہوں نے برے فوگل کے سر میں ڈنڈہ رسید کر دیا اور وہ سونے کا پتہ بھی کھو بیٹھا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری اور تلاش کا کام جاری رکھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یا تو وہ امیر کبیر بن کر لوٹے گا یا وادی مرگ میں اپنی ہڈیاں چھوڑ آئے گا۔ اس کے دیوانہ پن کو دیکھ کر لوگوں نے چاندی کی گمشدہ کان کو برے فوگل کی گمشدہ "کان" کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بارے میں لوگوں میں کئی قصے مشہور ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک موقع پر صحرا میں اس کے گروپ کو پانی اور خوراک کی شدید قلت کا سامنا کرنا پڑا تو باقی لوگوں نے ۱۰۰ میل دور ایک قلعے کو لوٹنے کا فیصلہ کر لیا مگر برے فوگل نے انکار کر دیا اور ساتھی اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ چھپکلیاں اور مینڈک کھاتا رہا اور ایک روز خوش خوش ساتھیوں کے پاس آیا اور انہیں خوشخبری سنائی کہ آخر کار اس نے چاندی کے عظیم ذخائر کا سراغ لگا لیا ہے مگر جب وہ صحرا میں گئے تو وہ ایک بار پھر چاندی کی کان کا راستہ بھول چکا تھا۔[17]

## ولندیزی شخص کی گمشدہ کان

ایریزونا (امریکہ) میں سپرسٹیشن ایک پہاڑی سلسلہ ہے جہاں ہزاروں مرتبہ لوگوں نے سونے کی کان تلاش کی ہے روایات کے مطابق ایک نامراد عاشق اس علاقے میں قسمت کو کوستا ہوا بے دلی سے جا رہا تھا کہ اس کی نظر آٹھ دراڑوں پر پڑی جہاں سونا ابلا پڑ رہا تھا۔ اپنی ہمت کے مطابق اس نے سونا اکٹھا کیا اور میکسیکو میں اپنے گھر واپس چلا آیا۔ اس کی دولت دیکھ کر نہ صرف محبوبہ شادی پر تیار ہو گئی بلکہ سب لوگوں نے کان کا پتہ لینے کے لئے اس سے تعلقات بڑھائے۔ ایک دوسری روایت کان کی دریافت سے متعلق ۳ افراد پیرالٹا بر دران کا قصہ بتاتی ہے جو پھرتے پھراتے سونے کی کان کی طرف آ نکلے تھے اور واپسی پر لوگوں کو سونا بھی دکھایا تھا۔ ۱۸۴۸ء میں یہاں سے سونا نکالنے والے لوگوں کو اپاچی انڈین قبیلے نے قتل کر دیا کیونکہ ان کے نزدیک یہ لوگ پہاڑ کا تقدس مجروح کر رہے تھے۔ اپاچی عورتوں نے مٹی ڈال کر سونے کے ذخیرے کو چھپا دیا۔ پھر ۱۸۷۰ء میں رامن پیرالٹا نامی شخص نے اسے دوبارہ ڈھونڈ نکالا۔ ایک جرمن شخص جیک والزر کو جب پیرالٹا نے کان مل جانے کی خبر کی تو اس بدفطرت شخص نے پیرالٹا کو ہلاک کر دیا اور ۱۸۹۱ء میں اپنی موت تک نہ صرف کان پر قابض رہا بلکہ اپنا پیچھا کرنے والوں کو بڑی خوبصورتی سے بھٹکاتا رہا تاکہ وہ اسے ذخیرے سے سونا نکالتے نہ دیکھ سکیں۔ والزر کا لقب "ولندیزی شخص" پڑ گیا تھا۔ جب کہ ریڈ انڈین اسے "برف کی داڑھی والا" کہتے۔ اس نے صرف دو افراد جولیا تھامس اور ایک جرمن نانبائی کو کان کا پتہ سمجھایا تھا۔ لیکن وہ لوگ کوشش کے باوجود والزر کے نقشے کے مطابق کان تک نہ پہنچ سکے۔ ان کا خیال تھا کہ ۱۸۷۷ء کے زلزلے میں کان کہیں دب گئی ہے۔ فینیپ کارپوریشن نامی ادارے نے کافی سرمایہ لگا کر ماہرین ارضیات سے جگہ کا سروے کرایا مگر سونے کی خبر نہ ملی۔ البتہ ۱۸۴۸ء میں اپاچی قبیلے کے قتل کردہ افراد کا حاصل کردہ سونا ۱۹۱۴ء میں ضرور ملا۔ پھر کان کی تلاش کے سلسلے میں حوادث اور اموات کا ایک ایسا سلسلہ ہوا کہ عام خیال یہی پیدا ہو گیا کہ سونے کی کان آسیب زدہ ہے اور جو اپاچی قوم کے مقدس پہاڑ کو کھودنے کی توہین کرے گا لعنتی ہو گا۔ اور کان کے پراسرار محافظوں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔[18]

# ایڈم کی سونے کی کان

۱۸۶۴ء میں ایڈم نامی شخص دوستوں کے ہمراہ لاس اینجلس جارہا تھا۔ راستے میں جیلا بینڈ کے مقام پر انڈین لوگوں کا ایک گاؤں پڑتا تھا۔ وہ وہاں کچھ دیر ستانے کے لئے رکے۔ اس گاؤں میں ایڈم کی ملاقات میکسیکو کے ایک ریڈ انڈین باشندے "گاچ ائیر" سے ہوئی جس نے پیش کش کی کہ اگر وہ لوگ چاہیں تو گاچ ائیر انہیں سونے کی ایک کان کا پتہ دے سکتا ہے ایڈم اور اس کے ساتھیوں کے لئے یہ نیکی اور پوچھ پوچھ والی بات تھی۔

یہ لوگ کئی روز تک گھوڑوں کی پشت پر سوار سفر کرتے رہے۔ غالباً ۲۱ ویں روز وہ پہاڑوں کے درمیان ایک ایسی درہ نما وادی میں آ نکلے جس کے داخلے کا راستہ خاصا دشوار تھا۔ وادی کے بیچوں بیچ سبزے کے آثار ہویدا تھے اور بل کھاتی پگڈنڈی نیچے ایک تنگ میدان تک چلی گئی تھی۔ اور یہ چھوٹا میدان سونے کے وسیع ذخیرے سے پر تھا۔ ایڈم کی پارٹی کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے گاچ ائیر کو انعام کی رقم ادا کی اور سونا اکھٹا کرنا شروع ہی کیا تھا کہ اچانک پہاڑوں سے اپاچی ریڈ انڈین قبیلے کے لوگ نکل آئے۔ انہوں نے ایڈم کی پارٹی سے کہہ دیا کہ وہ انہیں کچھ نہیں کہیں گے اور پارٹی کے لوگ جتنا جی چاہے میدان میں کھدائی کر کے سونا لے سکتے ہیں۔ مگر اوپر آبشار کے پاس واقع سونے کی دو عدد کانوں کی طرف آنے اور وہاں سے سونے کے حصول سے مکمل اجتناب کریں۔ ایڈم اور اس کے گروہ نے فوراً اپاچی سربراہ "ناتا" سے وعدہ کر لیا کہ ایسا نہیں ہو گا۔

۳ ہفتے گزر گئے۔ ایڈم کی پارٹی نے ساٹھ ہزار ڈالر کی مالیت کا سونا نکال لیا تھا اور اسے ایک بڑے برتن میں ڈال کر چولہے کے اندر ایک پتھر کے نیچے چھپا دیا۔ صرف ان کے ایک جرمن ساتھی نے اپنا سونا اپنے ساتھ رکھا۔ اگرچہ "ناتا" نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ وہ میدان کے علاوہ ادھر ادھر سے سونا نہیں نکالیں گے۔ لیکن لالچ نے انہیں اندھا کر دیا۔ گو ایڈم انہیں ناراض ہو کر منع کرتا رہا مگر وہ باز نہ آئے اور درے کی دیواریں کھود کر سونا نکالتے رہے۔ ایک مرتبہ جب کھانے پینے کی چیزیں لینے کے لئے یہ لوگ فورٹ ونگیٹ گئے تو انہیں کافی تاخیر ہو گئی۔ ایڈم ایک ساتھی ڈیوڈسن کے ہمراہ بل کھاتی پگڈنڈی سے چوٹی پر پہنچا تو انہیں دوسری طرف ایک روح فرسا منظر دکھائی دیا۔

انہوں نے دیکھا کہ ساتھ میں سے ۵ افراد تین گھوڑوں کے ساتھ مرے پڑے ہیں۔ جب کہ جرمن آدمی اور ان کا ساتواں ساتھی دونوں غائب ہیں۔ ایڈم اور اس کے ساتھی نے پیچھے مڑ کر نیچے وادی میں دیکھا اپاچی ریڈ انڈین ان کے باقی ماندہ ساتھیوں کو ہلاک کر رہے تھے اور ان کے خیمے نذر آتش کر رہے تھے۔ یہ دونوں دہشت زدہ ہو کر دوڑ پڑے ۱۲ روز بعد گشتی سپاہیوں نے دو لڑکھڑاتے آدمیوں کو سہارا دیا۔ یہ ایڈم اور اس کا ساتھی ڈیوڈسن تھے۔ سپاہی انہیں اپنے ہمراہ قریبی قلعے میں لے آئے۔ ڈیوڈسن نے اسی قلعے میں وفات پائی۔ ایڈم سخت جھنجلایا ہوا تھا اس نے دو اپاچی ریڈ انڈین ہلاک کر دیئے اور سزا پا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید کر دیا گیا۔ مگر وہ جیل سے فرار ہو کر لاس اینجلس بھاگ گیا۔ اور ۲۰ برس تک نیو میکسیکو کی طرف جانے سے ہچکچاتا رہا۔ اس نے اپنے آنجہانی ساتھی ڈیوڈسن کی بہن کو سارا قصہ گوش گزار کر دیا۔ اور مدفون برتن کا پتہ بھی دے دیا اس نے ایک بار خود بھی سونے کا برتن ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ ادھر ڈیوڈسن کی بہن نے بھی ایک گروپ تشکیل دے کر سونے کی تلاش میں روانہ کیا مگر وہ لوگ بھی نامراد لوٹے۔

یہ قصہ بھی مشہور ہوا کہ سکاٹ لینڈ کے ایک شخص سینڈی ویلچ کو سونا مل گیا تھا مگر وہ ابھی تھوڑی سی مقدار ہی نکال پایا تھا کہ ریڈ انڈینوں نے آ کر اسے روک دیا لیکن وہ بھی ایک کائیاں نکلا اور انہیں شراب بنا بنا کر سونے کے عوض دیتا رہا اور اس طرح بہت سا سونا نکال لے گیا۔ مگر اب بھی سونے کے وسیع ذخائر وادی، درے اور میدان میں پوشیدہ ہیں۔[۱۹]

# حوالہ جات

## باب ہفتم


۱۔ ماضی کے مزار ص ۳۶

۲۔ گمشدہ شہر اور مایا میٹ تہذیبیں

3۔ Great Mystries J.Great P:116

4۔ ایضاً ص ۱۱۸

5۔ ایضاً ص ۱۱۸

6۔ People's Almanac II P:1275

7۔ ایضاً ص ۱۲۷۶

8۔ ایضاً ص ۱۲۸۲

9۔ World of incredible But True P:208

10۔ People's Almanac II P:1234

11۔ World of Incredible But True P:188

12۔ Mysteries of the world By C.Prick P:148

13۔ World of incredible But True P:204

14۔ Discorering Ancient Mysteries

15۔ سچے ہیبت ناک افسانے۔ قمر شکیل

16۔ Stranger than science

17۔ People's Almanac II P:239

18۔ ایضاً ص ۲۴۰

19۔ ایضاً ص ۲۳۸

باب ہشتم

# پراسرار علوم

# علم نجوم

اس علم سے انسان کی دلچسپی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی اپنی تاریخ۔ تاریخی ریکارڈ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ قبل از تاریخ عہد کے لوں کو جنہیں "نیم انسان" کہا جاتا ہے، اجرام فلکی میں دلچسپی موجود تھی۔

شاید اس علم کی ابتداء میسوپوتامیہ میں ہوئی۔ پانچ ہزار سال ہوئے انہوں نے ستاروں کو نام دیئے اور پروہتوں نے ستاروں کی گردش پر نظر رکھنے کا یضہ سنبھالا۔ ۷۰۰ ق م تک وہ آسمان کو بارہ بروج میں تقسیم کر کے مختلف ناموں اور علاقوں سے شناخت کرنے لگ گئے تھے۔ بابل سے یہ علم مصر اور یونان نچا۔ فرعون سے قبل مصر میں اس کی خاص پذیرائی نہ ہوئی مگر یونان نے خوب قدر کی۔ بابلی نجوم میں تھوڑی سی تبدیلی لائی گئی۔

۲۰۰ ق م کے بعد سے یونانی نجوم پر کئی کتابیں ضبط تحریر میں لائی گئیں مگر اسکندریہ کے ایک شخص بطلیموس (ٹالمی) کی کتاب ٹیٹرابائبوس سب پر سبقت لے گئی اس شخص کے نظریات سترہویں صدی عیسوی تک جوں کے توں علم نجوم کی اساس بنے رہے۔ اس نے اپنی کتاب میں نجوم کے بارے میں اپنے دور تک معلومہ تمام تر معلومات کو یکجا کر کے زائچہ نکالنے کے اصول بھی وضع کئے۔

رومیوں کو نجوم سے دلچسپی یونانیوں سے ملی۔ پہلے رومی شہنشاہ آگسٹس نے تو اپنے پیدائشی برج کی علامت کو سکوں پر ڈھلوا دیا۔

اول اول نجوم کی مخالف عیسائیوں کی جانب سے ہوئی۔ مگر نجوم کے زوال کی ابتدا اس وقت ہوئی جب چوتھی صدی عیسوی میں مذہب عیسائیت روما کا رکاری مذہب ٹھہرا اور وہاں نجوم کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ روما پر وحشی قبائل کے قبضے کے بعد مغرب سے نجوم بالکل ہی مٹ گیا۔ تاہم مشرقی بازنطینی لطنت میں تھوڑا بہت رائج رہا اور وہاں سے عربوں کو منتقل ہو گیا۔ جنہوں نے نجوم میں اضافے کئے۔ بارہویں صدی عیسوی میں یورپ کو دوسری مرتبہ نجوم سے شناسائی اس وقت ہوئی جب عرب نجومیوں کے کام کا لاطینی ترجمہ کیا گیا۔ سولہویں صدی تک نجوم کو دوبارہ معتبر مقام حاصل ہو گیا۔ بادشاہوں کے باروں میں شاہی نجومیوں کی تقرری کی ابتدا ہوئی اور نجوم کو خاصی قبولیت عامہ حاصل ہو گئی۔ مگر سیاسی داؤ پیچ کے دوران بعض نجومیوں نے الٹی سیدھی ٹینگوئیوں سے لوگوں کو یہ باور کرانے کا سلسلہ شروع کر دیا کہ ستارے انہی کے پسندیدہ سیاسی ادارے کے حق میں ہیں۔ مثلاً انگلستان میں پارلیمانی یا بادشاہی ز سیاست کے سلسلے میں دونوں جانب سے نجومیوں کی متضاد پیشینگوئیوں نے لوگوں کا نجوم سے اعتماد اٹھانا شروع کر دیا۔ حالانکہ اس سارے سلسلے کے پیچھے علقہ مکتب فکر سے وابستہ نجومیوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر نجوم کے قواعد سے روگردانی روا رکھی تھی۔ مگر ایسے میں بھی بعض نجومیوں کی پیش گوئیاں حیرت یز طور پر درست ثابت ہوئیں۔ مثلاً انگلستانی نجومی ولیم للی جس نے پارلیمانی طریقہ حکومت کے رائج ہونے کی کامیاب پیشینگوئی کی تھی اور لندن کی عظیم نش زدگی اور طاعون پھوٹنے کی اطلاع دس برس پہلے دے دی تھی۔ آتش زدگی کے واقعہ کے بعد تو اسے باقاعدہ پارلیمانی ممبران کے سامنے اپنے علم کی صفائی ن کرنا پڑی کیونکہ ممبران کا خیال تھا کہ آتش زدگی میں اس شخص کا ہاتھ ضرور ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ یہ اتنے بڑے پیمانے پر تباہی کی اتنی ٹھیک پیشینگوئی ے۔

مگر نجوم کے زوال کا سلسلہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ یہ شعبدے بازوں اور فٹ پاتھیوں کے ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۹۰ء کے بعد کچھ لوگوں نے ہندوستان سے نجوم سیکھ کر مغرب میں پھر سے اس کا احیاء کیا۔

بیسویں صدی کی ابتداء میں ایک برطانوی ایلان لیو کی نجوم پر تحریر کردہ کتب خاصی مشہور ہوئیں۔ کیونکہ عوام کو موقع ملا کہ وہ نجوم سے خود آزمائی کے ذریعے استفادہ کر سکیں۔ اس کی کتابوں سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا ان میں سے ایک اوانجیلین ایڈم تھی۔ اسے نجوم پر خاصا عبور حاصل تھا۔ ایک رو اس نے نیویارک کے ایک ہوٹل کے پروپرائٹر کا زائچہ دیکھ کر کہا کہ کوئی بڑی مصیبت آنے کو ہے۔ اگلے روز ہوٹل آگ لگنے سے تباہ ہوا تو پروپرائٹر نے اخبار میں ایڈم کی پیشینگوئی کا خصوصاً ذکر کیا۔ ایڈم کی شہرت ہو گئی۔ اس نے لوگوں کے زائچے پڑھنے کا پیشہ اختیار کر لیا۔

۱۹۱۴ء میں اس منجم خاتون کو بعض پیشینگوئیوں کے حوالے سے گرفتار کر لیا گیا۔ گو وہ معمولی جرمانہ دے کر آزاد ہو سکتی تھی تاہم اس نے اپنے دفاع کا فیصلہ کر لیا۔ عدالت میں اس نے علم نجوم کی پختگی ثابت کرنے کا دعویٰ کیا اور اپنی آزمائش کے لئے درخواست کی کہ کسی بھی ایسے فرد کو جسے وہ جانتی تک نہ ہو کی تاریخ پیدائش بتائی جائے تو وہ اس پر نجوم آزما کر دکھائے گی۔ چنانچہ جج کے بیٹے کو چنا گیا۔ اب جو ایڈم نے لڑکے کا سارا کچا چھٹا بیان کیا تو جج کو نجوم کی صداقت کا اقرار کرتے ہی بنی اور ایڈم کو باعزت بری کر دیا گیا۔ تب سے اس خاتون کے بے شمار معتقدین اور گاہک پیدا ہوئے جن میں اعلیٰ سرکاری عہدے دار بشمول ڈیوک آف ونڈسر اور دیگر کئی مشہور سرمایہ دار شامل تھے۔ جو باقاعدگی سے ایڈم سے سیاسی اور کاروباری حوالے سے سنجیدگی سے مشورے لیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں وہ ریڈیو پر باقاعدہ نجوم سے متعلق پروگرام پیش کرنے لگی۔ نجوم پر اس کی کتاب ریکارڈ تعداد میں فروخت ہوئی۔ اس نے اپنی موت کی درست پیشینگوئی کی۔ اس کی آخری رسومات میں ملک بھر سے بہت بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے تھے۔

بیسویں صدی کے ایک عظیم نفسیات دان KARL JUNG نے کہا تھا کہ علم نجوم آخر کار ایک سائنس کا درجہ حاصل کر لے گا۔ اسے نجوم پر اس قدر یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنے ہر مریض کا زائچہ بنانے پر اصرار کرتا تھا۔ اس نے نجوم کے اس قدیم دعویٰ کی جانچ پڑتال بھی کی کہ شادی شدہ جوڑوں کی جنم پتری میں سیاروں کی پوزیشن کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

اس نے ۴۸۳ جوڑوں کے زائچوں کے تفصیلی جائزے کے بعد سورج اور چاند کے مابین تعلقات کی اہمیت اجاگر کی مثلاً اس نے بتایا کہ عورت مرد کے زائچوں کو سامنے رکھ کر متعدد بار دیکھا گیا ہے کہ عورت کے زائچے میں چاند اور مرد کے زائچے میں سورج کا قران (کواکب کی ایک خاص پوزیشن کے لئے نجوم کی ایک اصطلاح) دیکھنے میں آیا ہے اور ایسے ہی قران کو نجومی کامیاب گھریلو زندگی کی اساس قرار دیتے آرہے ہیں۔ ژونگ کا طرز تحقیق استعمال کرتے ہوئے کئی افراد نے نجوم پر کام شروع کیا۔ ان میں انگلستان کے فلسفی جان ایڈی کا تذکرہ زیادہ اہم ہے۔ ان صاحب نے ۹۰ سال سے زائد عمر کے ۷۰ افراد کے زائچے بنائے اور پھر ان کا موازنہ کر کے مشترکہ خصوصیات کی تلاش شروع کر دی۔ ایڈی کا بیان تھا کہ اگرچہ یہ سخت دشوار اور نازک کام ہے تاہم ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ہی بار علم نجوم کی اصلیت واضح کر دی جائے کہ اس میں کس قدر کھوٹ ہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ معلوم کیا کہ نجومیوں کے اس قدیم دعوے کی کیا صداقت ہے کہ مخصوص بروج کے زیر اثر پیدا ہونے والے طویل عمر پاتے ہیں۔ ایڈی نے دیکھا کہ نجومیوں کا یہ دعویٰ غلط ہے۔ کیونکہ اس کے زیر مشاہدہ لوگوں میں حوت کے افراد زیادہ تھے جنہیں نسبتاً کم عمر بتایا گیا ہے تاہم ایک بات نے اسے چونکا دیا۔

جوتش کے ماہرین نے حالت ASPECT کی دو اقسام بیان کی ہیں۔ اول APPLYING یعنی جب ایک تیز رفتار سیارہ کسی چھوٹے کم رفتار سیارے کے ساتھ کسی خاص زاویئے کے اندر کی جانب متحرک ہو اور دوسرے SEPARATING یعنی جب تیز رفتار سیارہ اپنے مقام سے دور حرکت کرے۔ ایڈی نے دیکھا ۹۰ سالہ افراد کے زائچوں میں ثانی الذکر حالت زیادہ نمایاں ہے۔ یاد رہے کہ نجوم میں اس SEPARATING کی حالت سے کاہلی اور آرام کے پہلو منسلک ہیں جو بڑھاپے کا خاصہ ہوتے ہیں۔

ایڈی اس امر کو جھٹلانے پر تیار نہ ہوا اور اس نے تجزیئے کو نئے افراد پر دہرانے کا فیصلہ کیا۔ اس مرتبہ اس نے ایسے افراد چننے کا فیصلہ کیا جو بوڑھوں کی نسبت تیز طرار متحرک، مصروف ہوں اور تناؤ کی کیفیت سے دوچار رہتے ہوں۔ اس سلسلے میں پولیو کے شکار مریضوں کا چناؤ بہت فائدہ مند تھا طبی اعتبار سے ایسے لوگ جو پولیو کی وجہ سے معذور ہو گئے ہوں ان میں عام آدمی کی نسبت ان میں حرکت میں رہنے اور ہوشیار رہنے کا جذبہ قوی تر ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے زائچوں

کا تجزیہ کیا گیا تو نتائج حیرت انگیز تھے۔ ان کے ہاں طویل عمر لوگوں کے مقابلے میں APPLYING حالت نمایاں تھی۔ اب ایڈی کو یقین کرنا پڑا کہ علم نجوم کے پیچھے حیرت انگیز حقائق کار فرما ہیں اور یہ محض توہمات پر مبنی نہیں ہے۔ ایڈی کے علاوہ اور دوسرے لوگوں نے بھی اس سلسلے میں کافی کام کیا۔ اس ضمن میں مائیکل گاکلین کا ذکر ضروری ہے۔

مائیکل گاکلین MICHAL GAUQUELIN فرانسیسی سائنس دان اور ماہر شماریات تھا۔ ۱۹۵۰ء میں جب اس نے تحقیق کی ابتداء کی تو اس کی نیت ہی یہ تھی کہ کسی طرح سے نجوم کو غلط ثابت کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اس نے چند مشہور نجومیوں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کو جانچنے اور پڑتال کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاکلین خود بھی اعداد و شمار کا ماہر تھا پھر اس نے جدید آلات کا استعمال بھی کیا چنانچہ اس نے بیشتر اعداد و شمار کو غلط ثابت کر دکھایا۔ جنہیں اس صدی کے شروع میں بعض نجومیوں نے نجوم کی صداقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا تھا۔ لیکن گاکلین ایک شخص LEON LASSON کو رد کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ لیان نے لوگوں کے پیشے اور سیاروں کی پوزیشن کے درمیان تعلق کی وضاحت کی تھی اور حیرت انگیز نتائج حاصل کئے مثلاً اس نے دریافت کیا تھا کہ طب کے شعبے سے تعلق رکھنے والے بیشتر افراد کے زائچہ میں مریخ کا اثر و نفوذ نمایاں ہوتا ہے جبکہ زہرہ آرٹسٹوں کے اور عطارد اہل قلم کے زائچوں میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ گاکلین نے اپنے طور پر لیون کے نظریات کو پرکھنے کا انتظام کیا تاکہ بڑے پیمانے پر سروے کر کے علم نجوم کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونک دی جائے۔ اس نے ۵۷۶ افراد کے زائچے حاصل کئے جو شعبہ طب سے متعلق تھے۔ اسے یہ حیرت انگیز بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے بیشتر کی پیدائش کے موقع پر مریخ یا زحل افق سے اوپر کی جانب متحرک تھے یا آسمان میں اپنے بلند ترین مقام سے گزر رہے تھے۔ گاکلین نے ایک بار پھر اس طریقے کو ۵۰۸ طبیبوں کے لئے استعمال کیا۔ نتائج اب بھی وہی تھے! گاکلین کی یہ تحقیقات پریس کے ذریعے منظر عام پر آئیں تو ایک ہلچل مچ گئی۔ ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونا شروع ہو گئی۔ بلجیم کے سائنس دان MARCELL BOLL نے کہا کہ اگر گاکلین نے یہی طریقہ کار برطانیہ، جرمنی، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور روس میں استعمال کیا ہوتا تو اسے وہاں بھی قومی سطح پر افتاد طبع کی یکسانیت مل سکتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ گاکلین کے جمع کردہ اعداد و شمار محض فرانس تک محدود تھے جو ایک اتفاق بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ معترضین کی تسلی کے لئے گاکلین نے ۲۵ ہزار ڈچ، اطالوی، جرمن اور بلجیم باشندوں کے زائچے حاصل کر کے ان کا تجزیہ کیا تو ایک مرتبہ پھر علم نجوم کے اس نظریئے کی تائید ہوئی کہ افراد کی پیدائش کے وقت سیاروں کی پوزیشن ان کے آئندہ زندگی کے پیشے پر اثر انداز ہوتی ہے۔ نجوم پر ان تحقیقات میں گاکلین نے اپنی زندگی کے ۲۰ برسوں سے زائد عرصہ تک کام کیا۔ دوسرے کئی افراد نے بھی اپنے طور پر سروے کیا اور سب کا اتفاق ہوا کہ بلاشبہ سیاروں کی پوزیشن کا فرد کے پیشے سے کوئی تعلق ہے ضرور۔ ۳۱۴۲ فوجیوں کے زائچوں سے معلوم ہوا کہ ان کے ہاں مریخ اور مشتری خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سائنس دان عام طور پر زحل اور سیارستان مریخ کے زیر اثر جنم لیتے ہیں لیکن صرف اتنے ہی اعداد و شمار پر تکیہ کرنا مناسب نہ ہو گا۔ علم نجوم کے دیگر دعوؤں کی صداقت معلوم کرنے کے لئے اور بھی زیادہ مختلف شماریاتی تجربوں کی ضرورت ہے۔

۱۹۳۷ء میں جرمنی کی فری برگ یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے پروفیسر HANS BENDER نے ماہرین علم نجوم کی خدمات حاصل کیں۔ تجرباتؔ کے دوران اس نے ان افراد کے مختلف ٹیسٹ لئے جن میں کسی شخص کی جنم پتری دے دی جاتی۔ جس کے بارے میں نجومی کچھ نہ جانتا ہو۔ پھر اس زائچہ کی مدد سے نجومی کو متعلقہ شخص کی خصوصیات بتانی ہوتیں جنہیں اصل شخصیت کے اوصاف کے مقابلے میں رکھ کر نجومی کی صداقت کو پرکھا جاتا۔ اس سلسلے میں بینڈر کی نگاہ انتخاب ایک شخص WALTER BOER پر پڑی جس نے تقریباً تمام ٹیسٹوں میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ وہ نجوم کی اصطلاحات کے ذریعے متعلقہ شخصیت کے کردار پر جزئیات تک مفصل طور پر بیان کرتا تھا۔ ایک تجربے کے دوران اسے دو افراد کی جائے پیدائش، تاریخ اور وقت پیدائش بتا کر ان کی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو والٹر نے حیران کن طور پر دونوں میں سے ایک کو درست طور پر ذہنی مریض اور دوسرے کو صحیح الدماغ قرار دیا۔ حالانکہ یہ تفصیلات ایک سیف کے اندر محفوظ تھیں اور والٹر کی پہنچ سے باہر تھیں۔ یہی تجربہ بار بار نئے افراد پر مشتمل گروپوں کے لئے دہرایا گیا اور والٹر نے ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔

۱۹۶۰ء میں امریکی ماہر نفسیات VERNON CLARK نے بھی اسی قسم کے ٹسٹ لئے۔ اس نے دس افراد (۵ مرد - ۵ خواتین) کے زائچے لئے جن کے پیشے مختلف النوع تھے۔ مثلاً ایک صاحب اکاؤنٹینٹ تھے، ایک موسیقار، ایک سلوتری، ایک نقاد، ایک سانپوں کے ماہر اور ایک کسبی وغیرہ۔ ان افراد کے زائچوں کو الگ سے اور ان کے پیشوں کی ایک فہرست علیحدہ سے بنا کر ۲۰ نجوم کے ماہرین کو دی گئیں کہ بتلائیے کون سا زائچہ کس پیشے والے یا والی کا

ہے۔ اس قسم کی دو دو فہرستیں نفسیات دانوں اور سماجی کارکنوں کے ایک گروپ کو بھی دی گئیں نتائج حیرت انگیز تھے۔ نجوم کے ماہرین کے جوابات باقی گروپوں کی نسبت بہت بہتر تھے۔ اس قسم کے اور بھی تجربات دہرائے گئے اور شاندار نتائج حاصل ہوئے۔ کلارک کے حاصل کردہ نتائج کو ماہرین شماریات نے باقاعدہ جانچ پڑتال کے بعد بالکل درست قرار دیا۔ کلارک نے ان تجربات کا یہ نتیجہ نکالا کہ علم نجوم کو فضول، بے مقصد، توہمات اور جھوٹ پر مبنی کہنے والے متعصب ناواقف لوگ ہیں۔ اگر وہ خود سے ایسے تجربات کرائیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ بھی علوم نجوم کی صداقت کے قائل ہو جائیں۔

یوں اگر ہم کہہ دیں کہ نجوم کا علم بہرحال خرافات پر مبنی نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر سیاروں اور ستاروں کے اثرات کیونکر انسانی زندگی پر پڑتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس بات کا جواب مختلف طرح سے دیا گیا ہے۔ تاہم کارل ژونگ کی توجیہات کو سب سے زیادہ شہرت ملی۔ ژونگ سے منسوب بہ تشریح اس سے صدیوں پہلے بھی بہت سے لوگوں نے مختلف انداز میں کی مگر ژونگ نے اسے باضابطہ طریقے پر بیان کیا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک اصطلاح اختراع کی۔ SYNCHRONICITY یا ہم زمانی انطباق یا اسے "معنی خیز اتفاق" بھی کہہ سکتے ہیں۔ ژونگ اسے سبب اور CAUSE AND EFFECT کا الٹ قرار دیتا تھا۔ دو واقعات جو ایک ساتھ وقوع پذیر ہوئے ہوں ضروری نہیں ہے کہ ایک واقعہ دوسرے واقعے کا سبب ٹھہرے لیکن ان دونوں واقعات کے مابین ایک معنی خیز رشتہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ فرض کیا ایک شخص روزانہ شام کو ایک خاص وقت پر ہی کھانا کھاتا ہے۔ ہر رات جب وہ کھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو اس وقت گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجا رہی ہوتی ہیں۔ اب اگر یہ کہیں کہ بھوک کی وجہ سے آٹھ بجتے ہیں یا آٹھ کا ہندسہ ظاہر ہونے پر بھوک لگنے لگتی ہے تو یہ احمقانہ بات ہوگی۔ تاہم ان دونوں کے درمیان ایک ہم زمانی انطباق ضرور ہے وہ یہ کہ دونوں عمل ایک ہی مظہر کے عکاس ہیں یعنی زمین کی گردش کا ۲۴ گھنٹے کا دورانیہ۔

بالکل اسی طرح ہم سیاروں کی پوزیشن کو گھڑی کی سوئیوں کی پوزیشن سمجھ سکتے ہیں جبکہ اس حالت میں کسی شخص کی پیدائش کو بھوک کا احساس کہہ لیتے ہیں۔ دونوں ہم وقتی ہیں لیکن کوئی ایک دوسرے کا سبب نہیں ہے۔ یعنی سورج چاند ستارے بذات خود اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ یہ واقعات کے ساتھ محض منطبق ہوتے ہیں۔ مثلاً ستاروں کی خاص پوزیشن کے دوران پیدا ہونے والا شخص کم عمری میں وفات پا جائے گا۔ اسے یوں بیان کیا جائے گا کہ ستاروں کی پوزیشن اپنی جگہ اور کسی کم عمری میں مرجانے والے کی پیدائش اپنی جگہ دو ہم وقتی وقوع پذیر ہونے والے مظاہر ہیں لیکن یہ دونوں بذات خود کسی بہت وسیع کائناتی نظام کا حصہ ہیں جسے فی الحال ہم نہیں جانتے۔

مائیکل گاکلین نے بھی ایک توجیہہ پیش کی ہے۔ اس نے ۵ برس کے دوران ۳ ہزار بچوں اور ان کے والدین کے زائچوں کے مطالعے کے بعد کہا ہے کہ بچے اس سیاروی پوزیشن کے دوران جنم لینے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے والدین کی پیدائش کے وقت تھی۔ گویا بچے والدین سے وراثت میں زائچے بھی قبول کرتے ہیں! دیگر وراثتی خصوصیات کے حامل جینز کے علاوہ کوئی ایسا نامعلوم جینز ضرور ہے جو فلکی اثرات سے متاثر ہوتا ہے اور یہی جین فرد کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے۔ ("متعلقہ مضمون: دیکھئے اسرار فطرت میں "کیا اجرام فلکی انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں")۔

# علم کیمیا / کیمیا گری

کیمیا یا الکیمیا بنیادی طور پر اس علم کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے کسی دھات سے سونا بنایا جائے۔ تاریخ انسانی میں بے شمار کاوشوں میں سونا بنانے والے جنونیوں کی انتھک لیکن بے نتیجہ کوششیں سرفہرست ہیں۔ ان کا سراغ ہمیں تاریخ میں ۵۰۰۰ ق م کے قدیم مصری پروہتوں اور کیمیا دانوں سے ملتا ہے۔ یہ لوگ دھات کاری اور دھاتوں سے متعلق ابتدائی علم حاصل کر چکے تھے اور چیزوں کے ملاپ سے بہتر مواد کی تیاری سے واقفیت رکھتے تھے۔ فراعنہ کا لالچ نت نئے تجربات کرانے میں مدد و معاون ثابت ہوتا رہا۔ مصری یہ جانتے تھے کہ عام سی چیز "ریت" بھی کتنی کار آمد ہوتی ہے جب اسے نباتاتی راکھ میں ملایا جائے اور اس کے نتیجے میں سخت چمکدار اور قیمتی چیز "شیشہ" پیدا ہوتا ہے یہ غالباً کسی پراسرار کیمیاوی قوت کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتا ہو گا تو کیا یہ قوت عام دھاتوں کو سونا بنانے پر قادر ہوگی؟ ان تصورات کے حامل مصری سونا بنانے کی دوڑ میں شریک ہو گئے۔

ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ق م) نے عناصر اربعہ (خاک، آگ، آب، ہوا) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے تمام اشیاء کو انہی سے مرکب قرار دیا اور کہا کہ ان اروں کی مقادیر میں مختلف تناسب رکھنے سے مختلف مادے کی شکل حاصل کی جا سکتی ہے اور یہ بھی کہا کہ جو شخص بنیادی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر لے گا تو ہ ایک اور فائدہ اور راز حاصل کر لے گا یعنی ـــــ حیات ابدی کا راز۔

ارسطو کے تصورات مسلمانوں تک کیونکر پہنچے؟ دراصل مصر کے مسلم فاتحین کو اسکندریہ کے عظیم کتب خانے سے یونانی سائنس تک رسائی حاصل وئی۔ یوں ساتویں صدی عیسوی میں عرب مسلمانوں میں کیمیاگری کا خبط باقاعدہ پیدا ہوا اور اس حد تک سرایت کر گیا کہ اس علم کے ڈانڈے تخلیق آدم کے قت سے ملائے جانے لگے جیسا کہ امام احمد بونیؒ اپنی کتاب "شمس المعارف" میں تحریر کرتے ہیں کہ آدمؑ کو زمین پر بھیجتے وقت خدا نے بذریعہ وحی انہیں عادن سے جواہرات اور سونا چاندی اور سمندر سے موتگے اور موتی حاصل کرنے کے طریقے بتائے اور ساتھ ہی ان کی قدر و قیمت، خاصیت اور مصرف بتاتے وئے فن کیمیاگری سے بھی آگاہ کیا۔ آدمؑ نے اپنے فرزند شیثؑ کو یہ فن سکھلایا اور غربت کی شکایت کرنے پر بذریعہ وحی موسیٰؑ کو کیمیا کی تربیت دی گئی۔ نلاس دور ہوا تو وہ شاکر ہوئے۔ لیکن قارون جس نے یہ فن موسیٰؑ سے سیکھا تھا اور ناقابل یقین دولت اکٹھی کی تھی زکوٰۃ ادا کرنے سے انکاری ہوا اور کہا سے میں نے اپنے علم سے حاصل کیا ہے۔ قال انما اوتیتہ علی علم عندی (سورہ قصص ۷۸) اور یہی قارون عذاب کا شکار ہو کر اپنی دولت کے ساتھ ہی زمین بس دھنستا چلا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کیمیاگری کے لئے اجزاء حضرت موسیٰؑ نے الگ الگ تین آدمیوں بشمول ہامان سے منگوائے تھے۔ لیکن ہامان نے چالاکی سے باقی دونوں آدمیوں سے بھی منگوائے گئے اجزا پوچھ کر کیمیاگری سیکھ لی۔

مشہور ہے کہ خالد بن یزید بن معاویہ اولین شخص تھا جس نے کیمیاگری کی۔ باپ کے مرنے کے بعد وہ مصر چلا گیا اور کیمیائی تجربات میں مصروف ہو گیا اور غیر زبانوں سے طب و کیمیا کی کتب کا عربی ترجمہ کرایا اور کتب بھی تحریر کیں جو ناپید ہیں۔ لیکن ابن خلدون نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے ان کے مطابق خالد جیسے بدوی عرب کو علوم و صنائع سے کیا تعلق ہاں یہ ممکن ہے کوئی اور اس کا ہم نام ہو جس سے کیمیا کے کچھ نسخے منسوب ہیں اور لوگوں نے غلطی سے اسے خالد بن یزید خیال کر لیا ہو۔ ابن خلدون کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی کا جابر بن حیان ایک ماہر کیمیا دان تھا اور اس کی تحقیق کے سبب کیمیاگری کو علم جابر کہا جانے لگا۔ س نے خفیہ زبان میں اس علم پر ۷۰ رسالے تحریر کئے۔

بعض کے ہاں اس کی تاریخ کچھ اور طرح سے بنتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فن ظہور عیسیٰؑ سے کچھ پہلے ایک ہی عہد میں چین اور سکندریہ میں رائج ہوا۔ بن خلدون کے مطابق مسلم کیمیاگروں نے اس علم کے لئے روح، بیضہ اور ارض مقدس جیسی اصطلاحات اس لئے استعمال کیں کہ شرعی سزاؤں سے بچ سکیں یونکہ جیسا کہ جابر نے بھی کہا کہ یہ ایک قسم کا جادو ہے اور جادو شریعت کی رو سے حرام ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والا شریعت کے تازیانے سے بچ نہیں سکتا، یکن رموز و اشارات کے استعمال کے ساتھ ساتھ کہا جانے لگا کہ یہ ایک الہامی علم ہے۔ یوں اسلامی طرز فکر میں اس کا پیوند ممکن ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو سیارہ ڈائجسٹ فروری، مارچ ۱۹۸۱ء)۔

بعض مسلمانوں کے نزدیک دیگر سری علوم کے ساتھ ساتھ کیمیاگری کے اولین ماہر حضرت ادریسؑ تھے۔ دوسرے نمبر پر تنکلوشاہ البابلی اور تیسرا مصر کا باس تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلامی دور کے ماخذوں میں پہلا کیمیاگر ابوالحکماء کے نام سے موسوم ہے۔

ہسپانیہ پر قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کے ذریعے یہ علم یورپی اقوام کے ہاتھ لگا۔ ۱۱۴۴ء میں رابرٹ چیسٹر نے ارسطو کے نظریات کا لاطینی میں پہلا ترجمہ کیا تو کیمیاگری کو شہرت ملنے لگی۔ یورپی سائنس کے بانی راجر بیکن (تیرہویں صدی) کو مرتے وقت بڑا افسوس تھا کہ دھاتوں کو سونا بنانے کے نظریئے کی اس کی زندگی میں تصدیق نہ ہو سکی۔ جس کا وہ بڑا حامی رہا تھا۔

جنوبی امریکہ میں انکا قوم سے بے تحاشہ سونا لوٹنے کے بعد بھی الزبیتھ اول کی طبیعت نہ بھری تو اس نے سمرسٹ ہاؤس لندن میں باقاعدہ ایک لیبارٹری تعمیر کرائی جہاں دن رات ایک کیمیا دان آب حیات اور عام دھاتوں سے سونے کے حصول کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا۔ تاکہ الزبیتھ اول کی تاابد زندہ رہ کر اور سونے کی کثیر مقدار کے ذریعے دائمی حکومت کا خواب پورا ہو۔ مگر ۷۰ برس کی عمر میں جب ملکہ کا انتقال ہوا تو بے چارے ناکام کیمیا دان کو ٹاور آف لندن میں بقیہ عمر کے لئے قید کی سزا دی گئی۔

آسٹریا کے سترہویں صدی عیسوی کے شاہ فرڈی نینڈ سوم کو جرمن، ڈچ اور سویڈش آرمی کے خلاف فتح کی قوی امید تھی کیونکہ ایک کیمیا دان کو عملی طور پر

اس نے سیسے اور گندھک کے آمیزے کو بھٹی میں گرم کر کے سونا بناتے دیکھا تھا لیکن یہ سب ٹھگی تھی اور دیوالیہ نکلنے پر اس نے مجبوراً صلح کی۔ وہ کیمیا گر بادشاہ کو ہاتھ دکھا گیا تھا۔

کیمیا گروں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کوئی ایسا اکسیری مادہ پالیں جو عام دھاتوں کو سونے میں بدل ڈالے اس کے لئے انہوں نے دنیا کی شاید ہی کوئی چیز چھوڑی ہو حتیٰ کہ ہڈیاں، پر، انڈے اور مینگنیاں تک استعمال کیں۔

ایک بڑا مشہور نظریہ یہ تھا کہ گندھک اور پارہ آپس میں مل کر زیر زمین بُلغ کھا کر سونا بن جاتے ہیں۔ دوسری تمام دھاتیں بھی گندھک اور پارے سے ہی مرکب ہیں لیکن مختلف تناسب کے ساتھ۔ استاد اسمٰعیل کوفی نے اپنے کتاب میں تحریر کیا ہے کہ دوران سفر وہ ضرورت پڑنے پر اس طرح سونا بناتے۔ ۳ حصے سیماب. ایک حصہ سونے کا برادہ ملا کر کھرل کر کے ملغمے بنالو۔ ہنڈیا لے کر اس میں مٹی کا مینار بناؤ جو اوپر سے روپے کے برابر مدور اور گہرا ہو۔ اس پر یہ ملغوبہ رکھ لیا جائے اور ہنڈیا میں چند چھٹانک گندھک آنولہ سار بھر کر مٹی کا پیالہ الٹا کر ہنڈیا پر ڈھک دیا جائے اور اس کے چاروں طرف مٹی لگا دی جائے پھر اس ہنڈیا کے نیچے چند پہر مسلسل آگ دی جائے تاکہ گندھک کی تصعید ہو اور پیالے کی نچلی طرف سے لگ کر ملغمہ پر ٹپکے حتیٰ کہ ملغوبہ سرخ کشتہ ہو جائے اور قائم النار (یعنی شدید آگ پر بھی فرار نہ ہو) ہو جائے۔ اب یہ کشتہ سونا سرخ ملغمہ بیس حصے چاندی پر طرح کرنے سے اس کو سونا بنا دے گا۔

کشتہ بنانے کا فن ہندوستان کے سنیاسیوں کا ویدک فن ہے ان کے مطابق بعض نہایت قیمتی اور کم یاب جڑی بوٹیوں کے عرق کو اگر گداختہ تانبے پر ڈالیں تو اسے سونا کر دیتی ہیں۔ ایسے ہی قدیم سادھوؤں میں گرو گورکھ ناتھ اور شام گوہر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک سادھو گرو گیان ناتھ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ مسلمان ہو کر شیخ سعادت مند کہلائے۔ آپ نے اپنے استاد گرو گورکھ ناتھ کے نسخے بہت مشکل اشعار کی صورت میں پیش کئے جن میں بیان کردہ بوٹیاں بڑی نادر و نایاب ہیں۔

مغرب میں سونا بنانے کی ناکام کوششیں جاری تھیں کہ ایک برطانوی طبیب نے انہیں ترک کرنے کا حکم دیا اور بے شمار کتب نذر آتش کر دی گئیں۔ یہ طبیب اور کیمیا دان جو ۱۵۴۱ء میں وفات پا گیا اس خیال کا حامی تھا کہ اب تمام کوششیں ادویات کی بہتر سے بہتر اقسام بنانے میں کی جانی چاہئیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تصورات اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئے بلکہ اگلی صدیوں تک جاری رہے جس کی ایک بڑی مثال اسحٰق نیوٹن ہے۔ جس نے خزاں اور بہار کے دو مہینے صرف کیمیا گری کے تجربات کے لئے مختص کر رکھے تھے اور اس دوران وہ کوئی اور تجربہ شاذ ہی کرتا۔ وہ بائیس بائیس گھنٹے جاگ کر بھٹی کے سامنے گزار دیتا تھا اور جب نیند سے سخت مجبور ہو جاتا تو معاون کو بٹھا کر وہیں کونے میں لیٹ کر دو یا تین گھنٹے آرام کر لیتا۔ وہ یورپ کے سفر سے آنے جانے والے ہر دوست سے کسی نئے کیمیا گری کے نسخے کی بابت ضرور دریافت کرتا اور بھجوانے کی درخواست کرتا۔

۱۹۱۹ء میں برطانوی طبیعات دان ردرفورڈ نے تجربات کے ذریعے عناصر کی تبدیلی کے ثبوت فراہم کر دیئے لیکن یہ کوئی پراسرار سا تجربہ نہ تھا اس نے محض ہیلیم ذرات کے مرکزوں کی شعاعوں کی نائٹروجن پر بمباری کر کے پہلے اسے آکسیجن اور پھر ہائیڈروجن میں تبدیل کر دیا تھا۔ یہ سب کچھ ایٹم یعنی عناصر کی بنیادی اکائی کے مطالعے اور تجربات کے بعد ممکن ہوا تھا اور یہ باقاعدہ اصولوں اور قوانین کے مطابق وقوع پذیر ہوا تھا۔ بعدازاں اس طریقے سے بنیادی دھاتوں کے سونے میں تبدیل کر دینے کے بارے میں سائنس دانوں نے بتایا کہ گو یہ ممکن ہے لیکن اس کے نتیجے میں بننے والے سونے کی قیمت اصل سونے کی نسبت بہت زیادہ ہو گی۔

ردرفورڈ کی تحقیق کے ۵ برس بعد میونخ کے ایک ۳۶ سالہ کیمیا دان فرانز طاؤسند FRANZ TAUSEND نے اعلان کیا کہ اس نے بھی ردرفورڈ کی طرح تجرباتی طور پر عناصر کی تبدیلی کی کامیاب کوشش کی ہے۔ فرق یہ ہے کہ لوہے کے آکسائیڈ اور کوارٹز کو سونے میں تبدیل کر لیا ہے اور تجرباتی تکنیک بھی مختلف رکھی ہے۔ اس نے ایک پمفلٹ شائع کرایا اور بتایا کہ ایٹمی مرکزے، تھرتھراتی ہوئی ہم آہنگ قوتوں سے آپس میں ملے ہوتے ہیں اور ان کی تھرتھراہٹ کا طول موج تبدیل کر دینے سے مختلف عناصر پیدا ہوتے ہیں۔

جرمن سائنس دانوں نے اس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا بلکہ بڑی ناک بھوں چڑھائی لیکن نازیوں کو اس کی سن گن لگ گئی اور ۱۹۲۴ء میں ہٹلر کے ساتھی لیوڈنڈارف نے طاؤسند سے رابطہ قائم کیا اور مختلف اداروں کے ذریعے اسے اتنا سہارا دینے کی کوشش کی کہ وہ اپنے تجربے کا مظاہرہ کر کے اس امر کا ثبوت دے دے۔ برلن کے ایک ہوٹل میں ایک آدمی کو تجربے کی تصدیق کے لئے تیار کر دیا گیا۔ جو وقت مقررہ پر خود طاؤسند کی فرمائش کے مطابق لوہے لے

آیا۔ دھاتوں کو پگھلا کر ایک غیر جانبدار آدمی کے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ تاکہ کیمیا دان کی پہنچ سے باہر ہونے کے سبب کسی قسم کی جعل سازی کا شائبہ نہ ہے۔ اگلی صبح طازند نے سب کی بغور دیکھتی ہوئی نگاہوں کے سامنے نحوس مواد کو دوبارہ گرم کر کے سفید سے پاؤڈر کی تھوڑی سی مقدار پگھلے ہوئے مواد میں ال دی ٹھنڈا ہونے پر جب متعلقہ برتن توڑا گیا تو ان کے سامنے چوتھائی اونس وزن کے مساوی ایک سونے کا ڈلا پڑا تھا۔ اسی رات طازند اور نازیوں کے مابین شترکہ اکاؤنٹ کھولا گیا لیکن طازند کو زیادہ فائدہ نہ ہوا پھر دو سال بعد جب لیوڈنڈارٹ نے باہمی اشتراک سے استعفیٰ دیا تو وہ پارٹی کے بینک اکاؤنٹ میں پانچ لاکھ مارک جمع کرا چکا تھا اور طازند کو ساہو کاروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ بیچارے کیمیا دان کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا تاہم دو سال بعد ۱۶ جون ۱۹۲۸ء کو اس نے ۲۶ اونس کا ایک سونے کا ڈلا حاصل کر کے اپنے آپ کو قلاش ہونے سے بچالیا۔ اودھم مچاتے ہوئے لوگوں پر اس کا اعتماد بحال ہونے لگا اور باہمی اشتراک کا عمل پھر سے شروع ہوا ہی تھا کہ ۱۹۳۱ء میں اسے جعل سازی کے الزام کے تحت ۴ سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن نازیوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

ایک اور واقعہ لندن کے ایک شخص آرچی بالڈ کوکرن کا ہے جو طب کے شعبے سے منسلک تھا۔ جنگ کے ایام میں وہ جوڑوں میں درد اور جلن کے تدارک کے لئے ایسی ادویات بناتا تھا۔ جن کا ایک جزو سونا تھا۔ اس نے گھر کی چھوٹی سی تجربہ گاہ میں کوشش شروع کر دی کہ اس مہنگے جزو کا متبادل کوئی سستا جزو تلاش کیا جائے۔ اس نے اینٹی منی، لوہے اور تانبے پر تجربات شروع کیے۔ نامعلوم وہ کیسا پاؤڈر استعمال کرتا کہ کیمیائی تعامل سے چکا چوند ہونے لگتی۔ ۱۹۴۰ء میں اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ وہ ایک ایسی دھات پر تجربے کرنے لگا ہے جس کے بارے میں اسے پہلے کچھ علم نہ تھا۔ اس دھات کے نمکیات اور اس پر دیگر تجربات کے نتیجے میں شاید وہی چیز حاصل ہو گئی ہے جسے فلسفی آب بہشت یا پارس قرار دیتے ہیں۔ پھر اس نے تحریر کیا کہ پہلے پہل سخت تیز قسم کی پھنکارنے کی سی آوازیں آئیں ابجزات ریٹارٹ سے مشین گن کی گولیوں کی طرح نکل رہے تھے پھر ایک زور دار دھماکہ ہوا اور کمرے میں ایک لطیف سی خوشبو پھیل گئی۔

اس رات وہ دوبارہ تجربہ دہرانے اور کاغذات جنگ کے دفتر میں جمع کرانے کے لئے گھر لوٹا تو نازی بمبار طیاروں کے بدترین فضائی حملوں میں ایک کا آغاز ہو چکا تھا۔ جس وقت خطرہ ٹلنے کا سائرن بجنے لگا تو اس وقت تک کاکرن کا گھر زمین بوس ہو چکا تھا۔ اس کی تحقیقات جل کر راکھ ہو چکی تھیں اور وہ قریب ہی مرا پڑا تھا۔

۱۹۶۲ء میں لوئس کروران LOUIS KERVRAN نے اپنی کتاب بائیولوجیکل ٹرانس میوٹیشن میں کچھ ایسے تجربات پیش کئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ جاندار حیاتی کیمیائی عوامل کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک عنصر سے دوسرا عنصر بنا سکتے ہیں۔ اور بناتے ہیں۔ لوئس کروران نے دیکھا تھا کہ اس کے گھر میں مرغیوں کے باڑے میں ابرق پھیلا ہوا تھا جو مرغیوں کا چوگا بن جایا کرتا۔ باوجود اس حقیقت کے کہ مرغیوں کی خوراک میں کیلشیم بے حد کم تھی لیکن روز انڈے صحیح سالم حاصل ہوتے جن کا خول کیلشیم کا ہوتا ہے۔ یہ روزانہ اتنا کیلشیم کہاں سے آتا ہے۔ شاید مرغیوں کی ہڈیوں سے۔ لیکن نہیں۔ کروران کے حساب سے اس صورت میں چھ ماہ میں مرغیاں صرف گوشت کا ڈھیر رہ جائیں گی اور ساری ہڈیاں انڈوں کے چھلکے بنانے میں کام آ جائیں گی۔

اب کروران نے ایک تجربہ کیا پہلے باجرے میں کیلشیم کی مقدار معلوم کی پھر صرف باجرا مرغیوں کو کھلانا شروع کیا تو اسے معلوم ہوا کہ باجرہ میں چونے کی مقدار سے زیادہ چونا تو صرف بیٹوں میں خارج ہوتا ہے۔ جب مرغیوں کو پوٹاشیم کا مرکب دیا جانے لگا تو انڈوں میں کیلشیم کی مقدار اور بڑھ گئی تب کروران نے کہا کہ مرغیوں اپنے اندر پوٹاشیم کے عنصر کو کیلشیم کے عنصر میں تبدیل کر لیا۔

ولیم پراؤٹ کے مطابق تازہ پیدا ہونے والے چوزے میں انڈے کی نسبت کیلشیم چار گنا زیادہ ہوتا ہے۔ نومولود چوزے میں انڈے کی نسبت اضافی کیلشیم کہاں سے آیا؟ شائید حیاتیاتی توانائی کے ذریعے۔

یوں زندہ اجسام کسی پراسرار قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے عناصر کی تغیر و تبدل کو جاری رکھتے ہیں۔ کیا معلوم یہ پراسرار حیاتیاتی قوت ایک حقیقت ہو اور کل کلاں کوئی سائنس دان اس کے طریق عمل کو سمجھ کر عام دھاتوں کو سونا بنانے کا خواب حقیقی کر دکھائے۔

# علم باطن - علم تصوف - علم لدنی

خرد دشمن صوفیوں کا خیال ہے کہ انسان کے پانچ ظاہری حواس محض مادی ذرائع کی شناخت کے لئے عقل کے مددگار ہیں مگر روح اصل کا سراغ کبھی نہیں کر سکتے بلکہ نفس انسانی میں عقل کے بالمقابل ایک اور عنصر جو زیادہ اہم ہے وجدان یا باطنی قوت ہے۔ علم لدنی ایک ایسا ہی پراسرار علم ہے جو صرف باطنی حاسے کے حامل شخص کو حاصل ہو سکتا ہے۔ اہل تصوف کا دعویٰ ہے کہ جو شخص علم لدنی کا حامل ہو وہ اپنے منظور نظر شخص کو سینے سے بھینچ کر یا بیٹھے بیٹھے پراسرار علم منتقل کر دیتا ہے۔

معترفین سب سے پہلے اس علم کے نام پر اعتراض وارد کرتے ہیں۔ لفظ لدنی کے معانی ہوتے ہیں "میرا عطا کردہ" پس اہل باطن جب کسی صاحب علم لدنی سے درخواست کرتے ہیں کہ "مجھے علم لدنی عطا کر دیجئے" تو گویا وہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ مجھے میرا عطا کردہ علم دے دیں۔ یہ عجیب مضحکہ خیز بات ہے کہ طالب علم استاد سے کہے کہ وہ علم جو طالب نے استاد کو عطا کیا تھا واپس لوٹا دے۔ گویا جب کوئی مرید یہ کہے کہ مرشد کے پاس علم لدنی ہے تو وہ نادانستہ طور پر اس بے ادبی کا مرتکب ہو رہا ہوتا ہے کہ اس کے مرشد کے پاس اس مرید کا دیا ہوا علم ہے۔[1] رہا یہ سوال ـــــــ کہ کیا یہ علم کوئی شخص کسی دوسرے کو منتقل کر سکتا ہے؟ اہل تصوف تو کہتے ہیں کہ باطنیت کے مزے لوٹتے ہوئے وہ خدا سے وصال کرتے ہیں جس کی بابت کچھ بتانا گویا حجلہ عروسی کی واردات کو بیان کرنے کے شرمناک کام کے مترادف ہے پھر وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ جو کچھ ان پر گزری وہ ان احساسات کو بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں پاتے اس بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ولیم جیمز نے کہا "سو اگر اسی کیفیت کو بیان نہیں کیا جا سکتا تو دوسرے کو منتقل بھی نہیں کیا جا سکتا لہٰذا باطنی تجربہ اگر کوئی صداقت رکھتا ہو تو یہ صداقت صرف صاحب تجربہ کے کام آ سکتی ہے یہ خالص جذباتی احساس کا نام ہے اور جذبات یکسر ذاتی اور گونگے ہوتے ہیں تاوقتیکہ وہ دوسرا شخص خود ہی محسوس نہ کرے"۔

علم باطن کی ماہیت کیا ہے؟ معلوم ہوا ہے کہ اس علم کی مختلف شاخیں ہیں جن کی اصل ایک ہے۔ یہ علم "روح اصل" سے بندوں کو منتقل ہوا اور سینہ بہ سینہ چلتا رہا اس علم کا مجموعی تاثر کچھ اس طرح ہے کہ "اگر ان تمام علوم کو جن کا مجموعی نام علم باطن ہے ایک کرہ سے مثال دی جائے تو اس کا قطب شمالی اعلیٰ درجے کی فلسفیانہ موشگافی ہے اور اس کا قطب جنوبی ذلیل ترین توہم پرستی" (اقبال تاریخ تصوف باب اول) اس علم کی پراسراریت میں اضافہ کرنے کے لئے اہل تصوف کے ہاں علوم کو دو شاخوں میں تقسیم کیا گیا ایک علوم ظاہر دوسرے باطنی علوم۔ اب ظاہری علوم کا اظہار معیوب نہیں لیکن باطنی علوم چونکہ مکاشفات سے متعلق ہیں لہٰذا مکاشفات کو ضبط تحریر میں لانا ممنوع ہے۔ وحی اور علم لدنی میں کہیں اہل تصوف تفریق کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وحی نبی سے مخصوص ہے اور علم لدنی نبیوں کو عطا نہیں ہوا اور کہیں دونوں کا منبع ایک ہی قرار دیا جاتا ہے۔

علم باطن وجدان پر مبنی ہوتا ہے۔ لفظ وجدان کے معانی ہوتے ہیں "پالینا" صوفیوں کا دعویٰ ہے کہ علم کی طرح نفس انسانی کے بھی دو حصے ہوتے ہیں پہلا حصہ عقل ہے جو پانچ حواس کی مدد سے مادی دنیا کے مسائل حل کرتی ہے دوسرا حصہ نفس "وجدان" ہے جو ایک پراسرار اندرونی قوت ہے اور عقل پر برتری رکھتی ہے۔ اہل خرد اور اہل کشف و باطن میں یہ عقیدہ قدیم عرصہ سے باعث نزاع بنا ہوا ہے کہ عقل اور وجدان میں کون برتر ہے ایک جانب اگر اہل خرد اس امر کا اقرار کرنے پر تیار ہوتے ہیں کہ بلاشبہ اس امر کے امکانات ہیں کہ عقل مادی ذرائع کے استعمال تک محدود ہونے کے سبب ماورائے مادیت کی لم تک پہنچنے سے محروم رہے لیکن اس بات کا ثبوت کیا ہے کہ وجدانی قوت گمراہ کن نہ ہو۔ "کشف یا وجدان کو کسی طرح بھی معیار صداقت قرار نہیں دیا جا سکتا۔ صاحب کشف اپنے تجربہ کی صداقت پر کیسا ہی یقین کیوں نہ ہو۔ لازم نہیں آ جاتا کہ اس کا تجربہ فی الواقعہ صداقت ہے...... وجدان علم ایک انفرادی تجربہ ہے جو اپنی دلیل آپ ہوتا ہے اس لئے یہ کسی دوسرے شخص کے لئے دلیل و حجت کیسے بن سکتا ہے؟" (پرنسپل کیرڈ)

مفکر برگساں کا کہنا تھا کہ وجدان غلطی نہیں کرتا عقل سے غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ اہل خرد کا جواب ہے کہ ٹھیک ہے عقل سے غلطی ہو سکتی ہے مگر غلط اور صحیح کا معیار تو پھر بھی عقل ہی ہے صاحب وجدان اس کسوٹی کے حامل نہیں ہوتے۔ وجدانی کیفیت تو صرف اس وقت قابل بھروسہ ہوتی ہے کہ اگر ہر صاحب وجدان کا کشف ایک ہی قسم کے نتائج دیتا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وجدانی وارداتوں کے نتائج متضاد نوعیت کے نکلتے ہیں اور کوئی پیمانہ نہیں ہو سکتا جس کے ذرائع

ان تضادات میں سے غلط اور صحیح کی نشاندہی ممکن ہو۔ جیسے ابن عربی کا وجدان اسے کہتا ہے کہ وحدت الوجود ہی اصل حقیقت ہے اور مجدد الف ثانی کا وجدان انہیں وحدت الوجود کا بطلان کرنے پر مجبور کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حقیقت تو وحدت الشہود ہے۔ جبکہ شاہ ولی اللہ کے وجدان کا فیصلہ یہ ہے کہ دونوں ہی باتیں درست ہیں۔

فلسفی جوڈ نے کہا تھا "اکثر صوفی جن سے میری ملاقات ہوئی احمق تھے۔ چونکہ تصوف عقل کو معیار تسلیم نہیں کرتا نہ اس کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اس لئے وہ ہر عطائی اور کم سواد شخص کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے یہ لوگ اپنی کم عقلی کی تلافی یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ ہمیں ذاتی کشف کی صورت میں دوسروں پر برتری حاصل ہے"۔

اس مقام پر باطنیت کے دو مسائل سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ وجدان اپنے اظہار کے لئے بھی عقل کی احتیاج رکھتا ہے اور دوسرے یہ کہ وجدانی تصورات میں اختلافات نے وجدان کو بہت رسوا کیا ہے۔ لیکن کیا اختلافی امور کی بنیاد پر علم باطن کو ترک کر دینا اور اسے خوش فہمی پر محمول کر کے رسوا کرنا کوئی عمدہ فعل ہے؟ یہ اسی وقت ایک حوصلہ افزاء عمل ہو گا اگر انسانی تاریخ اس بات کی شہادت دے کہ مدعین باطن کے تمام تصورات تمام دعاوی اور سب کے سب افعال گمراہ کن اور جھوٹ پر مبنی تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس سلسلے کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا ہی قابل ستائش ہوتا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ صوفیوں اور اہل باطن کا طرز عمل اور طرز فکر مجبور کرتا ہے کہ ان امور پر توجہ دی جائے۔

اہل تصوف کا طرز فکر اور کائنات کی تکوین کے اسرار و رموز سے متعلق ایسے مباحث جن کی اساس غیر مادی اور تاحال تحقیق طلب امور پر مبنی ہیں، نہ صرف فکر انسانی کا عظیم ریکارڈ بلکہ توجہ طلب اور مزید تحقیق کے متقاضی ہیں سردست ایک سادہ سی مثال پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ مقصد یہ نہیں کہ صوفی ازم کا پرچار کر کے اور رہبانیت کا دور واپس لا کر انسان کو غار کے دور کے توہم پرست میں بدل دیا جائے بلکہ عقل و دانش کے ذریعے کسی حتمی فیصلے کی کوشش تیز تر کرنا ہے۔

اہل تصوف کے ہاں صدیوں سے اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جانداروں کے ارد گرد روشنی کا ایک خاص ہالہ ہوتا ہے جو عام آدمیوں کی نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ عرصہ دراز تک اس دعوے کی تکذیب کی جاتی رہی۔ روحانیت پسندوں کا دعویٰ تھا کہ یہ ہالہ جسے وہ نسمہ کہتے ہیں آدمی کی بدلتی طبع کے ساتھ رنگت بھی تبدیل کرتا ہے اور صاحب نظر شخص محض رنگت دیکھ کر فرد کی طبیعت اور امراض کی شناخت کا اہل ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں اہل خرد کے نزدیک بیہودہ توہمات سے بڑھ کر کچھ نہ تھیں مگر ۱۹۳۹ء میں دو افراد سیمیان اور ویلنٹینا کرلیان نے تجربات کے دوران زندہ اجسام کی فوٹو کھینچ کر یہ عظیم حقیقت دریافت کی کہ فی الحقیقت ہر جاندار کے ارد گرد برقناطیسی امواج کا ایک ہالہ موجود ہوتا ہے جو صحت مند اور بیمار اجسام میں مختلف رنگوں اور شدت میں فرق کا حامل ہوتا ہے۔ اہل تصوف اس عظیم حقیقت سے کیونکر آگاہ ہوئے؟۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین غیر منقسم ہندوستان کے بلند پایہ ریاضی دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے یورپ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک مرتبہ وہ ریاضی کے ایک مسئلے کی پیچیدگی سے اس قدر پریشان ہوئے کہ جرمنی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات کے ناظم سید سلیمان اشرف کو ڈاکٹر صاحب کی مشکل کا علم ہوا تو انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو بریلی میں مولانا احمد رضا خان سے ملنے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ وہ یورپ سے تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں اور ریاضی کے مسائل میں ید طولیٰ رکھتے ہیں پھر ایک مقامی آدمی ریاضی میں ان سے زیادہ معلومات کس طرح رکھ سکتا ہے۔ گو ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ تھا کہ مولوی احمد رضا خان سے ملنا وقت برباد کرنا ہے۔ مگر سید سلیمان اشرف کے اصرار پر بریلی چلے گئے۔ احمد رضا خان بیمار تھے مگر سید سلیمان اشرف صاحب کا نام سن کر فوراً ملاقات کی۔ انہیں کہا گیا کہ ریاضی کے ایک بہت پیچیدہ مسئلے کے سلسلے میں حاضر ہوئے ہیں اور اطمینان سے بات کی جائے گی۔ مگر احمد رضا خان صاحب نے اسی وقت دریافت کرنے پر اصرار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ بیان کیا ہی تھا کہ مولوی صاحب نے جواب بتا دیا۔ ڈاکٹر صاحب حیرت سے گنگ ہو گئے بے اختیار بولے میں سنا کرتا تھا کہ علم لدنی بھی کوئی شے ہے۔ آج آنکھ سے دیکھ لیا ہے۔ مولانا نے اپنا ایک قلمی رسالہ ڈاکٹر صاحب کو دکھایا جس میں علم ہندسہ پر بحث کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی انہوں نے کہا "میں نے یہ علم حاصل کرنے میں بہت صعوبت اٹھائی ملک ملک کا سفر کیا۔ بے انتہا روپیہ صرف کیا۔ یورپین استادوں کی جوتیاں سیدھیں کیں تب کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ مگر جو کچھ آپ جانتے ہیں اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو طفل مکتب سمجھ رہا ہوں۔ مولانا یہ تو فرمایئے کہ اس فن میں آپ کا استاد کون ہے؟۔" مولانا نے کہا میرا کوئی استاد نہیں میں نے اپنے والد

سے چار قاعدے جمع، تفریق، ضرب اور تقسیم محض اس لئے سیکھے تھے کہ ترکے کے مسائل میں ان کی ضرورت پڑتی ہے۔ شرح چغمینی شروع کی ہی تھی کہ والد صاحب نے فرمایا کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو۔ مصطفیٰ پیارے ؐ کی سرکار سے یہ علوم تم کو خود ہی سکھا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں اپنے مکان کی چار دیواری کے اندر بیٹھا خود ہی کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب سرکار رسالت مآبؐ کا کرم ہے۔ (سات ستارے از مقبول جہانگیر)

یہ علم باطنی کی ایک مثال تھی جس کی روایت صدیوں سے کی جارہی تھی۔ یہ تھا باطنی علم کا وہ شعبہ جسے محض اتفاق کہہ کر نظرانداز کرنا کوئی حوصلہ افزاء امر نہ ہوگا۔ اگر وجدان اور باطنی علم محض خوش فہمی ہے تو ان امور کو کس کھاتے میں ڈالا جائے جو خوارق عادات کہلاتے ہیں جن کے شاہد بیک وقت کئی کئی قابل بھروسہ اور سنجیدہ شخصیات ہوتی ہیں اور جو اہل تصوف کے بقول وجدان کو تقویت دینے کے لئے استعمال ہونے والے امور مثلاً تجرد گزینی، ارتکاز و استغراق، مراقبہ اور چلہ کشی کے دوران طالبین سے سرزد ہوا کرتے ہیں "کرامتیں" کے عنوان کے تحت ایسے ہی چند اسرار مظاہر کا بیان ہے جو خرد پرستوں کو مزید جستجو کے لئے اکساتے ہیں۔ (دیکھئے "کرامتیں")

# علم ارواح - روحیت اور حاضرات ارواح

قدیم زمانے سے توہم پرست اقوام میں ایسے افراد کا تذکرہ ملتا ہے جو پراسرار قوتوں کے مالک ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ تجرد گزینی کے دوران غاروں، صحراؤں، جنگلوں وغیرہ میں عملیات کرتے جس سے ان میں یہ قوتیں پیدا ہو جاتی تھیں۔ اس قسم کے لوگوں کا سراغ، ہندوستان، افریقہ، آسٹریلیا، ملائشیا، انڈونیشیا، ریڈ انڈین امریکیوں اور جزائر غرب الہند میں ملتا ہے۔ ان کو ایک ہی اصطلاح شمن یا شامن سے یاد کیا جاتا ہے۔ (سنسکرت میں اسمن بمعنی تپسوی)، شامن لوگ مردوں کی روحیں بلانے پر قادر تصور ہوتے تھے۔ طریقہ کار کم و بیش یہی ہوتا تھا کہ روحی محفل میں ایک زود حس شخص کو بطور واسطہ یا میڈیم بٹھا دیا جاتا۔ اس پر خود رفتگی طاری ہوتی۔ روح حاضر ہو کر اس خود رفتہ شخص کی زبانی گفتگو کرتی۔ جب یہ روحی نشست اختتام پذیر ہوتی تو معمول اپنے حواس میں واپس لوٹ آتا۔

دور حاضر میں، مہذب اقوام کے ہاں روحوں سے رابطے کی محافل کا انعقاد مشرق و مغرب میں ایک دلچسپ مشغلے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سب شمن ازم کی یادگار ہے۔ اور اس کی کامیابی کا راز روحی عامل کی ہاتھ کی صفائی، چال بازی اور مکر و فریب میں مضمر ہے۔ دوسری جانب محفل میں موجود لوگوں کا فریب نفس اثر پذیری اور زود اعتقادی ان محافل میں جان ڈال دیتے ہیں لیکن بعض ایسے تاریخی واقعات اپنی جگہ ہیں جو بہرطور ناقابل تشریح قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں فریب کاری باوجود کوشش ثابت نہ کی جا سکی اور ان کے نتائج بھی حیرت انگیز رہے۔

مغرب میں روحیت کی ابتداء ۱۸۴۸ء میں امریکہ سے ہوئی۔ نیویارک کی وین کاونٹی میں ایک بستی ہائڈس ول تھی۔ یہاں ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں ایک غریب کسان جان ڈی فاکس اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کے ہمراہ رہتا تھا۔ بڑی بیٹی مارگریٹ دس برس کی اور چھوٹی کیٹ سات برس کی تھی جب ان کے گھر میں وہ واقعات رونما ہوئے جنہوں نے مغرب میں روحیت کے نظریئے کی داغ بیل ڈالی۔

۱۹۴۸ء میں مارچ کی ایک صبح ان لوگوں نے گھر کے در و دیوار پر دھپ دھپ اور دستک کی آوازیں سنیں۔ مگر کوئی نظر نہ آتا تھا۔ آوازوں کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ ان کا پورا مکان لرزنے لگتا۔ ایک روز ننھی کیٹ نے دھپ دھپ کی آوازوں کے دوران ویسے ہی تالی بجا دی تو فوراً جواب میں تالی کی آواز سنائی دی۔ بچی نے چٹکی بجائی تو جواباً چٹکی بجائی گئی۔ بچی نے پھر تالی بجائی تو نادیدہ نے بھی تالی بجا دی۔ تب کیٹ خوشی سے دوڑتی ہوئی ماں باپ کو بلا لائی انہیں یہ قصہ سنایا تو وہ بھی اس شغل میں شریک ہو گئے۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ اس طریقے پر اس نادیدہ مخلوق (جسے وہ شروع سے ایک بے چین روح قرار دے رہے تھے) سے رابطہ کیا جانا چاہئے۔

آوازوں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ ایک مظلوم خوانچے والے کی روح ہے جسے اس مکان میں ایک رات قیام کے دوران اس کے میزبانوں نے قتل کر کے لاش جلا کر دبا دی تھی۔

اس بات کی اطلاع کسان نے مقامی پولیس کو دی تو دور دور آسیبی مکان اور اس میں رہنے والی روح کی خبر پھیل گئی۔ بے شمار لوگ روح سے رابطے کے

لئے آنے لگے اور تب سے روحیت کے مسلک کو عروج حاصل ہوا۔ مغرب میں جا بجا لوگوں نے روحیں بلانے اور روحوں سے رابطے کرنے کا دھندا شروع کر دیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب چارلس ڈارون کے نظریات نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔ اور مروجہ مذہبی عقائد کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں۔ ایسے میں فوکس بہنوں کے واقعہ کو اس لئے اتنی شہرت ملی کہ یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ انسانی روح بھی کوئی چیز ہے جسے مرنے پر بقا حاصل ہے۔

اس دوران فاکس کی بیٹوں نے اپنی بین الاقوامی شہرت کو یہ کہہ کر دھبا لگا دیا کہ یہ سارا سلسلہ انہوں نے دھوکہ دہی سے شروع کیا تھا۔ مگر بعد ازاں انہوں نے بیان بدل دیا کہ نہیں یہ سب حقیقت تھی اور پچھلا بیان انہوں نے اس لئے دیا تھا کہ اس کے لئے ایک بڑی رقم کی آفر ہوئی تھی جو پوری نہ ملی۔ انہوں نے دوبارہ بیان درست دے دیا ہے۔ گو اس واقعے سے روحیت کے مسلک پر کوئی اچھے اثرات مرتب نہ ہوئے لیکن حاضرات ارواح کے شعبے کو شہرت ملتی ہی چلی گئی۔

حاضرات ارواح Necromancy روحوں کو طلب کر کے تحریر یا تقریر کے ذرائع سے ان سے گفتگو کرنے کا نام ہے۔ یہ بہت قدیم علم ہے اور تا حال تحقیق کا متقاضی۔

ارواح سے رابطے کے لئے چند افراد ایک پر سکون مقام پر محفل جما لیتے ہیں۔ ایک دائرے کی شکل میں بیٹھ کر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر حلقہ بنا لیتے ہیں۔ (ان کا خیال ہے کہ اس طرح برقناطیسی امواج دائرے کی صورت میں دوڑنے لگتی ہیں جس سے ارواح کو متوجہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے) اب کوئی مذہبی یا روحانی جملے دہرائے جاتے ہیں۔ حاضرین میں سے کوئی شخص جو شدید الاحساس اور شدت جذبات کا حامل ہو اچانک بے خود ہو جاتا ہے۔ اور حاضرین سے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اسے معمول یا میڈیم کہا جاتا ہے۔

روح سے رابطے کا ایک ذریعہ آٹومیٹک تحریر یا خود نویسی ہے۔ تنہائی میں کامل خاموشی سے قلم ہاتھ میں لے کر خالی الذہن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں روشنی کم کر دی جاتی ہے۔ سفید کاغذ پر قلم رکھ کر انتظار کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات ہاتھ خود بخود چلنے لگتا ہے۔ اور کاغذ پر کوئی بات یا علامت نقش کر دیتا ہے۔ یہ تحریر بسا اوقات فضول اور مبہم ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوتی ہے۔ آزاد نگاری کرنے والوں کا بیان ہے کہ ان کا ہاتھ یخ بستہ اور بے جان ہو کر غیر ارادی طور پر حرکت کرتا ہے۔

رابطے کا ایک اور ذریعہ پلان چٹ ہے۔ یہ طریقہ قدیم چین میں رائج تھا۔ پلان چٹ تکونی شکل کی چوبی تختی ہے۔ جسے بعض اوقات پان یا دل کی صورت میں بھی بنایا جاتا ہے۔ اس کی لمبائی عموماً ۶ انچ سے کم ہی ہوتی ہے۔ اس کی نچلی جانب دو گیند نما پہیے سے لگے ہوتے ہیں اور ایک نوک کے پاس سوراخ میں پنسل فٹ کر دی جاتی ہے۔ جس سے پلان چٹ مستوی ہو کر ایک انچ اوپر ہو جاتا ہے۔ دو یا دو سے زائد روحیت پسند پلان چٹ کو بڑے سفید کاغذ پر رکھ کر اپنی شہادت کی انگلی تختی پر مس کر کے انتظار کرتے ہیں کہ پلان چٹ حرکت شروع کرے اور روح اپنا پیغام کاغذ پر تحریر کر دے۔

تیسرا اہم طریقہ تختہ روحانی یا اوجا بورڈ کا استعمال ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک امریکی ولیم فلڈ نے یہ تختہ ایجاد کیا۔ لفظ اوجا فرانسیسی اور جرمن زبان کے دو الفاظ اوئی اور جا سے مل کر بنا ہے یہ دونوں ہم معانی الفاظ "ہاں" کا مفہوم رکھتے ہیں اوجا بورڈ ہموار اور پالش شدہ سطح والا ایک چوبی تختہ ہوتا ہے جس پر صفر سے نو تک کے اعداد تمام حروف تہجی اور "ہاں"، "نہیں" کے الفاظ درج ہوتے ہیں۔ اب شیشے کا ہلکا اور صاف گلاس اوندھا کر کے رکھا جاتا ہے۔ جس پر شائقین انگلیاں مس کر کے کسی روح کو حاضر ہونے کی درخواست کرتے ہیں اور روح گفتگو کے لئے گلاس کو ایک ایک حرف پر لے جاتی ہے جنہیں الگ سے درج کر کے حروف کو الفاظ میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔

عمانویل سویڈن بورگ ۱۶۸۸ء میں سٹاک ہوم میں پیدا ہوا۔ وہ پراٹسٹنٹ تھا اور خاصا پڑھا لکھا ذہین شخص بنیادی طور پر ریاضی دان تھا مگر گھڑی سازی اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی سویڈن کے کان کنی کے شعبے میں محصول کار کی حیثیت سے کام کے دوران اس نے سویڈن، ڈنمارک جنگ میں پانچ بحری جہازوں کو خشکی پر پندرہ میل تک لے جانے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔

۵۶ برس کی عمر میں اسے روحی تجربات ہوئے تو اس نے کہنا شروع کر دیا کہ فرشتے اسے جنت و دوزخ کی سیر کراتے رہتے ہیں۔ لوگوں نے سنا تو کہا کہ اتنا اچھا انجینئر پاگل ہو گیا ہے۔ مگر جو بھی اس سے ملاقات کرتا تو اس کی بذلہ سنجی دیکھ کر اپنی رائے بدل لیتا پھر اس کے روحی مکاشفوں اور کارناموں کی تصدیق بھی

ہوئی۔ مثلاً ایک مرتبہ شاہی دربار میں ملکہ نے اس سے مذاقاً پوچھا کہ کیا اس نے جنت کی سیر کے دوران اس کے فوت شدہ بھائی سے ملاقات کی ہے؟ سویڈن برگ نے بڑے افسوس سے کہا کہ نہیں تب ملکہ نے کہا کہ اگر کبھی ملاقات ہو تو سویڈن برگ کو بہن کی جانب سے سلام بھیجے۔ اگلی بار جب سویڈن برگ ملکہ سے ملا تو اس نے کہا کہ وہ ملکہ کے بھائی سے ملا ہے اور جب اسے ملکہ کا پیغام دیا تو اس نے معذرت کی کہ وہ ملکہ کے خط کا جواب نہیں دے سکا تھا جو اسے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے موصول ہوا تھا مگر اب وہ سویڈن برگ کی معرفت جواب دے گا۔ پھر اس نے ملکہ کے خط میں لکھی گئی باتوں کے جوابات اس کے بھائی کی جانب سے دیئے۔ ملکہ ہکا بکا بیٹھی رہی اور پھر بتایا کہ "سوائے خدا کے کسی کو بھی اس راز کا علم نہیں تھا۔"

انہی دنوں سویڈن میں ڈچ سفیر وفات پا گیا۔ اس کی بیوہ کو سامان کی فہرست دی گئی کہ اس کی قیمت ادا کی جائے مگر بیوہ کو یاد پڑتا تھا کہ اس کے شوہر نے وفات سے پہلے سامان کی قیمت ادا کر دی تھی لیکن بیوہ کو یہ نہیں پتا تھا کہ اس نے رسید کہاں رکھدی تھی؟ چند روز بعد سویڈن برگ نے ایک محفل میں اس سے کہا کہ اس کا شوہر کہتا ہے کہ رسید اوپر دفتر میں رکھی ہے۔ بیوہ نے کہا یہ ناممکن ہے کیونکہ وہ سارا کمرہ کھنگال چکی ہے۔ سویڈن برگ نے کہا اس کے شوہر نے ایک خفیہ دراز کا پتہ دیا ہے جس میں رسید رکھی ہے۔ بیوہ اوپر گئی اور ہدایات کے مطابق دراز تلاش کر کے کھولا۔ اندر رسید موجود تھی۔

شاید سویڈن برگ ارواح سے رابطے کا صحیح دعوے دار تھا لیکن بعض مکاشفے خاصے نامعقول ثابت ہوئے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب میں وہ مریخ کے لوگوں کو دیکھنے کا تذکرہ کرتا ہے اور آج روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مریخ سنسان جگہ ہے۔ جہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں یوں اس کے مکاشفوں میں غلطی کا احتمال موجود تھا۔

---

برطانیہ کی مشہور ترین تاریخی عمارات میں سے ایک گلاسٹون بری ایبے ہے۔ قدیم روایات کی رو سے یہ ایک نہایت مقدس مقام ہے۔ مختلف العقائد عیسائی فرقوں کی باہمی لڑائی کے دوران ہنری ہشتم کے عہد میں یہ عمارت بری طرح تباہ ہو کر ناقابل شناخت ہو گئی اور صرف قدیم مخطوطوں اور روایات میں اس کا تذکرہ باقی رہ گیا۔

اس کی تلاش کا کام ایک برطانوی معمار اور ماہر آثار قدیمہ فریڈرک بلائی بانڈ کے سپرد تھا۔ یہ شخص گلاسٹون بری ایبے کی مسلسل اور لاحاصل تلاش سے سخت دل گرفتہ تھا۔ ایسے میں اسے اپنا ایک دوست یاد آیا جو روحوں سے رابطے کا دعوے دار تھا۔ بلائی بانڈ نے سوچا چلو لگے ہاتھوں اسے بھی آزمالیں۔ یہ شخص کپتان بارٹ لیٹ تھا۔ بارٹ لٹ نے روحوں کو حاضر کر کے بلائی بانڈ کی خواہش کا اظہار کیا تو ارواح نے بخوشی مدد کرنے کی حامی بھر لی۔ اور بعد ازاں گمشدہ عبادت گاہ کے بارے میں حیران کن تفصیلات فراہم کیں۔ ان معلومات کی روشنی میں جب متعلقہ جگہوں پر کھدائی کی گئی تو یہ بالکل درست ثابت ہوئیں اور گمشدہ عبادت گاہ دریافت کر لی گئی۔ ان ارواح نے ایک ایک انچ کے بارے میں خطانہ کی۔ تلاش کنندگان کی بڑی واہ واہ ہوئی مگر جب بلائی بانڈ نے عوام الناس کو بتایا کہ اس تلاش کا سہرا درحقیقت ان ارواح کے سر ہے جو گلاسٹون بری ایبے کے راہب ہوا کرتے تھے تو اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اور ۱۹۲۲ء میں بے چارے سے یہ منصوبہ چھین لیا گیا۔ دس برس بعد بانڈ نے ایک کتاب میں ارواح سے متعلق تمام واقعات بیان کر دیئے اور پہلے سے بتا دیا کہ ابھی جن مقامات کی دریافت باقی ہے وہ کس طرح کے ہوں گے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بعد ازاں کھدائی کے دوران دریافت ہونے والی تعمیرات بلائی بونڈ کے درج کردہ اعداد و شمار کے مطابق تھیں۔ جس کا ثبوت بونڈ کی کتاب دی گیٹ وے آف ری ممبرنس ہے۔[2]

متعلقہ موضوعات

روحوں سے رابطہ

# حوالہ جات

## باب ہشتم


۱۔ بلاغ القرآن اگست ۱۹۶۸ء ص ۲۵

۲۔ World of incredible But True P:28

# کتابیات


| | |
|---|---|
| ۱۔ کائنات اور انسان | علی عباس جلالپوری |
| ۲۔ انسان نے کیا سوچا | غلام احمد پرویز |
| ۳۔ ماضی کے مزار | سید سبط حسن |
| ۴۔ اقبال کا علم الکلام | علی عباس جلالپوری |
| ۵۔ علم الکلام | مولانا محمد ادریس |
| ۶۔ من کی دنیا | غلام جیلانی برق |
| ۷۔ میری آخری کتاب | غلام جیلانی برق |
| ۸۔ اسرائیل اور قرآنی پیش گوئیاں | علی اکبر |
| ۹۔ الامام المہدی | سید محمد کاظم القزوینی |
| ۱۰۔ چودھویں صدی ہجری کا اختتام اور امام مہدی | محمد اعظم اکسیر |
| ۱۱۔ مسیح کی آمد ثانی | گارڈن لنڈسے |
| ۱۲۔ ایلیا۔ ادیان عالم کا مرکز نجات | حکیم سید محمود گیلانی |
| ۱۳۔ شمس المعارف | احمد بونی |
| ۱۴۔ مقدمہ ابن خلدون | |
| ۱۵۔ چودہ صدیاں نمبر (سیارہ ڈائجسٹ) | رئیس امروہوی |
| ۱۶۔ جنات | رئیس امروہوی |
| ۱۷۔ حاضرات ارواح | برکت علی سرمد |
| ۱۸۔ نظریہ روح کا تجزیہ | ایم سلیم |
| ۱۹۔ پراسرار کائنات کا معمہ | سید قاسم محمود |
| ۲۰۔ سائنس میگزین | |
| ۲۱۔ دیپک ڈائجسٹ | |
| ۲۲۔ افغانوں کی نسلی تاریخ | خان روشن خان |

| | |
|---|---|
| ۲۳۔ ہماری کائنات | سیّد قاسم محمود |
| ۲۴۔ احرام کے کرشمے | |
| ۲۵۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا | سیّد قاسم محمود |
| ۲۶۔ ظہور امام مہدی | محمد اعظم اکسیر |
| ۲۷۔ عام فکری مغالطے | سیّد علی عباس جلال پوری |
| ۲۸۔ اردو انسائیکلوپیڈیا | فیروز سنز |
| ۲۹۔ چودہ صدیاں نمبر | سیارہ ڈائجسٹ |
| ۳۰۔ انجیل برناباس | |
| ۳۱۔ تاریخ اقوام عالم | سیفی نوگانوی |
| ۳۲۔ ناقابل یقین سچائیاں | سجاد حیدر |

1. Ghosts the Illustrated History (Peter Hainiag) 1987.
2. The People's Almanac- II (David Wallechinsky)
3. A Brief History of time (Steven Hokings)
4. The Book of Great Mysteries (Colin wilson)
5. Mysteries of the world (Christopher Pick)
6. The world's Greatest Mysteries (Gerry Brown)
7. Encyclopedia of Mysterious Places. 1990
8. World Book Encyclopedia. 1992.
9. Unsolved Mysteries of the Universe (Richard Cavendish)
10. Great Mysteries (John Grant) 1988
11. Mysteries From Forgotten Worlds (Charles Berlitz) 1972
12. World of Incredible but true (Charles Berlitz) 1991
13. Stranger than Science.
14. Modern Mysteries of the World (Janet & Colin Bord) 1989
15. Discovering Ancient Mysteries (Micheel Gibson) 1981.
16. The Guiness Encyclopedia
17. World Book Encyclopedia
18. How to predict your Future (Treasure Press)
19. Secrets & mysteries (Granada T.V. Programme)
20. Gray's Anatomy (Henry Gray)
21. Encyclopedia of dinosaurs (Publication Internation Limited)
22. Worlc Famous Unsolved Mysteris (A Kumar Pustak Mahal Delhi)